رُوس کی تاریخ پر ایک اجمالی نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

یاد ہوگا کہ روسی نصرانیت نے گیارھویں صدی کے وسط میں آرتھوڈکس (Orthodox) عقائد قبول کر لئے تھے، لیکن اس ردو قبول کے کیا وجوہ تھے؟ اور روسی مسیحیت کی یونانی کلیسا سے مل کر کیا حالت رہی؟ سطور ہذا میں اس پر بھی ایک نظر ڈالی جاتی ہے، تاکہ قارئینِ کرام اس گوشۂ بحث سے بھی ناواقف نہ رہیں:-

روس میں یونانی کلیسا کی مذہبی تبلیغ واشاعت زیادہ تر سیاسی وجوہ پر مبنی تھی۔ چونکہ روس تمام یورپ میں بلحاظِ وسعتِ ارضی سب سے بڑی سلطنت تھی، جو متعدد فرمانرواؤں کے قبضہ میں تھی۔ اس لئے بائزنطینی (Byzantineam) کلیسا نے ضروری سمجھا کہ اس وسیع رقبۂ زمین کے تمام باشندوں کو اپنے مسلک ومشرب میں داخل کرکے، اپنا ایک زبردست عامی پیدا کرلے، اسی غرض سے آرتھوڈکس مشنری نے سب سے پہلے روسی امراء کو اپنے طریق کی دعوت دی، اور پھر تمام اقطاع واضلاع میں مبلغین بھیجدیئے، اور تمام روسی قوم کو آرتھوڈکس بپتسمہ دیدیا۔

روسی کلیسا کے اعیان واکابر اپنی خدمات وفرائض کے لحاظ سے دو قسموں پر منقسم تھے، ایک رہبان، دوسرے قسیس۔ قسیسین کا کام نکاح پڑھانا، اور عبادت کرانا تھا، اور رہبان کی خدمت، اس کا انتظام، اور ہمہ وقت پاسبانی۔ رہبان ہمیشہ کلیساؤں میں رہتے اور تجرد کی بے روح زندگی بسر کرنے پر مجبور تھے، ان لوگوں کی علمی حالت بھی عام طور پر نہایت پست اور مذہبی واقفیت بہت محدود ہوتی تھی، مذہبی مجالس ومحافل کے مراسم، اتوار کی دعاؤں کے الفاظ، اور نکاح واصطباغ کے طریقے زبانی یاد تھے، جو زیادہ تر زبانی رٹاؤ پر مبنی ہوتے تھے، عامۂ امت اور ان کے درمیان صرف یہ فرق تھا کہ وہ دنیوی کاموں میں مشغول رہتے، اور ہفتہ میں صرف ایک روز گرجا میں جاتے تھے اور یہ رات دن وہیں رہتے، اور نذرانوں سے پیٹ پالتے تھے،

لیکن یاد رہے کہ روسی کلیسا اور بائزنطینی کلیسا بالکل ایک نہ تھے، بلکہ دونوں میں کچھ کچھ اختلافات تھے، اور اس حیثیت سے روسی کلیسا بائزنطینی کلیسا کے تمام اثرات سے آزاد، اور خود ایک مستقل حیثیت رکھتا تھا، اس کے اوقاتِ عبادت، طریقِ دعا، الفاظ و مصطلحات، وظائف و معتقدات بالکل مختلف تھے، دعائیں قدیم سلافی زبان میں پڑھی جاتی تھیں،

سولھویں صدی میں حالت بدلی، طبیعتوں کے بے چین انقلابوں نے مذہب میں بھی انقلاب پیدا کرنا چاہا، اس انقلاب کی پہلی قسط اصلاح تھی، جسے خواب ربودہ روسیوں کی بیدردی کی پہلی کروٹ سمجھنا چاہیئے، سولھویں صدی کے وسط میں دربار شاہی سے ایک فرمان نافذ ہوا، یہ فرمان روسی گرجوں کے اِنتظام و نگرانی کے لئے ایک اسقفِ اعظم کے تقرر کا اعلان تھا، اس کے ضمن میں چند ضروری اصلاحات کا تذکرہ بھی تھا، جن میں سب سے زیادہ اہم جاہل راہبوں کی برطرفی اور مذہبی کتابوں کی تحریفات سے حفاظت تھی، اسقفِ اعظم نے تمام گرجوں کے راہبوں کو بُلا کر باقاعدہ ان کا اِمتحان لیا، جو راہب امتحان میں ساقط ہُوئے، ان کے لئے نصاب تعلیم ترتیب دیا، اور سب کو تمام و کمال پڑھ کر امتحان دینے پر مجبور کیا، بعض نے اس کے حُکم کی تعمیل کی کہ حکومت کی قوت اس کے ساتھ تھی، اور بعض اپنی سیادت دینی کے گھمنڈ میں آکر سرکش ہو گئے، اِس سرکشی پر نیکیوں نے انہیں سزا دی، اور ان کی جائدادوں کی ضبطی کا حُکم دیدیا، اس سے مُلک کی عام حالت بہت پُر آشوب ہو گئی، مذہب کے دیوانے پروانہ وار ان کے گرد جمع ہو گئے، اور ان باتوں کو بدعت سمجھ کر بگڑ بیٹھے، ہر طرف افراتفری پھیل گئی، ظاہر ہے، جو قوم مدتوں سے جہالت کی زندگی بسر کر رہی ہو، جس نے صدیاں ضعیف الاعتقادی کے قعرِ جمود میں گذار دی ہوں، وہ اِس صدائے اصلاح پر کیسے لبیک کہہ سکتی تھی، اس کے لئے تو ایسی ہوا کا ہر جھونکا، اور ایسی آواز کی ہر گونج اشد شدید معصیت تھی، جس کی مدافعت اس کا مذہبی فرض تھا، وہ اپنے موجودہ حال پر قانع تھی، اور اس کا قدامت پرست جذبہ اس کو ہر ایسی بات سے روکتا تھا جو طریقِ سلف کے خلاف، اور کسی جدید اسلوب و آیین کا داعی و ناشر ہو، چنانچہ انہوں نے وہی کیا جو فطرتِ جمود ایسے مواقع پر کرتی ہے، اس لئے ضرورت تھی کہ اصلاح کا صور یکایک اس قدر بلند آہنگی سے نہ پھُونکا جاتا، اور راہِ تجدید میں جو قدم اُٹھایا جاتا، نہایت آہستگی اور دانشمندی سے اُٹھایا جاتا، تاکہ سونے والوں کو کام کی

خاموش چیخ پکار گراں بھی نہ گذرتی اور ناقہ بھی منزل تک پہنچ جاتا،

بہر حال اس وقت جو کچھ ہونا تھا وہ ہوا، نئی مچھلی کو دیکھ کر تالاب کی ساری مچھلیوں نے طوفان اُٹھا دیا۔ لیکن بعد کو سب اسی رنگ میں رنگ گئیں، اور سب نے وہی طور طریق سیکھ لئے

تحریک اصلاح کے آغاز ہوتے ہی تو ہر طرف ہنگامے ہوئے، اور مذہبی غلو و اطراد نے اصلاح کو مثلِ مجنوں سنگِ طفلاں کا ہدف بنایا، لیکن آخر سب کو اسی کا حلقہ بگوش ہونا پڑا۔ اور ایک ایک نے شدید مذہبیت کا جامۂ احرام اتار کر اعتدال و توسط کا پہناوا پہن لیا،

نیکیون (Nikanon) جانتا تھا کہ آج جو لوگ چالیس چالیس روز روزے رکھتے، دو دو تین تین مہینہ گوشت نہیں کھاتے، ہر بات میں ایمان کو ٹھونستے اور جائز عیش و آرام سے بھی احتراز کرتے ہیں، کل اس سے بیزار ہو جائیں گے، اور مجبوراً اصلاح کی طرف مائل ہونگے۔ اس لئے وہ نہایت استقلال کے ساتھ اپنے لائحۂ اصلاح کی ترقی میں کوشاں رہا، زار کی اجازت سے نئے گرجے بنوائے، ان میں تعلیم یافتہ راہبوں کو مقرر کیا، اور ملک کو بڑی حد تک ناجائز مذہبی زیادتیوں سے سبکدوش کر دیا

قدامت پسندوں نے اس جماعت کو "منافق" کا لقب دیا، کیونکہ ان کے ہاں نہ ڈاڑھی منڈانے سے مذہب میں کوئی رخنہ پڑتا تھا، نہ حُقہ پینے سے کسی تزلزل کا خوف تھا، نہ عمدہ لباس پہننے اور عیش کرنے میں کوئی قباحت تھی، یعنی ان کا مذہب تو اسی طرح کی اور بہت سی باتوں کی اجازت دیتا تھا، اور اُن کا مذہب ہر بات سے ٹوٹ جاتا تھا۔ یہ صلیب کی طرف تین اُنگلیوں سے اشارہ کرتے تھے کہ عیسائیوں کے ہر قول و فعل سے تثلیث کا اظہار ہونا چاہیئے، اور وہ صرف دو انگلیوں سے۔ غرض اسی قسم کی بہت سی باتیں تھیں جو دونوں گروہوں میں مابہ النزاع تھیں، اور ان میں سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اصلاح پسندوں کا گروہ دن بدن ترقی کر رہا تھا، ان کی جماعت میں روزافزوں اضافہ ہو رہا تھا، اور مذہبی دیوانے کم ہو رہے تھے۔ راہبوں کے لئے یہ حسد کچھ کم نہ تھا، اس سے ان کے پرستاروں کی تعداد دن بدن گھٹ رہی تھی، اور آمدنی کے منافذ بھی بند ہو رہے تھے، وہ مدام اسی آگ میں جلتے اور ہر وقت مصروفِ قتل و پیکار رہتے تھے، تقریباً دو صدیاں اسی کشمکش میں گذر گئیں، آخر امتدادِ زمانہ سے جمود و نکبت کی یہ بندشیں ڈھیلی پڑیں، عقلیت کی روشنی چمکی

اور تمام نظریں خیرہ ہوگئیں۔ اب سب کو یہی سُوجھا کہ اس دیوانگی کا خرقۂ وحشت اتارنا چاہیئے، کہ مذہب آسانیاں چاہتا ہے، اور کسی پر اس کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا پھر اس کے احکام کو مُصیبت بنانے سے کیا فائدہ؟ دوسرے چونکہ اس تحریک کی خود حکومت بھی حامی تھی، اس لئے قدامت پرستی کا وجود قریب قریب مٹ گیا "مومنین" جاہلین اپنے توغل کا آپ شکار ہُوئے مصلح جماعت کامیاب ہُوئی، اور اس کی کامیابی نے یورپ سے متعارف ہونے کا راستہ کھول دیا، کیونکہ اُن کے مذہب میں اغیار سے ملنا بھی گناہ کبیرہ تھا

روس میں مغربی تمدن کا داخلہ اطالیوں (Italians) کی وساطت سے ہُوا ہے، ۱۵۵۲ء میں اطالوی (Italian) امارتِ بحری نے ایک تجارتی بیڑا چین کی طرف بھیجا، مگر وہ جبرالٹر (Gibraltar) سے نکل کر جنوب کی طرف جانے کے بجائے شمال کی طرف ہولیا، اور بھٹکتا ہُوا بحیرۂ ابیض (White Sea) میں پہنچ گیا، اور مشہور روسی بندرگاہ آرکینجل (Archangel) میں لنگر انداز ہُوا۔ اس وقت روسیوں کے قبضہ میں صرف یہی ایک بحری راستہ تھا، بالٹک (Baltic) پر سوئیڈش (Swedish) اور بحرِ اسود (Black Sea) پر تُرک قابض تھے، لیکن یہ بندرگاہ بالکل غیر آباد تھا، اطالیوں کے داخلہ سے ۱۵۸۳ء میں زار نے اس کو آباد کرنے کا حکم دیا، اور ان تاجروں کو جو یہاں متوطن ہوں خاص حقوق و رعایات عطا کیں۔ ان میں پہلا نمبر اطالیہ کا تھا، اور دوسرا انگلستان و ہالینڈ کا، شاہ ایوان کے عہد میں اطالیوں پر زیادہ عنایت رہی، اس نے صناعوں اور انجینیروں کو نہایت اعزاز و احترام سے بُلایا، ان کے ساتھ اور لوگ بھی آئے، جن میں فنِ طباعت کے ماہر بھی تھے، انہوں نے یہاں پریس قائم کرنے کا ارادہ کیا، اور حضورِ شاہی سے اس کا سر و سامان کیا گیا،

لیکن حضارت کی یہ نسیم بہار صرف مغربی روس میں چل رہی تھی، اور مغربی روس کے بھی صرف اُن حصّوں میں جہاں مستعمرین آباد تھے، ورنہ تمام روس خصوصاً مشرقی روس نہایت گہری وحشت و بربریت میں مبتلا تھا، راعی و رعایا دونوں یکرنگ اور اپنی جہالتوں میں یکتائی کے مدعی تھے، ایوانِ شاہی جن لوگوں سے لبریز تھا، ان کا ہر فرد سلطانِ وحشیت تھا، مسٹر مارس نے لکھا ہے کہ ۱۶۰۶ء میں روس کی طرف سے دو سفیر اٹلی بھیجے

گئے، یہ دونوں عادات وخصائل میں ایشیا کے جاہل ترین گنواروں کی طرح اکھڑ، مزاج وطبیعت میں عرب کے بدوؤں کی طرح خشن ودرشت، اور علم وتدبر میں افریقہ کے زولو تھے، اس پر طرہ یہ کہ ان کی وضع وہیئت بھی نہایت ابتر تھی، صفائی کے نام سے وہ قطعاً ناآشنا تھے، غسل سے انہیں نفرت تھی منہ دھونا ایک فعل عبث تھا، اور ڈاڑھی کا تا بحدِ ناف بڑھا لینا حسن مذہب وآیۂ تکمیل انسانیت، ان کے سر کے بال وحشیوں کی طرح بکھرے اور الجھے رہتے تھے، کپڑے بہت بدقطع پہنتے اور میل کے تودے چڑھا کر اتارتے تھے۔ شب وروز، خلوت وجلوت، صبح وشام کا ایک ہی لباس تھا، اسی کو پہنے دربار میں جاتے، جلسوں میں شریک ہوتے، دعوتوں میں جاتے، اور رات کو بے تکلف زمین پر سو جاتے تھے، وہ تقسیم عمل کی طرح تقسیم محل ومقام کے اصول سے بھی نابلد تھے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، سونے جاگنے، ملنے جلنے کی ایک ہی جگہ تھی، کھانا نہایت بدتمیزی اور بدتہذیبی سے کھاتے تھے، جیبوں کے رومال ان کے دسترخوان تھے، وہ گوشت کے بڑے بڑے بُچے ہاتھوں میں اٹھا لیتے اور دانتوں سے نوچ نوچ کر کھاتے تھے، ہر روز رات کے کھانے کے بعد شراب پینا، اور بدمستیاں کرنا ان کا معمول تھا، اور یہ ان کی تہذیب ومعاشرت میں اس قدر ضروری چیز تھی کہ اسے وہ بڑے بڑے پیپوں میں بھر کر اپنے ساتھ لائے تھے، کچھ تو اس وجہ سے کہ دیکھنے والے کثرتِ سامان سے مرعوب ہوں، اور کچھ اس وجہ سے کہ شراب پی کر گالیاں دینا، نوکروں کو مارنا، واہی تواہی بنکارنا، اور عیاشی کرنا ان کے فلسفۂ اخلاق وعواطف میں ایک عظیم الشان فضیلت تھی

شامتِ اعمال سے ایک اطالوی شاعر سے ان کی ملاقات ہوگئی۔ اس نے ان میں سے بڑے سفیر کی مداحی میں قصیدہ لکھا، چھوٹے سفیر کو یہ قصیدہ خوانی خوش نہ آئی، اور وہ بہت برہم ہوا کہ اس فعل سے اس کے جذبۂ خود پرستی کو بہت صدمہ پہنچا تھا، شاعر تھا مصاحب پیشہ اس نے ایک دوسرا قصیدہ لکھ ان کو بھی خوش کر دیا، اس سے دوسرے ممدوح ناراض ہوگئے، کہ اس قصیدہ میں کاغذ سفید اور دبیز لگایا گیا تھا، خط خوشنما اور روشنائی روشن تھی، اور یہ قصہ یونہی چلتا رہا

یہ تو تھی ان سفراء کی اخلاقی حالت۔ اب ایک نظر ان کی وسعت معلومات اور علم وتدبر

پر بھی ڈال لیجئے، اور اندازہ کیجئے کہ جس قوم کے منتخب شدہ سفیروں کا یہ رنگ ہو، اِس قوم کی عام حالت کیا ہوگی،

یہ لوگ صرف یہ کہ مغربی زبانوں سے کوئی زبان نہیں جانتے تھے، بلکہ خود اپنی مادری زبان میں بھی مہارتِ تامہ نہیں رکھتے تھے، اِن کا اندازِ گفتگو، طرزِ بیان، طریقِ تخاطب تو وحشیانہ تھا ہی مگر اس پر یہ اور طرّہ تھا کہ تقریروں میں الفاظ و محاورات نہایت سوقیانہ، تشبیہیں سخیف، سلسلۂ گفتگو طویل اور غیر متعلق قصص و حکایات سے لبریز ہوتا تھا، کسی بات میں فکر و تدبر نہیں کرتے تھے، عام اس سے کہ وہ کیسی ہی اہم ہو، نہ اپنے ملک کی سیاست پر عبور تھا، نہ اس مُلک کی عام سیاست سے واقفیت جہاں سفیر بن کے جاتے تھے، انتہا یہ تھی کہ اپنی سلطنت کی وسعت، اس کے شہروں کے نام، جغرافی حدود اور عام طبیعی باتیں بھی پوری طرح معلوم نہ تھیں، تاہم اصرار یہ تھا کہ ان کے فانوسِ عزت و حرمت میں ساری دنیا نمائش و گرائش کی شمعیں روشن کرے

۱۶۸۱ء میں ایک تجارتی معاہدہ کے لئے روسی سفارت بوتماکین (Butmakin) کے زیرِ قیادت فرانس آئی اور نابلدِ انسانیت لوگوں کا یہ وفد حضور شاہی میں پیش ہُوا، صدرِ وفد نے تقریر کی، تقریر کیا تھی اور کیسی، اس سے تو یہاں بحث نہیں قابل بیان جو واقعہ ہے وہ یہ ہے کہ صدرِ وفد کئی بار تقریر کرتے کرتے رک گئے اور شاہ فرانس کو نہایت حقارت سے دیکھا، کیونکہ وہ زار کا نام سُن کر تعظیماً کھڑا نہیں ہو جاتا تھا، یہ بات رفت گذشت ہُوئی اور تحریرِ معاہدہ کا وقت آیا تو بوتماکین (Butmakin) نے کہا کہ زار کا نام جس جگہ لکھا جائے ان کے القاب و آداب کے ساتھ لکھا جائے، فرانسیسی مدبروں نے اس گتھی کو بھی سُلجھایا، اور معاہدہ تکمیل پا گیا، اس کے اظہارِ مسرت میں لوئی نے زار کو ایک خط لکھا، جو تہہ ہو کر زار کے خط سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا، بوتماکین کے تیور پھر بدل گئے، بولا:- یہ خط ہمارے بادشاہ کے خط سے حجم میں چھوٹا ہے، اور اس سے ہمارے بادشاہ کی تخفیف و اہانت ہوتی ہے، اس کا جواب دیا گیا کہ اس خط کا کاغذ باریک، چکنا اور قیمتی ہے، اس لئے حجم میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے، ورنہ اصل میں اس کے برابر ہے، مگر صدر صاحب نہ مانے اور دوسرا خط اسی قسم کے کاغذ پر لکھوایا،

قریب قریب یہی کیفیت ۱۶۸۹ء تک قائم رہی، اِس عرصہ میں کئی دفعہ اصلاح و ترقی کے غلغلے بلند ہوئے اور یورپ کی طرف سے آنے والی ہواؤں نے روس کی ساکن و جامد فضا میں ہنگامۂ حیات پیدا کرنا چاہا، اور بالآخر نیند کے ماتے روسیوں کو سوتے سے جگا کر ترقی کی راہ پر لگا دیا،

سویڈن، اٹلی، انگلستان اور فرانس سے تعلقات قائم ہوئے، آمد و رفت، رسل و رسائل کا سلسلہ جاری ہوا، تاجر، صناع، مہندس، ڈاکٹر وغیرہ آتے اور وطن بنا کے رہ پڑتے تھے، یہ ایک ترقی یافتہ ملک اور عمران و حضارت کی طرف بڑھنے والی قوم کے سپوت تھے، اس لئے جدھر نکل جاتے اپنی راجدھانی قائم کر دیتے تھے، روس میں بھی انہوں نے اپنی راجدھانی قائم کی، اپنے طریق و عادات، تمدن و معاشرت، علم و ادب اور اخلاق و عواطف کے جوہر دکھائے، اور روسیوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا، تھوڑے ہی دن کے اتحاد و یکجائی سے تمام سنجیدہ دماغ انکی ہر بات للچائی نظروں سے دیکھنے لگے، انہوں نے اپنے اندر بھی وہی باتیں پیدا کر لینی چاہیں، اور ترقی کی جو راہ ہل چکی تھی، آہستہ آہستہ اسی کی طرف ہو لئے

مگر جذبۂ اصلاح و ترقی کی یہ خواہشیں ابھی بہت محدود تھیں، صرف وہی قبائل اس طرف آئے تھے جو یورپ سے روشناس ہو چکے تھے، اس روشناسی کا پہلا اثر یہ ہوا کہ روسیوں میں اتحاد اور شہریت کی رُوح پیدا ہو گئی، شمالی روس کے قبائل وسطِ روس میں آ کر آباد ہوئے، اور آناً فاناً میں جنگل کو منگل بنا دیا

روسی بادشاہوں کا عام قاعدہ تھا کہ وہ اُن قبائل کو اپنے ساتھ رکھتے تھے جو شہروں میں غارت گری کرتے، یا اپنے ساتھ کوئی ایسی قوت رکھتے جو کسی وقت حکومت کے لئے مضر ہو سکتی تھی، یہ قبائل دارالسلطنت میں رہتے تھے، اور ان کے سرگروہ ایوان شاہی میں ۱۵۶۵ء میں زار (ایوان) تین ہزار جرمن ولایات بالٹک سے اپنے ساتھ لایا، اور ماسکو Moscow ملک کے جنوبی حصہ میں ان کی نوآبادی قائم کر کے انہیں عام اجازت دیدی کہ وہ اس نوآبادی میں جو چاہیں کریں، ان کے لئے کوئی روک ٹوک نہیں، یہ اہلِ حرفہ کی جماعت تھی،

یہ دیکھ کر یورپ کی اور قوموں کو بھی اس طرف توجہ ہوئی، اور ایک قرن پورا نہ ہوا

تھا کہ ان کے توطن و استعمار کا سلسلہ ڈیڑھ لاکھ نفوس سے متجاوز ہو گیا، یہ مستعمرین یورپ کے مختلف شہروں سے یہاں آئے تھے، ان میں ہالینڈ، جرمنی، انگلستان کے باشندے زیادہ ممتاز تھے، اور اپنی معاشرت میں روسیوں کو جذب کر رہے تھے۔ لیکن یہ امیر مستعمرین کا ذکر تھا، حالانکہ ان میں ایک بڑی تعداد غربا کی بھی تھی، جو افلاس سے تنگ آکر محنت مزدوری کی غرض سے یہاں آئے تھے، ان لوگوں کی وہاں بھی کوئی خاص تہذیب و معاشرت نہ تھی، اس لئے یہاں آکر بھی ان میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ روسیوں میں مخلوط ہو گئے، اور انہی کے رسم و رواج سیکھ لئے، روسیوں کو غیر ملکی مزدوروں کا یہ اختلاط ناگوار ہوا، اور انہوں نے حکومت کو اس طرف توجہ دلائی، اس پر ۱۶۵۲ء میں دربارِ شاہی سے ایک قانون نافذ ہوا، اور نو آباد مجاذیب کو حکم دیا گیا کہ وہ ماسکو کے محلہ سلوبوا میں آباد ہوں، یہ محلہ محض انہی لوگوں کے لئے بنایا گیا تھا، ۱۶۷۸ء کی مردم شماری میں ان کی تعداد (۱۸۰۰۰) تھی،

اس تقریب سے روس میں مغربی تمدن پھیلا، اور وحشت و بربریت کا دور ختم ہو کر تہذیب و عمران کا آغاز ہوا، اتفاق سے اسی زمانہ میں روس کا تختِ حکومت ایک ایسے شخص کے ہاتھ آیا جو مغربی تہذیب کی گود میں پل کر جوان ہوا تھا، یہ مغرب کی ہر ادا پر فریفتہ تھا، اس نے روس میں اصلاح و ترقی کی عام حرکت پیدا کی، ملک کو اندھی مذہبیت اور جھوٹے ایمان کی لعنت سے پاک کیا، قدیم تہذیب و معاشرت کی بوسیدہ دیواریں گرا کر جدید عمران و حضارت کی عمارتیں کھڑی کیں، مدارس و مکاتب قائم کئے، صنعت و حرفت کے کارخانے کھولے، سیر و تفریح کے تماشا گھر بنائے، اور روسیوں کو جہد للحیات و بقاء اصلح کی جنگ میں کامیاب ہونے کے لئے تیار کر دیا،

یہ پیٹر اعظم تھا،

پیٹر اعظم ۱۶۸۹ء میں سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کا عہد مختلف حیثیات سے بہت نمایاں ہے، ازاں جملہ عیسائیت کی ترقی، نظم و قانون کا قیام، تہذیب و تمدن کا نشر، اور علوم و فنون کا فروغ ہے، چونکہ اس کی تربیت ابتدا سے مغربی اصولوں پر ہوئی تھی، اس نے آنکھیں کھول کر جو چیزیں دیکھی تھیں، جن رسوم و آداب کے ہنگاموں میں عہدِ طفلی و مراہقت بسر کیا تھا،

وہ سب مغربی تہذیب و تمدن سے متاثر تھیں، اور چونکہ مغرب کا تمدن فاتح تمدن تھا اور اس کی فتوحات کا سلسلہ برابر جاری تھا، اس لئے قدرتی طور پر ہر دل و دماغ اسی کا ہو رہتا تھا، جو آنکھ ایکبار اس کو دیکھ لیتی تھی اسی کی پرستار بن جاتی تھی، اور ہر شخص ترک و اختیار پر مجبور تھا،

پیٹر اس سے پہلے بھی ایک دفعہ تخت حکومت پر بیٹھ چکا تھا، لیکن اس وقت اس کی عمر فرمانفرمائی کے قابل نہ تھی، عنانِ حکومت اس کی بہن صوفیا (Sophia) نے اپنے ہاتھ میں لے لی، اور اس کو آرکینجل (Archangel) کے قریب ایک گاؤں میں بھیجدیا، یہاں اس نے اپنی تعلیم مکمل کی، قوائے دماغی کو تربیت دی، مغربی زبانیں سیکھیں، علوم و فنون میں درخور حاصل کیا، یورپین قوموں کے ساتھ میل جول بڑھایا، مختلف صنعتوں سے واقفیت پیدا کی، فنونِ سپہ گری میں دستگاہ کامل حاصل کی، جہازرانی کے اصول سیکھے، فرانس و انگلستان کے فلاسفہ سے تعلقات پیدا کئے، اقتصادئین سے خط و کتابت کی، اور اپنا زیادہ وقت انہی کاموں کے لئے وقف کر دیا، وہ غور و خوض کا عادی تھا، اس کی صحبتوں کا دلچسپ ترین موضوع ملکی ترقی کے مسائل ہوتے تھے، اور اسی پر وہ یورپ کے اہل الرائے حضرات سے بحث کیا کرتا تھا، فولٹیر (Voltaire) نے لکھا ہے کہ وہ بچپن سے نہایت فہیم و فطین اور اسی کے ساتھ نہایت محنتی و جفاکش تھا، اس کی قوتِ اخذ و انتخاب قوی تھی، وہ جس سے ملتا تھا اس کی تمام خوبیوں کو اپنے اندر جذب کر لیتا تھا، اور جہاں جاتا وہاں کے صنعت پیشہ لوگوں میں مل بیٹھ کر ان کے اصولِ صنعت سیکھ لیتا تھا، وہ ہر کام کو اس کی ضرورت و اہمیت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا اور اسی دلچسپی کے ساتھ اس کے سرانجام میں منہمک ہو جاتا تھا

یہ ایک واقعہ ہے کہ نیپر (Dnieper) کی آبنائے میں اس نے ایک جہاز پر ملاح کا کام کیا، اور آرکینجل جا کر ملاحوں اور تاجروں میں اس طرح رہا کہ وہ پہچان بھی نہ سکے کہ یہ کوئی مصیبت زدہ مزدور ہے، یا صوفیا کا بھائی پیٹر اعظم!

پیٹر اعظم کی سیرت کی یہ وہ خوبیاں تھیں جو بچپن سے فطرت نے اس کے اندر ودیعت کی تھیں، اور جن کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ بچہ گھر کا چراغ ہوگا، اور اس کا وجود سارے خاندان کے لئے مایۂ فخر و ناز!

۱۶۹۷ء میں اس نے یورپ کا سفر کیا، اس سفر میں (۲۵۰) روسی اس کے ساتھ تھے، جو سب کے سب نوجوان تھے، اور ابتداء سے اس کی نگرانی میں رہے تھے، پیٹر اعظم نے ان کو مختلف شہروں کی یونیورسٹیوں (Universities) دارالتجربوں (Laboratories) اور کارخانوں میں داخل کیا، اور خود بھی مشہور مشہور صنعت گاہوں اور یونیورسٹیوں میں شریک ہوتا رہا، موسیو شارل نے لکھا ہے کہ وہ ہالینڈ (Holland) کے شہر زانڈم (Zandam) میں صرف آٹھ روز ٹھیرا تھا، یہ آٹھ روز اس نے فضول سیر و تماشے کے بجائے وہاں کے جہاز سازی و جہاز رانی کے کارخانوں میں گذارے، اور معمولی مزدوروں کی طرح کام کیا،

اس پرجوش کسب و اکتساب کے بعد جب وہ روس واپس آیا تو یگانۂ ہر علم و فن تھا، یورپ کی سیاحت نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں، یورپ کی ہمرنگی و ہم نوائی کی لگن دل میں سما گئی تھی، اور وہ صمیم قلب سے چاہتا تھا کہ کسی طرح روس، یورپ بن جائے، چنانچہ جب وہ مسند آرائے حکومت ہوا تو اسی قسم کے احکام و فرامین نافذ کئے، رعایا ان کی تعمیل کی طرف بڑھی، اور مغربی باشندوں نے اس کے ہر حکم کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا، لیکن مشرقی روس جو وسعتِ ارضی اور کثرتِ آبادی میں مغربی روس سے بہت بڑا تھا، ابھی بہت پیچھے تھا، اس کے باشندے قدامت پرستی میں مبتلا تھے، آبا و اجداد کی تقلید کو فرض سمجھتے تھے، اور مغربی تہذیب و تمدن کو بہت ہی بری نظروں سے دیکھتے تھے، پیٹر اس قدامت پرستی کا جانی دشمن تھا، اور اپنے ہاتھ میں قلم کے ساتھ تلوار بھی رکھتا تھا، اس نے عام حکم دیدیا کہ جو لوگ بے معنی مذہبیت نہ چھوڑیں، قدیم اخلاق و عادات ترک نہ کریں اور آبائی رسم و رواج سے باز نہ آئیں، انہیں جرمانہ اور تازیانہ کی سزائیں دی جائیں

پیٹر نے اور باتوں کے ساتھ ڈاڑھیوں پر بھی رحم کیا تھا، اور اعلان کر دیا تھا کہ تمام درباری اپنے چہروں کو "خسِ سیاہ" کی پیداوار سے پاک رکھیں، اور اس حکم کے اعلانِ قطعیت کے لئے خود اپنے ہاتھ سے ارکین و اساطینِ حکومت کی لانبی لانبی ڈاڑھیاں کاٹ دیں، اور تمام ملازمینِ سرکاری کو لانبی لانبی اور بدوضع ڈاڑھیاں رکھنے سے منع کر دیا،

روس میں اب تک تقسیمِ لباس کا رواج بہت محدود تھا، تمام سرکاری ملازم گھر کے کپڑوں سے دفتر میں آتے، اور انہی سے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، پیٹر نے اس بدتہذیبی کو بھی روکا، اور

چپراسیوں سے لے کر اعلیٰ افسروں تک سب کی یونیفارم [illegible] مقرر کی، وکلا اور اہلِ علم کے لئے گون اور روب متعین کی، اور حکم دیا کہ سرکاری ملازم، کالجوں کے طلباء اور اہلِ دربار وہی لباس پہن کر دفتروں اور کالجوں وغیرہ میں جایا کریں جو ان کے لئے تجویز کیا گیا ہے

اسی سلسلۂ اصلاح و انقلاب میں پیٹر نے عورتوں کی طرف بھی توجہ کی، اب تک یہ نازک کرشمۂ فطرت ظلم و ستم کا شکار تھا، اس کی حکومت نے ان کو بھی اپنی آغوشِ شفقت میں لیا، اور پردہ کی مصیبت سے نکال کر اوجِ بام حریت و ترقی کی راہ کھولدی، ان کی تعلیم کا انتظام کیا، معاشرت میں انہیں بلند کیا، انسانیت و شہریت کے حقوق دے کر ان کو عزت بخشی، اور ان کے لئے وہی لباس متعین کیا جو یورپ میں عورتیں پہنتی ہیں،

اِس فرمانِ اصلاح کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ سگرٹ پینا ممنوع نہیں ہے، اور ہر شخص کو مذہبی قانونی حیثیت سے اختیار ہے کہ وہ جس جگہ چاہے سگرٹ پیئے، کوئی دوسرا شخص مزاحمت کا مجاز نہیں، جو لوگ ایسا کریں اور جائز چیزوں کے استعمال سے روکیں، وہ حریتِ انفرادی اور حقوقِ شخصی میں دست اندازی کے مجرم ہوں گے،

اس دفعہ کی شانِ نزول یہ تھی کہ روسی کلیسا نے تمباکو نوشی کو مذہباً ممنوع قرار دیا تھا، اور جو شخص سگرٹ وغیرہ پی لیتا تھا سزا پاتا تھا، پیٹر نے اس بیہودہ مذہبی امتناع کی مخالفت کی، اور اس کو قانوناً ناجائز قرار دیا، پادری لوگ اس پر بہت چراغ پا ہوئے، لیکن اس نے ان کی مطلق پروا نہ کی، اور جو کچھ کرنا تھا وہی کیا،

لیکن لائحہ اصلاح کی یہ تمام دفعات محض فروعات تھیں، پیٹر کو مغربی تمدن میں جو چیز سب سے زیادہ محبوب تھی وہ مادی اختراعات تھیں، جنہیں وہ اپنے ملک میں رائج کرنا چاہتا تھا، وہ خود بھی اکثر فنون میں خاص مہارت رکھتا تھا، یورپ سے جن لوگوں کو اپنے ساتھ لایا تھا۔ ان میں کثیر تعداد انجینیروں اور صناعوں کی تھی، اور روس سے جو طالب علم ساتھ لے گیا تھا ان کو بھی اس نے صنعت و حرفت کے کارخانوں اور سپہ گری کے مدرسوں میں داخل کیا تھا، اپنی مملکت میں جو مدرسے اور یونیورسٹیاں قائم کیں، ان میں زیادہ تر فنی اور حرفتی یونیورسٹیاں تھیں تاکہ روس کو یورپ کی مادی غلامی نہ کرنی پڑے، ان یونیورسٹیوں کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ

ان میں مادری زبان میں تعلیم دی جاتی تھی، اسی غرض سے سینٹ پیٹرسبرگ St. Petersburg میں ایک دار التصنیف کا افتتاح کیا، جس کا مقصد وحید مغربی زبانوں سے فنی کتابوں کا ترجمہ تھا، اس تخصیص کا یہ نتیجہ ہوا کہ روسی زبان چند ہی سال میں نہایت گرانقدر فنی اور کلاسیکل کتابوں سے مالامال ہوگئی، اور اس عملی ٹکسال نے مغربی روس سے علم وفن کی کساد بازاری کو بالکل عنقا کر دیا،

پیٹر کے اخلاق کا یہ ایک نمایاں حصّہ ہے کہ وہ کسی کام کو ذلیل، یا اپنے درجہ ومنصب سے فروتر نہیں سمجھتا تھا، اس نے اپنی عمر کے مختلف حصّوں میں جس دلچسپی کے ساتھ نجّاری ملّاحی، اور صنّاعی کے کام کئے، اسی دلچسپی کے ساتھ مہماتِ سلطنت کے انجام دینے میں بھی منہمک رہا سینٹ پیٹرسبرگ میں جب وہ سر پر تاج شاہی رکھتا تھا، جب وہ ایک نہایت وسیع رقبۂ زمین کا حاکمِ مطلق تھا، اور جب وہ تختِ حکومت پر بیٹھ کر احکام وفرامین نافذ کرتا تھا، عین اسی وقت اس کا دماغ صنعت وحرفت کے مسائل پر بھی غور وفکر کرتا تھا، حرفتی اختراعات کی طرف توجہ کرتا تھا، ترقیِ تجارت کی تدابیر سوچتا تھا، اور چاہتا تھا کہ کوئی ایسی تدبیر ہو جائے کہ روسی چشم زدن میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے ہمسر وہم پایہ ہو جائیں، اس مقصد کے لئے اس نے اپنی تمام امکانی کوششیں صرف کیں، قوم کی امانت میں پہلے لوگوں کیطرح خیانت نہ کی، بلکہ اپنے عیش وآرام کو تج دیا

روسیوں نے اول اول تو اس کی ان تدابیر سے اتفاق نہ کیا، اور جاہل پادریوں کے کہنے میں آکر اکڑے رہے، لیکن جب ذرا ذرا ہوش آیا، اور پادریوں کی دوزخ وجنت کا جادو اترا تو جوق جوق اس کی طرف مائل ہونے لگے، اور کلیسائی اقتدار پر موت کی بیکسی چھاگئی، پیٹر کہتا تھا کہ:۔ روسی عمران وتمدن کی دنیا میں ابھی نادان بچّے ہیں مدرسے جانا اور استاد کے آگے مودب بیٹھنا ان کے لئے تکلیفِ مالا یطاق ہے، کھیل کود کی زندگی آہستہ آہستہ چھوٹتی ہے، لیکن جب یہ بچے سنِ شعور کو پہنچیں گے، جب یہ جوان ہونگے تو مدرسہ سے محبّت ہو جائے گی، استاد کو دوست سمجھیں گے، اور جس سے نفرت کرتے ہیں، اسی کو سب سے زیادہ عزیز رکھنے لگینگے،

ناظر

فنِ قصّہ نویسی

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۳) مطالعۂ نفس:- سرفلپ سڈنی کا مقولہ تھا "اپنے دل میں بنگاہِ تعمق دیکھو اور لکھو" علم النفس کے ماہر میسلین سے جب اس کے متعلق سوال کیا گیا تو اُس نے صاف کہا "میں نے سب کچھ اپنے دل کا مطالعہ کرنے سے حاصل کیا ہے" بائرن۔ جان لاک کی نسبت کہتا ہے کہ "فطرتِ انسانی کے متعلق اُس کی تمام واقفیت اپنے نفس کے مطالعہ پر مبنی تھی"۔ مگر جہاں اس راہ میں وسیع تخیلات کا ایک لق ودق میدان نظر آتا ہے وہیں اس راستہ میں ایک ایسی تباہی بھی مصنفین پر آئی ہے جس سے بڑے بڑے افسانہ نویس بھی نہ بچ سکے۔ وہ اپنے افرادِ قصہ کی آڑ میں اپنی شخصیت کا اظہار رہے۔ بائرن نے جو کچھ لکھا وہ اُس کی شخصیت کا مترادف تھا اور یہ مسلمہ امر ہے کہ اُس کی تصانیف پڑھنے سے اُس کے چلن کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھچ جاتی ہے۔ اس کے افرادِ قصہ سب کچھ وہی بیان کرتے اور اُسی بات پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو کچھ اُس حالت میں بائرن کرتا بلکہ امریکہ کے مشہور جادو نگار فسانہ نویس پو اور ہاتھارن بھی اسی بات کا شکار ہوئے اگرچہ نہ اس قدر جتنا کہ چالیڈ ہیرلڈ کا مشہور ومعروف مُصنف۔ ہندوستان کے بعض اہلِ قلم حضرات بھی اسی مرض کا شکار ہیں۔ ایک واقفکار اور سمجھدار حلقہ میں یہ مشہور ہے کہ مصنف "آپ بیتی" نے اُس قصّہ میں اپنی شخصیت کا اظہار کیا ہے

(۴) اقتباس:- تخیلات کا سمندر جس وقت مصنف کے دماغ میں متلاطم ہوتا ہے اُس وقت ہر قسم کے اچھے بُرے۔ تراشیدہ وناتراشیدہ خیالات کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اُس وقت اپنے مطلب کے خیالات یکجا جمع کرنا اور تخیل کی تیز وتند موجوں کے تھپیڑوں میں اپنے قوائے ذہنی کو مضبوط چٹان کی طرح قائم رکھنا نہایت عقلمندی وہوشیاری کا کام ہے۔ خیالات

کا اقتباس ایک نہایت ضروری امر ہے۔ ایک مشہور عالم کا قول ہے کہ "یادداشت اقتباس کی رُوح ہے" صحیح الدماغ انسان کے لئے یہ کوئی مشکل امر نہیں اور اس قسم کے اقتباس صفحۂ دل پر اس طرح منعکس ہو جاتے ہیں جس طرح فوٹوگرافی کے شیشے پر کسی چیز کا عکس۔ کچھ عرصہ ہُوا جارج ڈبلیو کیبل نے نارتھ امریکن ریویو میں ایک نہایت پُرمغز اور عالمانہ مضمون بعنوان "قصہ نویس کے خیالاتِ بازیافتہ" لکھا تھا۔ جس کے دَوران میں وہ تحریر کرتا ہے کہ کوئی مصنف خواہ وہ کسی مضمون پر زورِ قلم دکھانا چاہتا ہو جب تک اُن تمام واقعات کا اپنے دل پر اِمتحان کر کے اُن کا اقتباس نہ کرے وہ کبھی بھی اس بات کا دعویدار نہیں ہو سکتا کہ اُس کے قِصّہ نے پڑھنے والے کے دل پر ایسا اثر کیا جیسا کہ خود اُس کے دل پر ہُوا تھا یا کم ازکم جیسا وہ اثر ڈالنا چاہتا تھا،

مصنفٌ "بہشت بریں" ایک سولی کے نظارہ کو قلمبند کرتا ہُوا یوں رقمطراز ہے:۔

"عین بازار میں تین لوہے کی لمبی سلاخیں نصب کی گئیں اور اُن کے اردگرد لکڑیاں جمع کی گئیں اور تینوں مجرموں کو جیلخانہ سے بلوایا گیا۔ ہر ایک کو جداگانہ لوہے کی سلاخوں سے باندھ کر لکڑیوں میں آگ لگا دی۔ جوں ہی آگ کی خوفناک لپٹ چٹانوں سے نکلی پادری لوگ جو اُن کے گرد کھڑے تھے جھٹ دوزانو ہو گئے۔ لیکن مجرموں کے دردناک نعروں سے آسمان گونج اُٹھا۔ سب کے چہرے زرد پڑ گئے۔ بہت سے اس وحشت ناک نظارہ کی تاب نہ لا کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔۔۔۔۔"

"اب ہم اس خوفناک سین کو نہیں دیکھ سکتے ناظرین فرض کر لیں کہ یہ نظارہ ختم ہو چکا۔۔۔۔۔"

مگر اسی قسم کے ایک واقع کو جارج ڈبلیو رینلڈ نے اپنے مشہور عالم قصۂ "بُت روئیں یا بوسۂ بکر" میں یوں قلمبند کیا ہے:۔

"پھر وہ مجرم کو دوشیزہ کے بُت کے سامنے لائے جو ایک چبوترہ پر بنا ہُوا تھا۔ جس کے پیچھے ایک نہایت ہیبتناک کل دکھائی دیتی تھی۔ نوجوان مجرم نے بُت کو دیکھتے ہی نہایت خوفناک آواز سے چیخنا شروع کیا۔ فرطِ ہیبت سے اُس کا تمام بدن تھرتھر کانپ رہا تھا۔ خوف سے آنکھیں نکلی پڑتی تھیں۔ وہ مجروح شیرنی کی طرح نگاہِ حسرت و یاس سے نقاب پوشوں کو تک رہا

تھا۔ آخر اُسے زبردستی سنگین چبوترہ پر کھڑا کیا گیا۔ ڈر اور ہراس سے وہ غش کھا کر نیچے گر پڑا۔ مگر جلادوں نے جھٹ ہوش آور دوائی کی ایک شیشی اُس کی ناک کے پاس رکھ دی تاکہ موت کا مزہ چکھنے سے محروم نہ رہے۔ اب وہ دوبارہ ہوش میں آگیا تھا۔ بُت نے اپنے ہاتھ سینے کی طرف بڑھانے شروع کئے اور مُنہ کھول دیا۔ درد بھری چیخوں کی آواز ابھی تک آرہی تھی۔ بعدہٗ بُت رُوئیں نے اُس کو اس زور سے دبایا کہ اُس کی آواز بیٹھ گئی۔ سینے کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں اور اُس کو مُنہ میں ڈال لیا۔ تھوڑی دیر بعد خوفناک کل کو جنبش ہوئی اُس کی چھریوں۔ کٹاریوں کی جھنکار۔ جلادوں کے فولادی دل پانی پانی کر رہی تھی۔ قربان شدہ ملزم کی دبی چیخوں کی اواز ابھی تک کانوں کے رستے دلوں میں اُتر رہی تھی۔ آخر آریوں نے اُس بیگناہ کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔ جہاں سے اُس کے بدن کے ٹکڑے چھریوں تلے آگئے اور اُس کا تمام جسم قیمہ ہو کر ایک نہر میں گر گیا۔ جس نے سینکڑوں بیگناہوں کا گوشت قلعہ کی چار دیواری سے باہر پھینک دیا تھا"

غور کرنے سے دونوں واقعات ایک ہی قسم کے معلوم ہوتے ہیں اور ممکن ہے کہ جس وقت اس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لانا مقصود تھا دونوں مصنفین کے دماغوں میں ایک ہی قسم کے خیالات موجزن ہوں۔ مگر اوّل الذکر مُصنّف نے اختصار پر اکتفا کی اور بہت حد تک اپنے فسانہ کی رنگینی زائل کردی مگر ثانی الذکر نے خیالات وحسیات کا پورا اقتباس کیا اور مندرجہ بالا واقعات کو سپردِ قلم کرنے سے پیشتر اپنے دل کی کسوٹی پر اُنہیں پرکھ لیا کہ آیا یہ سولی کا واقعہ پڑھنے والے کے دل پر کچھ خوف پیدا کریگا یا قارئین کے جذبات ومحسوسات میں تموج پیدا کرنے کے قابل ہوگا اور یقیناً وہ ہر موقعہ پر کامیاب رہا ہے۔ ایک قِصّہ نویس کا یہ لکھ دینا، ناظرین فرض کرلیں کہ یہ نظارہ ختم ہوگیا" اُس کی شان سے بعید ہے۔ مصنف پیکرِ الفاظ کا مصور ہے۔ جس کا فرض ہے کہ جب تک ایک خاکہ پُورا نہ کھنچ جائے اُسے ختم نہ کرے۔ اس قسم کے الفاظ کے ساتھ کسی واقعہ کا اختتام تین باتوں پر دلالت کرتا ہے۔

۱۔ یا تو مصنف کا ذخیرۂ الفاظ محدود تھا یا

۲۔ وہ اس واقعہ کو ضبطِ تحریر میں لانے کا حوصلہ نہ رکھتا تھا یا

۳۔ کبھی ایسا واقعہ دیکھنے اور مشاہدہ کرنے کا اتفاق نہ ہُوا تھا۔
ہزار میں شاید ہی کوئی اہلِ قلم نکلے جس میں پہلی بات موجود ہو۔ دوسری صفت بعض مصنفین میں عنقا ہوتی ہے جیسی مصنف بہشت بریں ہیں جس کا انہوں نے نہایت ایمانداری سے اعتراف کیا ہے۔ البتہ شرطِ سوئم ایک ہندوستانی قِصّہ نویس کے لئے مشکل ترین بات ہے۔ مگر ممالک مغرب میں ہر شخص اپنے اندر قصہ نویس کے انداز خصوصی پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ سے سعیٔ بلیغ کرتا ہے۔ اور بڑی دیدہ دلیری و عالی حوصلگی سے اپنے خیالات کی تربیت و پرورش کے لئے قدرت کی لازوال نعمتوں کا مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے اسباب اور درس و تدریس کے مدارس تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ بارلوبیٹ ایک ایسے نوجوان مصنف کا ذکر کرتے ہُوئے لکھتا ہے "اگرچہ اُس کے خیالات نہایت شستہ و اعلےٰ تھے مگر پھر بھی قِصّہ کا رنگ قائم رکھنے اور واقعات کو اصلیت کا جامہ پہنانے کے لئے اُس نے لازمی سمجھا کہ وہ اُن لوگوں کی طرزِ زندگی کا ایک مدت تک مطالعہ کرے جو نہایت عالیشان اور پُرتکلف محلات میں عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ ایک کروڑپتی کے ہاں اُس کی لڑکی کے گھوڑے کی خبرگیری پر مقرر ہوگیا۔ ایک روز بعدِ دوپہر وہ خوبصورت لڑکی اصطبل میں آئی اور نوجوان مصنف سے کہنے لگی" میں اور امّی ایک دوست کے ہاں ناچ میں شریک ہونے کے لئے جائینگے۔ اس لئے شام کے آٹھ بجے مجھے گھوڑا چاہیئے۔ امی گاڑی پر تشریف لے جانیکا ارادہ رکھتی ہیں" نوجوان مصنف نے سرِ تسلیم خم کرکے اُس مہ لقا کا حکم سُنا اور دھیمی آواز میں کہا "بہت بہتر" شام کے وقت آسمان پر بادل گھرے ہُوئے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی۔ نوجوان سائیس عربی النسل گھوڑی لئے اپنی مالکہ کے انتظار میں تھا۔ مادہ کیست غصہ اور زردرییں اسپات کی لگام چبائے ڈالتی تھی کہ اتنے میں وہ حسینہ جوانی کے نشہ میں مخمور باہر نکلی اور ایک محبت بھری نظر سے اپنی وفادار عرب نژاد گھوڑی کو دیکھا جو سرپٹ دوڑنے کے لئے بے چین ہوکر پختہ سنگ آستانہ پر ٹھوکریں مار رہی تھی۔ سائیس نے مودبانہ سلام کیا مگر نوجوان رئیسہ نے بغیر جواب دیئے کہا "موسم خراب ہے اسے واپس لے جاؤ ہم نے موٹر میں جانے کا ارادہ کرلیا ہے" اِتنے میں اس کی ادھیڑ عمر والدہ بھی اپنے ناچ کے لباس میں باہر آگئی اور دونوں ماں بیٹیاں خراماں خراماں

احاطہ سے باہر بڑے پھاٹک تک پہنچ گئیں۔ جہاں اُن کی سواری کے لئے شاندار قیمتی موٹر کار اُن کا انتظار کر رہی تھی۔

رات کا وقت۔ بالکل خاموشی۔ ٹھنڈی اور روح پرور ہوا کے جھونکے۔ برق کی چمک اور رعد کی کڑک نے نوجوان مصنف کے سینہ میں تخیلات کے مدّ و جذر کا طوفان مچا رکھا تھا۔ گذشتہ دنوں کے مطالعہ نے اُس کے دماغ میں ہزاروں قسم کے خیالات انبار کر دیئے تھے۔ وہ نہایت پُردلی اور دیدہ دلیری کے ساتھ اپنی مالکہ کے کمرۂ مطالعہ میں چلا گیا۔ جہاں اُس نے ایک شاندار پُرتکلف آرام کُرسی میں اپنے آپ کو گرا دیا۔ ہزاروں کتابیں قیمتی الماریوں میں عروسِ نوخیز کی طرح جھانک رہی تھیں اور وہ حیرت کی آنکھوں اور للچائی ہُوئی نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند منٹ کے بعد وہ خوبصورت لکھنے کی میز پر پہنچا اور قلم سنبھال کر ایامِ گذشتہ کے خیالات کا اقتباس ضبطِ تحریر میں لانا شروع کیا۔ اُسکا خیال تھا کہ اس کی زاہد فریب مالکہ رات کے بارہ بجے سے پہلے واپس نہ ہوگی اور وہ اُس وقت سے پیشتر اپنا کام ختم کر کے چُپ چاپ واپس نکل جائیگا۔ مگر وہ اپنے خیالات میں ایسا محو ہُوا کہ وقت کا اندازہ بالکل بھُول گیا۔ اتنے میں لڑکی واپس آگئی اور کمرۂ شب خوابی میں پہنچی تو ملحقہ کمرۂ مطالعہ میں اُسے روشنی دکھائی دی۔ اُس نے کھڑکی کا ریشمی پردہ اٹھا کر دیکھا تو اپنی میز پر کسی آدمی کو لکھتے پایا۔ اُس نے جھٹ اپنا مضبوط طپنچہ اُٹھالیا اور آہستہ آہستہ دوسرے کمرہ میں پہنچ کر نہایت ڈراؤنی آواز میں بولی" اگر خیر چاہتے ہو تو فی الفور ہاتھ اُوپر اُٹھا دو۔"

اپنے دریائے تخیل میں غوطہ زن مصنف نے سمجھ لیا کہ راز طشت از بام ہو گیا۔ مگر اُس نے اپنے حواس قائم رکھتے ہُوئے نہایت صبر و استقلال اور دلی تہور کے ساتھ کرُسی چھوڑ دی اور ہاتھ سر سے اوپر اُٹھا دیئے۔ مہ جبین رئیسہ نے اُسے غور سے دیکھ کر کہا "ہیری"

ہیری نے بُرد باری سے جواب دیا "جناب"

"مگر تم یہاں کیوں آئے ہو۔ کیا لکھ رہے ہو؟ دیکھوں تو"

یہ کہکر وہ چند قدم آگے بڑھی اور دھڑکتے ہُوئے دل کو سینے میں سنبھال کر اُس نے وہ پُرزہ کاغذ اُٹھالیا۔ جس پر ہیری نے اپنے خیالاتِ پریشاں کا اقتباس درج کر رکھا تھا۔

اس وقت تک لڑکی کی تعشق خیز آنکھوں میں جو بے خوابی کا خمار اور لمبی مژگاں میں نیند بھری ہوئی تھی وہ زائل ہو چکی تھی۔ وہ چند لمحوں تک اُس کا مطالعہ کر کے بولی "تو کیا تم قِصّہ نویس ہو"؟

ہیری نے مرے ہُوئے دل سے جواب دیا "غریب نواز"

نوجوان عورت کی خوبصورت ملک فریب پیشانی پر بے حد بے قراری اور پریشانی سے پسینہ آگیا وہ اپنے ہاتھ سے کاغذ کو میز پر رکھ کر بولی "مگر تم ایسی حالت میں میرے پاس آ کر ایسی ذلیل ملازمت کے کیوں خواستگار ہُوئے؟ خیر میں اس کے جواب میں کچھ سُننا نہیں چاہتی۔ تم اسی وقت میرے مکان سے نکل جاؤ۔ میں اپنے افرادِ خاندان کو قِصّہ نویسوں کا تختۂ مشق اور اپنے محل کو مطالعہ اور مشاہدہ کی درسگاہ نہیں بنانا چاہتی۔ اور یہی سب سے بہتر شریفانہ سلوک ہے جو موجودہ حالات میں مَیں تمہارے ساتھ روا رکھ سکتی ہوں"۔

یہ سُنتے ہی ہیری کی پیشانی پر عرقِ انفعال نمودار ہوا وہ اپنا کاغذ اُٹھا وہاں سے چلا گیا۔ جب دروازہ کے قریب پہنچا تو رحمدل عورت کے دل پر اُس کی عاجزی و خاموشی نے اثر ڈالا وہ تیزی سے کہنے لگی "دیکھو تو" یہ سُنتے ہی ہیری پھر واپس آگیا۔ نوجوان دوشیزہ نے شفقت مآب نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا "اس بادو باراں کی رات میں میں تمہیں سرگرداں نہیں کرنا چاہتی۔ تم آج رات یہیں بسر کرو مگر صبح ہونے سے پیشتر مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ تم نے ابھی مکان نہیں چھوڑا" بے بس ہیری نے شکریہ کے مختصر الفاظ زبان سے نکالے اور اپنا راستہ لیا۔

۵۔ مطالعۂ کتب:۔ فخرِ مشاہیر بیکن کا قول ہے کہ "مطالعۂ کتب انسان کو کامل بنا دیتا ہے" مگر دراصل یہ مصنف کے انتخاب پر موقوف ہے کہ وہ کس قسم کا مطالعہ پسند کرتا ہے۔ عموماً مصنفین بہت کم پڑھا کرتے ہیں اور جو کچھ بھی اُن کی نظر سے گذرتا ہے وہ اُن کے دماغ میں سما جاتا ہے اور دل میں جاگزیں ہو جاتا ہے۔ مگر اس قسم کے دل و دماغ کا اجتماع انہیں اپنے نوزائیدہ خیالات کی پرورش میں کوئی مدد نہیں دیتا۔ لیکن بعض اوقات اپنے خیالات کے ساتھ موازنہ کرنے کے لئے اچھا کارآمد ثابت ہوا ہے مگر برعکس اس کے

بعض نقال تو اُن خیالات کے زیرِ اثر اپنے جذبات کو کم قیمت اور ناکارہ بنا لیتے ہیں۔
اکثر اوقات مشہورِ عالم مصنف بھی اکثر تصانیف کو اپنی بیاضِ مطالعہ بنا لیتے ہیں اور اس بات پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر فلپ اپنی کتاب "انسان اور مطالعہ کتب" کے صفحہ ۳۰۲ پر لکھتا ہے۔ والیئر ہمیشہ میلین کی تصانیف پڑھا کرتا تھا تاکہ اُس کی کُتب کا مطالعہ اُس کے دل میں ایسی کتابوں کی تصنیف کا جوش پیدا کرے۔ اسی مطلب کے لئے بوسٹ نے ہومر کو انتخاب کر رکھا تھا۔ گرے کتنی مدت تک سپنسر کی "پریوں کی ملکہ" پڑھتا رہا۔ ملٹن کے منظورِ نظر ہومر اور یوریپڈیز تھے۔ اسی طرح ڈرائیڈن پوپ کا منتخب کردہ تھا۔ اور کارنیلی نے ٹیسی ٹس اور لوکی سے لو لگائی تھی۔ اُن اُستادانِ فن نے مطالعۂ کتب اس لئے نہیں اختیار کیا تھا کہ وہ اُن سے خیالات کی دست بُرد کر کے اپنے خیالات کو اُستوار کریں بلکہ اُن کا منتہائے خیال اپنے جذبات سے متقدمین کے خیالات کا مقابلہ و موازنہ اور دل میں اس قسم کا احساس پیدا کرنا تھا جو اُس سے بہتر کتب تصنیف کرنے کے لئے اُبھارے +

۶۔ مباحثہ:۔ ایک مشہور قِصہ کے متعلق جو نہایت معقول معاوضہ پر فروخت ہُوا تھا۔ یہ مشہور ہے کہ اگر ایک تاریخ دان اُس میں سے ایک سُقم نہ دُور کرتا تو اُسے کبھی اتنی قبولیت عامہ ہرگز نہ حاصل ہوتی۔ یقیناً وہ بڑی بھاری فرو گذاشت تھی۔ ہنری اول کے عہد کے واقعات مصنف ہنری سوئم کے دربار سے منسوب کرتا تھا۔ ایک شب بسبیلِ تذکرہ کھانے کی میز پر اُس نے اپنے ناول کے اس باب کو بڑے فخریہ لہجے میں بیان کیا اور سب نے بڑی فرحت و شادمانی سے سُن کر داد دی مگر ایک یونیورسٹی کے پروفیسر تاریخ نے ان واقعات کی تردید کر دی۔ سمجھدار مصنف نے جھٹ اُسے قبول کر کے اُس کا شکریہ ادا کیا۔ فرانسس بیکن اپنے خیالات کے متعلق بحث مباحثہ کرنے کو "تحصیلِ علم" سے منسوب کرتا تھا اور وہ ہمیشہ اُن آدمیوں سے تبادلۂ خیالات کرتا رہتا تھا جو کسی بات میں اُس سے بہتر واقفیت رکھتے تھے +

۷۔ ضبطِ خیالات:۔ سب سے آخری بات اس باب میں ضبطِ خیالات ہے۔ بعض اوقات راستے میں چلتے پھرتے کوئی ایسا عمدہ خیال دل سے اُٹھتا اور دماغ میں سماجاتا ہے جو کسی قِصہ کی روح رواں ہو۔ مگر جس تیزی سے ایسے خیالات پیدا ہوتے ہیں اُسی رفتار سے

فراموش بھی ہو جاتے ہیں۔ اس لئے سب سے بہتر علاج یہ ہے کہ جس وقت کوئی خیال پیدا ہو اُسی وقت اُسے قلمبند کر لیا جائے۔ بعض اپنی نوٹ بک۔ کتاب کے کسی صفحہ۔ کسی پُرزۂ کاغذ اور بعض اپنے قمیص کے کف پر لکھ لیتے ہیں۔ رچرڈ ہارڈنگ کے متعلق یہ مشہور ہے کہ اخبار پڑھتے پڑھتے بعض اوقات اُس کی نظر سے ایک ایسا فقرہ گذر جاتا ہے جس میں بڑی حد تک موادِ قصہ موجود ہو۔ وہ فوراً اُس کے لئے اپنے تخیلات کا جال بچھا دیتا ہے اور اُس کے پڑھتے ہی جو خیال اُس کے دل میں پیدا ہوں وہ فوراً اُنہیں ضبطِ تحریر میں لاکر ایک نہایت شاندار قصہ تیار کر لیتا ہے۔

واقعات نگاری

ارسطو کا قول ہے "ترجیح دو اُس ممتنع کو جو ممکن معلوم ہو اُس ممکن پر جو ممتنع معلوم ہو" ایک اور عالم کا مقولہ ہے کہ "کذب نما راستی سے صداقت نما دروغ بہتر ہے"۔ فسانہ نویسی کی بنیاد ہی واقع نگاری ہے جسکے لئے مصنف کے دل و دماغ ایک لازوال طاقت کا ورکشاپ ہیں۔ یا یوں کہئے۔ کہ ایسے واقعات کا فسانہ میں درج کرنا سچائی کی مٹی پلید کرنا ہے قصہ کو ایسے قالب میں ڈھالنا کہ پڑھنے والا باوجود اُسے کذب و افترا سمجھ کر بھی سچ ہی سچ باور کرے بلاشک اعلیٰ درجہ کی سحر طرازی ہے۔ میرے ایک دوست نے کل مجھ سے ایک نہایت مزیدار قصہ بیان کیا۔ وہ فرمانے لگے "میں اپنے مطب میں بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا اور میرے ایک عزیز میرے سامنے بیٹھے طلسم ہوش ربا یا طلسم نور افشاں پڑھ رہے تھے۔ جب میں نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو انکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اُنہوں نے بلا توقف فرمایا 'دوست بادشاہ نور افشاں مر گیا'۔ میں نے لاحول پڑھ کر کہا بلا سے مرجائے تم کیوں گریہ و زاری کرتے ہو۔ اگرچہ اُس قصہ کا اثر دماغ سے زائل ہوتے ہی وہ بہت محجوب ہوئے"

دیکھئے کتنی بڑی قوت ہے پڑھنے والا اسقدر محو اور حواس باختہ ہے کہ سچ جھوٹ کی تمیز نہیں رہی اور لاریب یہی اعلےٰ درجہ کی فسانہ نویسی ہے جو پڑھنے والے کے دل پر اپنا تسلط قائم کرلے اور اُس وقت تک اپنا اثر باطل نہ ہونے دے جبتک کہ قصہ ختم نہ ہو جائے۔ منشی محمد کامل کے تصنیف شدہ قصہ "دلفریب" کی نسبت مشہور ہے کہ کوئی سخت سے سخت دل بھی اُسے پڑھے تو آنکھوں میں آنسو ضرور بھر آتے ہیں۔ اگرچہ یہ مبالغہ ہے مگر اتنا ضرور ہے کہ اُسکے لکھنے سے منشی صاحب موصوف کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ آئندہ نمبر میں انشاء اللہ میں پلاٹ پر بحث کرونگا جس پر قصہ کا دارو مدار ہوتا ہے۔

محمد ضیاء الدین شمسی۔ (لاہور)

جرمنی میں تعلیمی اصلاحات

انقلابِ حکومت کے بعد جرمنی کی تعلیمی دُنیا میں کئی تغیرات واقع ہُوئے ہیں۔ یہ تغیرات حامیانِ مساوات کے نقطۂ خیال سے گو کیسے ہی ناکافی ہوں۔ تاہم یہ امر واقعہ ہے کہ ان کو بھی اِتنی جلدی اور ایسی اچھی طرح عملی صورت میں لانا ناممکن ہوتا۔ اگر ان کے لئے جنگ شروع ہونے سے پیشتر زمین تیار نہ ہو چکی ہوتی۔ تعلیمی پیاس جتنی سخت اور جیسی عالمگیر جرمنی میں ہے اس سے زیادہ اور کسی ملک میں نہیں۔ لیکن اب سے کچھ عرصہ قبل اس پیاس کو بجھانے کے لئے ہر شخص کو مساوی امکانات حاصل نہ تھے۔ اس کا نتیجہ قدرتی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ طبقۂ عوام میں بے چینی اور بے اطمینانی پھیل جائے۔ یہ بے چینی رفتہ رفتہ اس حد تک ترقی کر گئی کہ کٹر سے کٹر قدامت پسندوں کو بھی اصلاحات کی ضرورت تسلیم کرنی پڑی۔ آخر کار ایسٹر ۱۹۲۰ء میں تعلیمی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے اشخاص کی ایک کانفرنس بڑے وسیع پیمانہ پر منعقد ہوئی۔ جس میں بہت سی اصلاحات زیرِ بحث آئیں۔ ان اصلاحات میں سے نفاذ پذیر اگرچہ بہت کم ہوئی ہیں۔ تاہم اس بارے میں ابتدا ہو گئی ہے۔

اشتراکی جمہوریت پسندوں کے گرم طبقہ کا تعلیمی نقطۂ خیال معلوم کرنے کے لئے ایک اشتراک پسند ماہرِ تعلیم ڈاکٹر ون ٹین کی پیش کردہ اسکیم کا کچھ حال جاننا ضروری ہے۔ اس اسکیم کا مقصد یہ تھا کہ ہر ایک بچّے کو بلا امتیاز درجہ وحیثیت روزِ پیدائش سے لے کر بلکہ اس سے بھی قبل تعلیم حاصل کرنے کا ہر ایک امکان مہیا کیا جائے۔ ڈاکٹر موصوف کی تجاویز کا لبِ لباب حسبِ ذیل تھا:-

حاملہ عورتوں کی بود و باش اور نشست و برخاست کا انتظام پُر فضا اور فرحت بخش مقامات میں کیا جائے۔ بچّے کو پیدا ہونے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد کسی ایسے مکان میں پہنچا دیا جائے۔ جہاں کھلونوں کے ذریعے تعلیم دی جاتی ہو۔ آٹھ سال کی عمر تک اس کو اسی طریق پر

تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد ابتدائی مدرسہ میں داخل کر دیا جائے۔ جہاں وہ چودہ سال کی عمر تک تعلیم پائے۔ ابتدائی مدارس میں لکھائی۔ پڑھائی اور حساب کو عملی تربیت پر ترجیح نہ دی جائے۔ بچّوں کو چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں منقسم کر دیا جائے اور تعلیم تا بہ حدِّ امکان بے ضابطہ ہو۔ ابتدائی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ اعلیٰ مدارس میں جاکر اصولی تعلیم حاصل کریں۔ زاں بعد کسی خاص پیشہ کے متعلق خاص تعلیم پائیں اور پھر یونیورسٹی میں داخل ہو جائیں +

ظاہر ہے کہ اس قسم کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لئے اصولی اور مالی مشکلات کو حل کرنے کے علاوہ دنیائے عمل میں بھی نمایاں تبدیلیاں کرنے کی ضرورت ہے۔ لیکن جرمنی میں جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ کم ازکم اس کی ابتدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ وہاں نئی قسم کے ابتدائی مدارس جاری ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر ایک بچّے کو خواہ اس کے والدین کی مجلسی حیثیت کچھ ہی ہو۔ کم ازکم چار سال تک تعلیم حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ان مدارس میں اشتراکیوں کے نصب العین کا اثر صاف طور سے نظر آتا ہے۔ چنانچہ ان میں عملی تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ ذریعۂ تعلیم اس علاقہ کی تکلمی زبان ہے۔ جس میں مدرسہ واقع ہو۔ شمالی جرمنی میں اس اصول کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں دیہات کے تقریباً سب بچّوں کے لئے فصیح جرمن زبان ایک غیر ملکی زبان ہے۔ بچّے تعلیم کھلی ہوا میں پاتے ہیں اور سیر و تفریح میں قدرت کا مشاہدہ و مطالعہ کرنا سیکھتے ہیں۔ جسمانی تربیت کو پہلے کی نسبت بہت زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ وزیرِ تعلیمات نے حکم دیا ہے کہ ہر مہینے میں ایک دن طویل تفریح کے لئے مقرر کیا جائے اور اس روز تمام استاد اپنی اپنی جماعت کے ہمراہ باہر جایا کریں +

ان مدارس میں چار سال تک تعلیم پانے کے بعد طالب علم کو اختیار ہے کہ خواہ ابتدائی تعلیم کو مکمل کرنے کے لئے چودہ سال کی عمر تک وہیں رہ جائے۔ خواہ وہاں سے نکل کر کسی ثانوی مدرسہ میں داخل ہو جائے۔ اگرچہ کوشش یہ کی جارہی ہے کہ غریب بچّوں کے لئے ثانوی مدارس میں داخل ہونے کا امکان رفتہ رفتہ زیادہ کیا جائے۔ تاہم بحالاتِ موجودہ اس سوال کے فیصلہ کا انحصار والدین کی مجلسی حیثیت پر رہی ہے +

ثانوی مدارس میں جہاں تک بیرونی پہلوؤں کا تعلق ہے۔ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

لیکن اندرونی طور پر کچھ اصلاحات عمل میں آئی ہیں۔ چنانچہ اب جسمانی تربیت کو نظر انداز نہیں کیا جاتا متذکرۂ بالا ماہانہ تفریح کے علاوہ ہفتہ میں ایک دن دوپہر کے بعد کا وقت کھیلوں کے لئے وقف کیا جاتا ہے۔ ان کھیلوں میں شریک ہونا تمام طلباء کے لئے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ زنانہ مدارس میں بھی اس قاعدہ کی پابندی کرائی جاتی ہے +

ثانوی مدارس میں زیادہ قابلِ ذکر تبدیلی یہ ہوئی ہے کہ پرانی تاریخی کتب منسوخ کردی گئی ہیں۔ جرمنی کے دشمنوں کے لئے یہ امر موجب اطمینان ہو سکتا ہے کہ نئے دور میں تاریخ کی تعلیم ایک بالکل نئے نقطۂ خیال سے دی جائیگی۔ اس میں جنگی فتوحات اور خاندانوں کے عروج و زوال کو دلچسپی کا مرکز نہیں بنایا جائیگا۔ بلکہ یہ دکھایا جائیگا کہ تہذیب نے مختلف زبانوں میں کون کون سے مدارجِ ارتقا طے کئے۔ رائج الوقت زبانوں میں سے انگریزی روزافزوں مقبولیت حاصل کر رہی ہے اور اغلب ہے کہ بہت جلد فرانسیسی کی جگہ پر قابض ہو جائے +

مذہبی تعلیم بھی انقلاب کے اثرات سے نہیں بچی۔ پہلے یہ تعلیم تمام بچوں کے لئے لازمی تھی لیکن اب والدین کی خواہش پر ان کو اس سے مستثنیٰ بھی کر دیا جاتا ہے۔ بعض بڑے بڑے شہروں میں طلباء کو مذہبی تعلیم کا نعم البدل اخلاقی تعلیم کی صورت میں مہیا کیا جاتا ہے۔ بشرطیکہ والدین اس کی خواہش کریں۔ ڈسلڈرف۔ البرفیلڈ اور مغربی جرمنی کے دیگر بہت سے شہروں میں ایسے اسکول جاری ہو گئے ہیں۔ جن میں مذہبی تعلیم بالکل نہیں دی جاتی +

زنانہ مدارس کے لئے بہت ہی دوررس اصلاحات زیرِ غور ہیں۔ ان میں سے بعض کو عملی صورت بھی دیدی گئی ہے۔ لڑکیوں کو تعلیم دینے کا مقصد بھی وہی رکھا گیا ہے۔ جو لڑکوں کو تعلیم دینے کا ہے۔ لڑکیوں کا معیارِ تعلیم بلند کرنے کی غرض سے زیادہ قابل اُستانیوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجا تعلیم دینے کا اصول رواج پذیر نہیں ہوا۔ لیکن اکثر اوقات حالات سے مجبور ہو کر لڑکیوں کو لڑکوں کے ثانوی مدارس میں بھی داخل کر لیا جاتا ہے +

یونیورسٹیوں میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی۔ البتہ ان کی تعداد میں اضافہ کرنیکا سوال مرکزِ توجہ بن گیا ہے۔ چنانچہ تجویز کی جا رہی ہے کہ ہر ایک بڑے شہر اور بہت سے چھوٹے شہروں میں یونیورسٹیاں جاری کر دی جائیں +

اس امر پر بھی کچھ روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معلموں اور متعلموں نیز معلموں اور والدین کے باہمی تعلقات کس قسم کے ہیں۔ اس امر کی کوشش کی جارہی ہے کہ ثانوی مدارس کے طالب علموں میں حکومتِ خود اختیاری کا اصول رائج کیا جائے۔ یا کم از کم معلموں اور متعلموں کے باہمی رشتۂ اعتماد کو مضبوط بنایا جائے۔ بعض مدارس میں باقاعدہ طور پر ایک "اسکول جمہوری" قائم کردی گئی ہے۔ یعنی مدرسہ کے طلباء کا ایک جلسہ ہوتا ہے۔ جس میں وسطی اور اعلیٰ جماعتوں کے طلباء التزام کے ساتھ شریک ہوتے ہیں اور مدرسہ کے مختلف معاملات پر بحث کرتے ہیں۔ بعض مدارس میں ہر ایک جماعت کی طرف سے ایک ایک۔ دو دو قائمقام منتخب ہو جاتے ہیں اور معلموں اور متعلموں کے باہمی معاملات کی سرانجام دہی کا بار انہی پر ڈال دیا جاتا ہے +

اسکے علاوہ والدین کی انجمنیں بھی قائم ہوگئی ہیں۔ ان انجمنوں سے لوگوں کو بہت اُمیدیں ہیں پہلے جرمنی میں معلموں کو سول سروس کے افسروں کی طرح نہایت وسیع حقوق و اختیارات حاصل تھے لیکن اب یہ حالت نہیں رہی۔ مثال کے طور پر اب اِبتدائی مدارس میں والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جس وقت چاہیں۔ جماعت میں بیٹھ کر معلموں کے طریقۂ تعلیم کے متعلق اپنا اطمینان کریں۔ لیکن ثانوی مدارس میں ابھی یہ قاعدہ رائج نہیں ہُوا۔ والدین کی انجمن والدین اور معلموں کے باہمی معاملات کو سرانجام دیتی ہے۔ ان انجمنوں کی حیثیت اگرچہ مشیرانہ ہے۔ تاہم اگر وہ چاہیں تو ارا کینِ مدرسہ پر ناقابلِ مزاحمت دباؤ ڈال سکتی ہیں۔ اِس لئے اگر والدین کو اپنے حقوق و فرائض کا احساس صحیح طور پر ہو جائے تو یہ انجمنیں آگے چل کر بہت نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی ہے ان انجمنوں کے تمام ممبر بذریعہ انتخاب مقرر ہوتے ہیں۔ انتخاب میں رائے دینے کا حق صرف ان لوگوں کو ہے۔ جن کے بچے مدرسہ میں تعلیم پاتے ہوں۔ کسی شخص کو ایک سے زیادہ رائے حاصل نہیں۔ خواہ اس کے کتنے ہی بچے مدرسہ میں زیرِ تعلیم ہوں۔ بروئے قانون ہر ایک مدرسہ میں اس قسم کی ایک انجمن ہے۔ معلم بھی انجمن کے اجلاسوں میں بطور مشیر شریک ہو سکتے ہیں لیکن ممبروں کو اختیار رہے کہ وہ معلموں کو مدعو کئے یا اطلاع دئیے بغیر بھی انجمن کا اجلاس کرلیں +

(ماخوذ) **میلارام وفا**

ہندی نقاشی

شاید کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ہندوؤں کے ہاں علوم وفنونِ لطیفہ ونفیسہ کسی انسان کے لئے استعمال نہیں ہوتے تھے۔ شاعر کسی راجہ مہاراجہ کی شان میں قصیدہ گو نہ تھا۔ یہ کام بھاٹوں سے لیا جاتا تھا۔ کوئی نقاش کسی انسان کی تصویر نہیں بناتا تھا۔ کوئی بُت تراش انسان کا بُت نہ بناتا تھا۔ موسیقی کسی انسان کی دنیوی اغراض میں استعمال نہ ہوتی تھی۔ ہندوؤں کے ہاں نیچر یا اُس کے آفرینندہ جسے ایشر کہتے ہیں یا اُس کے خواص کی مورتیں یا بعض جذبات کے اظہار کے لئے فنونِ نفیسہ استعمال ہُوا کرتے تھے۔ عمارات میں نقاشی وسنگتراشی دیوی دیوتاؤں کی مدح یا اُن کے متعلقہ مظہرات کے لئے کی جاتی تھیں۔ عیسائیوں کے ابتدائی زمانہ میں بھی فنونِ لطیفہ مذہب کے تحت رہے مگر وہاں رفتہ رفتہ اب دنیوی اغراض میں استعمال ہوتے ہیں مہاتما بُدھ کے بُت اُس وقت بننے شروع ہُوئے جب اُن کو انسان سے بالاتر سمجھا گیا۔ بودھوں کے زمانہ میں تصویر کشی اور نقاشی کا بہت رواج ہو گیا تھا۔ عوام الناس کے لئے گوتم بدھ کا ذریعۂ تعلیم نقاشی تھی ۔ بُت تراشی بعد میں شروع ہُوئی۔

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بُدھ بھکشو جب ہندوستان سے باہر گئے تو اپنے ہمراہ تصویریں اور مختلف قسم کے نقاشی کے نمونے بھی لے گئے جن کے ذریعہ سے وہ بُدھ مت کی تعلیم دیتے رہے (Percy Brown) پرسی براؤن علم (Painting) نقاشی کے مسلم ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ وہ اپنی کتاب انڈین پنٹینگ (Indian painting) میں رقمطراز ہیں کہ چینیوں نے نقاشی بُدھ بھکشوؤں سے سیکھی وہاں سے جاپان میں پہنچی۔ چین اور جاپان کے مندروں میں جس قسم کی نقاشی موجود ہے وہ غار اجنٹا (Canes Ajanta) کے دیواری نقوش سے نقل کی ہُوئی معلوم ہوتی ہے۔ دراصل بُدھ کے زمانہ کی مصوری و نقاشی مذہبی رنگ میں تھی۔ بُدھ دھرم کے اصول۔ اُس کے بانی کے سوانح دکھلائے جاتے تھے۔ جس کے ذریعہ سے

اس دہرم کی اشاعت کیجاتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ ۶۷ء میں ایک بدھ بھکشو جس کا نام کشپ مدنگا تھا چین پہنچا۔ شاہنشاہ منگ ٹی نے اسے بلوایا تھا۔ اس کے بعد متواتر بہت سے مصور اور نقاش ہندوستان سے چین جاتے رہے اور وہاں دیواروں پر نقاشی کرتے رہے۔ مندروں میں انہوں نے نقاشی شروع کردی جس سے مقصود بدھ مت کا پھیلانا تھا۔ حتیٰ کہ بہت سے چینی ہندوستان میں آکر یہ فن سیکھتے رہے۔ سترھویں صدی تک یہ سلسلۂ آمد و رفت جاری رہا۔ ہندوستان کے مصوّر بہت سے چین میں سکونت پذیر ہوگئے اور وہیں مرے۔

محققانِ علم مصوری و ماہرانِ علم نقاشی نے جاپان اور چین کی مصوری اور نقاشی کو نہایت غور سے مطالعہ کیا ہے اور بدھ مت کے زمانہ کے ہندی نقوش کے ساتھ مقابلہ کیا ہے مثلاً ڈلن صاحب۔ بن ین صاحب۔ رکٹ صاحب وغیرہ وغیرہ اس رائے پر پہنچے ہیں۔ کہ چین اور جاپان کی مصوری اور نقاشی میں ہندی مذہبی رنگ ہویدا ہے جس میں شک کی گنجایش نہیں افسوس ہے کہ (غار ایجنٹا) کی دیواروں کے نقوش حوادثِ زمانہ سے زیادہ تر خراب ہوگئے ہیں۔ کسی صاحب نے عرصہ ہوا اُن کے عکس لئے تھے۔ افسوس کہ اتفاق سے وہ بھی جل گئے۔ تاہم کہیں کہیں اب بھی نقوش اور تصاویر موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ فنِ نقاشی درجۂ کمال تک پہنچا تھا۔ انگریز ماہر حیرت میں ہیں کہ اس ابتدائی زمانے میں ہندوستان میں مصوری کس درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ حیدر آباد دکن میں چند سال ہوئے انجمن آثارِ قدیمہ قائم ہوئی ہے اور اعلےٰ حضرت نظام کو اور اُن کے اہلکاروں کو قدیم صنادید کے محفوظ کرنے اور مرمت کرنے میں نہایت دلچسپی ہے۔ یہ سوسائٹی ایک رسالہ بھی شائع کرتی ہے ناظرین کو معلوم ہے کہ علاقہ بمبئی میں ایک مصوّر راوی ورما گذرا ہے اکثر تصاویر جو بازاروں میں فروخت ہوتی ہیں اسی کے مطبع کی ہیں۔ اِس شخص نے ہندوؤں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہندو دہرم کے دیوی دیوتاؤں اور ہندو پورانوں کے فسانے اُس نے تصاویر میں دکھلا دیئے اور طباعت جدید کی رنگ آمیزی سے کام لے کر لاکھوں کی تعداد میں سارے مُلک میں پھیلا دیں بنگال میں بھی ایشیائی مصوّری کی ترقی ہو رہی ہے اس مصوّری کی

طرز وضع اپنی خاص ہے۔ ضلع کانگڑہ میں بھی ہندو راجاؤں کے عہد میں ایک خاص طرز رائج تھی۔ وہ کانگڑہ اسکول کہلاتا ہے۔ جو مغلیہ طرز کی نقل تھی۔ فارسی خوانوں نے فارسی کتابوں میں مانی و بہزاد کے نام سُنے ہونگے۔ یہ دونوں مصوّر اسمٰعیل صفوی شاہِ ایران کے زمانہ میں گذرے ہیں۔ یہ دونوں مصوّر ایرانی مصوّری کے موجد اور اُستاد تھے۔ ایرانی نقاشی مشہور ہے۔ ایران سے نقاشی کشمیر پہنچی ۔ جہاں آپ کشمیری کتابوں میں نقاشی دیکھیں تو سمجھئے کہ یہ ایران کی نقاشی کی نقل ہے ۔

زمانۂ حال میں مصوّری اور نقاشی کا مقصد دُنیوی ہو گیا ہے۔ عبادت کے محکمہ سے وہ علیحدہ ہو گئی ہیں۔ آیا یہ ترقی سمجھی جائیگی یا تنزل۔ ہم کوئی رائے پیش نہیں کرتے۔ کن جذبات کو حال کے فنونِ لطیفہ تحریک دیتے ہیں اپنے اپنے مذاق پر منحصر ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ روحانیت اور مذہبی رنگ رخصت ہو گئے ہیں ۔

شمیم

"اے عورت! تو مخلوق کا سب سے بہتر نمونہ ہے۔ تو خدا کی انتہائی اور سب سے اعلےٰ مخلوق ہے تجھ میں یعنی تیری ہستی میں سب اچھی چیزیں جو خیال اور نظر میں آسکتی ہیں بدرجۂ کمال موجود ہیں۔ تو پاک ہے۔ تو شانِ عرفاں رکھتی ہے۔ تو نرم اور خلیق ہے تو بہت مرغوبِ طبع ہے۔ اور تو بہترین کائنات ہے"۔

ملٹن

"اے عورت! میں تیری اس وجہ سے تعریف نہیں کرتا۔ کہ تو کائنات میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اور میں بایں سبب تجھ سے محبت نہیں کرتا کہ تو انسانی راحت کا اعلیٰ سرچشمہ ہے۔ بلکہ میں اس واسطے تعظیم کرتا ہوں۔ کہ انسان کی انسانیت تیرے ہی طفیل سے قائم ہے۔ اور تو تمام نیکوں کا ملجا و ماوا ہے۔ تیری ذات، تیرے دل و دماغ میں وہ خوبیاں ہیں۔ جن سے انسانِ ضعیف البنیان بھی فرشتوں کی ہمسری کر سکتا ہے"

ہوریس ٹوسل

(ماخوذ)　　　افتخار رسول بدر

مروّجہ اُردُو شاعری

مروجہ اُردو شاعری دو چار کوڑی اِلفاظ کو لڑا لڑا کر معنی آفرینی کے اکھاڑے کی رونق دوبالا کرنے میں مشغول ہے۔ ان الفاظ کی فہرست کچھ طویل نہیں۔ آئینہ۔ حیرت۔ خموشی۔ غم۔ سکوت۔ ذرہ۔ قمر۔ حُسن۔ جلوہ تپش۔ شعلہ۔ شمع۔ محفل۔ شوق۔ خواب وغیرہ وغیرہ پچوں قسم تیس چالیس۔ کبھی حیرت خم ٹھونک کر آئینہ کے بالمقابل ہوتی ہے کبھی اس سے گتھم گتھا۔ کبھی بالکل اپنے آپے سے باہر۔ کبھی خموشی میں کبھی خواب میں غرض سو سو طرح ذلیل ہوتی ہے۔ یہی حال دوسرے الفاظ کا ہے۔ شوق بیچارہ تو بالخصوص اس قدر ہرجائی ہُوا ہے کہ کہیں کا نہیں رہا۔ کبھی آغوشِ حیرت میں کبھی شعلہ سے ہم پیالہ وہم نوالہ۔ کہیں غم کا میاں۔ کہیں چمن کا خانہ زاد غلام۔ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوستا ہے اور بعض دفعہ بیتاب ہوکر خواہش کرتا ہے کہ کاش میں بھٹیارا ہوتا۔ مگر شوق نہ ہوتا۔ اردو شعر گویوں کے ظلم سے تو بچتا۔ باقی رہا چاند سو کچھ تعجب نہیں کہ وہ قطعی طور پر ہجرت کر جائے۔ اسے زمینِ شعر راس نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر ان الفاظ کی دُہائی سُنی گئی تو اُردو شعر سازی کے کارخانہ کے کاریگر آئندہ کن الفاظ کو اپنے دماغی ہتھوڑے اور دل کی بھٹی سے نرم گرم کرکے توسنِ کلام کی نعلبندی کیا کرینگے ؟

اول اول جب زلف وگیسو کے محلہ سے فریاد اُٹھی تو اتفاقیہ طور پر قومی تابوت کی تیاری تھی اس وقت کے شعر بافوں نے میلوں لمبا کفن پیش کردیا مگر اب تو وہ موقع بھی نہیں۔ اس مُردے کی ہڈیاں تک گل چکیں۔ اصلی نہ نقلی کسی قسم کے آنسوؤں کی گنجایش نہیں +

چند دن شاعروں نے مناظرِ قدرت پر سواری گانٹھنے کی ٹھہرائی تھی۔ بچارے دشت وکوہسار زخمی ہوئے۔ بادلوں کے پرخچے اُڑے۔ چاندنی بلبلا اُٹھی۔

تصوف وعرفان بھی شعر کی چکی میں پس کر سُرمہ ہو چلے۔ اس خاک اُڑانے سے بھی کچھ نہیں بنے گا۔ تو آخر پھر اب کیا ہوگا؟ سٹرائک یا ہڑتال !

عبد العزیز

روزنامچہ

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسین آزاد مرحوم

(گذشتہ سے پیوستہ)

تمام دن ہمارے دائیں ہاتھ پر گادر۔ جاسک وغیرہ کی پہاڑیوں کا سلسلہ تھا۔ اگرچہ بات اعتبار کے قابل نہیں۔ مگر کہتے ہیں۔ اس میں فرقہ بام (جنگلی آدمی۔ بن مانس) رہتے ہیں۔ مرد اکثر غاروں میں رہتے ہیں۔ ان کی عورتیں انسان پر عاشق ہوتی ہیں۔ جہاں کسی مسافر یا اکیلے دوکیلے آدمی کو پاتی ہیں لے جاتی ہیں۔ اُس سے ہوس رانی کرتی ہیں۔ جنگل کے میوے لاکر کھلاتی ہیں۔ تلوے چاٹتی ہیں۔ کہ چل نہیں سکتا۔ خود حیوان مطلق ہیں۔ مگر انسانِ نرینہ سے ہوس رانی کا مرض ہے۔ اِن کے نر ہوتے ہیں۔ مگر وہ نہایت ضعیف اور یہ ایسی قوی ہوتی ہیں کہ وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ وہ انسان سے صاحب اولادبھی ہوجاتی ہیں، آدمی اگر بھاگ کر نکل جائے تو پیچھاکرکے دوڑتی ہیں اور پکڑلے جاتی ہیں۔ اور نسل بڑھاتی ہیں، ایک دفعہ ایک شخص بھاگا ۔ مادہ نے تعاقب کیا۔ ایک ندی بیچ میں حایل تھی ۔ خوش قسمتی سے وہ قوم پانی سے ڈرتی ہے۔ خوبیٔ قسمت سے یہ پار ہوچکا تھا۔ مادّہ کنارے پر آکر رُک گئی غائیں بائیں کرکے غل مچاتی تھی۔ روتی تھی۔ غصّہ ہوتی تھی اور بچّوں کو اُٹھا اُٹھاکر دے دے مارتی تھی۔ کہ شاید ان کی محبت کے سبب سے چلا آئے۔ مگر وہ بلا سے نکلا، اب کب جاتا تھا کھڑا دیکھتا رہا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد بھاگ آیا۔

جہاز ہمارا چلاجاتا ہے۔ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں۔ خلاصی اور نوکرانِ جہاز تاش کھیل رہے ہیں کبھی دو کبھی تین بادبان چڑھا دیتے ہیں رات کو چار بادبان ہوگئے ہوا کم تھی اُتار چڑھاؤ ہوتا رہا۔ دن کو گرمی بشدت رہی رات کو کچھ امن رہا۔

۵ر اکتوبر ۱۸۸۵ء یوم دوشنبہ ۲۵ ذالحجہ ۱۳۰۲ھ صبح مبارک صُبح ہوئی۔ سُنا کہ دسن

بارہ بجے بندر عباس پہنچ جائیں گے۔ میں نے ½ ۷ بجے تک عرشہ پر جاکر ہوا کھائی بہت خوش آئند تھی۔ پھر آکر لکھنے میں مصروف ہوا۔ دن کو گرمی ایسی شدت کی رہی کہ چاروں طرف پھرتا تھا۔ اور کہیں امان نہ پاتا تھا، خدا کی قدرت یاد آتی تھی۔ کہ کجا وہ لاہور کی سیر اور سوا سیر برف کوٹ کر پھانکنی اور دن رات میں تین تین دفعہ تربوز کھانے خوراک میں فقط دہی دودھ۔ اور کجا یہ عالم۔ اس پر غذا کی بے سامانی الگ ہے۔ مگر حق یہ ہے کہ مظہر العجائب کی شان اس سے بہت عالی ہے۔

ہمراہی ہمارے جو پہلے اوپر آچکے ہیں کبھی کہتے ہیں کہ بہ دستِ راست کوہ مبارک ہے یہاں عرب اور کوہستانیوں سے کسی زمانے میں جنگ ہوئی تھی۔ اور عرب کی فتح ہوئی تھی اس لئے اس کا نام جبل مبارک رکھا۔ کبھی کہتے ہیں۔ کہ سامنے کوہ سلامہ نظر آتا ہے۔

رات کو گرمی نے سخت تکلیف دی تھی میں گھبرا کر اٹھتا اور بیٹھ جاتا۔ صبح تک یہی حال رہا۔ رات کو میں نے دریا میں دیکھا۔ کف جو موج میں یا جہاز سے ٹکرا کر پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے جاتے ہیں۔ جیسے فاس فورس کے بادل بہہ رہے ہیں اور اِکا دُکا بلبلے جگنو نظر آتے ہیں۔

مسقط کنارے پر تھا۔ مگر چھوڑ دیا۔

۲۰ اکتوبر ۸۵ء سہ شنبہ ۲۶ ذلحجہ۔ صبح کو دونوں طرف پہاڑیاں نظر آنے لگیں۔ کہتے ہیں کہ ٹھیک دستِ راست پر کوہ ہرمز ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی سمندر کے بیچ میں ہے اِس پر آبادی ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کوہ لاک سے جہاز دُور نکل آیا۔ بائیں ہاتھ پر ہاتھ کو چکّر دے کر کہتے ہیں کہ تمام کشم کا علاقہ ہے۔ سمندر کے کنارے مرزا نظر الہ شاہِ ایران کی طرف سے حاکم ہے۔

½ ۸ بجے بندر عباس پر پہنچے۔ یعنی آبادی ہمارے داہنے ہاتھ تھی ہمارے جہاز نے کنارے سے اس قدر دُور لنگر کیا۔ کہ میں بلکہ کوئی بھی شہر میں نہ جا سکا۔ دفعۃً ایک چھوٹا جہاز بادی آیا۔ کہ یہاں کے لوگ اسے غراب کہتے ہیں۔ وہ انگریزی کمپنی ہے۔ ڈاک دینے اور لینے کے لئے۔ اور میں وہ مال لینے آیا تھا۔ جو بندر عباس کے لئے ہمارے

جہاز میں تھا۔

بندر کے ملاح چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر آئے۔ اور یہاں کے اُترنے والے مُسافروں کو اُتار لے گئے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں پر چند نوجوان لڑکے آئے۔ اور خربوزے۔ خشک انجیر۔ انار۔ ناشپاتی۔ انڈے۔ لائے۔ پھر چند اور سودے والے آئے۔ مگر سب کی زبان خالص فارسی تھی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ یہاں سے خاکِ ایران شروع ہوتی ہے باوجود اس کے سب کی رنگت کالی یا سانولی۔ اس کا تعجب نہیں۔ جس ملک میں اس غضب کی گرمی پڑے وہاں تو حبشی پیدا ہونے چاہیئے ہیں۔ خیر جو جہاز آیا تھا۔ اس میں حبشی اور اکثر دوغلے حبشی بھی تھے۔ انار بالکل کھٹے تھے۔ خربوزے بھی مزے میں قابلِ تعریف نہ تھے۔ البتہ بڑے بڑے تھے۔

۱۲ بجے تک مال جہاز سے اُترتا رہا۔ بہت سے ٹھیلے شکر کے تھے کالی مرچ۔ کھوپرہ اور کئی بوجھ تانبے کی چادروں کے تھے۔ یہاں سے ہندوستان کو جانے کے قابل کوئی چیز نہیں۔ مہندی اور "لوکے" لیمو بغداد کو جاتے ہیں اور کپڑا ان تمام بندروں میں بمبئی سے آتا ہے۔ دو بجے جہاز چلا اور ٹھنڈی ہوا کھلی۔ مگر اس طرح کھلی۔ گویا اسی کی منتظر تھی ہماری جان میں جان آئی تھی لیکن مشکل یہ کہ عین مقابل سے آتی تھی اگر بادی جہاز ہوتا تو قدم بھر آگے نہ بڑھ سکتا۔ دخان کی برکت تھی کہ رات کے چار بجے تک جہاز تیر کی طرح ہوا کی چھاتی پر چڑھتا چلا گیا۔ اب شام ہوگئی۔ میں عرشہ پر ٹہلتا پھرتا ہوں۔ بندر عباس سے ایک مرد عرب شیخ محمد حسین سوار ہوئے۔ بحرین جاتے ہیں کہ روضہ خوانی کریں۔ سلسلۂ گفتگو میں میں نے سید نعمت اللہ جزائری علیہ الرحمۃ کا ذکر کیا۔ کہا کہ میں اُن کی اولاد میں ہوں ٭

باقی آئندہ

افسانہائے عشق

بخت نصر کا قیدی

بابل کے باغچہ ہائے آویزاں میرے ہی لئے بنائے گئے تھے۔ میں بخت نصر کی محبوبہ اشتارت تھی۔ جس دیوی کے نام پر میرا نام تھا، میں اُسی کی طرح حسین تھی۔ اُسی کی طرح میں ایک ریشمی لباس پہنے رہتی تھی جو مردوں کی رُوحوں کو قید کرنے کے لئے اک جال تھا۔ میرے دامن سے کسی کا سر چُھو جائے، وہ بےچارہ، اُس دامن کے نرم تاروں میں پھنس کے رہ جاتا تھا۔ جتنا اُس سے نکلنے کی کوشش کرتا تھا اُتنا ہی اور پھنستا تھا، اُتنا ہی اور اُس کے گلے میں پھندا پڑتا، میرے ذرا سے حکم، میرے خفیف سے اشارے پر خون کے آبشار گرتے تھے، دریا بہتے تھے، انسان بھیڑوں کی طرح ذبح کئے جاتے تھے، دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت، وہ شکل، وہ رنگ اختیار کرتی تھی جو میں اُسے دینا چاہتی تھی، اور وہ تاجدارِ معظم جو تمام دُنیا پر حکمرانی کر رہا تھا، میرے گورے پاؤں کے نیچے، اک زبوں و عاجز قیدی کی طرح پڑا رہتا تھا، مگر میں خوش نہ تھی۔ ہاں، اگر ستارے میرے کمرے میں جمع ہو کر، چراغ کا کام دیتے اور آفتاب میرے محل کو گرم کرنے کے لئے انگیٹھی بنتا، اور دُنیا میرے پسندیدہ پھولوں سے لد کر میرا پائیں باغ بن جاتی، تو بھی میرے لئے یہ سب کچھ ہیچ تھا،

اِس لئے کہ میری رُوح میں اک نقطہ، ایک عمیق و حاکم نقطہ خالی تھا،

اس نقطہ کو نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کی بندگی، نہ اُن کے خون، اور نہ اجرامِ فلکی بھر سکتے تھے، وہ نقطہ ایک ایسے وجود، ایک ایسے رفیق کو ڈھونڈھتا تھا جو میری زندگی کے باریک ترین عنصر میں سکون و حظ پیدا کرے۔ اک دن میں اپنے باغچہ کے سب سے زیادہ رنگین سب سے زیادہ چمکیلے پھولوں کے دستے میں لیٹی ہوئی تھی۔ کہ میرے کانوں کو سپاہیوں کی ہائے ہُو، اور ہتیاروں کی جھنکار سُنائی دی، یہ سپاہی ارضِ فلسطین سے فاتحانہ واپس ہو رہے تھے، اور

اُن کے نعرے بابل میں گونج رہے تھے۔

اب میرے حضور میں کتنے قیدی آگ میں جلائے جائیں گے، کتنوں کی آنکھیں نکالی جائیں گی کتنوں کی کھال کھینچی جائیگی۔ کیا کیا شکنجے، کیا کیا تکلیفیں، کیا کیا اذیتیں دی جائینگی اور فریادوں کے ساتھ خون کی نہریں ہم آہنگ ہوکر بہینگی۔ زمین میرے باغ کے محبوب ترین لالہ زار سے زیادہ سُرخ، زیادہ آتشیں رنگ میں رنگی جائیگی، خود بخت نصر آکر مجھ سے نئی اذیتوں نئے شکنجوں کی ترکیبیں پوچھے گا۔ یہ ظالم و خونخوار قوم، جو اپنے معبدوں، اپنے دیوتاؤں اور اپنی زندگی میں ظلم و اذیت اور اُس کے مظاہر کی پرستش کرتی ہے، شاید اسی وجہ سے مجھے پیار کرتی ہے کہ میں نے ظلم اور اذیتوں کے نئے نئے طریقے انہیں سکھائے ہیں۔

بخت نصر، وہ آلۂ ظلم جو دنیا میں موت اور خون تقسیم کیا کرتا تھا، مجھ سے آکر رائے لیا کرتا تھا یہ حاکم قہار جو دنیا کے اوپر، انسانوں کے اوپر ایک حکمران مطلق کی حیثیت سے، اپنی رعایا کا گلا گھونٹتا تھا، ایسے لمحے بھی ہوتے تھے کہ میں اس کی رعایا کی طرح اُس کا گلا گھونٹتی تھی میں نے گھنٹوں اس منظر سے لطف اُٹھایا ہے کہ اپنے مرمر کے دروازے کی چوکھٹ پر اُس کے تاجدار سر کو میں نے ٹھکرایا ہے، اور وہ اک زخمی شیر کی طرح غرّایا ہے اور پھر خاموش ہوکر رہ گیا ہے۔ اس رات میں اپنے محل کی سیاہ چھت کو دیکھ رہی تھی، جس میں آسمان کی تقلید میں چاندی کے چمکدار ستارے جڑے گئے تھے کہ مجھے معلوم ہُوا کہ بخت نصر آرہا ہے۔ اُس نے سب ہتیار میرے کمرے کے دروازے پر اُتار کر رکھدیئے اور ایک سانپ کی طرح سرکتا ہُوا میرے حضور میں آیا اور کہنے لگا،

"اشتارت! میں نے فلسطین میں ہر چیز پر قبضہ کر لیا، اور اک سرے سے دوسرے سرے تک اُسے ویران کردیا اور جلاکر خاک کرڈالا، مگر وہاں اک شخص ہے جس کی روح پر میں تسلط حاصل نہیں کرسکا، وہ اک سپاہی منشی آدمی ہے۔ موت کی ہر شکل پر اُس کی آنکھیں ہنستی ہیں وہ اک بہادر رُوح رکھتا ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کرسکتا کہ میں اُسے مرعوب نہ کرسکوں یہ شخص جو میرے سامنے بالکل بے ہراس رہتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اُس کی آنکھوں میں خوف دیکھوں، بتا کہ میں اُسے کس اذیت میں مبتلا کروں کہ وہ میرے سامنے کانپے،،

میں نے کہا:- "کل اُسے میرے سامنے لایا جائے۔ میں جانتی ہوں کہ اُس کے ساتھ کیا کرنا چاہیئے۔ دوسرے دن، میں محل "طلائی آفتاب" میں گئی، اس کی چھت میں اک مرصع طلائی آفتاب بنایا گیا تھا، کمرے کا فرش اور دیوار و در اُس کے طلائی نور سے دمک رہے تھے، میں اپنے زرتار بالوں میں اک طلائی موباف لگائے ہُوئی تھی، میرے حسین جسم پر اک طلائی ملبوس تھا، میں اس طلائی کمرے میں اس دبدبہ و احتشام کے ساتھ داخل ہوئی کہ دُنیا پھر اُسکی مثال نہ دیکھے گی۔ اک طلائی تخت پر جو نہایت سبکدست، نہایت ماہر صناعوں کی صنعت گری کا نمونہ تھا، میں متمکن ہُوئی، اور وہاں میں نے اُس کا انتظار کیا۔ تھوڑی دیر میں میں نے دیکھا کہ دروازے کے مرصع طلائی پردوں کو اک غلام کے سیاہ ہاتھ نے ہٹایا، اور بنی اسرائیل کا وہ نوجوان جو بخت نصر کے سامنے بے خوف رہتا تھا داخل ہُوا،

مجھے اپنی طاقتِ حسُن پر اتنا بھروسہ تھا کہ میں جانتی تھی کہ وہ سرکش طبیعتیں جو آفتابوں، معبدوں، معبودوں کے سامنے سجدہ نہ کرتی تھیں، میرے حسُن کے سامنے سر بسجود ہو کر میری پرستش کرتی تھیں،

یہ نوجوان کمرے میں داخل ہُوا، ایک کھال اوڑھے ہُوئے، بازو اور کندھے کھُلے ہُوئے،

بابل کے سورماؤں کے سانولے ہاتھوں پر، اور بازؤں اور چہروں پر رگیں اس طرح اُبھری ہُوئی ہوتی ہیں جیسے بٹی ہُوئی رسّی، مگر اس نوجوان کی گوری اور ہموار جلد پر ایک ساکت اور مطمئن قوت کا احساس ہوتا تھا۔ اس کا اصلاً صبیح مگر تمازتِ آفتاب سے سُرخ چہرہ کتابی تھا جس میں ایک ایسی روحانیت جھلکتی تھی جس کا میں اب تک تصوّر بھی نہ کر سکی تھی۔ اس کے شانوں پر گھنے سنہرے بال لہرا رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں میں۔ سمندر کی اور آسمان کی نیلاہٹ، اُس کی رُوح سے مل کر ایک ضیائے رنگیں پیدا کر رہی تھی اور یہ ضیائے رنگیں میری رُوح کے خالی نقطے میں، جسے اس قدر برسوں سے، اِس قدر طویل مُدت میں کسی چیز نے نہ بھرا تھا، نفوذ کر رہی تھی، میری رُوح اب تک تشنہ تھی، دولت کی شان، اِنسانوں کی عبودیت، انسانوں کے خون، اور اجرام فلکی جس روح کی تاریکی دور نہ کر سکے تھے،

اس وقت اُس کی آنکھوں کی روشنی اُس رُوح کو منور کر رہی تھی۔ اب میرے لئے، نہ دولت کی شان، نہ انسانوں کے خون، نہ اُن کی بندگی، نہ زمین نہ آسمان، نہ اجرام فلکی، کچھ نہ تھے، میری روح، میری حیات میں سے کائناتِ محو ہو چکی تھی۔ میرے لئے صرف وہ سیلِ نور تھا جو اُس کی آنکھوں سے نکل رہا تھا، یہ نور تھا اور میری روح کی وہ مسرت تھی جو چشمے کی طرح اُبل رہی تھی،

میں اپنے تخت سے اُتری، اُسکی ثابت اور ضیا بار آنکھوں کی طرف سیدھی کھنچی چلی گئی میں نے اپنے بالوں میں سے طلائی موباف نکال پھینکا، اور اُن قدموں کو جو فلسطین سے یہاں تک آنے میں پتھروں پر چلنے سے چھل گئے تھے، اپنے لمبے کھُلے ہُوئے پریشاں بالوں سے ڈھک لیا، اور کہا:۔

"تو بھی اسی طرح عشق کے سنہری تاروں سے میری تشنہ روح کو جو سالہا سال سے تیرا ہی انتظار کر رہی تھی ڈھک لے"

اُس نے چند لمحے جواب نہ دیا جب اُس نے بات کرنی شروع کی تو مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ ایک معبود اپنی معظم و نجات بخش رحمت تقسیم کر رہا ہے۔ اس نے کہا:۔

"اے عورت!" یا خدا نے تیری روح کی طرف التفات کیا، جو تو چاہتی تھی وہ تجھے دیا تو بھی اس کرم خاص کے عوض میں بنی اسرائیل کی جانوں کو بچا" میں نے اپنا سر اُٹھایا، اور اُس انقیادِ مطلق سے جو میری طبیعت میں ابھی پیدا ہُوا تھا میں نے کہا:۔

بُہت اچھا، مگر مجھ پر اک نظر تو ڈال، مجھے اک چھوٹی سی نوازش سے محروم نہ رکھ آہ! میں کتنے برسوں سے تیرا انتظار کر رہی تھی، اُسنے اپنے لمبے اور نرم ہاتھ میرے سر کی طرف بڑھائے، مگر عین اس وقت بختِ نصر آنکھوں سے شُعلے برساتا ہُوا کمرے میں داخل ہُوا اور پُر غضب آواز سے کہنے لگا:۔

"اس خانہ بدوش کو اپنا عاشق کرنیکے لئے تو نے یہاں بُلایا تھا، لیجاؤ اِسے" اس وقت میں نے معلوم کیا کہ میرا تمام افسوں، میرا تمام طلسم جو انسانوں پر تھا ختم ہوگیا، اور اُس جانور کے سامنے جسے میں نے اپنا مطیع و منقاد کر رکھا تھا میں عاجز کھڑی تھی، بخت نصر کا آخری حکم اسوقت تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے:۔

"اشتارت کو باغ آویزاں میں، اسکے بالوں سے لٹکا دو۔ اور بنی اسرائیل کو ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کرو"

(خالدہ خانم ادیب)

سید سجاد حیدر

نُدرتِ ذوق و نظر

ان ہی کچّی پکّی مٹّی کی چار دیواریوں میں اب بھی بعض لوگ ایسے رہتے ہیں کہ اگر دُنیا کو اُن کے متعلق صحیح معلومات نصیب ہو جائے، تو اُس کی مسرت، عہدِ عتیق کے کسی پُرانے دفینہ کی دریافت سے کچھ کم نہ ہو۔

آبادی کے اسی ہنگامے میں مِلے جُلے، کچھ افراد ایسے بھی ہیں کہ اگر زمانہ اُن کو، اُن کی حقیقی قابلیت کے علم کے ساتھ حاصل کرلے، تو آج بھی فنونِ لطیفہ کی بعض شاخوں میں جدید انکشافات کا اضافہ ممکن ہے۔

رشید، کیا ہے اک چھریرا سا، خوب صورت بائیس تئیس سالہ نوجوان، عامِ ہیئتِ جسمی سے متین، مگر جس وقت کسی طرف دیکھے تو اُس کی گردن میں وہ ذرا خم کا پیدا ہو جانا، اُس کی شوخیِ فطرت کی دلیل، قیافہ مضمحل، طبیعت کھوئی ہُوئی، دل گرفتہ و دلگیر، آشفتہ حال، علی گیرین، گریجویٹ، مگر قدرت کی بلیغ ترین تصنیف۔ اگر خاموش ہو جائے تو مصحفی مرحوم کا جمود شعری، مسکرائے تو آسکر وائلڈ کا استہزائے فصیح، اور جب سرگرمِ سخن ہو تو ملک محمد جائسی کی پدماوت، اپنی مکمل رعنائیوں کے ساتھ اُس کے بیان کا اک جزو محسوس ہو +

کبھی ادب و شعر کی رنگینیوں میں گم۔ کبھی ترکِ لذات کا مدح خواں۔ کبھی تہذیب و مدنیت کا عَلم بردار۔ کبھی فلسفۂ رہبانیت کا مبلغ، غرض آدمی کیا ہے اک چیستاں ہے۔ پہلے پہلے جب میں اُس سے ملا میں نے اُس کو دیوانہ سمجھا، مگر جب اُس سے باتیں ہُوئیں تو کھو گیا۔ اور اب جبکہ اُس سے کچھ محبت سی ہو گئی ہے تو اپنے آپ کو اُس کے لئے بیتاب سا پاتا ہوں۔

اگرچہ اُس کے ادبی افکار و آراء انگریزی ادب و لٹریچر سے بہت کچھ متعلق ہیں مگر پھر بھی اُس کے محسوساتِ شعری یورپ ہی کی فضاء کے لئے مخصوص نہیں۔ مجھے معلوم ہے کاشی دہر دوار کی زمین بھی اُس کے سجدۂ ادبیت کی اک خاص سمت ہے۔

یوں تو اُس کی طبیعت کا کیف خود اپنے لئے، اور احباب کے واسطے ہر وقت اک مستقل دعوتِ لطف ہے۔ لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ جس طرح کششِ مقناطیس کے لئے مادۂ آہن ناگزیر ہے بالکل اسی طرح بعض لطیف عنوانات ہیں، جن پر رشید کے ذوقِ تکلّم کا پیمانہ بے اختیار چھلکنے لگتا ہے

میں کسی طرح بھی وہ زمانہ نہیں بھول سکتا، جبکہ مسلسل چھ سات روز میں نے رشید کو دیکھا کہ اس نے شاید اپنی زندگی کے لئے فیصلہ کرلیا ہے کہ یُوں ہی بلا کچھ کھائے، پئے، بلا کچھ بولے چالے، خاموش۔ اُداس، بقیہ حیات بسر کردے گا

صبح ہو یا شام، دن ہو یا رات، اک کیفیت ہے کہ اُس پر مستولی ہے، چُپ ہے، مسرور ہے، مست ہے، آخر چھٹے یا ساتویں روز بے خدمتوں سے میں نے اُس کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ بڑے اصرار سے اس حالت کے اسباب کو دریافت کرنا چاہا مگر جس اجمال سے اُس نے کام لیا ہے اُس کے بلاغتِ ذوق کا اُس سے پتہ چلتا ہے، اُس نے کہا "فتح النساء کے کوچے سے نکل رہا تھا کہ مرے کانوں میں اک آواز آئی اور پھر مرے ہوش بجا نہ رہے دیکھو کیا ماجرا طراز جملہ ہے۔

"اِدھر تو آ۔ ارے او پھول والے!!"

اُس نے کہا "مظہر تم ہی کہو اس طلبِ نکہت، اس تفصیلِ ذوق، اس ترنّمِ صوت کا صحیح جواب مرد کی مبتلا طبیعت، خرابیٔ مذاق اور کرختگیٔ فطرت کبھی دے سکتی ہے، میرے احساس کی نزاکت کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنی روح کے فشار کو یوں نذرِ نکہت بنا دیتا۔۔۔۔۔"

رشید کے وظائفِ ادبی کی تفصیل تو بہت دشوار ہے مگر غالباً اس قدر اجمال بھی لطف سے خالی نہ ہوگا جو عرض کرتا ہوں۔ اک مرتبہ بمبئی مالا بار ہل کی زیرین سڑک کے موڑ پر، جبکہ مظہر و رشید ساتھ ساتھ جا رہے تھے اک زرد رنگ کی نہایت خوب صورت سی موٹر برابر سے گذری، صرف اک نرم و نازک آواز قہقہہ ہمارے کانوں میں گونجتی ہوئی گذرگئی۔ مگر رشید حواس باختہ ہوگیا ٹھیک گیارہ بجے رات تک وہیں بے حس و حرکت اک جانب بیٹھا رہا۔ موسیقی جب نغمہ کے کیف میں ڈوب کر اپنا آخری بول، طربوں پر اثر بنا کر پھیلا دے اور کائنات کو تڑپا کر رکھ دے، مصوّر، جب اپنے نقوشِ مصوّرہ میں آخری رنگ بھرے اور دیکھتا رہ جائے، شاعر

تخیل کی کیفیت کو جب ادا کرنے بیٹھے اور دو لفظ خوبی سے کوئی نادر ترکیب اختیار کرلیں، جس پر وہ اُچھل پڑے۔ بس ایسا ہی اثر اِس شیریں و نازک سے قہقہے نے رشید پر کیا!

قیام بمبئی کے زمانہ میں اک مرتبہ رشید دو روز ہوٹل سے غائب رہا، نہایت تلاش کی نہ ملا۔ آخر تیسرے روز چرچ گیٹ کی جنوبی کوٹھیوں کے طویل و حسین سلسلۂ تعمیر کے آخرین حصّہ پر جہاں اک مکان کے سامنے مختصر سا پارک ہے اُس کے سبزہ پر آپ خموش و غمگین پائے گئے۔

یہ مشاغل اُس کے روزانہ وظائف میں داخل ہیں اور احباب اسکے عادی۔ تاہم اُس کے دوستوں میں یہ خلش بھی ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا!؟

۲

رشید کے بعض دوستوں نے مشورہ کیا، کہ چونکہ جوانی صحتِ اخلاط کے نتائج سے عبارت ہے مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ رشید کے والدین کو یا خود رشید کو شادی پر آمادہ کرنا چاہیئے، اور بات یہ بھی تھی کہ اول اول رشید کو جو لوگ دیکھتے اور اُس سے باتیں کرتے یا اُس کا حال اُس کے خاص دوستوں سے سنتے تھے تو وہ یکایک صحیح رائے قائم کرنے پر قادر نہ ہوسکتے تھے، چونکہ اُس کے خیال کی پرواز بہت بلند و آزاد تھی بعض لوگ تو اُس کا ساتھ ہی نہ دے سکتے تھے مگر اُس پر بھی جو لوگ کچھ ہم آہنگ و ہم نوا ہو جاتے تھے اُن میں بھی بہت دیر تک ساتھ دینے کی سکت نہ رہتی تھی، شدتِ تخیل، غلوئے افکار ہر شخص کا حصہ نہیں۔ تاہم اس شادی کی تحریک نے اُس کی زندگی کے اک بڑے اغلاق کو واضح کر دیا اور سب لوگ جاننے لگے کہ یہ کس طرح کا معصوم مجنوں اور پاکباز دیوانہ ہے۔

سب سے پہلے میں نے ہمت کرکے اُس سے کہا "رشید! ماشاء اللہ تم جوان ہو، فارغ ہو، مناسب ہے شادی کرلو۔ شادی شرکت ہے عیش کی، جس سے جانبین کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ شادی تدریجی ارتقا ہے تہذیب و تمدن کا اور اخلاق کا تصفیہ بھی اس سے ممکن ہے۔ شادی مردانہ زندگی کا حسن ہے۔ شادی مردانہ عبودیت کا وقار ہے اور سچ تو یہ ہے کہ شادی ہی مرد کی مصروفیت کی راہ ہے، تمہارا یہ التہاب و اضطراب اور یہ بیکار شباب اک تسلی چاہتا ہے اور یہ چیز صرف اک عورت کی محبت ہی پیش کرسکتی ہے اِدھر اُدھر تلاش عبث ہے!"

آپ باور کیجئے گا رشید، اک معصومانہ جوش کے ساتھ میری جانب متوجہ ہوا اور کہنے لگا

بس محمود بس خدا کے واسطے حقایق کو اپنے جہل سے مجروح نہ کرو، تم نے اپنی دانست میں بڑی قابلیت سے مسئلۂ مناکحت پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر یقین کیجئے آپ نے اپنے ان چھ سات جملوں میں اس درجہ جہل و نادانی سے کام لیا ہے کہ اگر میں چھ سات مہینے تک سرگرم گفتگو رہوں تب بھی شاید تمہارے اغلاقِ منطق کے سلجھاؤ سے عہدہ برا نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ حضرات کی دُنیا اور ہے اور مجھ بیکس کی دُنیا اور ہے۔ کاش کوئی بات تو آپ نے سوچ سمجھ کر کہی ہوتی۔ یہ انتیاری شبہات، یہ یک طرفہ تصدیقِ ظنیات۔ یہ خود ساختہ ابہام۔ یہ اغلاط کے خوشنما عنوانات، کیا آپکی دُنیا کی تعمیر ان ہی خرابیوں پر منحصر ہے - ؟!

"تم نے یہی کہا ہے نا کہ تم جوان ہو۔ فارغ ہو۔ شادی کر لو۔

"محمود! جوانی یہ تعینِ زمانی واللہ اُس دُنیا کے جذباتِ کثیف کی اصطلاحات ہیں جن کے ہاں طفلی۔ جوانی۔ ضعیفی کے کچھ مدارج و مشاغل الگ الگ مختص و قائم ہیں۔ اور حیات کی یہ تقسیم سہ گانہ اپنے اندر کچھ بیکاری۔ کچھ لہو و لعب۔ اور کچھ بندگی و بے چارگی کی تفصیل پوشیدہ رکھتی ہے۔ ورنہ مجھ سے اگر پوچھئے تو انسان کی یہ ہوشمندیٔ حس، اک حیات ہے غیر فانی اور اس کی نہ طفلی ہے۔ نہ شباب اور نہ بڑھاپا۔ جب تک حسی استدراکات زندہ ہیں۔ انسان زندہ ہے ورنہ یوں آدمی جیا کرے۔ مگر اس شے سے محروم، تو اُس کی زندگی حقیقت میں وہی زندگی ہے جہاں بچپن بھی ہے۔ جوانی بھی ہے اور ضعیفی بھی، جس کے ساتھ ساتھ زوال ہے اور جس کے آگے پیچھے اجل!

"پس میری جوانی اُس نوع کی جوانی نہیں جیسا تم نے فرض کیا ہے، اور اس طرح تم نے مجھ پر میری معصومیت پر اپنی جوانی سے ظلم توڑے ہیں، ہاں اُس جوانی سے جو سراسر غلاظت کا اک ڈھیر ہے!!

"تم نے کہا ہے کہ تم فارغ ہو!؟

"ہاں تمہاری دُنیا میں اگر متفکر و متلاشی، فارغ کہلائے جاتے ہیں تو مجھے بھی تم فارغ کہہ لو ورنہ میں تو محمود! اس درجہ مصروف ہوں جس کے مقابلہ میں تمہاری مصروفیتیں میری فراغت کا اک داغ ہیں،

تم یہی فرماتے ہو کہ شادی کر لو، اس سے جانبین کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا ہے "شادی شرکت ہے عیش کی" شاید محمود! تم نے اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ شادی کیوں کرتے ہیں، شادی کی کیوں ضرورت ہے؟ ورنہ تمہاری زبان سے کبھی تحریص و تشویق کے لئے

ایسے جملے نہ نکلتے۔ دیکھو آسکر وائلڈ کہتا ہے "مرد اس لئے شادی کرتے ہیں کہ وہ تنگ آجاتے ہیں۔ عورتیں اس لئے شادی کرتی ہیں کہ وہ نئی زندگی کا اشتیاق رکھتی ہیں" پس تو بحمداللہ اُس صحبتِ اخلاط کے ہنگامی نتائج و اثر سے، جس کو تم جوانی کہتے ہو، میں اُس کی ولولہ خیز تحریکات سے ابھی مغلوب و متاثر نہیں ہوا ہوں۔ میں آپ لوگوں کی سی جوانی کا مالک نہیں، اور نہ اس جوانی کے التہاب و اضطراب سے میں تنگ آ گیا۔ نہ ابھی میری مصروفیتوں سے مجھے رستگاری نصیب پھر مجھے شرکتِ عیش کی کیا حاجت، میرے مطمئن و سادہ سکونِ خلوت کو ہنگامہ آرائیوں کی کیا جستجو؟"

"مجھے تو اک مرتبہ جب اک فردِ صنفِ نازک نے دعوتِ ازدواج دی تھی تو میں نے یہ کہا تھا کہ جو لوگ اسیرِ ازدواج ہیں انہوں نے اپنی نادانی سے اپکی نئی زندگی کی آرزوئے خام کی قربانگاہ پر اپنے آپ کو بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ میں اس طلسمی کھیل کے کھیلنے سے معذور ہوں ـــ

"اس کے بعد تمہارا یہ ارشاد کہ "شادی تدریجی ارتقا ہے تمدن و تہذیب کا" یہ بھی تم ہی کو مُبارک اور اس میں کوئی شک نہیں کہ تم نے اپنے اس خیال کو سوسائٹی کی اجتماعی عزتوں کے سائے میں سرسبز ہونے کی توقع پر کہا ہے۔ ورنہ یہ خیال انسانی ظلم و استبداد کی اک قدیمی روداد ہے، جس کی تم نے نہایت خوبصورت و خوشنما لفظوں میں نمائش کی ہے، شادی، انسانی غلامی کے احیاء کی تاریخ ہے، کہ کس کس انداز و طریق سے کن کن حیلوں اور فریبوں سے عورت کو اسیر و پابند کیا ہے، وہ جب آزاد تھی تب بھی مرد کی حرص و آز کا شکار تھی۔ وہ جب سے تمہاری اسیر و پابند ہوئی، تمہاری خوئے ہوس رانی کا لقمہ ہے، میں تم سے پوچھتا ہوں تمدن کے نظام نے عورت کو چند قواعدِ رسمیہ کے ماتحت تمہارا بنا دیا مگر عملی صورت سے کیا تم خود بھی اُسی شدتِ قید کے ساتھ اُس کے ہو جاتے ہو، اور ایماناً اگر ایسا نہیں ہے تو بتاؤ تم کو کیا حق حاصل ہے کہ تم دوسروں کو غلام بنائے رکھنے کی آرزو کرو۔ ہاں شادی اس معنیٰ کر ضرور ارتقاء ہے تمدن و تہذیب کا کہ اس سے افزائشِ نسلِ انسانی متعلق ہے۔ فنِ انساب وضع ہوا، اسماء الرجال مدون ہوا۔ یا جب انسانوں کو تن ڈھانکنے کی ضرورت ہوئی۔ اور پیر پھیلا کر سائے میں رات کاٹنے کی فکر ہوئی۔ تو صنعتِ پارچہ بافی کو فروغ ہوا، اور فنِ تعمیر کی ایجاد ہوئی۔ ضرورتیں بڑھنے لگیں۔ مکر و فریب کی ترقی ہوئی۔ دنیا نے اپنی معصومیت کا نوحہ پڑھا۔ سادگی کا ماتم برپا ہوا، اُس کی جگہ معصیت کی مجلسیں قائم

ہوئیں اور تصنع اور بناوٹ نے دُنیا میں چہل پہل کر دی ۔

محمود! عورت شادی کے لئے نہیں، شاعری کے لئے ہے۔ دیکھو آسکر وائلڈ کیا خوب کہتا ہے "اُس سے محبت کرنا نہایت ہی شاعرانہ تخیل ہے مگر تحریکِ مناکحت میں مطلق شعریت نہیں" لاریب کہ جس دلچسپی و تخیل میں شگفتگی۔ بلندی۔ اور شعریت نہیں ہے، میں نہیں جانتا دنیا میں اُس کی وقعت کیسے قایم ہو سکتی ہے؟ ہاں تم نے یہ بھی کہا ہے کہ شادی تصفیۂ اخلاق کا بھی ذریعہ ہے تمہارے اس خیال سے شاید تمہاری دنیا کے علمائے نفسیات متفق ہو سکتے ہونگے۔ میرے احساسِ محض کی دُنیا آپ کے ساتھ اس باب میں اتفاق کر لینے سے عاجز و معذور ہے۔

تمہارے نزدیک شاید اخلاق کا تصفیہ، کسی شبِ عیش میں ہنگامی ولولوں سے اپنے جوش کے بار کو سبکدوشِ عصمت ہو جانے سے عبارت ہے تب تو آپ نے سچ کہا ہے ورنہ میرا خیال تو یہ ہے اپنا ماحول تک اس خیال سے جب تک کوئی پاک نہ کریگا، اُس وقت تک اخلاق کا تصفیہ اُس سے کبھی ممکن نہیں!

حیف کہ آپ کے ہاں "شادی مردانہ زندگی کا حُسن ہے" مگر میرے ہاں عورت سے اس نسبتِ مہمل کا پیدا ہی کرنا ذمائم اخلاقی کا منبع ہے۔ تمہارے ہاں مردانہ عبودیت کا وقار، شادی ہے، ہاں ان لوگوں کے ہاں جو اپنی درندگی و بہیمیت کے آگے غنچوں کی خلقتِ منفعل، صرف سجدہ ہو جانا پسند کریں ورنہ دنیا ابھی رشید سے خالی نہیں جس کے نزدیک حُسنِ نسائیت کی پرستش ہی عروجِ حیاتِ صادقہ ہے۔ ہاں کس نوع کی پرستش، کہ خیال میں اُس کے لئے یکسوئی فراہم کرنا جس کے بعد شئے متصوّر کے سوا کچھ بھی باقی نہ رہے ــــ

شادی، مرد کے لئے مصروفیت کی راہ ہے۔ آپ نے سچ کہا مگر محمود! مصروفیت کی نوعیت مبہم ہے۔ غالباً تمہاری منشاء اس سے یہ ہے کہ عورت کی کفالتِ خرچ کی ذمہ داریوں کے احساس میں مرد انسان سے چوپایہ تک ترقی کر سکتا ہے: اس حصے کو مصروفیت سے الگ کر کے میرا خیال یہ ہے کہ محبت جیسی شئے کبھی روپیہ سے نہیں حاصل کیجا سکتی۔ میری سمجھ میں آجتک یہ نہیں آیا کہ اک مرد۔ اک عورت آپس میں محبت سے مل جُل کے رہتے ہیں مرد روپیہ کماتا ہے، اس پر خرچ کرتا ہے اور عورت اُس کے روپیہ کو لیتی ہے اور اپنے آپ پر بھی خرچ کرتی ہے اور اُس کے معاوضہ میں اپنا

ذخیرۂ حیات۔ اور اپنی محبت، مرد کو دیتی ہے؟ محمود! یہ کیا فلسفہ ہے اتحاد کا؟۔ اس لین دین میں کیا محبت کی خرید فروخت ہُوا کرتی ہے۔ جاؤ، لاحول ولا قوۃ! مجھ سے اگر ایسے بیوہار کی خواہش رکھتے ہو تو میری متانت آپ کے جواب میں یکسر اک قہقہہ ہو جائے تو مجھے معذور ادب خیال فرمائیے!

عورت میرے واسطے وجۂ مصروفیت ہو سکتی ہے۔ وہ اپنی تحسینِ خلقت کے لحاظ سے رنگینی۔ سادگی۔ اور معصومیت کا مظہر ہے۔ اس لئے ساری دُنیا کے لئے وہ موجبِ دلچسپی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کا جزوِ ادنیٰ مَصرَف ہے شادی کا، اور اجمالِ اعلیٰ مبدلہے پرستش کا۔ اوّل الذکر دنیا کی جوانیوں کا موضوعِ گفتگو ہے اور آخر الذکر صرفِ ادیبوں کا مشغلۂ شعری——!"

سب سے آخر محمود تم نے غائتِ ہمدردی سے کہا ہے کہ تمہارا اضطراب اور یہ بیکار شباب، دونوں اک تسلی چاہتے ہیں اور وہ صرف عورت کی آغوشِ مودۃ میں نصیب ہو سکتی ہے۔ تمہارے علوئے خیال پر اس وقت تو مجھے بھی پیار آگیا۔ مگر چونکہ تمہارے ہاں عورت اور نسائیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور میرے ہاں عورت اک اور چیز ہے اور نسائیت اک اور چیز اس لئے تمہاری ہر وہ بات جو چاہے کسی قدر مفید ہو مگر ذرا سے اس امتیازی خط کو محسوس نہ کرنے کے باعث ہر بلندی سے محروم رہ جاتی ہے۔ ہاں میرا التہاب یہ بیکار شباب اگر حضور کے نزدیک اک عورت کی تسلی کا جویا ہے تو پھٹکار اُس اضطراب پر لعنت اُس شباب پر۔ آپ کے خیال کی عورت آپکی دُنیا کی جوانی کے لئے موجبِ مسرت ہو تو ہو۔ نہ میں تمہاری دُنیا کا سا جوان اور نہ مجھے اُس عورت سے ربط، جو آپ کے بزمِ خیال کی زینت ہے——!

اس قضئے سے علیحدہ ہو کر ہاں مجھے اُلفت ہے اُس مظہرِ شعری سے جو پیکر ہے لطافت و نسائیت کا۔ جس کے تصور میں شعریت ہے جس کے نظارہ میں مُصَوّری ہے۔ جس کی گفتگو میں موسیقی ہے۔ جس کی خاموشی عنوان ہے دیویت کا، جس کی تمکینِ وقار لرزہ ہو الوہیت کا . . . !"

خلیقی دہلوی

وزیرِ عدالت

یہ واقعہ آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے کا ہے۔

ایک دن شام کے وقت جبکہ آسمان پر بادل لہرا رہے تھے۔ بدھ گیا نامی گاؤں میں ایک اجنبی ششو پال براہمن کے دروازے پر آیا۔ اور لجاجت آمیز لہجہ میں بولا "کیا مجھے رات کاٹنے کے لئے پناہ کی جگہ مل سکے گی؟"

ششو پال اپنے گاؤں میں سب سے غریب تھے انتہائے افلاس نے بھوکے بیل کے مانند اُن کی ہڈیوں کے پنجر نکال رکھے تھے۔ اُن کی گذر اوقات اراضی کے ایک ٹکڑہ پر تھی۔ جس کی پیداوار اس قدر قلیل تھی۔ کہ اُن کے لئے بھی ناکافی تھی۔ مگر اس کے باوجود اجنبی کو دروازے پر دیکھ کر اُن کا چہرہ شگفتہ ہوگیا جس طرح سورج مکھی کا پھول طلوع آفتاب سے کھل اُٹھتا ہے۔ اُنہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ میری خوش نصیبی ہے۔ آیئے تشریف لایئے اَتھتھی[1] کے چرنوں سے میرا چوکا[2] پوتر[3] ہو جائیگا"

اجنبی اور براہمن دونوں اندر گئے۔ ہندوستان میں اَتھتھی ستکار[4] کا رواج عام تھا۔ ششو پال کے لڑکے نے اجنبی کی خاطر مدارات کی۔ اجنبی اس پر لٹو ہو گیا۔ اُس نے براہمن سے کہا "آپ کا لڑکا نہایت کام کا آدمی ہے۔ اُسکی خدمت سے میرا جی خوش ہو گیا"

ششو پال نے اس طرح سر اٹھایا جیسے کسی نے سانپ کو چھیڑ دیا ہو۔ اور حقارت آمیز لہجے میں جواب دیا "تم ہمارے اَتھتھی ہو۔ ورنہ براہمن یہ الفاظ سُننے کی تاب نہیں رکھتے۔"

اجنبی نے اپنی غلطی پر نادم ہو کر کہا "معاف کیجئے۔ میرا یہ مطلب نہ تھا۔ مگر آج کل وہ براہمن کہاں ہیں؟ اب تو آنکھیں اُن کے لئے ترستی ہیں"

ششو پال نے جواب دیا "براہمن تو اب بھی ہیں۔ کمی صرف چھتریوں کی ہے"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا"

ششو پال نے ایک طُول طویل تقریر شروع کر دی جس کو سُن کر اجنبی حیران رہ گیا۔ اُن کی باتیں اس قدر مدلل اور جامع تھیں۔ کہ اجنبی پر رُعب طاری ہو گیا۔ اُسے یہ گمان تک نہ تھا۔ کہ اس چھوٹے سے گاؤں میں ایسا عالم متبحر بھی موجود ہو سکتا ہے۔ اُس نے ششو پال کی منطقانہ دلائل اور مسائل حکومت سے واقفیت دیکھ کر کہا "مجھے خیال نہ تھا کہ گودڑ میں لعل چھپا ہوا ہے مہاراج اشوک کو معلوم ہو جائے۔ تو آپ کو کسی عہدے پر متمکن کر دے"

[1] مہمان [2] باورچی خانہ [3] پاکیزہ [4] مہمان نوازی

ششوپال کے خشک لبوں پر مسکراہٹ آگئی ۔
جس کا دل کُڑھ رہا ہو جس کی آنکھیں اشکباری کر رہی ہوں جس کا دماغ پریشان ہو۔ اُس کے لبوں پر مُسکراہٹ ایسی خوفناک معلوم ہوتی ہے۔ جیسی کورستان میں چاندنی بلکہ اُس سے بھی زیادہ۔ ششوپال کی آنکھیں نیچے جُھک گئیں۔ اُنھوں نے تھوڑی دیر کے بعد سر اوپر اُٹھایا اور کہا۔" آجکل بڑی بے انصافی ہو رہی ہے۔ جب دیکھتا ہوں میرا خُون اُبلنے لگتا ہے"۔

اجنبی نے پہلو بدل کر جواب دیا۔" شیر بکری ایک گھاٹ پانی پی رہے ہیں"۔

"رہنے دو۔ میں سب جانتا ہوں"۔

"نقص نکالنا آسان ہے۔ مگر کچھ کر کے دکھانا مشکل ہے"

ششوپال نے آگ پر پڑے ہُوئے پتے کی طرح گرم ہو کر جواب دیا۔" موقعہ ملے تو دکھا دوں۔ کہ انصاف کسے کہتے ہیں؟"

"تو آپ موقعہ چاہتے ہیں؟"

"ہاں! موقعہ چاہتا ہوں"

"پھر کیا ہوگا۔ کیا کوئی بے انصافی نہ ہوگی؟

"قطعاً نہ ہوگی"۔

"کوئی مُجرم سزا سے محفوظ نہ رہیگا؟"

"نہیں رہے گا۔

اجنبی نے تحمل سے کہا۔" یہ بہت مشکل ہے"۔

"براہمن کے لئے بات کوئی مشکل نہیں میں انصاف کا ڈنکا بجا کر دکھا دوں گا"۔

اجنبی کے چہرے پر مُسکراہٹ تھی، آنکھوں میں چمک اُس نے ہنس کر جواب دیا" اگر میں اشوک ہوتا۔ تو آپ کا ارمان پُورا کر دیتا"۔

براہمن کے دل میں ایک شُبہ نے سر اُٹھایا۔ لیکن دُوسرے لمحہ میں وہ رفع ہو گیا۔ جس طرح ہوا کے تیز جھونکے ابر کو اُڑا کر لے جاتے ہیں۔

۲

دُوسرے دن مہاراج اشوک کے دربار میں ششوپال کی طلبی ہُوئی۔ اس خبر سے گاؤں بھر میں آگ لگ گئی۔ یہ وہ وقت تھا۔ جب مہاراج اشوک کی حکومت شروع ہُوئی تھی اور سخت گیری کی پالیسی کا آغاز تھا۔ اُس وقت مہاراج ایسے ظالم اور خونخوار تھے۔ کہ براہمنوں اور عورتوں کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا کرتے تھے۔ اُن کی نگاہِ غضب سے بہادروں کا پِتّہ بھی پانی پانی ہو جاتا تھا۔ لوگوں نے سمجھ لیا۔ ششوپال کے لئے یہ طلبی کا حکم پیامِ مرگ ہے اُن کو پُورا پُورا یقین تھا کہ اب ششوپال زندہ نہ لوٹیں گے۔ ششوپال کی بیوی اور لڑکے پر کوہِ الم ٹُوٹ پڑا۔ اور وہ پُھوٹ پُھوٹ کر رونے لگے لیکن ششوپال کے چہرے پر شکن نہ پڑی۔ وہ کہتے تھے جب میں نے کوئی قصور نہیں کیا۔ حکومت کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔ تو مُجھے کوئی پھانسی کیوں دینے لگا؟ بلاشبہ حکومت ایسی بے انصاف اور اندھی نہیں ہو سکتی۔ کہ بے قصور براہمنوں کو اذیت دینے لگے۔ رنج و الم کی لہروں کے درمیان میں وہ اس طرح خاموش

کھڑے تھے۔ جیسے سمندر میں چٹان۔

شام ہوگئی تھی۔ ششوپال پاٹلی پتر پہنچے اور شاہی محل میں لے جائے گئے۔ اس وقت تک اُن کو کسی بات کا اندیشہ نہ تھا۔ لیکن شاہی محل کی شان وشکوہ نے اُن پر ہیبت طاری کردی جس طرح اِنسان کم پانی میں مطمئن رہتا ہے۔ لیکن ذرا آگے بڑھ کر گھبرا جاتا ہے۔ اُن کے دل میں قسم قسم کے خیالات آنے لگے۔ کبھی سوچتے۔ کسی نے کوئی شکایت نہ کردی ہو۔ آزادی سے جوجی میں آتا ہے۔ کہدیا کرتا ہوں کہیں اس کا خمیازہ نہ اُٹھانا پڑے۔ کئی دشمن ہیں۔ کبھی سوچتے وہ اجنبی پتہ نہیں کون تھا؟ ہو سکتا ہے۔ کوئی جاسوس ہی ہو اور یہ آگ اُسی کی لگائی ہوئی ہو۔ تب تو اُس نے سب کچھ کہدیا ہوگا۔ کیسی حماقت کی۔ جو ایک ناواقف سے گھُل مل کر باتیں کرتا رہا۔ اب پچھتا رہا ہوں۔ کاش اُس وقت زبان پر قابو رکھتا۔ کبھی خیال آتا۔ شاید میرے افلاس کی کہانی یہاں تک پہنچ گئی ہو۔ اور مہاراج نے مجھے کچھ دینے کو بلا بھیجا ہو۔ یہ بھی تو ممکن ہے۔ اِس خیال سے دل کا کنول شگفتہ ہوجاتا۔ مگر پھر دوسرے خیال سے مُرجھا جاتا۔ اتنے میں نوکر نے کہا ”مہاراج آرہے ہیں“۔ ششوپال کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اُن کو ایسا معلوم ہُوا گویا جان لبوں تک آگئی ہو۔ حکومت کا کیسا رُعب ہوتا ہے؟ اِس کا پہلی بار تجربہ ہُوا۔ نگاہ دروازے کی طرف جم گئی۔ مہاراج اشوک شاہانہ انداز سے کمرے میں داخل ہُوئے۔ اور مُسکراتے ہُوئے بولے ”برہمن دیوتا! غالباً آپ نے مجھے پہچان لیا ہوگا“۔

ششوپال گھبرا کر کھڑے ہوگئے۔ اس وقت اُن کے جسم کا ایک ایک بال کانپ رہا تھا۔ وُہی چہرہ تھا۔ وہی آواز۔ ششوپال نے مہاراج کو چُبھتی ہُوئی نگاہوں سے دیکھا۔ شُبہ یقین ہوگیا۔ یہ وُہی تھے۔

۳

ہاں یہ وُہی تھے۔ ششوپال سنانٹے میں آگئے کیا سردی کی رات کو ایک براہمن کے ہاں پناہ لینے والا اجنبی ہند کا باوقار تاجدار ہو سکتا ہے۔ ششوپال نے فوراً اپنے جسم پر قابو حاصل کرلیا۔ اور کہا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ ہی مہاراج ہیں۔ ورنہ اس قدر آزادی سے گفتگو نہ کرتا“۔

مہاراج اشوک بولے ”ہوں“

”لیکن میری بات میں رتّی بھر مبالغہ نہ تھا“

”ہو سکتا ہے“

”میں ثبوت دے سکتا ہوں“

مہاراج نے کہا ”میں نہیں چاہتا“۔

”تو مجھے کیا حُکم ہوتا ہے“

”میں آپ کی آزمایش کرنی چاہتا ہوں“۔

ششوپال کے دل میں ایک خیال نے چٹکی لی کیا وہ سچ ثابت ہوگا۔ مہاراج نے کہا ”آپ نے کہا تھا کہ اگر مجھے موقعہ میسر ہو تو میں اِنصاف کا ڈنکا بجادوں گا۔ مَیں آپ کی اس باب میں آزمایش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تیار ہیں“۔

ششوپال نے مانسرو ور کے راج ہنسوں کے

مانند اپنی گردن بلند کی اور جواب دیا "ہاں۔ اگر مہاراج کی
یہی خواہش ہے تو میں انکار کی جُرأت نہیں کر سکتا۔"

"کل صبح تم وزیر عدالت مقرر کئے جاتے ہو۔ سارے
شہر پر تمہارا اختیار ہوگا۔"

"مہربانی۔"

"ہر ایک پاٹلی پُتر کا حاکم پولیس تمہارے ماتحت
ہوگا۔ اور تم اُسکے ذمے دار سمجھے جاؤ گے۔"

"بہت اچھا۔"

"اگر کوئی واردات ہوگئی۔ یا کہیں قتل ہوگیا۔
یا ڈاکہ پڑگیا۔ تو اِسکے جواب دہ تم ہوگے۔ بولو منظور ہے؟"

ششوپال نے خودداری کے انداز سے سر جُھکا
کر جواب دیا۔ ہاں منظور ہے۔"

مہاراج نے تھوڑی دیر تک سکوت کیا۔ اور
پھر ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر بولے "یہ شاہی انگوٹھی ہے۔
تم کل صبح کی پہلی شعاع کے ساتھ وزیر عدالت سمجھے جاؤ گے
میں دیکھوں گا۔ تم اپنے آپ کو کس طرح کامیاب ثابت کرسکتے ہو"

۴

ایک ماہ گذر گیا۔ وزیر عدالت کے انصاف و انتظام
کی چاروں طرف دُھوم مچ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ششوپال نے
شہر پر جادو ڈال دیا ہے۔ اور چور ڈاکوؤں کو اس طرح
قابو میں کرلیا ہے جس طرح سانپ کو بین سے سپیرا قابو میں کرلیتا ہے
اُن ایام میں لوگ دروازے کُھلے چھوڑ جاتے
تھے۔ لیکن کسی کا نقصان نہ ہوتا تھا۔ ششوپال کا انصاف
اندھا اور بہرا تھا۔ جو نہ شکل دیکھتا تھا۔ نہ سفارش سُنتا تھا
وہ محض سزا دینا جانتا تھا اور سزا بھی عبرت انگیز۔ شہر کی
حالت میں زمین آسمان کا فرق پڑگیا۔

رات کا وقت تھا۔ آسمان پر تارے کھیلتے تھے۔
ایک امیر نے ایک عالی شان مکان پر دستک دی۔ دریچہ
سے کسی عورت نے سر نکال کر پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں۔ دروازہ کھول دو۔"

"مگر وہ یہاں نہیں ہے۔"

"پروا نہیں۔ تم دروازہ کھول دو۔"

عورت نے نڈر ہوکر جواب دیا "میں نہیں کھولونگی۔
تم اس وقت جاؤ۔" امیر نے تلخی سے کہا "دروازہ
کھولدو۔ ورنہ میں توڑ دوں گا۔"

عورت بولی "تم جانتے نہیں شہر میں ششوپال کی
حکومت ہے۔ اب کوئی اس طرح کی سینہ زوری نہیں کرسکتا"

امیر نے تلوار نکال کر دروازے پر حملہ کیا۔ معاً
ایک پہرے دار نے آکر اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور کہا
"کیا کر رہے ہو؟" امیر نے اُس کی طرف اس طرح دیکھا
جس طرح بھیڑیا بھیڑ کو دیکھتا ہے۔ اور تندی سے بولا۔
"تم کون ہو؟"

"میں پہرے دار ہوں۔"

"تم کو کس نے مقرر کیا ہے؟"

"وزیر عدالت نے۔"

"غلطی نہ کرو میں اُسے بھی خاک میں ملا سکتا ہوں۔"

بہتر یہی ہے کہ تم ٹل جاؤ "

پہرے دار نے استقلال بھرے لہجہ میں جواب دیا۔

"لیکن اس وقت مہاراج اشوک بھی آجائیں تب بھی نہ ٹلونگا"

"کیوں موت کو بلا رہے ہو"

"مہاراج میں نے جو عہد کیا ہے اُسے پورا کرونگا"

"کس سے عہد کیا ہے ؟"

"وزیرِ عدالت سے "

"کیا ؟"

"یہی کہ جب تک زندہ ہوں اور جب تک خون کا آخری قطرہ میرے جسم میں باقی ہے۔ تب تک ادائیگیِ فرض میں کوتاہی نہ ہونے دونگا "

امیر نے تلوار نکال لی۔ پہرے دار نے پیچھے ہٹ کر کہا " آپ غلطی کر رہے ہیں میں نوکری پر ہوں "

مگر امیر نے سُنا ان سُنا ایک کر دیا۔ اور تلوار لے کر جھپٹا۔ پہرے دار نے بھی تلوار سونت لی۔ مگر وہ ابھی نیا تھا پہلے وار میں ہی گر گیا۔ اور جان بحق ہُوا۔ امیر کا خُون خشک ہوگیا۔ اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اُس کی خواہش نہ تھی کہ پہرے دار کو مار دیا جائے۔ وہ محض اُسے ڈرانا چاہتا تھا۔ لیکن زخم کاری لگا۔ امیر نے اُس کی لاش کو ایک طرف کر دیا۔ اور آپ بھاگ نکلا۔

۵

صُبح کو اس واقع کا گھر گھر چرچا تھا۔ لوگ حیران تھے کہ ایسی جرأت کیسے ہوگئی۔ کہ پولیس کے آدمی کو قتل کرے۔ اور پھر ششوپال کے عہدِ حکومت میں۔ دارالسلطنت میں سراسیمگی طاری تھی۔ پولیس کے آدمی چاروں طرف دوڑتے پھرتے تھے۔ گویا یہ اُن کی زندگی اور موت کا سوال تھا۔

وزیرِ عدالت نے تفتیش میں دن اور رات ایک کر دیا۔ یہ واردات اُن کے عہدِ وزارت کا پہلا واقعہ تھا۔ اُن کو کھانا پینا فراموش ہوگیا۔ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی۔ دل سے چین۔ قاتل کا سُراغ لگانے کے لئے اُنہوں نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کر دیں۔ لیکن اُن کی تمام محنت تمام جُستجو۔ سعیِ بے سُود ثابت ہوئی۔ جیسے کوئی پانی بلوتا رہا ہو۔

ناکامی کا ہر ایک دِن اشوک کے غُصّے کو زیادہ مشتعل کر رہا تھا۔ وہ کہتے تم نے کس طمطراق سے اِنصاف کا دعوےٰ کیا تھا۔ بولو اب کیا ہوگیا۔ وزیرِ عدالت سرِ ندامت جُھکا لیتے۔ مہاراج کہتے قاتل کب تک گرفتار ہوگا۔ وزیرِ عدالت جواب دیتے۔ کوشش کر رہا ہوں۔ عنقریب پکڑ لوں گا۔ مہاراج ہر روز پوچھتے قاتل گرفتار ہُوا۔ وزیرِ عدالت کہتے نہیں۔ مہاراج کا غصہ بھڑک اُٹھتا۔ اُن کی آنکھوں سے آگ کی چنگاریاں نکلنے لگتیں وہ بادل کی مانند گرج کر کہتے " میں یہ متواتر نہیں نہیں سُن کر تنگ آگیا ہوں "

اِسی طرح ایک ہفتہ گذر گیا مگر قاتل کا سراغ نہ مِلا۔ مہاراج اشوک نے ششوپال کو بُلا کر کہا " تمہیں تین دن کی مُہلت دی جاتی ہے۔ اگر اس عرصہ میں بھی قاتل

گرفتار نہ ہُوا تو تمہیں پھانسی دیدی جائیگی "

اس خبر سے شہر میں ہلچل سی مچ گئی ایک ماہ کے قلیل عرصہ ہی میں ششو پال عوام میں ہردلعزیز ہو چکے تھے۔ اُن کے اِنصاف کی چاروں طرف دھاک بندھ گئی تھی۔ لوگ مہاراج کو گالیاں دینے لگے۔ جہاں چار آدمی اکٹھے ہوتے اِس موضوع پر گفتگو شروع ہوجاتی۔ وہ چاہتے تھے کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے۔ مگر ششو پال کا بال تک ٹیڑھا نہ ہو ششو پال خود سرگرمی سے تحقیقات میں مصروف تھے۔ اور اتنا ہی نہیں پولیس کا تمام عملہ دل و جان سے کوشش کر رہا تھا۔ مگر بے کار۔ یہاں تک کہ تیسرا دن آگیا۔ اب صرف چند گھنٹے باقی تھے۔ رات کا وقت تھا۔ ششو پال کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ شہر کے اُس گنجان آباد حصّہ میں گھوم رہے تھے۔ جہاں یہ واردات ہُوئی تھی۔ یکایک ایک مکان کے دریچہ سے ایک عورت نے جھانک کر باہر دیکھا چاروں طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ عورت نے آہستہ سے کہا "تم کون ہو؟ پہرے دار" تاریکی یاس میں شعاعِ امید دکھائی دی۔ ششو پال نے جواب دیا "نہیں میں وزیر عدالت ہوں"

"ذرا یہیں ٹھیرو"

عورت کھڑکی سے غائب ہوگئی۔ اور روشنی لے کر دروازے پر نمودار ہُوئی۔ وزیر عدالت کو ساتھ لے کر وہ اپنے کمرے میں گئی۔ اور اُن کو ایک چوکی پر بٹھاکر بولی "آج آخری رات ہے" وزیر عدالت نے پُرمعنی نگاہوں سے عورت کی طرف دیکھا۔ اور جواب دیا "ہاں آخری"

آواز میں یاس تھی، الفاظ میں حسرت۔ عورت تلملاکر کھڑی ہوگئی۔ اور بولی "میں اس واردات سے واقف ہوں"

ششو پال کے مُردہ قالب میں جان زار آگئی۔ اطمینان کی سانس لے کر بولے "کہو"

"رات کا وقت تھا۔ قاتل نے اس مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ وہ یہاں اکثر آتا رہتا ہے"

"مگر کیوں"

"اُس کا چال چلن درست نہیں"

"پھر۔ آگے"

"میں نے جواب دیا۔ جس کے پاس تم آئے ہو۔ وہ یہاں نہیں ہے۔ مگر اُس نے اسے غلط سمجھا۔ اور دروازہ توڑنے پر مُصر ہُوا۔ پہرے دار نے اُسے روکا اور اُسی کے ہاتھ سے مارا گیا"

وزیر عدالت نے پوچھا "مگر قاتل کون ہے"

عورت نے اُن کے کان میں کچھ کہا۔ اور سہمی ہُوئی کبوتری کی مانند چاروں طرف دیکھا۔ ششو پال جوش سے تن کر کھڑے ہو گئے *

۶

صُبح ہُوئی۔ دربار میں تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی آج وزیر عدالت کی قسمت کا فیصلہ ہونے کو تھا۔ اشوک نے تخت پر پاؤں رکھتے ہی کہا "وزیر عدالت کو حاضر کرو" ششو پال سامنے آئے۔ اس وقت اُن کے

چہرے پر سکون تھا۔ مہاراج نے پوچھا "قاتل کا پتہ لگا؟"
وزیرِ عدالت نے حوصلہ مندی کے انداز سے
جواب دیا "ہاں لگ گیا۔"
"حاضر کرو۔"
وزیرِ عدالت نے سر جھکا کر کچھ سوچا۔ بظاہر انکے دل میں
اسوقت دو مخالف طاقتوں کی جنگ ہو رہی تھی۔ چہرے کا رنگ
اسکی شہادت تھا لیکایک انہوں نے مضبوط قوتِ ارادی سے سر
اٹھایا۔ اور اپنے ایک افسرِ اعلیٰ سے مخاطب ہو کر کہا "رن بیر۔"
"شریمان جی۔"
"گرفتار کر لو۔ میں حکم دیتا ہوں۔"
اشارہ مہاراج کی طرف تھا۔ دربار میں سناٹا چھا گیا۔
مہاراج کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔ گویا تپا ہوا تانبا ہو۔
آنکھوں سے غصّے کے شرارے نکلنے لگے۔ وہ تلملا کر بولے۔
"گستاخ! یہ کیا کہہ رہے ہو؟"
وزیرِ عدالت نے ایسا ظاہر کیا۔ گویا یہ الفاظ سنے ہی
نہیں۔ اور اپنے الفاظ کا پھر اعادہ کیا "میں حکم دیتا ہوں۔ گرفتار کرلو"
رن بیر پتلی کی مانند آگے بڑھے۔ درباریوں کے سانس
رک گئے۔ مہاراج تخت سے نیچے اتر آئے۔ وزیرِ عدالت نے
کہا "یہ قاتل ہے۔ میری عدالت میں حاضر کرو۔"
نظارہ وزیرِ عدالت کی کچہری میں منتقل ہوا۔ وہاں سارا
شہر جمع تھا۔ ششوپال نے حکم دیا "مجرم شاہی خاندان سے ہے
اس لئے اکیلا حاضر کیا جائے۔"
مہاراج اشوک نے اشارہ کیا۔ وزرا پیچھے ہٹ گئے
اور اس جنگلے میں کھڑے ہو گئے جو ملزموں کے لئے مخصوص تھا
تاجِ شاہی کی اسکی اپنی مملکت میں اسکے اپنے نوکر کے ہاتھوں یہ
توقیر(؟) ہو سکتی ہے۔ اسکی کسی کو امید نہ تھی لیکن ششوپال
آہنی ارادے سے کرسیِ عدالت پر متمکن تھے۔ انہوں نے آنکھ کے
اشارے سے مہاراج کو بے نام کیا۔ ہاتھوں کو انصاف کی گرفت نے
باندھ رکھا تھا۔ وہ آہستہ سے بولے "تم پر پہرے دار کے قتل کا
الزام ہے۔ تم اس کا کیا جواب دیتے ہو؟"
مہاراج اشوک نے ہونٹ کاٹ کر جواب دیا "وہ گستاخ تھا۔"
"تو تم جرم کا اقبال کرتے ہو؟"
"ہاں میں نے اسے قتل کیا ہے۔ گو میرا ارادہ نہ تھا۔"
"وہ گستاخ نہیں تھا میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں۔"
"وہ گستاخ تھا۔"
"تم جھوٹ بولتے ہو میں تمہارے قتل کا حکم دیتا ہوں"
اشوک کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وزیروں نے تلواریں
نکال لیں بعض آدمی ششوپال کو گالیاں دینے لگے۔ بعض نے یہانتک
کہہ دیا "وزیرِ عدالت پاگل ہو گیا ہے۔" ایک آواز آئی "تم اپنا سر
بچاؤ۔" اشوک نے ہاتھ اٹھا کر خاموشی کا اشارہ کیا۔ چاروں
طرف پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ وزیرِ عدالت نے کڑک کر کہا "آپکا
غصّہ سراسر ناواجب ہے۔ میں اس وقت وزیرِ عدالت کی کرسی پر
ہوں۔ اور انصاف کرنے بیٹھا ہوں۔ مہاراج اشوک کی دی ہوئی
یہ انگوٹھی میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی نے شور و شر کیا۔ تو
میں اس کو چن چن کر تحقیرِ عدالت کے جرم میں سزا دونگا۔"
اسکے بعد انہوں نے پھر اشوک سے خطاب کیا "اشوک!

تم نے رعایا کے ایک فرد کو قتل کیا ہے۔ میں تمہارے قتل کا حکم دیتا ہوں۔" مہاراج نے سر جھکا دیا۔ اس وقت اُنکے دل میں روحانی سرور کا سمندر لہریں مار رہا تھا۔ یہ شخص سونا ہے جو آگ میں پڑ کر کُندن ہو گیا ہے۔ کہتا تھا میرا انصاف اپنی دھوم مچا دیگا۔ وہ قول جھوٹا نہ تھا۔ اُس نے اپنے الفاظ کی لاج رکھ لی ہے۔ ایسے ہی شخص ہوتے ہیں۔ جن پر قومیں فخر و ناز کرتی ہیں اور اپنے دل و جگر قربان کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ اُنہوں نے ایک عجیب انداز سے سر بلند کیا۔ اور بے پروائی سے کہا۔ "میں اس حکم کے خلاف کچھ نہیں بول سکتا۔"

وزیر عدالت نے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ سونے کا ایک بُت لے کر حاضر ہُوا۔ وزیر عدالت نے کھڑے ہو کر کہا۔ "صاحبان! یہ درست ہے کہ مَیں وزیر عدالت ہوں۔ یہ بھی درست ہے کہ میرا کام انصاف کرنا ہے یہ بھی درست ہے کہ رعایا کے ایک آدمی کا قتل کیا گیا ہے۔ اُس کی سزا لازمی ہے۔ لیکن شاستروں میں راجہ کی ذات مقدس تسلیم کی گئی ہے۔ اُسے ایشور ہی سزا دے سکتا ہے۔ یہ کام وزیر عدالت کے احاطۂ طاقت سے باہر ہے۔ اس لئے میں حکم دیتا ہُوں۔ کہ مہاراج کو تنبیہ کرنے کے بعد رہا کر دیا جائے۔ اور اُن کے اِس بُت کو پھانسی پر لٹکا یا جائے۔ تا کہ لوگوں کو عبرت ہو۔"

وزیر عدالت کی جے کے نعرے بلند ہُوئے۔ لوگ اس انصاف پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ کہتے تھے یہ آدمی نہیں دیوتا ہے۔ جو نہ شخصیت سے خائف ہوتا ہے۔ نہ طاقت کے آگے گردن خم کرتا ہے۔ ضمیر کی آواز سُنتا ہے اور اُس پر بلا دھڑک بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اور کوئی ہوتا تو مہاراج کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔ لیکن اس نے اُنہیں "تم" کہہ کر مخاطب کیا ہے گویا کوئی معمولی مجرم ہو۔ اُن کو ذہنی کیف کا احساس ہُوا۔ ہزاروں آنکھوں نے خوشی کے آنسو بہائے۔ ہزاروں زبانوں نے پُرشور نعرے لگا کر کہا۔ "وزیر عدالت کی جے۔"

رات ہو گئی تھی۔ وزیر عدالت شاہی محل میں پہنچے اور اشوک کے سامنے انگوٹھی اور مہر رکھ کر بولے۔

"مہاراج! یہ اشیاء آپ سنبھالیں میں اپنے گاؤں میں واپس جاؤں گا۔"

اشوک نے احترام کی نگاہوں سے اُسے دیکھ کر کہا۔ "آج آپ نے میری آنکھیں کھول دی ہیں اب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"مگر شریمان . . . . . ."

اشوک نے بات کاٹ کر کہا۔ "آپ کی جراٴت تاریخ ہند میں یادگار رہیگی۔ یہ بار آپ ہی اُٹھا سکتے ہیں۔ مجھے دوسرا کوئی اس عہدے کے قابل نظر نہیں آتا۔"

وزیر عدالت لاجواب ہو گئے۔

سُدرشن

خیالات

تیرے لئے وہی اچھا ہے جو تیرا خدا تجھے دے!

اُس کی بخششوں کا انحصار کچھ احسان پر نہیں بلکہ محبت پر ہے! ماں اپنے ننھے کو وہی چیز دیتی ہے جو اُس کی سچی خوشیوں کی کفیل ہو۔ وہ اپنی خوشی کو اپنے ننھے کی راحت کے ساتھ وابستہ کر دیتی ہے اور اُسی کی معصوم اُلفت کو اپنی بے لاگ محبت کی تنہا جزائے خیر سمجھتی ہے!

تیرے خدا نے جس روز تجھے پیدا کیا اُس کا مقصد تیری ہی گردن کو بارِ احسان سے جھکانا نہ تھا بلکہ یہ کہ تو اُس کی دُنیا میں ایک بیکس بچے سے جو انسانوں کی بستی میں اوروں کے لئے ایک ربانی پیغام لے کر آتا ہے ایک توانا جوان بن جائے جو اُس کی ہمہ گیر قوت کو عالمِ ہستی کی ہر شئے میں آشکار دیکھے اور اُس سے پیار کرے!

جو تیرا خدا تجھے دیتا ہے وہی تیرے لئے اچھا ہے! تو اُس کے پُرخلوص ہاتھوں سے ہر اُس چیز کو جو وہ تجھے دے شکریہ کے ساتھ لے لے اِس لئے نہیں کہ تیرا اظہارِ امتنان تیرے آقا کے لطف وکرم کو مطمئن کر دیگا یا تیری احسانمندی اُسکی قابلیتِ عمل کو کسی صورت میں تقویت دے سکتی ہے۔ اُسکی قوتِ عمل اعترافِ کارکی حاجت مند نہیں، اُس کا قدوم خیر مقدم کی آرزو نہیں رکھتا، وہ متمنی نہیں کہ اُسکی مخلوق اُس کے سامنے سرِ نیاز خم کئے رہے! وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ تیری ترستی آنکھیں اُس کے جلوے سے سیراب ہوں اور تیرا دل اُس کی رحمتوں سے تسکین پاکر دُنیا کے رنج و راحت سے روز و شب مضطرب نہ رہے! اور یہ اِس لئے کہ اُس کی بخششوں کا انحصار کچھ احسان پر نہیں بلکہ بے لاگ محبت پر ہے!

تیرا خُدا جب تجھے تکلیف دیتا ہے تو اِس لئے نہیں دیتا کہ اُسے اِس بات میں راحت حاصل ہوتی ہے یا اس لئے کہ اس کی خوشیوں کا ذخیرہ کچھ کم ہو جاتا ہے! — اُس نے تو طرب وانبساط کی لہریں

کو کائنات کے رگ و پے میں دوڑا دیا ہے۔ اور جب کوئی وجود متفکر نظر آتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ تیرا آقا رنج و آلام کو عمداً اُس پر نازل کرتا ہے بلکہ خود اُس وجود کے ناکردنی اعمال ہی افکار ہستی سے ہمکنار ہو جاتے ہیں! دُنیا کی ہر شئے وہ اچھی ہو یا بُری اُس کا سرچشمہ وہی ربّ ذو الجلال ہے اور مصائب دہر بھی اُسی قسّامِ ازل کے تابع فرمان ہو کر تجھ تک پہنچتے ہیں لیکن اُسی وقت جب تیرے اپنے عمل ان آہنی آلات کو مقناطیسی قوت سے اپنی طرف کھینچ لیں! اور یاد رکھ کہ ان کے اتّصال سے جو تصادم تیرے نفس کو پہنچتا ہے۔ وہ تیری رُوح کے لئے محرّکِ خیر ہے! ۔ وہ تیری قوتِ ارادی ہی تھی جو تجھے جادۂ عصیاں پر لے گئی لیکن اِس کے باعث جو زحمت و ندامت تجھے اُٹھانی پڑی وہ تیرے لئے تیرے خالق کی طرف سے اک سودمند ہدیہ ہے! تُو باہیں پھیلا کر اُس کی سمت دوڑ اور اپنے بیقرار ہاتھوں سے اِس بیش بہا تحفے کو لے لے!

تیرا خدا تمام حاجات سے بالاتر اور کُل اغراض سے پاک ہے! اُس کی نیکیاں لاانتہا ہیں اور اُس کے انعامات کا خزانہ کبھی ختم نہیں ہوتا! ۔ زندگی عالمِ بالا کا عطیہ اور خواہش دُنیائے اسفل کا تحفہ! خواہش تیری زندگی کو اس دُنیا میں لائی تھی اور خواہش ہی کارزارِ دُنیا میں تجھے کشاں کشاں لئے پھرتی ہے لیکن تیرا اُمد علائے حیات سرابِ خواہشات کے عقب میں آوارہ و سرگرداں رہنا نہیں بلکہ مٹی میں مٹی ہو کر اُسی وجودِ لازوال میں جذب ہو جانا ہے جس سے تو رُونما ہُوا! ——— تو تیرے لئے وہ اچھا نہیں جس کی تو خواہش کرے تیرے لئے اچھا وہی ہے جو تیرا خدا تجھے دے!! تو خام تمناؤں کے پیچھے پڑ کر رنج و راحت کی کشمکش میں اپنے نازک وجود کو پُرزہ پُرزہ نہ ہو جانے دے، تو اپنے ذکی الحس دل کو مظالمِ جذبات کی برق پاشیوں سے پارہ پارہ ہونے سے بچا لے اور اُسے اُس خاموش وادی میں لے چل جہاں کی لطیف ہوائے سرور حیاتِ جاوید کا سامانِ بقا بہم پہنچاتی ہے اور نفسِ انسان کو دُنیا کی پست ہوسوں سے بے نیاز کر دیتی ہے؟

بشیر احمد

محفلِ ادب

شعروشاعری اور سائینس - لٹریچر کو دو حصوں میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ ایک شعروشاعری دوسرے سائنس شعروشاعری میں تخیل کی حکومت ہے۔ دُنیائے سائنس میں دلیل کا سکہ چلتا ہے۔ ناول اور ناٹک شاعری کی قلمرو میں پھلتے پھولتے ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمری سائنس کے ذیل میں شامل ہیں۔ شاعری کا میدان اندرونی خیالات ہیں۔ سائنس کی بنیاد بیرونی صداقتوں پر رکھی جاتی ہے۔ درخت سے پھل ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ سائنس دان اسے صاف طور پر دیکھتا ہے اور نتیجہ کتاب میں نوٹ کرتا ہے۔ مگر انسان کیسے عروج حاصل کرتا ہے۔ اور کن غلطیوں کے باعث اس کا عروج تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اسے دیکھنا سمجھنا اور پھر دوسروں پر واضح کرنا تخیل کا کام ہے۔ سائنس دان کا نظریہ دُنیا فوراً تسلیم کرلیتی ہے۔ لیکن جب کوئی باکمال شاعر جذباتِ اندرونی کا کوئی راز حاصل کرلیتا ہے اور اُسے دُنیا کے سامنے پیش کرتا ہے۔ تو لوگ اُسکی صداقت میں شبہ کرنے لگتے ہیں —— حالانکہ تخیل کا سنگِ بنیاد ہمیشہ صداقت ہوتا ہے ۔

سرسوتی الہ آباد (ہندی)

بجھا ہوا چراغ - آہ! میرا چراغ بجھ گیا۔ اب میں کیا کروں؟

دُنیا بھر میں روشنی ہو رہی ہے۔ لیکن مجھ بدنصیب کے آنگن میں گہری تاریکی چھائی ہے۔ میں اپنے دل کو کس طرح تسلی دوں؟

میری سکھیاں اپنے کمروں میں آرام کی نیند سو رہی ہیں اور اُن کے سرہانے کافوری شمعیں روشن ہیں۔ کیا اُن کو یہ خیال نہیں رہا۔ کہ میں تاریکی میں بجھا ہوا چراغ ہاتھ میں لیکر بھٹک رہی ہوں۔ اور اُن کے دروازوں پر جاتے ہوئے ڈرتی ہوں کہ وہ مجھ پر خفا نہ ہو جائیں۔

میرا راستہ تاریک ہے، اور اُس پر کسی مسافر کے قدموں کی آواز سُنائی نہیں دیتی۔ کون ہے؟ جو میرے بجھے ہوئے چراغ کو جلانے کی پروا کرے۔

پربھا کانپور (ہندی)

نوزائیدہ بچہ - معصوم نوزائیدہ بچہ چارپائی پر پڑا سو رہا ہے۔ اور اُس کی ماں کی لاش گھاٹ کے کنارے آگ کے شعلوں کی نذر ہو رہی ہے۔

وہ کس قدر بے بس ہے۔ زندگی کا طوفان اُسے مٹانے کے لئے بادل کے مانند گرجتا ہوا قریب تر آرہا ہے یکایک بچہ کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور وہ بھوک سے

بیتاب ہوکر چیخنے، چلانے، اور شور مچانے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ پاس کھڑی ہوئی عورتوں کے دل پگھل جاتے ہیں اور وہ مضطربانہ انداز سے بچے کو گلے سے چمٹاکر اشکباری کرنے لگتی ہیں

اُس وقت اُن پر اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے۔ کہ بے بس بچہ نہیں جو انہیں ہونٹ بسورنے سے قابو میں کرسکتا ہے بلکہ وہ خود ہیں۔ جو دل میں محسوس تو کرتی ہیں، لیکن بچے کے لئے کچھ نہیں کرسکتیں۔

بھارت ورش (بنگالی)

عالم بے بسی۔ ایک عورت تھی، جو نہایت حسین تھی اُس کی آنکھیں سوتے وقت بھی مسکراتی رہتی تھیں۔

وہ جس محفل میں جاتی تھی، اپنے حُسن کے جادو سے اُسے زیروزبر کردیتی تھی۔ جس آدمی کو چاہتی تھی تسکین قلب سے محروم کردیتی تھی۔

ایک دن مکڑی کا جالا ٹوٹ گیا۔ اُس نے اپنی بہترین کوششیں صرف کردیں۔ لیکن جالے کے تار نہ جُڑسکے۔

اس کے بعد اُس کا آئینہ ٹوٹا۔ اور اُس کا روپہلی سایہ فضا میں گم ہوگیا۔ اُس نے اُس کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اُٹھائے لیکن ہر دفعہ ناکام رہی۔

اُس کے قریب کوئی متنفس نہ تھا۔ لیکن اپنی بے بسی پر اُسے اس قدر رنج ہوا۔ کہ اُس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اُس نے اس رنج کو ایک پُر لطف نغمہ میں غرق کرنا چاہا۔ لیکن اُس کی انگلیوں اور آواز دونوں نے جواب دیا۔

مغرور حسینہ بے بس ہوکر صوفہ پر گرگئی۔ اور گرم گرم آنسو اُس کے رُخساروں پر بہنے لگے۔

پوسٹری (شکاگو)

دُنیا کی اہم ترین ضرورت۔ ہم نے اہلِ دماغ اصحاب سے سوال کیا تھا۔ کہ اُن کے خیال میں اس وقت دُنیا کو سب سے زیادہ کس شے کی ضرورت ہے اس کے جواب میں جو خطوط موصول ہوئے ہیں۔ اُن میں سے بعض یہ ہیں:۔

۱۔ دُنیا کو اسوقت جس شئے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ جوش و سرگرمی ہے اگر اسکی طرف توجہ نہ دی گئی۔ تو دُنیا بہت جلد تباہ ہوجائیگی۔

۲۔ دُنیا کو اسوقت جس شئے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ایک ایسا ہوائی جہاز ہے جو نہایت آہستہ آہستہ زمین پر اُتر سکے اور جسکے ٹوٹنے کا اندیشہ نہ ہو

۳۔ دُنیا کو اسوقت روحانی ارتقا کی ضرورت ہے اور اس میں دُنیا کا آئندہ امن مضمر ہے

۴۔ دُنیا کی سب سے بڑی ضرورت امن ہے۔

۵۔ دُنیا کو امن و آزادی اور پریشانی سے نجات کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

۶۔ میرے خیال میں اسوقت دُنیا کی اہم ترین ضرورت یہ ہے۔ کہ اسکی بڑھتی ہوئی آبادی کو جنگ، قحط سالیوں اور وبائی امراض سے کم کردیا جائے۔

۷۔ ایندھن دن بدن کم ہورہا ہے اور دُنیا پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ اس کا نعم البدل پیدا کرو۔

۸۔ لوگ تقدیر کے خلاف بغاوت کررہے ہیں اُنکو اس امر کا یقین ہونا چاہیے کہ ہمارے لئے کونسا پروگرام مرتب کیا گیا ہے۔

۹۔ دنیا کو اس وقت صرف ایمان کی ضرورت ہے۔

سُدرشن ٹٹ بٹس (لندن)

حصۂ نظم

بربطِ دل

اے حریمِ شہود کی زینت!
کعبۂ ہست و بود کی زینت
خانقاہِ وجود کی زینت
اہلِ معنے کی جانماز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

فلسفی تجھ پہ فخر کرتے ہیں
متقی تجھ پہ فخر کرتے ہیں
رند بھی تجھ پہ فخر کرتے ہیں
شاعروں کی متاعِ ناز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

زمزمہ تیرا سر بسر قم ہے
زیر و بم میں حیاتِ مردم ہے
تیرا نغمہ ترا تبسم ہے
طبعِ محمود ہے ایاز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

تیرے نغموں میں احترام کی روح
تیرے شیون میں ہے دوام کی روح
ہے فقط تیری روح کام کی روح
مخزنِ راز خود بھی راز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

تجھ کو مضرابِ غم سے نسبت ہے
تجھ کو محبوب سوز کی گت ہے
تیرا نالہ نہیں قیامت ہے
غم کے پردے میں پر گداز ہے تو
بربطِ دل عجیب ساز ہے تو

امین

ترانۂ حمد

اے داورِ مہر و ماہ و اختر!
اے نکہتِ حسن و مشکِ سارا!
اے تو کہ ہے عکس تیرا جاں سوز!
اے تو کہ کبھی نہ تجھ کو پائے!
تیرا ہے فلک زمیں ہے تیری
عالم کو کئے ہوئے ہے محصور

اے خالقِ جسم و جانِ مضطر!
اے قوتِ عشق و سنگِ خارا!
اے تو کہ جھلک تری دل افروز!
پائے بھی تو لوٹ کر نہ آئے
وہ شے نہیں جو نہیں ہے تیری
اور دیکھو تو خود نظر سے مستور

فطرت ہے ترے قدم کا مظہر
پانی میں تری روانیاں ہیں
گوہر کی چمک میں آب تیری
محسوس ہے سب کو تیری ہستی
لہروں میں خروش ہے کہ تو ہے

قدرت ہے ترے کرم کا منظر
مٹی میں تری نشانیاں ہیں
جوہر کی دمک میں تاب تیری
باطل بھی ہے محوِ حق پرستی
ساحل بھی خموش ہے کہ تو ہے

مالک ہے تو اور کریم بھی ہے
بیجاں تھے جو ان میں جاں ہے تجھ سے
بیباک جنہیں اماں ہے تیری
اٹھا جو ترے کرم کا طوفاں
دی نخل کو شاخ شاخ کو گل
صحرا کو نسیم بحر کو موج
رنگت سے کیا چمن کو معمور
خاموش تھیں پتیاں خزاں میں
رحمت کی تری گھٹا جو چھائی
لالہ بھی چمن میں رنگ لایا

قادر ہے مگر رحیم بھی ہے
پنہاں تھا جو سب عیاں ہے تجھ سے
شہ زور جنہیں تواں ہے تیری
جل بھن گئے باغ و راغ و میداں
گلشن کو شجر شجر کو بلبل
دریا کو خرام کوہ کو اوج
نکہت سے کیا فضا کو مخمور
ہو حق کا سماں تھا گلستاں میں
گلشن میں نئی بہار آئی
ظاہر ہے کہ تجھ کو دیکھ پایا

مجھ کو بھی دیا مرا مقدر
گر تو نہ جلائے اپنے دم سے
بے بس ہوں کہ تیری جستجو ہے
کس طرح بھلاؤں تجھ کو دل سے

سینے میں جو ہے یہ قلبِ مضطر
مر جاؤں میں زندگی کے غم سے
بیکس ہوں کہ تیری آرزو ہے
ہے ربط مجھے اس آب و گل سے

مدت سے یہ میری التجا ہے
دل میں مرے اپنی لو لگا دے
گر تجھ کو میں لمحہ بھر نہ دیکھوں
آنکھوں میں ہو میری نور تیرا!

راتوں کو یہی مری دعا ہے
کانوں کو پیامِ حق سنا دے
دنیا کو بھی اک نظر نہ دیکھوں
باتوں سے مری ظہور تیرا

زار

جذباتِ عالیہ

مرزا یاس لکھنوی

نیشِ درد و نوشِ درماں نتا بدہر دلے
زیست مشکل مرگ آساں نتا بدہر دلے

غمزۂ ناخواندہ مہماں نتا بدہر دلے
زحمتِ ہر رنگِ احساں نتا بدہر دلے

العطش اے ساقیٔ خمخانۂ غم العطش
نشۂ عیشِ پشیماں نتا بدہر دلے

دوزخِ خود را بہشتے سازم از اعجازِ عشق
جائے گل آتش بداماں نتا بدہر دلے

از خزاں آبادِ عالم خویش را در دیدہ ایم
رنگ و بوئے ایں گلستاں نتا بدہر دلے

در بہارِ پرخلش آسودہ نتواں زیستن
خار در پیراہنِ جاں برنتا بدہر دلے

تہمتِ راحت کشم در منزلِ واماندگی
پا بگل سر در گریباں نتا بدہر دلے

منزلِ موہوم مارا با بجولاں می برد
خاک بر سر سر بساماں نتا بدہر دلے

سجدہ تا صد سال بر خاکِ وطن نبود گراں
تکیہ بر دیوارِ زنداں نتا بدہر دلے

دست و پا گم گشتہ از اندیشۂ تعبیرِ بد
یادے از خوابِ پریشاں نتا بدہر دلے

بہرہ از عقل چو یابد فیضے از دیوانگی
پند پیر و سنگِ طفلاں نتا بدہر دلے

یاس امیدِ وفا از لکھنو فکرِ محال
در گروہِ نامسلماں برنتا بدہر دلے

مرزا اعجاز دہلوی

تلافی ظلم کی اچھی ستم ایجاد کرتا ہے
زبانِ مظلوم کی کٹتی ہے جب فریاد کرتا ہے

وہ مشقِ ناز کرتا ہے وہ دادِ حسن دیتا ہے
غلط ہے کون کہتا ہے کہ وہ بیداد کرتا ہے

نہیں اٹھتا ہے تیشہ بوالہوس کے ہاتھ سے لیکن
زباں سے ادعائے ہمتِ فرہاد کرتا ہے

عبث ہے نالہ گر طاقت نہیں منقار و بازو میں
قفس سے کب کسی کو یوں کوئی آزاد کرتا ہے

خبر گو دانہ پانی کی نہ لے پر لطف کیا کم ہے
کہ باتیں میٹھی میٹھی رات دن صیاد کرتا ہے

نہ ہو مغموم ہمدم یہ خدا کے کارخانے ہیں
کبھی آباد کرتا ہے کبھی برباد کرتا ہے

کوئی اعجاز یارانِ فراموشکار سے کہہ دے
جسے تم بھول بیٹھے ہو وہ تم کو یاد کرتا ہے

کیفی دہلوی

ہم نے اس عالمِ فانی کو تماشا جانا
ایک نیرنگیٔ آشوبِ تمنا جانا

دیر میں جا کے اگر جلوہ صنم کا دیکھا
اپنی تصویر کا ہم نے اسے چربا جانا

کس مپرسی کا حرم میں جو ذخیرہ پایا
خانہ بربادیٔ دل کا اسے خاکہ جانا

دل کے آئینہ میں عکسِ رخِ زیبا اترا
جو خیال آیا اسے خوابِ زلیخا جانا

ہم کو چھوٹا نظر آیا نہ یہاں کوئی بڑا
ذرۂ خاک کو ہم پایۂ ثریا جانا

دل کے ہوتے جسے آئینہ کی حاجت ہو اسے
محوِ دلبستگیٔ لطفِ تماشا جانا

طور پر حضرتِ موسیٰ نے جو کچھ دیکھا تھا
وہ بھی اک پتلیوں کا ہم نے تماشا جانا

اصلِ وحدت کی بنا ہے عدمِ غیریت
اس کا جب رنگ جما غیر کو اپنا جانا

یہ جو خواہش ہے کہ خواہش سے ملے آزادی
یہ بھی اک عشوۂ افسونِ تمنا جانا

جس کو تم کہتے ہو موت اس کو میں سمجھا ہوں وصال
دمِ شمشیر کو میں نے دمِ عیسیٰ جانا

تیری جو بات ہے دنیا سے نرالی کیفی
سب برا کہتے ہیں جس کو اسے اچھا جانا

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگارِ علامۂ فضیلت آنریبل مسٹر جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم)

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

مرتبہ

میاں بشیر احمد بی اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لاء - ایڈیٹر (مرحوم)
مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

فہرستِ مضامین بابت ماہ اگست سنہ ۱۹۲۲

جلد ۲ — نمبر ۲

حصۂ نثر

حصۂ نظم

جذباتِ عالیہ

جہاں نما

عورتوں پر مظالم - رسالہ ماڈرن ریویو اپنی تازہ اشاعت میں رقمطراز ہے کہ ہندوستان اس وقت خاص حالات سے گذر رہا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ اس بیداری کے دور میں ہندوستانی سوچیں۔ کہ کیا اُن کو عورتوں کے ساتھ اپنے سلوک میں خوشگوار تبدیلی کرنیکی ضرورت نہیں؟ یہ امر واقعہ ہے۔ کہ جتنی عورتوں کی اموات ہندوستان میں ہوتی ہیں اُتنی اور کہیں نہیں ہوتیں۔ مہذب ممالک اُس پر چونک اُٹھتے ہیں۔ بنگال میں نوعمر لڑکیاں ساڑھیوں پر تیل چھڑک کر جل مرتی ہیں۔ اسکی وجہ کیا ہے ؟

مردوں کی بدسلوکی اور بے مہری !!

بہت سے مرد ایسے ظالم بھی ہیں۔ جو غریب عورتوں کی ناک کاٹ ڈالتے ہیں اور عمر بھر کیلئے اُنکی صورت بگاڑ دیتے ہیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے کہ ایسے بدکرداروں اور انسان صورت وحشیوں کو چار پانچ مہینے کی سزائے قید دیکر چھوڑ دیا جاتا ہے اسکے علاوہ عورتوں پر اور بھی قسم قسم کے ناگفتہ بہ مظالم کئے جاتے ہیں جو ہندوستان کی ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹ ہیں۔ ضرورت ہے۔ کہ ملک کے بہی خواہ اسکی طرف توجہ کریں۔ اور ملک کی حقیقی خدمت سرانجام دیں۔

چین کی تہذیب - لنڈن کے مشہور رسالہ ڈائل میں آنریبل برٹرینڈ رسل نے اس موضوع پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ میں اس وقت تک یہی فرض کئے ہُوئے تھا۔ کہ تہذیب کے لحاظ سے چین بہت پس اُفتادہ ملک ہے۔ لیکن تجربہ نے یہ خیال غلط ثابت کر دیا۔

جب ہم کسی چینی سے کہتے ہیں۔ کہ تم دُنیا کے تمدن کی طرف دیکھو۔ اور اُس سے اپنا مقابلہ کرو۔ تو وہ مشرقی سنجیدگی سے چندمنٹ کے لئے سکوت اختیار کرتا ہے۔ اور پھر جواب دیتا ہے کہ ہم اگر اپنے آپ سے مطمئن ہیں۔ تو اسکی ضرورت ہی کیا ہے۔ اور اگر نہیں ہیں۔ تو دُنیا خواہ تہذیب کے کسی نقطہ پر ہو۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔

میں چین میں چینیوں کو تعلیم دینے کی غرض سے گیا تھا۔ لیکن وہاں جاکر معلوم ہُوا۔ کہ مجھے وہاں سے بہت کچھ سیکھنا ہوگا۔ اور یہ میرا ہی نہیں۔ ہر ایک یوروپین کا جو وہاں کچھ عرصہ رہ چکا ہے۔ خیال ہے۔ چین میں بیرونی شان و شکوہ عنقا ہے۔ لیکن معصومیت، خوبصورتی، سادگی اور اطمینان قلب گوشہ گوشہ میں ملتے ہیں

ہُمایُوںؔ

جلد ۲ اگست ۱۹۲۲ء نمبر ۲

چاندنی رات میں

چاندنی رات میں، دامنِ پاک کے کنارے، جب چاند بکھرے ہوئے بادلوں کی جھلملیوں سے سوتی دُنیا کو اپنی صاف و سرد کرنوں کے ساتھ جھانک رہا ہو، بچپن کے گئے گذرے دنوں کی یاد تازہ ہوتی ہے!

برس گذر گئے، اسی جھیل کے کنارے، تاروں بھری رات میں، مجھے دُنیا میں اُسکی موجودگی کے ساتھ زندگی کا لُطف حاصل تھا جو اب چاند کی شکل میں، میری تاریک راتوں کو، اپنے نت نئے جلووں سے منوّر کئے ہُوئے ہے!

کتنے حسین و سادہ تھے طفلی کے وہ دن جب بہتی ندیوں کے کنارے تُو اور میں اے دوست! اپنے معصوم کھیل کھیلتے تھے، کاغذ کی ناویں بہاتے تھے، جب نسیمِ سحر کے مَس پر یا چڑیوں کے چہچہوں کو سُن کر ہم اک دوسرے کو دیکھتے تھے اور مُسکراتے تھے، ہم نہ جانتے تھے کیوں؟ ہم جاننا نہ چاہتے تھے کس لئے؟

ایسی تھی ہماری باہمی رفاقت، جو اب اِک خوابِ مطمئن کی طرح صرف چاندنی راتوں ہی میں یاد آتی ہے!

آہ! وہ دن کہاں گئے؟ وہ دوستی کیا ہوئی؟

مجھے تو اس بے ہنگامہ ساحل پر کشتی ڈالے مدتیں گذر چکی ہیں، نسیمِ صبح آتی ہے اور میں عرقِ شرم میں غرق ہو جاتا ہوں کہ ایسی ہی نرم و نازک خرام تھی میری طفلانہ اُلفت جسے میں نے کھو دیا! سُورج کی شعاعیں سطحِ آب پر اپنا اضطرابی رقص کرتی ہیں اور میں اپنے دست و پا میں اک بےچین حرکت کا آغاز محسوس کرنے لگتا ہوں کہ ایسا ہی روشن و بے تکلف تھا میرا کھیل کُود جسے میں نے اپنے ہاتھوں ضائع کر دیا!

اکثر جی میں آتا ہے کہ اِس ساکن کشتی کو جو ساکن پانی پر بیکار پڑی رہتی ہے توڑ پھوڑ کر دُور دُور کسی چنار کے ٹہنوں میں ایک معلّق جھونپڑا بنالوں اور اُسی میں روز و شب تنہا رہا کروں ۔۔۔ لیکن اُمید تیرا مُسکراتا چہرہ شبِ ماہ کے بادلوں میں مجھے دکھاتی ہے اور میرا دل لپک کر رہ جاتا ہے!

آ آفتاب کی رخصتی شعاعوں کے سنہری جادہ لرزاں پر اے دوست! اور شام و شفق کی دھندلی روشنیوں میں میری بیکار کشتی کو اپنے ننھے چپوؤں سے، اپنے بچپن کے ننھے خوشنما چپوؤں سے چلا اور مجھے بھی کھینے کا حکم دے کہ میں پھر دنیا کی اصلی زندگی کو اک نظر دیکھ لوں!

اُف! ظالم ہوا کوہ کے دامن سے دامن چھڑا کر پانی کی روانی کو چھوتی ہے گویا عصمت بندشوں کی سنجیدگی سے الگ ہو کر حسن کو پیار کرتی ہے اور چاندنی پہاڑ کی چوٹیوں پر پرتو افگن ہے یعنی انکسار رفعت سے ہم آغوش ہو کر میٹھی نیند سو رہا ہے!

پھولوں سے بھینی بھینی خوشبوئیں نکلتی ہیں اور پہاڑوں سے ہلکی ہلکی ہوائیں چلتی ہیں!!

فضا میں چاندنی، چاندنی میں نسیم، نسیم میں نکہت اور نکہت میں تیری محبت کی ہوش ربا کیفیتیں تیرتی پھرتی ہیں!!! ـــــ آہ! چاندنی رات میں کسی کاشمیری جھیل کے کنارے اپنے تئیں اک خوابِ سیمیں کے نذر کر دینے میں زندگی کا لطف ہے!

غرض کی دوستی اے دل! سورج کی عریاں روشنی میں چلتی پھرتی ہے لیکن محبت کی دوستی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ، صرف چاندنی کے سیمیں ملبوس ہی میں نظر آسکتی ہے، کیا میں اُس کھوئی ہوئی دوستی کو پا سکتا ہوں؟ وہ ننھی پتیوں کی طرح لہرانے والے نازک خیالات کیا پھر میرے بے تاب سینے میں موجزن ہو سکتے ہیں؟ نہیں نہیں! جب تک اپنے گم کردہ بچپن کو پھر نہ پالوں گا اُس کھوئی ہوئی دوستی کا خوابیدہ حسن نہ دیکھوں گا!

وہ معصوم وقت جب ہر شے مجھے حسن کی اک مورتی معلوم ہوتی تھی اس مخمورِ علم زمانے میں کیونکر واپس آئے جب سورج کی کرن کہیں میرے لئے ہر وجود کے نقائص ہی پر روشنی ڈالتی ہے!

ہاں! چاندنی راتوں میں، جب روشنی اک نیم وا کلی کی مانند، حقیقت کی تاریکیوں میں چھپی چھپی رہتی ہے باہمی رفاقت، چاند کی متین و منظوم نگاہوں سے جلوہ ریز ہو کر، دل کی سب سے پوشیدہ گہرائیوں میں اک ہلکا سا تموج پیدا کر دیتی ہے!

میں دل سے پوچھتا ہوں کہ "کیا میں دوست رکھتا ہوں"؟ وہ جواب دیتا ہے کہ "ہاں رکھتا ہے مگر یوں کہ کبھی وہ تجھ سے کچھ غرض رکھتے ہیں کبھی تو اُن سے کوئی مطلب"!

میں بھی اُن سے مطلب رکھتا ہوں! میں جو بے غرضانہ دوستی کا متلاشی رہتا ہوں مجھے بھی اپنی ہی غرض سے واسطہ ہے! ذلت ہو میرے لئے کہ اس روشن دنیا کی خودکامی کا سرچشمہ میرا ہی نفس ہے!

اے یادِ طفلی کے چاند! تو سیاہ بادلوں کے پیچھے چھپ جا! اے مہیب رات! تو اپنی تاریکی کا آنچل مجھ پر ڈال دے کہ میں خود پرستی کی نیند سو جاؤں!!

بشیر احمد

ادبیاتِ اردو

اور

ذوقِ عامہ

ادبیات کا صحیح ذوق خاص لوگوں کا حصّہ ہے۔ اس کا انحصار ادب کے اُن دقیق و لطیف محاسن کی تحسین پر ہے جن کے لئے علمی استعداد و ادبی معلومات کے علاوہ "دلِ گداختہ" کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ چونکہ ادب کا پیرایہ اظہار زبان ہے۔ اس لئے ذوقِ سلیم رکھنے کے لئے زبان داں ہونا شرط ہے۔ اس کے صرف یہی معنے نہیں کہ لُغات کے ایک ذخیرہ پر دسترس حاصل ہو۔ بلکہ محاورات و الفاظ کے صحیح مواقع۔ معانی کے نکات۔ فصاحت و بلاغت کے رموز غرضکہ زبان داں بننے کے لئے یہ سب کچھ لازم ہے۔ یہاں جُملہ معترضہ کے طور پر یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا علمِ لسان و علم ادب دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ اور اگر ایک نہیں۔ تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اس سوال کا شافی جواب تو بہت سی بحث و تشریح کا محتاج ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے۔ کہ جہاں تک علم النفس سے اس سوال پر روشنی پڑتی ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ادب و زبان دونوں کی ابتداء اظہارِ خیالات کی معاشرتی ضرورت سے ہُوئی ہے۔ بعض حکماء کا خیال ہے کہ غالباً کوئی ایسا زمانہ بھی گذرا ہے۔ جس میں نسلِ انسانی باہمی اظہارِ خیالات کیلئے زبان کی وساطت سے مستغنی تھی۔ اور بعض کا یہ خیال ہے کہ اب بھی خیالات کا ایک دماغ سے دوسرے تک زبان کے وسیلہ کے بغیر منتقل ہونا خاص حالتوں میں ممکن ہے۔ بہر حال اس مشکوک زمانہ سے قطع نظر کر لیا جائے۔ تو جہاں تک ہمارے موضوع کا تعلق ہے یہ سمجھ لینا کافی ہے کہ ادب و زبان دونوں خیالات کے مظہر ہیں۔ صرف فرق یہ ہے کہ جو کچھ زبان یا اُس کے نائب قلم سے ادا ہو۔ وہ لازمی طور پر ادب کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ ادبی درجہ اُس وقت حاصل ہو سکتا ہے۔ جب اظہارِ خیالات بعض شرائط سے مقید اور بعض

صفات سے متصف ہو۔ یہ صفات کچھ تو خیال کی نوعیت سے علاقہ رکھتی ہیں کچھ الفاظ اور اُنکے پیرایۂ استعمال سے۔ اور جب کوئی وسیع خیال موزوں الفاظ میں ادا ہوجاتا ہے۔ تو وہ دلکش و دل نشین بن جاتا ہے۔ اور ادبیات کے ذیل میں آجاتا ہے۔ اس حقیقت کو پہچاننا ذوقِ سلیم کا کام ہے۔ اور یہ ذوق اگرچہ زبان و خیالات دونوں کی تنقید کا مستلزم ہے۔ لیکن در اصل جیسا کہ اُس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ وہ ایک وجدانی کیف ہے۔ جو خاص آدمیوں ہی کو نصیب ہوتا ہے ؎

حسنِ فروغِ شمعِ سخن دُور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

ذوقِ سلیم کو تسلیم کر لینے کے باد جود اس امرِ واقعہ سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہر انسان میں بُرے بھلے کی کچھ تمیز ہوتی ہے۔ گو اُس تمیز کا معیار بہت مختلف ہے۔ اختلافِ معیار کی وجہ سے بعض مبصرین اس گمراہی میں پڑ گئے ہیں کہ حسن و تحسین کا کوئی معیار ہی نہیں۔ اور اُنہوں نے اُن صفات کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ جو ہر زمانہ اور ہر ملک میں قدرِ مشترک سمجھی جاتی ہیں۔ اُنکے قول میں صرف اتنی صداقت ہے کہ کسی حسین شے کے حُسن کو تجزیۂ صفات کے ذریعہ سے بیان کرنا قریب قریب ناممکن ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص یہ کہے کہ انسانی حُسن گورے رنگ پر موقوف ہے۔ اور اُس کے لئے سیاہ بال اور سیاہ آنکھیں بھی ضروری ہیں۔ تو یہ تعریف سب لوگوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ اور اس کی تردید چنداں دشوار نہیں۔ حسین شے وہ ہے جس میں حُسن ہو۔ جیسا کہ اچھا کام وہ ہے جو نیکی پر مبنی ہو۔ حُسن اور خوبی بجائے خود انوکھی صفتیں ہیں۔ جو اشیا میں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی ماہیت کو شناخت کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ لیکن اُس کو کسی خاص مجموعۂ صفات کے اندر مقید کرنا صحیح نہیں۔

جب یہ مان لیا گیا کہ ہر شخص میں بھلائی بُرائی کی کچھ نہ کچھ تمیز ضرور ہوتی ہے۔ تو یہ بھی سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں کہ علاوہ ذوقِ سلیم کے جو خواص کا حصّہ ہے۔ ہر زمانہ میں ایک ذوقِ عامہ بھی ہوتا ہے۔ جو بسا اوقات ذوقِ سلیم کا عکس اور بعض دفعہ اُس کا متضاد ہوتا ہے۔ یہ بھی اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ زمانۂ حال کا ذوقِ سلیم زمانۂ مستقبل کا ذوقِ عامہ بن جاتا ہے۔ اور

ذوقِ سلیم اپنے لئے کوئی دوسرا مسلک اختیار کر لیتا ہے۔ ذوقِ عامہ کا ادب پر ہر زمانہ میں کچھ نہ کچھ اثر پڑتا ہے۔ کیونکہ شہرتِ عام کی خواہش شاعر و ادیب کو عام مذاق کی پابندی کی ترغیب دیتی ہے اور یہ ترغیب اُس وقت اور بھی زیادہ قوی ہو جاتی ہے۔ جب ادیب کی معاش اپنے قلم کی پیداوار پر منحصر ہو۔ ایسے بھی ادیب و شاعر گذرے ہیں۔ جو اپنی خاص طبیعت کی وجہ سے ان ترغیبات سے ہمیشہ بالاتر رہتے ہیں۔ لیکن اُن کو کبھی تو افسردگی حسرت سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ ؎

بیا در ید گر اینجا بود سخندانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

اور کبھی اس خیال سے دل کو ڈھارس دینی پڑتی ہے کہ ذوقِ عامہ کے تغیر کے ساتھ اُن کے کلام کی قدر کی جائے گی ؎

ایں مے از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن
رونقِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شدن

اُردو زبان و ادب پر ذوقِ عامہ کا خصوصیت سے زبردست اثر پڑا ہے۔ کیونکہ یہ زبان جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ ابتداً صرف کاروبار اور معاملاتِ عام کے سرانجام دینے کے لئے وضع ہوئی تھی۔ اور جو ادبی لطافت اس میں اب موجود ہے۔ وہ مرورِ زمانہ کے ساتھ ادبی مذاق کے تغیرات کا نتیجہ ہے۔ گو اُس لطافت کا موجود ہونا ہی اس بات کی کافی شہادت ہے کہ اس زبان میں شروع سے خیالات و الفاظ کے اخذ و قبول کی اہلیت تھی۔ اور اس کا نتیجہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان و ادب اپنی ذاتی روشنی سے نہ سہی کم از کم دوسری زبانوں کے پرتو سے چاند کی طرح چمک رہے ہیں۔ تاہم ذوقِ عامہ کے ساتھ جو ایک خاص تعلق اُردو زبان کو ہمیشہ سے تھا۔ وہ اگر ایک طرف اُس کی ترویج و اشاعت کا باعث ہوا ہے۔ تو دوسری طرف ادبی حیثیت سے اُس کی ترقی میں حارج بھی ہوا ہے۔ اول تو اس زبان کی یہ بدقسمتی تھی کہ اس کی ادبی ترقی کی طرف ہندوستانی مسلمانوں کو (جن کی یہ اب قومی زبان بن گئی ہے) اُس وقت توجہ ہوئی جب اُن کا معاشرتی و ملکی انحطاط شروع ہو کر افسوسناک حد تک پہنچ چکا تھا۔ اور اُن کے دماغوں میں

وہ اُمنگیں اور جذبات باقی نہیں رہے تھے۔ جو قومی عروج کے دوران میں موجزن ہوتے ہیں۔ اُن کی ہمتِ مردانہ صحیح نصب العین سے منحرف ہو کر عیش کاری کی جانب مائل ہو گئی تھی۔ اور اُن کے اخلاق محض تکلفات کی صورت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مسلمانوں کی ادبی تربیت صرف دو زبانوں کے علمی خزائن کی رہینِ منت تھی یعنی عربی و فارسی۔ یہاں بھی بدقسمتی سے جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے بہ نسبت عربی کے فارسی کا اثر زیادہ پڑا۔ اور فارسی کے بھی اُس دور کا جب ایرانی قوم خود اُن سب عیوب و کمزوریوں میں مبتلا تھی۔ جو ہندوستانی مُسلمانوں سے منسوب کی جاتی ہیں۔ اکثر زبانوں کی تاریخ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نظم کا ارتقاء نثر کی ترقی سے قبل ہوتا ہے۔ اُردو زبان بھی اس کلیّہ کے ذیل میں آتی ہے۔ اور اُس کی ادبی ابتداء بھی نظم ہی سے ہُوئی ہے۔ اس زبان کے اوائلِ زمانہ کے کثیر شاعر اُردو کے علاوہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اور موخر الذکر کو اظہارِ خیالات کے لئے ارفع و برتر خیال کرتے تھے۔ مثال کے طور پر امیر خسرو کو لیجئے۔ اُن کا متین کلام سب کا سب فارسی میں ہے ہندی و ریختہ میں صرف اس قسم کی چیزیں ہیں جیسے پہیلیاں۔ انملیں۔ دوسخنیاں۔ جنہیں اُن کی روانیٔ طبع کا خس و خاشاک۔ یا شاعری کے اُبال کا اوپری جھاگ کہنا چاہیئے۔

میر و سودا کے زمانہ تک اُردو شاعری شعراء کے لئے صرف تفننِ طبع کے اظہار کا ذریعہ تھی۔ اور اُن میں سے اکثر اپنے دقیق و سنجیدہ خیالات کے لئے فارسی زبان کو زیادہ موزوں خیال کرتے تھے۔ یہ تعصب کم و بیش زمانۂ حال تک رہا۔ کیونکہ میرزا غالب جن کا زمانہ عصرِ حاضر سے بہت قریب ہے۔ فخر یہ کہتے تھے کہ

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بیرنگِ من است

ان جملہ اسباب کا جو ابھی بیان ہُوئے ہیں یہ نتیجہ ہُوا کہ ادبیات اُردو شروع ہی سے ذوقِ سلیم کی نسبت ذوقِ عامہ کی زیادہ پابند رہیں۔ اور یہ پابندی آج تک اُنکی بلند پروازی کو روک رہی ہے۔ شاعری غزل گوئی تک محدود ہو گئی۔ اور اگرچہ راقم الحروف کے نزدیک اصنافِ شاعری میں غزل کا پایہ بہت اونچا ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ

بعض دفعہ موزوں طبع اُس کی بندشوں سے اُکتا کر یہ کہنے پر مجبور ہوتی ہے کہ

بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

غزل کا نام ہی شہادت دیتا ہے۔ کہ اُس کا بہترین موضوع حسن وعشق کا بیان ہے چونکہ اُردو غزل گوئی کی بناء ایک ایسے زمانہ میں پڑی جو اخلاقی انحطاط کا زمانہ تھا۔ ذوقِ عامہ نے غزل میں عامیانہ عشق پر زیادہ انحصار کیا + اس مبتذل میلان کی ایک وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مسلمانوں نے اس زمانہ میں اور فنونِ لطیفہ کی جانب مطلق توجہ نہیں کی + علم النفس کے ماہرین کا خیال ہے کہ فنونِ لطیفہ انسان کے جذباتِ شہوانی کے لئے ایک بے ضرر اخراج کا پیرایہ مُہیا کرتے ہیں + اگرچہ مذہب اور فلسفۂ اخلاق کو اس خیال پر اصرار ہے کہ خلقتِ انسانی کا مدعا فرض کی ادائگی ہے۔ لیکن جہاں تک اُس کی جسمانی اور دماغی خلقت کا پتہ چلتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جسم و دماغ بعض خواہشات وتحریکات کا آماجگاہ ہے۔ جو ہر لحظہ اپنی تسکین وتشفی کے لئے بے چین رہتی ہیں + ہر عضو کے لئے ایک مخصوص لطف ہے جس کا وہ ہردم متلاشی رہتا ہے + نگاہ کو ذوقِ تماشا ہے۔ کان کو لطفِ آواز اور دیگر حواس کے لئے بھی اسی کے مانند اخذِ لطف کے پیرائے ہیں + فنونِ لطیفہ ان خواہشات وتحریکات کے لئے ایک مناسب ومفید طریقہ پر تسکین بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں + جب انسان فنونِ لطیفہ کی تربیت سے بہرہ ور نہیں ہوتا تو حواس کا لطف و ذوق بعض جذباتِ اسفل کے ساتھ وابستہ ہوجاتا ہے۔ اور اپنی تشفی کے مذموم ومخرب طریقے اختیار کر لیتا ہے + چونکہ اُردو زبان وادب کی ترویج ایسے زمانہ میں ہوئی جب فنونِ لطیفہ کا ذوق بالکل معدوم تھا۔ اس لئے غزل گوئی شہوت پرستی کا شکار ہوگئی۔ اور رکیک مضامین کی بندش سے بہترین شعراء کا کلام بھی نہ بچ سکا +

غزل کی جان معاملہ بندی ہے۔ لیکن معاملات ہر قسم کے ہوسکتے ہیں + میرا اعتراض صرف اُن معاملات کی بندش پر ہے جو عام طور پر اخلاق کے لئے ننگ وعار خیال کئے جاتے ہیں + بدقسمتی سے ہمارے شعراء کا بیشتر کلام اسی قسم کی معاملہ بندی سے لبریز ہے + اور یہیں اس بدنما

خصوصیت کو ذوقِ عامہ کی پیروی کا نتیجہ خیال کرتا ہوں۔ اُردو کے دورِ اول کے شعراء اپنی تمامتر توجہ زبان کی طرف صرف کرتے تھے۔ اُنکا مآل کار یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ریختہ میں رنگین خیالات کے اظہار کی صلاحیت پیدا کردیں۔ مضامین کی جانب وہ چنداں متوجہ نہ تھے۔ فارسی ادب میں شاعرانہ خیالات کا جو ذخیرہ پیشتر سے موجود تھا وہ ان نومشق اُردو شعراء کی طبع آزمائی کے لئے کافی ووافی تھا۔ میر و سودا شاید اُردو زبان کے پہلے شاعر ہیں۔ جنھوں نے علاوہ زبان کی درستی کے خیال آفرینی و جدتِ مضامین کی جانب توجہ وسعی کی۔ اور اُن کے کلام میں حقیقت و تخیل کے ایسے شاندار نمونے ملتے ہیں جن پر آج تک ہماری شاعری کا مدار ہے لیکن ذوقِ عامہ کے مسموم اثر سے میر و سودا بھی محفوظ نہیں رہے۔ اور یہ اثر اُن صفات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ جو ان شاعروں کے لئے مایۂ ناز خیال کی جاتی ہیں۔ میر کا کلام اپنے سوز و گداز۔ رقت و درد کے لئے مشہور ہے۔ سودا کی ہجو گوئی شہرۂ آفاق ہے۔ لیکن یہ سوز و گداز اور رقت و درد ایک حد تک اُس عیش پسندی و تن آسانی کے پروردہ تھے جو اُس زمانہ میں قوم پر چھاگئی تھی۔ اور یہ ہجو گوئی لبا اوقات اُن آدمیوں کا مضحکہ اُڑانے کے لئے استعمال کی جاتی تھی جو دراصل اپنے وقت کے بہترین افراد میں سے تھے۔ سودا نے حافظ رحمت خاں روہیلا سردار اور مولوی سید احمد صاحب بریلوی دونوں کی ہجو پیرایہ میں ہنسی اُڑائی ہے۔ حالانکہ اگر مورخانہ نظر سے دیکھا جائے تو اگرچہ اول الذکر کی حکمت عملی۔ اور موخرالذکر کا جوش مذہبی دونوں اعتراض سے خالی نہیں۔ تاہم اس میں شبہ نہیں کہ یہ دونوں شخص بلحاظ اپنے کمالاتِ ذاتی و اثر کے برگزیدہ و قابل احترام آدمیوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ مُسلمانوں کے مذہبی و قومی تنزل کا اس سے زیادہ اور کیا بیّن ثبوت ہوسکتا ہے کہ ایک مُسلمان شاعر مولوی سید احمد صاحب اور اُن کے مجاہد مقلدین کا ان بازاری الفاظ میں ذکر کرتا ہے:۔

ہرن کی طرح میدان وغا میں چوکڑی بھولے
اگرچہ تھے دُمِ شمسہ سے وہ شیرِ نیستانی

میر و سودا اور اُن کے معاصرین کے دور کے بعد اُردو شاعری کا دوسرا وسیع دور لکھنؤ

کی شاہی اور اُس کے تکلّفات و تصنّعات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس دَور کی شاعری درحقیقت اُس نوع کی تھی جس پر یہ تعریف صادق آتی ہے کہ "شاعری کارِ بیکاران است"۔ اِس میں شبہ نہیں کہ مصحفیؔ و انشاؔ کے ہم عصر شعراء نے زبان کے اعتبار سے بہت سی قابلِ قدر خدمات اُردو علم ادب کی سرانجام دیں۔ اُن کی رعایت لفظی سے قطع نظر کرکے جو بعض دفعہ مضحک حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ان شعراء نے اردو میں بلاغتِ معنوی پیدا کرنے کے لئے بھی کچھ کم سعی نہیں کی۔ لیکن ذوقِ عامہ کا اثر پھر مضرت و خرابی کی جانب مائل تھا۔ اور اس کی سب سے زیادہ ناگوار مثالیں ہمیں اُس شاعر کے کلام میں ملتی ہیں۔ جو خداداد ذہانت اور جولانیٔ طبع کے لحاظ سے اپنے تمام معاصرین پر سبقت رکھتا تھا۔ انشاؔ کی شاعری میں وہ جُملہ عیوب نمایاں ہیں۔ جو دربارِ اودھ کی بودو باش سے کسی ذہین و طبّاع آدمی میں پیدا ہونے ممکن تھے۔ اگر اُس کے کلام میں شوخی و ظرافت کی چاشنی موجود نہ ہوتی تو ذوقِ سلیم اُس کے کلیات کی ورق گردانی سے بالکل برگشتہ خاطر ہوجاتا۔ یہ شوخی و ظرافت بھی بسا اوقات اپنی حالتِ اصلی سے مسخ ہوکر لطیفہ گوئی بلکہ جگت بازی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انشاء نے خود کو شاعر کے ارفع مقام سے گراکر اُمراء کے مصاحبین اور اربابِ نشاط کے زمرہ میں داخل کر لیا تھا۔ اگر انشاؔ کا کلام ہمارے دعوے کے ثبوت کے لئے کافی نہ سمجھا جائے۔ تو ریختی کی ایجاد کی جانب اشارہ کرنا کافی ہے۔ جو اُسی زمانہ کے اختراعات میں سے تھی۔ اور جس کی نسبت خود انشاؔء نے ظریفانہ رنگ میں یہ کہا ہے کہ رنگینؔ کا منشاء ریختی کی طرح ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شریف بہو بیٹیوں کے چال چلن میں رخنہ اندازی کرے۔

اُردو ادب کا وہ دَور جس کے آثار اب بھی باقی ہیں اور جو اُنیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے کئی اعتبار سے ازمنۂ ماضی پر فوقیت رکھتا ہے۔ اول تو اردو نثر کی تمام ترقی اسی دور کے ساتھ وابستہ ہے۔ دوسرے زبان کی ترویج جتنی اس زمانہ میں ہُوئی وہ اُس سے پہلے کبھی نہیں ہُوئی تھی۔ تیسرے اردو شاعری نے بھی جو کمال اس دور میں حاصل کیا وہ شاید میرؔ و سوداؔ کے بھی حدِّ امکان سے باہر تھا۔ لیکن ان خوبیوں کے باوجود افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ذوقِ عامہ میں اب بھی کوئی بیّن ترقی نظر نہیں آتی اور نہ ہی اسقام و عیوب جو

اُردو علم ادب کو تخیّل و تخلیق کے اعلےٰ مدارج تک پہنچنے سے مانع رہے ہیں اب بھی کم و بیش موجود ہیں + مومن و غالب و آتش نے اتنا تو ضرور کیا کہ شاعری کو کنگھی چوٹی کی زنجیروں سے آزاد کرکے اُسے قلبِ انسانی کے واردات و کیفیات کے اظہار کے قابل بنادیا + ان شعراء کی تقلید میں ایک عام میلان خیال بندی کی جانب پایا جاتا ہے۔ جو بجائے خود قابلِ اعتراض نہیں + بدقسمتی سے ہمارے شعرا کی پرواز خیال کچھ انوکھے انداز کی ہے۔ یا تو وہ ایک دم سے ملاء اعلےٰ تک پہنچ جاتے ہیں۔ اور یا اسفل السافلین تک جا گرتے ہیں۔ اور اکثر یہ نشیب و فراز ایک ہی غزل میں جمع ہو جاتا ہے + مثلاً آتش کے یہ دو شعر دیکھئے۔ جو دونوں ایک ہی غزل سے لئے گئے ہیں۔

پتلوں سے خاک کے یہ گڑھے بھر چکیں کہیں
جھگڑا مٹے زمیں سے نشیب و فراز کا
عمر خضر سے اُس کی زیادہ ہو زندگی
دھوون پیئے جو یار کی زلفِ دراز کا

دونوں اشعار کے مضامین خیال کی بلندی اور پستی کی انتہائی مثال ہیں + میرزا غالب اور حکیم مومن خاں بھی پستی کی جانب میلان سے خالی نہیں۔ اور اُن کے اشعار بھی بسا اوقات ہمارے تنزل کی عبرت ناک یاددہانی کر دیتے ہیں + اس دور کے شعراء میں میر انیس خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں کیونکہ اُنکی شاعری نہ صرف خود اعلےٰ پایۂ کی ہے بلکہ اُس کا موضوع بھی بلند ہے۔ لیکن لکھنؤ کے عام مذاق نے اُنکے مرثیوں میں بھی بیجا مبالغہ۔ بدشمار رنگ آمیزی۔ ناجائز تصنّع اور انکے مثل اور بہت سے ادنےٰ عنصر شامل کر دیئے ہیں + زمانۂ حال کے شعرا میں نواب میرزا داغ مرحوم سے بڑھ کر کسی شخص کا کلام مقبول عام نہیں ہوا۔ اور حق تو یہ ہے کہ اگر غزل گوئی کو منتہائے شاعری قرار دیا جائے (اور عملاً ہمارے شعراء کا یہی منشا رہا ہے) تو اُس کے بہترین و بدترین نمونے داغ کے کلام میں پائے جاتے ہیں +

اس مضمون میں اُردو غزل کے خصوصیات پر بحث کرنے کی گنجایش نہیں۔ مگر اس حقیقت کی جانب اشارہ کرنا ضروری ہے۔ کہ عام مذاق کو جس قدر اس صنفِ ادب سے

دلچسپی ہے اُس قدر کسی اور صنف سے نہیں۔ شمالی ہند کے کسی بڑے شہر کو لے لو کوئی کوچہ و بازار ایسا نہ ہوگا۔ جس میں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے کسی نہ کسی وقت غزل کی الاپ نہ سُنائی دے۔ اور یہ شغف بچّہ سے لیکر بوڑھے۔ اور عورت سے لیکر مرد سب میں کم و بیش پایا جاتا ہے۔ یہ ایک دلچسپ سوال ہے کہ اس شغف کا ہمارے دماغ و جسم کی پرداخت پر کیا اثر پڑتا ہے۔ اور عاشق مزاجی و تعیش کی جانب جو عام میلان ہمارے نوجوانوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ کس حد تک اسی غزل گوئی کا نتیجہ ہے۔ لیکن ہمیں اس وقت اس سوال سے بحث نہیں۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ ذوقِ عامہ کا خود غزل گوئی پر کیا اثر پڑا ہے۔ اس دوسرے سوال کا جواب مختصر طور پر یہ ہے کہ چونکہ عام مذاق عامیانہ جذبات کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اس لئے غزل میں اُن خیالات کا متجسس ہوتا ہے۔ جو اُن جذبات پر مبنی ہوں۔ اور وہ خیالات جو صرف خواص کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں عام طور پر پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے۔

طول نویسی کا خوف اس اجمال کی تفصیل سے مانع ہے۔ تاہم ناظرین کی طبع نازک دو ایک مثالوں کی شاید متحمل ہو سکے۔

ا- یہ ایک فطرتی امر ہے کہ جب کسی سے عشق و محبت ہو تو یہ جی چاہتا ہے کہ اُس کو بھی اپنے محسوسات سے آگاہ کیا جائے۔ یہاں تک تو انسانی فطرت کم و بیش یکساں ہے۔ لیکن اس سے آگے بڑھیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام خیال اظہارِ عشق کی تائید میں ہے۔ لیکن خاص حالتیں یا خاص طبیعتیں اس قسم کے اظہار سے گریز کرتی ہیں۔ لہٰذا لازمی امر ہے کہ یہ شعر ؎

افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہُوئیں
لیکن اُسے جتا تو دیا جان تو گیا

ذوقِ عامہ کو پسند آئے۔ اور مندرجہ ذیل شعر کا لطف صرف خواص تک محدود رہے ؎

اسیرِ دل نہ ہو کیوں حرفِ آرزو میرا
گلا دباتی ہے کمبخت آبرو میرا

حالانکہ دوسرا شعر بہت بلند پایہ ہے اور پہلے شعر کو بلحاظ رفعتِ خیال دوسرے شعر سے کوئی نسبت ہی نہیں ہو سکتی +

۲- نظارہ بازی اور تاک جھانک کا شوق عام ہے۔ لہٰذا داغ کے اس شعر کے مقبول ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں کہ

حسنِ بے پردہ تو ہوتا ہے فقط ہوش رُبا
وہ قیامت ہے جو چلمن کی جھلک ہوتی ہے

خلافِ ازیں حسنِ تقریر اور اُس کی لذت خاص لوگوں کا حصہ ہے۔ اور وہی غالب کے اس شعر کا لطف اُٹھا سکتے ہیں کہ

بجلی سی کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

شاید یہ دو مثالیں میرے مفہوم کو صاف کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور ہر شخص اُن میں اپنی معلومات کے مطابق اضافہ کر سکتا ہے +

عام مذاق کا سب سے بُرا اثر جو غزل گوئی پر پڑا ہے وہ یہ ہے کہ جذبات کی عریانی اور خواہشات کی پستی عموماً محاسنِ سخن میں شمار ہوتی ہیں۔ حالانکہ صحیح ادبی مذاق کو ان صفات سے عار ہے + یہ میلان اب نظم کی حد سے نکل کر نثر پر بھی چھا پا گیا ہے۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اُردو رسالوں میں وہ مضامین قابلِ پسند خیال کئے جاتے ہیں جو حُسن و عشق کے متعلق جذبات کو عریاں اور صاف پیرایہ میں بیان کریں۔ اور اُس حجاب سے عاری ہوں جو تہذیب کے لوازمات میں سے ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس قسم کے مضامین نثر کی ترقی کیلئے وہی رکاوٹیں پیدا کرینگے جو عامیانہ غزل گوئی نے نظم کی ترقی کیلئے پیدا کردی ہیں

بعض ناظرین کو تعجب ہوگا کہ میں نے اپنے مضمون میں نظیر اکبرآبادی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ جسکا کلام ایک معنی میں ذوقِ عامہ کا بہترین عکس ہے اسکی اصلی وجہ یہ ہے کہ میں اس شاعر کے کلام کو کئی اعتبار سے توجہ و مطالعہ کا مستحق خیال کرتا ہوں۔ اور چونکہ میرا ارادہ ہے کہ کسی آئندہ موقعہ پر اس شاعر کے کلام کے متعلق کسی قدر تفصیل کے ساتھ بحث کروں۔ اس لئے موجودہ مضمون میں مجمل تذکرہ مناسب نہیں معلوم ہُوا +

محمد سعید

تاریخ روس پر ایک اجمالی نظر

گذشتہ سے پیوستہ

پیٹر اعظم نے خلیج فن لینڈ کے ساحل پر ایک شہر بھی آباد کیا تھا، اس کا نام (جرمنی ناموں کی طرح) سینٹ پیٹرسبرگ تھا، یہاں کی آبادی کا غالب حصہ آرکینجل کے مستعمرین تھے، ان کی آبادی کی وجہ سے یہ شہر بہت شاندار ہو گیا تھا، بازار وسیع تھے، دوکانیں خوشنما تھیں، اور سوادِ شہر کالجوں، کارخانوں، ہوٹلوں، اور امراء و رؤساء کی کوٹھیوں سے مزین تھا، اس کی رسمِ افتتاح ۱۷۱۸ئہ میں رقص و سرود کی رنگین بزموں سے ہوئی، ان بزموں میں تمام امراء و رؤساء، عمال حکومت اور معزز و سربرآوردہ مستعمرین شریک ہوتے تھے، اور سب کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک ایک رات اپنے ہاں جشنِ افتتاح منائیں، رقص و نغمہ کی نشاط انگیز مجلسیں آراستہ کریں، اور مغربی تہذیب تقلید کی طرح اپنے ساتھ عورتوں کو بھی شریک کریں، ان مجلسوں کے آدابِ نشست و برخاست، طریقِ رقص و نغمہ، اور تہذیب مخاطبہ و مکالمہ بالکل یورپین ہوتے تھے، یہاں ہر شخص آزادی سے سگرٹ وغیرہ پی سکتا تھا، اور کوئی مزاحمت و مخالفت کا مجاز نہ تھا،

ان مجلسوں کا نظام امور خود پیٹر نے ترتیب دیا تھا، اور وہ عام طور پر شائع کر دیا گیا تھا اس نئے شہر کی فضا جب ان لطیف ہنگاموں، اور لطف و مسرت کے رنگین قہقہوں سے لبریز ہو گئی، تو پادریوں نے بڑی لے دے کی، اور اپنے مذہبی جنون کا ایک اور آخری ثبوت دیا، انہوں نے مشرقی روس کے باشندوں کو جو اس حد تک انقلاب قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے اپنے ساتھ ملا لیا تھا، اور اسی بے سری فوج کو لیکر فاتح تمدن کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے، لیکن پہلی ہی پیشقدمی میں شکست کھائی، اور جس فوج کے گھمنڈ پر آگے بڑھے تھے وہ تتر بتر ہو گئی، جو پڑھے لکھے تھے وہ اسی میں جذب ہو گئے، اور جو جاہل تھے انہوں نے اپنے خروج کی سزا بھگتی،

لیکن موت جب آتی ہے تو کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی، ان پے در پے شکستوں کے بعد

بھی ان کا جنون ٹھنڈا نہ پڑا، اور اب یہ خفیہ سازشیں کرنے لگے، اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام جو انہوں نے کیا، پیٹر کے بیٹے (کسیس) اور بیوی (ایڈوکسیا) کو ورغلانا تھا، تاکہ وہ پیٹر کو ہلاک کر دیں، مگر ان کی شومئی قسمت سے یہ سازش کھل گئی، اور پیٹر کے سامنے مقدس پادریوں کی فردِ جرم پیش کی گئی، اس کی پاداش میں اس نے بیوی کے لئے تازیانوں کی سزا تجویز کی، اور بیٹے کے لئے قتل کی، باقی تمام سازشیوں کو حبس دوام کا حکم سنایا، اور اسقف اعظم کا عہدہ توڑ دیا، جس کے بعد ملک میں ایک گونہ سکون و اطمینان پیدا ہو گیا۔

اس آگ کو بجھا کر وہ مستقل طور پر پیٹرسبرگ میں جا رہا، یہاں اس نے لیو ونیہ کی ایک قیدی عورت سے شادی کر لی، اس عورت کا نام کیتھرائن تھا۔ کیتھرائن سے دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، جن کے پالنے کے لئے فرانس سے آیائین بلائی گئیں ان دونوں لڑکیوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام نہایت اعلےٰ اور بالکل یورپین اصولوں پر کیا گیا تھا، یہ لڑکیاں جب جوان ہوئیں، اور پڑھ لکھ کر فراغت پائی، تو اپنے روشن خیال باپ کی امیدوں کو پورا کرنے اور اس کے نظامِ اصلاح کو تکمیل کے بامِ رفعت تک پہنچانے میں منہمک ہو گئیں،

پیٹر نے روسی نظامِ حکومت کو بھی بدلا تھا، لیکن اس بارے میں اس نے جو کچھ اصلاحات کیں قدیم اصول ملوکیت کو تسلیم و برقرار رکھتے ہوئے کیں، بلکہ اپنے حکم و تسلط کو علم و سیاست اور نظم و قانون کا آب و رنگ دے کر اور زیادہ مطلق العنان کر دیا۔

اصلاحات کے سلسلہ میں فوجی اصلاحات کو عدالتی و انتظامی اصلاحات پر ترجیح ہے، اس لئے اسی ترتیب سے یہاں اس کا ذکر کیا جاتا ہے،

روس میں اب تک فوجوں کا کوئی خاص نظام نہ تھا، جس قدر فوجیں تھیں بالکل بے قاعدہ تھیں، عہدوں کی تقسیم، فرائض و اختیارات کی تحدید، صبح و شام کے قواعد اور مصنوعی جنگ کا تو کیا ذکر، یہاں سرے سے سپاہیوں کے پاس اسلحہ بھی ایک وضع کے اور کافی تعداد میں نہ تھے، اس پر طرہ یہ تھا کہ ان کی وردیاں ان کا روزمرہ کا لباس ہوتی تھیں، اور فوج میں بلا تخصیص سن و سال ہر شخص بھرتی کر لیا جاتا تھا،

پیٹر نے اس بدنظمی کو بدلا، پرانے آدمیوں کو نکال کر نئے آدمی، اور ایک خاص عمر

کے بھرتی کئے، انہیں یورپین عسکریت کے سانچہ میں ڈھالا، خدمات کی تقسیم کی، عہدوں کے نام جرمن ناموں سے اخذ کئے، صبح و شام کی قواعد لازمی قرار دی، ہر تیسرے مہینہ مصنوعی جنگ کا طریقہ جاری کیا، فرانس سے اسلحہ منگائے، اور تمام فوجوں کے لئے خاص خاص وردیاں مقرر کیں،

روس وسیع وسیع جنگلوں اور چٹیل میدانوں کا ملک تھا، اس کی کائنات ارضی میں سمندروں اور دریاؤں کا دور دور پتہ نہ تھا، لے دے کر جو چند دریا تھے وہ مغربی روس میں تھے، اور اس وقت جو سمندر ان کے قبضہ میں تھا، اس کا ساحلی مقام (آرکینجل) غیر ملکی باشندوں سے آباد تھا، لیکن یورپ میں اور باعزت رہنے کے لئے بحریت روح پیدا ہونی ضروری تھی۔ خصوصاً استقلالِ قومی کے لئے جنگی بیڑہ نہایت ضروری تھا، ورنہ روس، یورپ کی دستبرد سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا، اس لئے پیٹر نے اور کاموں سے زیادہ اس طرف توجہ کی، اور اس ضرورت کو بدرجۂ اتم پورا کیا،

اس زمانہ میں بحریات کی سلطانی کا تاج ہالینڈ کے سر پر تھا، اور اس کا بیڑہ یورپ میں سب سے زیادہ قوی اور منتظم تھا، پیٹر نے اسی کے نظام بحریت کو اختیار کیا، روسیوں کو بحری کام سکھوائے، اور اپنا بیڑہ بالکل انہی اصولوں پر مرتب کیا، اور تکمیل نظام کے لئے ماتحت عہدوں پر اہل ہالینڈ کو مقرر کیا، لیکن تمام ذمہ وار عہدے اور اعلےٰ خدمات روسیوں کو تفویض کیں، اور اس طرح اپنی برّی و بحری فوج یورپ کے مقابلہ کے لئے تیار کر لی،

یہی دونوں قوتیں تھیں، جن کے بل پر روس، سویڈن پر غالب آیا، ترکوں کو شکست دی، بحر اسود پر قبضہ کیا، اور ساری دُنیا سے اپنی قوت کا لوہا منوا لیا، اس کے بعد عدالتی اصلاحات کا نمبر آتا ہے، ہالینڈ کی بحریت کی طرح اس زمانہ میں سویڈن کی ملکیت بُہت مشہور تھی، اس کے لئے پیٹر نے اسی کے نظام حکومت کا اتباع کیا، اور بالکل انہی طریقوں پر اپنے ہاں عدالتی نظم و نسق کے قواعد، فصل مقدمات کے قانون، اور مالگذاری کے آئین و ضوابط مدون کر کے نافذ کئے، ملک میں قانونی مدرسے جاری کئے، وضع آئین و قوانین کی مجلسیں بنائیں، کابینۂ وزارت مرتب کیا، خفیہ پولیس کا محکمہ قائم کیا، انتظامی پولیس کی اصلاح کی، اسکے

فرائض و اختیارات تعین کئے، اور تمام صیغوں میں اعلیٰ عہدوں پر روسیوں کو مقرر کر کے غیر خود مختار عہدوں پر سویڈش اہلکاروں کو مامور کیا،

عدالتی و انتظامی نظام جدید میں جن لوگوں نے حصّہ لیا، اور جو مختلف مناصب و خدمات پر مامور ہوئے، ان کے لئے ٹیشین کا لقب تجویز کیا گیا، اور آبائی شان و شوکت پر مرنے والوں کی آن توڑنے کے لئے تمام عزت و حرمت اسی جماعت کے لئے مخصوص کر دی، ان لوگوں کو خزانۂ عامرہ سے بڑی بڑی تنخواہیں ملتی تھیں، دربار شاہی سے خطابات عطا ہوتے تھے، اور جب کبھی شاہی لطف و کرم اور بخشش و عنایات کی بارش ہوتی تھی، انہی لوگوں پر ہوتی تھی، موروثی امیروں اور خاندانی منصبداروں کا اس میں کوئی حصّہ نہ ہوتا تھا، ویلس کا بیان ہے کہ پیٹر نے ایک ایسا قانون بھی نافذ کیا تھا جو خاندانی سیادت کے لئے ملک الموت تھا، اس میں صاف لکھا تھا کہ اگر کوئی خاندان دو پشت تک عدالتی یا فوجی خدمت یا ملازمت نہ کرے، اس کو شریف خاندانوں میں شمار نہیں کیا جائیگا، درباروں میں ان کی کوئی عزت نہیں ہوگی، خواہ ان کے اسلاف نے سلطنت کی کتنی ہی خدمات انجام دی ہوں، اور خواہ وہ کتنے ہی بڑے عہدوں پر مامور رہے ہوں، اس قانون کی رو سے انتقال عہدہ و منصب کا طریقہ بھی بند کر دیا گیا تھا، اور ہر کام کے لئے قابلیتِ ذاتی دیکھی جاتی تھی۔

جب نظامِ حکومت میں خرابیاں ہوتی ہیں تو سینکڑوں بُرائیاں خود بخود پیدا ہو جاتی ہیں، اور وہ نظامِ حکومت ملک کے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر اور نقصان دہ ہو جاتا ہے، ان خرابیوں میں ایک بڑی خرابی رشوت بھی ہے، جو دوسری خرابیوں کے لئے بمنزلۂ بنیاد و اساس ہوتی ہے،

روس میں رشوت خواری کا عام چرچا تھا، ادنےٰ اہل کاروں سے لیکر اعلیٰ عہدہ داروں تک ایک متنفس بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھا، پیٹر نے جدید نظام حکومت میں اسکا بہت زائد خیال رکھا تھا، اور قریب قریب ایسی تمام راہوں میں رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں۔ جو رشوت کا منفذ ہو سکتی تھیں، تاہم رشوت خواریاں بالکل بند نہ ہوئیں، اور بدرجۂ مجبوری ایک علیحدہ قانون نافذ کرنا پڑا، جس نے صاف لفظوں میں رشوت خواری کی قطعی ممانعت کی،

اور مرتشی افسروں اور اہلکاروں کو مستوجب سزا قرار دیا،

لیکن بری عادتیں آسانی سے کہاں چھوٹتی ہیں، پھر جس عادت میں مادی فوائد بھی ہوں وہ اس طرح کیسے چھوٹ سکتی تھی، چنانچہ اس قانون کے نافذ ہونے کے بعد علانیہ رشوت خواری تو بند ہو گئی، مگر پوشیدہ کا بازار کھل گیا، اور عمال حکومت عدل و انصاف، اور نظم و قانون کو رشوت کے ہاتھ فروخت کرتے رہے، اور اس کی بھی پروا نہ کی کہ اس سے حکومت کے مالیہ پر کیا اثر پڑتا ہے، بالآخر پیٹر نے ان لوگوں پر جاسوس مقرر کئے، اور ان کی اطلاعات پر نہایت سخت سزائیں دیں، اور بقول مسٹر میکنزی جن کے جرائم رشوت زیادہ تھے انکی جائدادیں ضبط کرلیں اور انتظاماً قتل بھی کیا، ایک روز پیٹر ایک اعلیٰ افسر سے انسداد رشوت کے مسئلہ پر گفتگو کر رہا تھا، گفتگو کے دوران میں اس نے کہا:- اب میں ایسا قانون نافذ کرنا چاہتا ہوں جس کی رو سے مرتشی عمال سزائے موت کے مستوجب ہوں،" افسر نے جواب دیا:- لیکن یہاں تو سب کے سب مرتشی ہیں، اگر یہ قانون نافذ کیا گیا تو باقی کون بچیگا؟ کیا جلالت مآب یہ چاہتے ہیں کہ روس کو ویران کر دیں؟

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ روس میں رشوت کتنی عام تھی، جو ایسی سزاؤں کے بعد بھی بند نہ ہوئی،

جیسا کہ قاعدہ ہے کہ تمدن کی ترقی، تہذیب کا نشر اور نظام حکومت کی اصلاحات سے مالگذاری اور ٹیکس وغیرہ بڑھ جاتے ہیں، اور ضروریات زندگی وسیع ہو کر گراں ہوتی جاتی ہیں، روس میں بھی یہی ہوا، اور یورپ کی طرح یہاں بھی زندگی کی قیمت بہت بڑھ گئی، ہر شخص شریفانہ زندگی بسر کرنے کے لئے کام کاج کرنے پر مجبور تھا، جس سے مغربی تمدن کو اور ترقی ہو رہی تھی؛

روسیوں میں جو تمدن زیادہ رائج ہوا تھا وہ فرانسیسیوں کا تمدن تھا، تمام خوش حال روسی اپنے قدیم تمدن اور آبائی رسم و رواج سے نفرت کرنے لگے تھے، انھوں نے اپنی قومی زبان فرانسیسی زبان کو بنا لیا تھا، اور عام طور پر اسی میں گفتگو کرتے تھے، ان کے کتب خانوں کا غالب حصہ فرنچ لٹریچر ہوتا تھا، کلب میں آنے جانے، اٹھنے بیٹھنے، ہنسنے بولنے کے طریق و آداب بالکل یورپین تھے، وہ مذاق بھی کرتے تو مغربی انداز میں، اور قہقہے بھی مارتے تو فرنچ

طریقہ پر،

پیٹر اعظم کی سیرت کے مختلف واقعات آپ کے سامنے آچکے ہیں، لیکن اب وہی پیٹر اعظم خون چکاں دامن لئے نمودار ہوتا ہے۔

یہ خون کس کا ہے؟ غریب مسلمانوں کا!

اب تک آپ نے پیٹر کو روشن خیالیوں کی تمثال، اصلاح پسندیوں کا نمونہ اور رواداری و منصف مزاجی کا مجسم دیکھا ہے، لیکن یہ تمام باتیں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے لئے تھیں، مسلمانوں کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ غیظ و غضب اور قدیم مسیحی جنون کے جوش سے تمتما اٹھتا ہے، وہ پہلے جس قدر نیک تھا اب اسی قدر بد ہوتا جاتا ہے، پہلے اس میں جس قدر خوبیاں تھیں اب اتنی ہی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، اور نظر آتا ہے کہ پیٹر صرف آئینۂ رحمت ہی نہ تھا بلکہ چنگیز اور ہلاکو بھی تھا!

اوراق گذشتہ میں جو واقعات پیش کئے گئے، ان کے مطالعہ سے آپ نے سمجھا ہوگا۔کہ پیٹر مذہبی آدمی نہ تھا، لیکن حقیقتہً ایسا نہیں ہے، پیٹر اپنے مذہب کا بہت پابند تھا، عیسائیت کا داعی تھا، اور اسلام کا شدید دشمن تھا، اس حصۂ مضمون میں اسی موضوع پر چند سطریں سپرد قلم کی جاتی ہیں:-

تاتاری ممالک میں مسلمان بکثرت آباد تھے، قزان، خوارزم، فرغانہ، روفا، بخارا وغیرہ میں انکی بڑی بڑی بستیاں تھیں، یہ مسلمان ترکی قبائل تھے، جو اپنی اخلاقی و مذہبی خوبیوں کی وجہ سے اپنے دوسرے ہمسایوں سے بہتر تھے، اور اپنے انہی ہتیاروں سے بلا جنگ و جدل سب کو مفتوح کر لیا کرتے تھے، یہ مفتوح قومیں زیادہ تر نصرانی ہوتی تھیں، جنکے بڑے بڑے قبیلے چواش، چرش، آر وغیرہ تھے، ان میں بعض قبیلے تو کلیتہً اسلام میں جذب ہو گئے تھے، بعض نے صرف اخلاقی اثرات قبول کئے تھے، اور اس جذب و قبول کو اس قدر ترقی ہوئی تھی کہ اطراف و جوانب کی تمام آبادیاں لفظاً و معناً اسلام کی حلقہ بگوش ہو گئی تھیں،

یہ حالت تھی کہ روس نے تاتاری ممالک پر قبضہ کیا، اور یہ تمام شہر اسکے آہنی چنگل میں آگئے،

باقی آئندہ

روزنامچۂ آزاد

شمس العلماء مولانا مولوی محمد حسینؒ آزاد مرحوم

گذشتہ سے پیوستہ

۲۷ر اکتوبر ۱۸۸۵ء چہار شنبہ ۲۷ر ذلحجہ میں بموجب معمول کے آخر شب سے عرشہ پر ہوا کھا رہا تھا۔ کہ سفید صبح کے ساتھ بندر لنگہ (لنجہ) کے درخت کناروں پر دکھائی دیئے۔ لنگر ڈالنے کے سامان ہوئے ۲ بجے کے بعد دو کشتیاں اسباب لینے آئیں ۸ ۔۔ اسواریاں آئیں کہ بحرین میں اُتر جائینگی ۲ گھنٹہ اسباب اُترتا رہا ۱۰ ½ بجے جہاز روانہ ہوا۔ لنگہ بندر عباس سے چھوٹا ہے۔ شہر کنارے پر آباد ہے، اصلی آبادی کم تھی۔ جہازوں کی آمد و رفت نے سہ چند بڑھا دیا ہے۔ اس کے بیچ میں کھجوروں کی قطار ہے۔ اس کے پیچھے پھر آبادی ہے مکانات کی ساخت سامنے سے انگریزی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہوادار کھڑکیاں برابر برابر رکھتے ہیں میوہ یہاں کچھ نہیں۔ اصلی عرب کے لوگوں کی آبادی ہے۔ اگرچہ ایران کی عملداری ہے مگر حاکم سید ہوتا ہے چنانچہ حاکمِ حال کا نام سید نقیب ہے آج کل محرم کے سبب سے شہزادہ محمد حسین مرزا بندر عباس سے آیا ہوا ہے۔ اور جب کوئی صورتِ خاص واقع ہوتی ہے۔ تو کوئی حاکم ایرانی بھی آجاتا ہے۔

گرمی کی شدت ہے، ہوا کھل گئی ہے اگر عرشہ پر سایہ ہوتا تو عیش ہو جاتا۔ اب سخت تکلیف میں ہیں۔ میں رات بھر میں کئی بار اوپر اور کبھی نیچے گیا کہ مبادا کوئی چیز غائب ہو جائے۔ آدمیوں کی کثرت نے زیادہ تر تکلیف دی حاجی عبد الرسول نام بوشہری معلم جہاز ہو کر لنجہ سے آئے ہیں وہ میرے شریکِ بستر ہوئے۔ نجف نام ایک نوجوان خوش مزاج اُن کے ساتھ ہے۔ ایک حبشی دراز قد بھی ساتھ ہے۔

لطیفہ۔ میں نے حبشی کا نام پوچھا۔ کہا مہندنی (ماندنی) میں نے پوچھا مہندنی چہ

معنی دارد۔ ہنس کر کہا۔ غرض ہیکہ انشاء اللہ میماند"

حاجی صاحب کاروبارِ دریا سے خوب واقف ہیں۔ جو جہاز آتا ہے بوشہر تک ساتھ ساتھ جاتے ہیں وہاں سے ان کی بدلی ہوجاتی ہے یہ معلم۔ راہ کے نیک و بد اور خوف و خطر کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس وقت حاجی صاحب کا قہوہ پیا ہے،

لنجہ کے لوگوں کی اصل عربی ہے۔ بحرین اور بوشہر سے ان کی ایسی آمد و رفت ہے جیسے لاہور، امرتسر، جالندھر، یا دلی، میرٹھ،

۸ر اکتوبر ۸۵ء ۲۸ ذلحجہ پنجشنبہ۔ رات بھی ہوا سخت چلتی رہی۔ کہ عرشہ پر چلا نہ جاتا تھا، جہاز آگے پیچھے اس طرح ہلتا تھا۔ جیسے کوئی بچہ کو گودی میں لٹا کر بیٹھا رہے اور زانوؤں کو حرکت دے اوّل اوّل مجھے اس سے نیند آئی۔ مگر پچھلے پہر سے مجھے ضعف شروع ہُوا۔ اور صبح تو ایسا ضعف معلوم ہُوا کہ دل و دماغ گُھلے جاتے ہیں۔ جس وقت دُودھ میں بیائے ڈال کر گھولی اور روغنی روٹی بھگو کر پی۔ اس سے ذرا سہارا ہُوا مگر دل بدمزہ ہوگیا گھی میں کھو پرے کا تیل تھا۔ تھوڑی دیر میں بہت بے قراری اُٹھائی۔ عرشہ پر جا کر پڑا رہا۔ میں سر سے پا تو یک دل تھا۔ یا اب دل بیٹھا جاتا تھا۔ بارے آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں دھوپ آگئی۔ اُٹھا تو طبیعت ٹھیری ہوئی تھی۔ نیچے آکر کئی گھونٹ پانی پیا۔ سہارا سا ہوگیا۔ اِدھر اُدھر پھرتا تھا۔ مگر حال بے حال تھا۔ لیٹے بیٹھے چین نہ تھا۔ دوپہر کو جھوکے کم ہُوئے چند نوالے چاول کے دال کے ساتھ کھائے۔ یہ بھی معلوم ہُوا۔ کہ ہمارے حصہ کا عرشہ جو جہاز کی ناک سے لگا ہُوا ہے اس پر زیادہ جھوکے لگتے ہیں۔ وسط میں کم۔ میں بھی وہیں جا بیٹھا اور یہ چند سطریں لکھیں۔

باقی آئندہ

چمنستان

گلزارِ محبّت

اگر تم جمادات ہو تو مقناطیس کی طرح کشش پیدا کرو، نباتات ہو تو سُورج کی شعاعوں سے رنگ پکڑو، اور انسان ہو تو اپنے سینے کو محبّت سے معمور کر لو!

اگر محبت کے پُجاری دُنیا میں نہ ہوتے تو شمعِ آفتاب کبھی کی سرد پڑ گئی ہوتی۔

محبّت کیا جانا جان کی راحت ہے محبّت کرنا دل کی فرحت!

جب فرشتے ستاروں کے سامنے آداب بجالاتے ہیں تو ہم لوگ اُسے محبّت پکارتے ہیں۔

محبّت کا غم سب غموں سے بڑھ کر جاں گُسل ہے۔

خود نمائی کا انجام محبّت کا آغاز ہے اور محبت کا انجام معرفت کا آغاز!

خُدائے لایزال تکمیلِ افلاک ہے اور محبت تکمیلِ انسان!

محبّت جنت الفردوس کی ہواؤں میں ایک آسمانی تنفس ہے!

جو محبّت کی بیعت کرتا ہے وہ شجاعت کا سبق پڑھ لیتا ہے!

اے وہ ہستی کہ محبت کی وجہ سے مُصیبت میں گرفتار ہے ہاں محبت کر محبّت کر!

کہ محبت کا درد حیاتِ مستعار کی کلفتوں کی بہترین دوا ہے ؎

چو منصور از مُراد آنانکہ بردارند بردار اند

کہ بایں درد اگر در بند درمانند درمانند

دل کتنا اُداس ہوتا ہے جب وہ محبّت سے اُداس ہو!

آہ ایک ہی مرقد میں پہلو بہ پہلو ہاتھ میں ہاتھ دیئے لیٹے رہنا اور زندگی کی تاریکیوں کو اپنی چمکتی آنکھوں کی شمعوں سے روشن کرنا! میری ہستی کے لئے یہ بات کافی ہے: اُس شخص کی جُدائی جس کے ساتھ دُنیا بھر کی خوشیاں وابستہ ہیں فضائے ہستی کا سب

سے زیادہ اندوہ گیں خلا ہے۔ یہ بات کس قدر سچی اور پیاری ہے کہ محبوب معبود بن جاتا ہے
اگر خدائے کون و مکاں کائنات کو رُوح کے لئے اور رُوحوں کو محبت کے لئے پیدا نہ کرتا
تو (نعوذ باللہ) یہ گمان کیا جا سکتا کہ وہ محبت کی سحر کاریوں کو قدرت کی نیرنگیوں کا رقیب
سمجھے ہُوئے ہے!

جو دل باہمی محبت کا راگ گاتے ہیں خدا اُن کی راحتوں میں بجز اِس کے اَور کیا اضافہ
کر سکتا ہے کہ وہ اُن کی محبت کو ہمیشگی عطا فرمائے! ایک ایسی فانی زندگی کے بعد جو محبت میں
گذری ہو ایک ایسی ابدی زندگی جو محبت ہی میں گذرے بلاشبہ اک نعمتِ خداوندی ہے۔
لیکن جو دل آویز مسرتیں اس چند روزہ دُنیا میں محبت کا عطیہ ہیں اُن کے لُطف کو زیادہ کرنا
خالقِ کائنات کے لئے بھی اک ناممکن سا امر ہے!

اے میرے دوست! تُو آسمان کے تاروں کی درخشانی اور اُن کی گہرائیوں کو ٹکٹکی
باندھے ہُوئے کیا دیکھتا ہے کہ اک روشن تر ہستی کی ننھی اُجلی اُجلی کرنیں خود تیرے ہی پہلو میں
کھیلتی ہیں اور اُس کا عُمق تیرے دل کو زیادہ حیران کرنے والا ہے!

میں رات کی تاریکی میں ہوں! میں کیا کہوں کوئی صورت تھی جو نظروں سے غائب ہوگئی،
آہ میں کس سے کہوں کہ اب میں رات کی تاریکی میں ہوں! وہ ساتوں آسمانوں کی حدود سے دُور
دُور چلی گئی، وہ آٹھوں بہشتوں کی فضا کو اپنے ساتھ لے گئی اور اب میں وحشت خیز راتوں میں
اپنے غم سے ہم آغوش ہو کر اپنی محبت کو رنج و الم کے آنسوؤں سے کوس رہا ہوں!

اُس کا غمگین چہرہ اکثر میری نیندوں کو اُچاٹ کئے دیتا ہے!

دُنیا دلِ افسردہ کے تاروں کو چھیڑتی ہے تو تار تار سے درد بھرے نغمے نکلنے لگتے ہیں!
میں اک مُدت اُن تاروں کو دیکھتا رہا ہوں جو آسمان پر میرے لئے چمکتے ہیں۔ مگر
وائے ناکامی کہ میں نے ہنوز اُس شمع کو روشن نہیں کیا جو میرے ہی تاریک دل میں بیکار پڑی ہے!

اے رات

اے رات! نقابِ تاریکی میں چھپ جانے والی! اے رات! کُنجِ تنہائی میں پہروں

سرنگوں رہنے والی! مجھے اپنا شاعر بنالے اور ان لوگوں کے بے گائے ہوئے گیت مجھے گانے دے جو تیرے سائے میں عمروں خاموشی کی داد دیتے رہے۔ آہ! مجھے اپنے اِس بے پہیہ رتھ پر جو ایک دُنیا سے دُوسری دُنیا کو بغیر کسی شورش کے جنبش کئے جاتا ہے سوار کرلے! اے تو وقت کے قصرِ عالیشان کی ملکہ اے تو تاریک اداؤں کی متین و پُرعظمت حسینہ!

آہ! کتنے ہی دردِ تمنا سے پامال ہونے والے دل تیرے وسیع صحن میں داخل ہوئے اور تیرے بے چراغ گھر میں اپنے خواب آلودہ نصیبے کو بیدار کرنے کی آرزو میں گھنٹوں آوارہ و پریشان پھرا کئے اور کتنے ہی دل ایسے تھے جو کسی مسرتِ نامعلوم کے تیروں سے چھدے ہوئے نغمہائے انبساط سے لبریز ہو کر بہہ نکلے اور اُن کی موسیقی کی شیریں آوازوں نے کائنات کی دُور دراز بستیوں میں اک عظیم الشان غلغلہ ڈالدیا!

یہ سب کی سب رُوحانی ہستیاں جو اب ہمیشہ کے لئے بیدار ہو چکی ہیں تاروں کی ہلکی ہلکی روشنیوں میں اک حیرت کے ساتھ اُس روز افزوں خزانے کو دیکھتی ہیں جو اُن کی متجسس نگاہوں نے دفعتہً پالیا ہے! اے رات! شرابِ تاریکی سے مخمور ہونے والی! اے رات بحرِ تنہائی میں مستغرق رہنے والی! مجھے اُن کی بے تھاہ خاموشی کا خوش آواز شاعر بنالے!!

وائے قسمت

وائے قسمت کہ مجھے چین نہیں ہے گھر میں
ہائے تقدیر مجھے گھر ہی نہیں گھر اپنا

نعرہ زن راہ پہ ہے راہرِو روزِ ازل
ہے مرے جی میں بنالوں اُسے رہبر اپنا

جادہ پیما ہے وہ اور اُس کے قدم کی آواز
مجھے پیغامِ سفر دیتی ہے دن بھر اپنا

ماجرا کہتی ہے غربت کا اِدھر بادِ صبا
اور اُدھر قصۂ اندوہ سمندر اپنا

چھوڑ کر زیست کے افکار و محن جاتا ہوں
موجِ آوارہ کا پیرو ہے مقدر اپنا

نعرہ زن رہ پہ ہے میرے لئے دلگیرِ ازل
جی میں آتا ہے بنالوں اُسے دلبر اپنا

عالمِ شباب میں۔ میری زندگی اک پھُول کی مانند تھی، وہ پھُول جو اپنے بھرے خزانے سے ایک دو پنکھڑیاں گرادے اور پھر بھی جب نسیمِ بہار اس کے دروازے آکر دستِ گدائی دراز کرے تو

کبھی اپنے اُس خسارے کو محسوس نہ کرے! ---- لیکن اب جب کہ جوانی کے دن ختم ہو چکے ہیں میری زندگی ایک پھل کی طرح ہے کہ وہ کوئی زائد شے نہیں رکھتی اور اپنی پوری شیرینی کے ساتھ اپنے تئیں تیرے حضور قطعی نذر کر دینے کی منتظر ہے!

تُو نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنے پہلو میں بٹھا لیا اور تمام لوگوں کے سامنے مجھے اک مرتفع مقام پر جگہ دی یہانتک کہ میں بزدل ہو گیا کہ نہ جنبش کر سکتا نہ آپ اپنا رستہ چل سکتا ہیں ہر قدم پر شکوک و بحث کرتا مبادا میری کوئی سی حرکت بھی اُن کی ناراضگی کا موجب ٹھیرے۔

بالآخر میں آزاد ہو گیا ہوں۔ مصیبت میرے سر پر ٹوٹ پڑی طبلِ ہتک بج چکا، میرا مرتبہ خاک میں مل گیا۔ اب میرے رستے میرے سامنے کھُلے ہیں، میرے پر پروازِ آسمان کی تمنا سے پھڑپھڑا رہے ہیں میں نیم شب کے ٹوٹنے والے تاروں کے ساتھ سایۂ عمیق میں غوطہ زن ہونے کو جا رہا ہوں، میں موسمِ گرما کے اُس طوفان زدہ بادل کی مانند ہوں جو اپنا زرّیں تاج پھینک کر ایک زنجیرِ برق پر بجلی کی تلوار آویزاں کئے ہُوئے ہو!

اک پُر وحشت مسرت میں میں حقیر لوگوں کی گرد آلود راہ پر دَوڑتا ہوں اور تیرے آخریں خیر مقدم کے قریب تر ہُوا جاتا ہوں۔ بچہ اپنی ماں کو پالیتا ہے جب وہ اُس کے رحم کو چھوڑ دے، جب میں تجھ سے جُدا ہوتا ہوں جب میں تیرے گھر سے باہر نکال دیا جاتا ہوں تو آزاد ہو کر میں تیرا پیارا چہرہ دیکھ سکتا ہوں!

نامۂ محبت

جب شرابِ نُور سے لبریز تھا جامِ سحر
اور دیتی تھی صبا پھُولوں کو پیغامِ سحر
جاگ اُٹھی اور محبت سے ہُوئی سرشار میں
دیکھ کر پہلو میں اپنے نامۂ دلدار میں
میں اسے سمجھوں یہ قدرت میری فطرت میں نہیں
پڑھ سکوں لکھا ہُوا یہ میری قسمت میں نہیں
میں نہ رکھوں گی کسی عالم کی خلوت میں قدم
فلسفی کے فکر کو دوں گی نہ میں بارِ الم
جی میں آتا ہے رہا دُنیا میں جو محرمِ عشق
پڑھ سکے وہ کس طرح سے نامۂ منظومِ عشق
دل مرا مضطر ہے سینے سے لگا لُونگی اسے
طفلِ الفت ہے یہ گودی میں کھلاؤنگی اسے
رات جب خاموش ہو اور آسماں غرقِ نشاط
انجمن میں چھیڑ دیں تارے بھی سازِ انبساط
ہو کے میں مستِ طرب اُس ساعتِ مدہوش میں
اِس کو پھیلاؤں گی اپنی وسعتِ آغوش میں
پتیاں گُل کی پڑھیں گی نامۂ اُلفت مرا
ندیاں گائیں گی مل کر نغمۂ راحت مرا
اپنا جھُومر مجھ کو پہنائے گی پروینِ فلک
پھُول لائے گا مری محفل میں گلچینِ فلک
گرچہ پا سکتی نہیں میں مُدعائے جستجو
گو سمجھ سکتی نہیں ہوں علم کی میں گفتگو
جی مرا ٹھنڈا ہُوا پیغامِ اُلفت دیکھ کر
دل تو ابھرا ہُوا لُطفِ محبت دیکھ کر

زندگی

زندگی کیا ہے؟ بقائے دوام کا بچپن!
اُس کی زندگی دراز ہوجاتی ہے جس کی زندگی نیک ہو۔
علم محبت قوت! یہ ہے مکمل زندگی۔
زندگی فانی ہے اور فن باقی۔
وہ جو ہمیشہ زندہ رہنے کے لئے زندگی بسر کرتا ہے
موت سے ہرگز نہیں ڈرتا۔
زندگی چندروزہ ہے، فن بے پایاں، مواقع گریزاں،
تجربہ مشکوک اور فیصلہ مشکل۔
زندگی اک پُرلطف داستان ہے اُسکے لئے جو غور کرے
اور اک پُرغم کہانی اُس کے واسطے جو محسوس کرے۔
زندگی پر بھی اک حکم لگایا جاسکتا ہے کہ نوجوانی ایک غلطی
ہے شباب ایک جد وجہد اور بڑھاپا ایک پچھتاوا۔
ہماری زندگی عملوں میں ہے سالوں میں نہیں، خیالوں میں نہ
کہ سانسوں میں، احساسات میں نہ کہ دقیانوسی ڈھکوسلوں میں،
ہمیں اپنے وقت کو دل کی دھڑکن کے ساتھ شمار کرنا چاہیئے
زندہ زیادہ وہ رہتا ہے جس کے خیال زیادہ اچھے جسکے
احساس زیادہ پاکیزہ اور جس کے عمل زیادہ نیک ہوں!
اگر تم زندگی سے مستفید ہونا چاہتے ہو تو شباب میں پیری
کا تجربہ اور پیری میں شباب کی قوت کو اپنے اندر محسوس کرو!

موت

موت تو محض پھول کا جھڑ جانا ہے تاکہ زندگی کی شاخ میں پھل آئے۔
خدا انسان سے موت کی خوشیاں چھپائے رکھتا ہے تاکہ وہ
زندگی کی صعوبتوں کو آسانی کے ساتھ برداشت کرسکے۔
موت سب کو برابر آتی ہے اور جب آتی ہے تو سب کو برابر کردیتی ہے
یہ دن جس سے تُو اس قدر خائف ہے اور جسے تُو اپنا آخری
دن پکارتا ہے ہمیشگی کی پیدائش کا روز ہے۔
زندگی میں بے دھڑک قدم رکھنا یہ موت ہے اور
مرجانا تو اپنے ہتھیار ڈال دینا ہے۔
موت صرف ایک بار آتی ہے اور ہم عمر بھر اُسکا احساس کرتے ہیں
اگر خدا موجود ہے تو موت دلکش ہے اور اگر وہ موجود نہیں تو
زندگی بے سُود ہے۔
اِس زندگی کی بیداری کے کھیل تو میں دیکھ چکا۔ اب آرزو
ہے کہ موت کی نیند کے نت نئے خواب دیکھوں۔
ہم نہیں جانتے ہم کیا ہوجائیں گے ہم کہاں جائینگے؟؟
ڈر ہمیں ان باتوں کا ہے موت کا نہیں!
موت کے تیروں سے بچنے کی ایک ہی زرہ ہے نیک عمل!
"موت"؟ آسمانی زبان میں اُسے "زندگی" کہتے ہیں!
موت زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ ہم مرتے ہیں تاکہ پھر کبھی فنا نہ ہوسکیں!
خودداری کی موت بے حرمتی کی زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔

گلچیں

ابلیس اور عورت

ایک شخص کو کسی پرانی کتاب سے شیطان کی طلبی کا وظیفہ مل گیا۔ آدمی تھا ارادے کا پکا۔ لگا پوری تن دہی سے وظیفہ رٹنے۔ کسی عابد و زاہد نے اس قدر یک دلی سے خدا کی پرستش نہ کی ہوگی جتنی ان حضرت نے ابلیس بازی میں زحمت اٹھائی فاقوں سے دن کو رات۔ رات کو دن کر دیا۔ ترکیب کا لازمی جزو یہ تھا کہ تیرہ دن کا ایک ہی روزہ اور پھر چودھویں دن شراب سے افطار وہ بھی اس طرح کہ بلا کسی چیز کے کھائے لگاتار چودہ گلاس شراب کے چڑھائے جائیں تب شیطان صاحب نمودار ہونگے چنانچہ اس عامل نے ایسا ہی کیا۔ جونہی اس شخص کی گلاس بازی ختم ہوئی تو اس نے سب سے پہلے اپنے جسم میں ایک غیر معمولی تبدیلی محسوس کی یعنے بجائے اس کے کہ تیرہ دن کے روزے کی کمزوری یا چودہ گلاسوں کے نشے کا کچھ اثر ہوتا اس کا جسم اعلیٰ سے اعلیٰ صحت کی حالت سے بھی ہزار گنا زیادہ چست۔ اس کی آنکھیں بجائے خمار آلود ہونے کے صاف۔ دماغ تر و تازہ اور دل مطمئن تھا۔ اور خود بخود ہی یہ خیال پیدا ہو رہا تھا کہ اگر اس قسم کی صحت و طمانیت شیطان صاحب کی ملاقات کا پیش خیمہ ہے تو ملاقات کے پر لطف ہونے میں کچھ شک نہیں۔ اس عمل کے شروع کرنے سے پہلے اسکی نیت تھی کہ شیطان سے دولت۔ حسن۔ حکومت۔ دیرپا جوانی کے حصول میں امداد لی جائے لیکن اب جب کہ وہ وقت اسے قریب معلوم ہوتا تھا تو اس کے دل میں ان خیالات میں سے ایک بھی جاگزیں نہ تھا بلکہ وہ محسوس کرتا تھا کہ شیطان کے سامنے ان خواہشوں سے بھی بڑھ کر کوئی خاص آرزو پیش کرے۔ تاکہ شیطان بھی قائل ہو جائے کہ انسانی نسل نے دنیا میں لاکھوں سال گنوا کر کم از کم ایک فرد ایسا پیدا کیا ہے جس کے خیالات میں جدت ہے۔

یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دروازے پر انگریزی طریقے سے کسی نے انگلی سے کھٹ کھٹ کی عامل نے حسب معمول بے تکلفی سے Come on (آجاؤ) کہا۔ دروازہ کھلا۔ ایک صاحب بہادر نہایت خوش قطع لباس میں ٹوپی اتارتے ہوئے بصد آن بان وارد ہوئے اور فرمانے لگے" آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں۔ اس زمانے میں واقعی بہت کم لوگ اس قدر ثابت قدمی سے اپنے عزم پر قائم رہتے ہیں"

مسٹر شرید۔ (عامل کا نام شرید تھا۔ ان کے

وطن یا دیگر تعلقات کا پتہ نہ چل سکا۔ نو وارد تھے۔ کرائے کی کوٹھی میں رہتے تھے۔ چند ملاقاتوں میں ان سے یہ تمام واردات معلوم ہُوئی۔ اب پھر مفقود الخبر ہیں) یہ آپ کی قدر دانی ہے۔ تشریف رکھئے۔ کہئے کچھ نوش کیجیئے گا؟

شیطان:۔ (اطمینان سے آرام کرسی پر متمکن ہوتے ہُوئے) تھینکیو مجھے واقعی پیاس محسوس ہو رہی ہے۔ میں آپ کے پاس سیدھا پریذیڈنٹ ولسن کے ہاں سے آ رہا ہوں۔ اور یہ تو آپ خود ہی قیاس کر سکتے ہیں کہ امریکا سے سیدھا ہندوستان آنا اور رستے میں صرف چند منٹ کے لئے بیت المقدس ٹھہرنا کم از کم پیاس کا موجب تو ضرور ہو گا۔

شریر۔ واللہ آپ نے کافی سفر کیا۔ مگر آپ کے بشرے سے تکان معلوم نہیں ہوتی۔ کیا پیجیئے گا۔ وسکی۔ سوڈا یا کچھ اور؟

شیطان۔ جی نہیں۔ وسکی تو کبھی نہیں پیتا۔ پانی پلو ا دیجئے ٹھنڈا ہو اگرچہ آپ کے وطن کے پانی سے بھی ڈر لگتا ہے۔

شریر۔ کیا آپ اتنے سفر کے بعد بھی وسکی نہیں پیتے؟ تعجب ہے۔

شیطان۔ واقعی بدقسمتی یا خوش قسمتی سے سے اس نعمت سے محروم ہوں۔

(نوکر جس کے لئے شریر پہلے ہی بٹن دبا چکا تھا دبے پاؤں داخل ہُوا۔ مہمان کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ کیا ارشاد ہو گا اس کے لئے بلا حکم لئے وسکی اور سوڈے کی بوتلوں کی طرف جھکا)

شریر۔ وسکی نہیں چاہیئے۔ اُبلا ہُوا فلٹر شدہ پانی۔ ایک گلاس۔

(خادم اعلیٰ درجے کا تربیت یافتہ خادم تھا پھر بھی اس غیر معمولی فرمائش کو سُن کر مہمان صاحب کی طرف بہ نظر تحسین دیکھنے سے رُک نہ سکا۔ دل میں اس نو وارد کی عظمت کا سکہ جمائے ہُوئے گیا۔ اور فوراً پانی لا کر پیش کیا)

شریر۔ سگرٹ رکھ دو۔ بس۔

(خادم مشین کی طرح تعمیل کر کے غائب ہُوا)

شیطان۔ اس پانی کا کس قدر خوش نما پاکیزہ رنگ ہے۔ آپ کی خانہ داری کا انتظام قابلِ تعریف ہے۔ مسز شریر لاثانی منتظمہ ہیں۔ مجھے لنڈن یاد آ گیا۔

شریر۔ کیوں بناتے ہیں۔ چہ نسبت والا معاملہ ہے۔ لیجیئے سگرٹ کا شوق کیجئے۔

شیطان۔ چونکہ پہلی مُلاقات ہے اِس لئے ضرور آپ کو تعجب ہو گا مگر میں سگرٹ بھی نہیں پیتا۔

شریر۔ (قہقہہ لگا کر) یک نہ شد دو شد

اب تو ضرور میں اپنے دوستوں میں کہہ سکونگا کہ شراب اور سگرٹ نہ پینا شیطانی کام ہیں۔

شیطان۔ آپ سے تو مجھے بڑی بڑی اُمیدیں ہیں نہ یہ کہ آپ اُلٹا مجھے بدنام کرینگے۔

شرید۔ (اور زیادہ ہنس کر) آپ کی گفتگو کس قدر پُر لُطف ہے مگر آمدم برسر مطلب۔ فرمائیے "مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟"

شیطان۔ یہ سوال ہمیشہ مجھے بڑی دقت میں ڈالتا ہے۔ اگر میں اپنے ضمیر۔ (ضمیر کا لفظ سُنتے ہی شرید صاحب نے ایک اور بے اختیار قہقہہ لگایا)۔ ہنسئے۔ ہنسئے مگر واقعی میرا ضمیر ہے اور وہ کچھ ایسا بُرا بھی نہیں۔ میں بدگمانیوں کا شکار ہوں اگر کبھی کسی سے صاف صاف دل کی بات کہتا ہوں تو وہ مجھ پر مُلّا ہونے کا شک کرتا ہے۔ یہ ایذا اور اس پر گالی بھی برداشت کرتا ہوں۔ خیر اگر میں اپنے ضمیر کے مطابق اور آپکے فائدے کے لئے صحیح مشورہ دوں تو یہی کہوں گا کہ آپ کو مسز شرید کی اس قدر دل آزاری نہیں کرنی چاہیئے۔ مانا کہ وہ اولڈ فیشن کی خاتون ہیں مگر ان میں خوبیاں بھی ہیں اور انسانی زندگی کچھ اسی قسم کی معجون ہے

شرید۔ (The devil کہہ کر رُک گیا)

معاف کیجئے۔ مگر میں خود مختاری چاہتا ہوں۔ شہرت دولت حکومت اور ان سب سے بڑھ کر نیچر کی پوشیدہ طاقتوں پر کلی اختیار۔ ایسی کوئی رُوحانی کشش کہ انسانی ساختہ مشینوں سے آزاد ہو کر دم زدن میں کبھی مریخ کی سیر کروں۔ کبھی زحل کی کبھی مشتری کی اُنگلی پکڑ کر کہکشاں کے گلستان میں چکر لگاؤں۔ میرے خیال کی پرواز تو یہانتک ہے اور آپ نے وہی دقیانوسی چھیڑ نکالی کہ بیوی سے دل بہلاؤ اور بیوی بھی ایسی جس کے بال عید۔ شب برات کو بھی نیا فیشن اختیار نہیں کرتے۔ یہ تو میں سمجھتا تھا کہ ملٹن نے جو آپ کا قصہ لکھا ہے وہ فرضی ہے مگر کیا جرمن Goethe کے Faust میں جو آپ کے کرشمے درج ہیں۔ یا وہ جو ماری کوریلی کی کتاب میں آپ کے کارنامے ہیں وہ بھی سب غلط ہیں۔ مجھے افسوس ہوگا اگر میری محنت رائگاں گئی۔

شیطان۔ فاضل شرید۔ وہ قصص بس کسی حد تک ہی درست ہیں۔ مگر میں آپ کو مایوس کرنا نہیں چاہتا۔ جو کچھ آپ چاہتے ہیں اس کے لئے بھی تیار ہو کر آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا تھا "مجھے کیا کرنا چاہیئے ؟" میرے خیال میں عورت خاوند ایک ہیں اور آپ کی "مجھے" میں در اصل مسز شرید بھی شامل ہیں۔ اس لحاظ سے میں نے عرض کیا تھا کہ آپ ان کی دل آزاری نہ کریں۔ کیونکہ انکو رنج دینا گویا اپنے آپ کو مصیبت میں ڈالنا ہے

انسان کے لئے دنیامیں رنج و راحت تمامتر اس کے خیالات پر مبنی ہے۔ اب آپ خود ہی ......

شرید۔ معاف کیجئے قطع کلام کرتا ہوں۔ مگر ...... (رک گیا)

شیطان۔ جی ہاں۔ کہئے۔ آپ کیوں رکتے ہیں؟

شرید۔ میرا خیال تھا کہ آپ کو میرے مافی الضمیر سے پوری آگاہی ہوگی۔ آپ نے نصیحت بازی شروع کر دی۔ ناصح تو لاکھوں ہیں۔ آپ چارہ ساز بنئے۔

شیطان۔ اچھا آنکھیں بند کیجئے۔

(اگلا حصہ مسٹر شرید کی ڈائری سے لفظ بلفظ نقل ہے)

"مجھے آج ڈاکٹر نے ٹھیک دو دن کی سخت بیماری کے بعد اجازت دی ہے کہ میں صرف ایک گھنٹہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کردں۔ ڈاکٹر سب پاگل ہیں۔ ان کی تشخیص یہ تھی کہ زیادہ شراب نوشی سے مجھے ہذیان لاحق ...... ہوا۔ مجھے غش یا بیہوشی جو کچھ ہوئی وہ محض ایک صدمے سے۔

اس وقت تنہائی ہے۔ میرا دماغ صاف ہے اور میں اس ڈائری کو ٹھیک اسی لمحے سے شروع کرتا ہوں جب شیطان نے مجھے کہا۔ کہ "اچھا آنکھیں بند کرو"۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد کے واقعات مجھے پورے پورے یاد ہیں اور ایسی طرح کہ میں ان کو کبھی ہزار کوشش سے بھی بھلا نہیں سکتا۔ میری جسمانی صحت اس وقت کامل بلکہ اکمل حالت میں تھی اور اب گو میں کمزور ہوں مگر کمزوری صرف جسمانی ہے۔ میں نے آنکھیں بند کیں۔ شیطان کے کرسی سے اٹھنے کی آہٹ مجھے سنائی دی۔ اس نے میرے سر پر نہایت نرمی سے مگر مضبوطی سے اپنا سرد ہاتھ رکھا۔ اس ہاتھ رکھنے کی دیر تھی کہ میری آنکھیں پھر کھلیں مگر میرا کمرہ نہ تھا۔ مجھے اچھی طرح دکھائی دیا کہ میرا لباس بھی متغیر تھا۔ پھر جو میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ کسی قسم کی سواری میں ہم نہایت سرعت سے ہوا میں سفر کر رہے ہیں۔ یہ سواری ہوائی جہاز سے مشابہ نہ تھی بلکہ الف لیلہ کی اڑنے والی قالین یا طلسم ہوش ربا کے ساحر بادشاہ افراسیاب کے تخت کے طریق کی تھی۔ شیطان کا لباس بھی متغیر تھا۔ وہ بڑی رعونت سے ایشیائی طریق پر اس تخت کی صدر کی جگہ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ تخت بہ خفیف حرکت معلوم ہوتی تھی مگر یہ صاف ظاہر تھا کہ سیدھا بلندی کی طرف لاکھوں میل فی سکنڈ کی رفتار سے بڑھ رہا ہے۔ مجھے کچھ اچنبھا نہ معلوم دیا شیطان نے یوں گفتگو شروع کی۔

شیطان۔ کہئے کچھ اس طریق سفر سے تکلیف تو نہیں؟

میں۔ جی نہیں۔ کہاں چل رہے ہیں؟

شیطان۔ ایک ملکہ سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں۔

شیطان کا یہ کہنا تھا کہ تخت ایک عجیب غریب باغ کے دروازے پر رُک گیا۔ ہم اُتر کر داخل ہُوئے۔ باغ کی چار دیواری سے ملحق اندر کی جانب کھلے ہُوئے۔ ہزاروں دلفریب والان نما کمرے تھے۔ دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہُوئے۔ وہاں دو عورتیں تھیں۔ دونوں ہم شکل ایک قطع۔ ایک لباس۔ ایک عمر مگراُن میں جو برائے نام بڑی معلوم ہوتی تھی وہ دوسری کو سخت بیرحمی کے ساتھ گھور رہی تھی۔ جو بیچاری اس غضب آلود نگاہ کا نشانہ بن رہی تھی وہ سخت بے بسی کی حالت میں بلاچون وچرا اس قہر کو برداشت کر رہی تھی۔ میں سخت متعجب ہُوا۔ کچھ سوال کرنیکو تھا کہ شیطان نے اشارے سے کہا پہلے دیکھ لو۔ دوسرے کمرے میں داخل ہُوئے وہاں بھی دو عورتیں۔ ایک قطع۔ ایک لباس ایک آن۔ جو پہلے کمرے میں ذرا بڑی تھی وہ یہاں ذرا چھوٹی تھی۔ یہاں والی بڑی ملکہ چھوٹی ملکہ پر نہایت سفاکانہ طریق سے روحانی تشدد کر رہی تھی۔ سینکڑوں بلکہ ہزاروں کمروں میں آن واحد میں ہم گزرے سب جگہ یہی دیکھا کہ دو ہم شکل ایک ظالم ایک مظلوم۔ اخیر میں ایسے بھی بہت سے کمروں میں سے گذر ہُوا جہاں دو ہم شکل لڑکیاں ایک دوسرے کے ساتھ کھیل میں مصروف ہیں میں بہت سوال کرنا چاہتا تھا مگر شیطان مجھے روک دیتا تھا سب سے اخیر میں ایک ایسے کمرے میں داخل ہُوئے جہاں ایک حسن و جمال کی پری ایک کتاب پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ کتاب کے ورق بغیر اسکی کوشش کے خود بخود بڑی سرعت سے اُلٹے جارہے تھے۔ بعض صفحوں کو وہ چاہتی تھی کہ زیادہ دیر تک دیکھے مگر کتاب کے ورق اُلٹنے والی طاقت اس خواہش سے آزاد تھی اور وہ شاہزادی بامر مجبوری اس کتاب کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے بڑھ کر اس کتاب کو دیکھا۔ فوراً سمجھ میں آگیا کہ جتنے کمروں میں سے جو حالت دیکھ کر میں گذرا ہوں یہ کتاب ان کمروں کی حالت کا مرقع ہے۔ اتنا دیکھا اور بیتابی سے باہر نکلا۔

شیطان مسٹر شرید! یہ ملکہ نورجہاں ہیں۔ اس باغ میں اتنے کمرے ہیں جتنے نورجہاں کی زندگی میں دن تھے۔ سوائے بچپن اور زندگی کے ابتدائی حصّے کے باقی تمام دن اس ملکہ کی یہ کیفیت تھی کہ منگل کی نورجہاں بیر کی نورجہاں کو ملامت کرتی تھی۔ اور بدھ والی نورجہاں منگل والی نورجہاں کو ایذا دیتی تھی۔ انسانی خواہشوں کا

خاصہ ہے کہ دو دن بھی ایک اصول پر قائم نہیں رہتیں۔ چنانچہ یہ لاثانی عورت بھی اس مرض میں مُبتلا تھی۔ اور اب اس کی آنکھوں کے سامنے تاقیامت اس کی زندگی کا ڈراما ہوتا رہیگا۔ کیا تم اس کی حسرت کا اندازہ کرسکتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ یاد رکھو کہ یہ ملکہ بمقابلہ دیگر فرمانرواؤں کے ہزار درجہ بہتر تھی اور یہی وجہ ہے کہ میں نے تم کو ایک اچھا نمونہ دکھلایا ہے۔

میں۔ کیا کوئی اِنسان ایسا بھی گذرا ہے جس کی ساری زندگی ایک اصول پر بغیر تغیر کے گذری ہو؟

شیطان۔ لاکھوں۔ سب سے بہتر مثال رسُولِ عربی کی ہے مگر وہاں نہ میں جاسکتا ہوں نہ تم۔ لیکن ہزاروں ڈاکو اور چور بھی ایسے ہُوئے ہیں جن کے عزم میں، خواہشوں میں۔ ذرائع میں تغیر نہیں ہُوا۔ جن کا ایک دن دوسرے دن کا قاتل نہیں ہُوا۔ مگر عام طور پر انسانی زندگی یہی ہے کہ . . . . نہیں تمہیں لفظوں سے نہیں بتلاتا۔ صحیح صحیح دکھلا دیتا ہوں۔

یہ کہکر شیطان نے ایک کتاب میرے سامنے رکھ دی۔ میرے کئی دوستوں کی متحرک تصویریں اس کتاب میں نظر آئیں۔ سب کو یہی کرتے دیکھا کہ جو ایک دن بوتے دوسرے دن اُسی کو اکھاڑتے حیران ہوگیا کہ افسوس ہماری آنکھیں کس قدر بند ہیں۔ مثلاً میرے دوست غندل کی کئی سو تصاویر اس کتاب میں تھیں۔ ہر تصویر میں وہ بڑی تندہی سے اپنے کام میں مشغول تھے مگر کام سب جگہ یہی کہ جو ایک دن کیا اسے دُوسرے دِن مٹایا۔

شیطان۔ یہ تو انسانی زندگی کا معمولی نمونہ ہے۔ آؤ تمہیں عمر خیّام سے ملائیں۔

ایک ندی نمودار ہوئی کیا دیکھتا ہوں کہ ندی کے دونوں طرف ہزارہا انسان بیٹھے ہیں غور سے دیکھا تو معلوم ہُوا کہ گو شکلیں ہزاروں ہیں۔ مگر شخص ایک ہی۔ ہر شکل ندی سے پیالے بھرنے میں مصروف تھی۔ جام بھرے جارہے ہیں۔ اور رکھے جارہے ہیں۔ نہایت شدومد سے۔ اور کوئی کام نہیں۔ شیطان نے مسکرا کر پوچھا کہ کہئیے حضرت کیا حال ہے؟ سب نے متفقہ جواب دیا "جی سخت متردد ہوں۔ یہ نایاب شراب بہہ رہی ہے۔ اسے پیالوں میں سمیٹ لوں تو پھر پیوں۔"

یہ جواب میں نے سُنا اور پھر شیطان میری طرف مخاطب ہوکر کہنے لگا۔

"دیکھو مسٹر شرید! یہ شخص سینکڑوں برس سے اسی کام میں لگا ہُوا ہے۔ اسی دُھن میں ہے کہ ندی کو ساغروں میں بھر کر رکھلے پھر پئیے تاکہ کچھ ضائع نہ ہو اور ندی ہے کہ بہے جارہی ہے

بیچارہ لگا رہیگا اسی طرح ۔

میں ۔ افسوس ہے ۔ میرا خیال تھا کہ یہ شخص توسعِ لاحاصل کی مُصیبت سے آزاد ہو گا ۔

شیطان ۔ یاد رکھو کہ خیام نوعِ انسان کے برگزیدہ لوگوں میں سے تھا اور اس کا یہ حال ہے

اس واقع کو دیکھ کر میرے دل پر سخت مایوسی طاری ہُوئی کہ ایک طرف سے قہقہہ کی آواز سُنائی دی ۔ دیکھا تو سینکڑوں ہمشکل لڑکے بےتحاشا ہنس رہے ہیں ۔ شیطان کی طرف میں نے بہ نظرِ استفسار دیکھا ۔

شیطان ۔ کیا تم نے نہیں پہچانا ۔ یہ ظہیر الدین بابر ہیں ۔ ارادے کا پکّا تھا مُصیبت میں بھی ہمت نہ ہارتا تھا ۔ بڑھاپا اس کے شباب کو زوال نہ دے سکا ۔ یہ ہمیشہ جوان اور خوش رہیگا یاد رکھنا کہ عالمِ ارواح میں بھی کسی کو مستقبل کی خبر نہیں ۔ چنانچہ بابر کو بھی کچھ پتہ نہیں کہ اس کے بعد کیا ہُوا ۔ شخصی زندگی کا پہلا اور آخری اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنے خیالات کا ذمہ دار ہے افعال یا ان کے نتائج کا ذمہ دار نہیں ۔ افعال و نتائج انسانی ارادے سے آزاد ہیں ۔

مَیں ۔ یہ تو نیا قانون ہے ۔

شیطان ۔ نیا ہو یا پُرانا ۔ ہے صحیح ۔

میں ۔ مگر جب نتائج کی ذمہ داری نہیں تو ذمہ داری کیا خاک ہُوئی ؟

شیطان ۔ واقعی باوجود کافی علمیت کے تمہاری سمجھ ابھی خام ہے ۔ بیشتر حصّہ انسانوں کا اِسی غلطی میں ہے کہ انہیں دُنیا میں کچھ کر کے دکھلانا ہے ۔ حالانکہ صحیح بات اتنی ہے کہ ہر انسان اپنی ہستی کا اڈیٹر ہے ۔ اور اُسے دیکھنا یہ ہے ۔ کہ اس نے اس جزوِ عالم کو کس طرح اڈٹ کیا ۔ دولت حکومت ۔ اصلاح تمہارے اختیار میں نہیں کبھی نہیں پوچھا جائیگا کہ تم نے اوروں کے لئے کیا کیا؟ بلکہ صرف یہ کہ تم خود کیا بنے ؟ کیا سال ۔ دس سال بھر کی متواتر کوشش سے اتنا بھی نتیجہ پیدا ہُوا ؟ کہ تمہارے خیالات میں حسن و اطمینان کی جھلک پہلے سے بیشتر ہُوئی ۔ نور جہاں کے پاس سب کچھ تھا ۔ اس نے تمہارے معیار سے ہزاروں نیکیاں کیں مگر اس کے خیالات اکثر اسفل رہے ۔ اسے حکومت ۔ دولت ۔ فرمانروائی کے جال سے کبھی آزادی نہ ہُوئی ۔ تم اپنی نسبت سوچو کہ آج سے دس سال پہلے کے اور آج کے تمہارے خیالات میں کچھ بیّن فرق ہے ؟ کچھ عروج ہے ؟ ہرگز نہیں ایک بھی سوال ان دس سالوں میں تم طے نہیں کر سکے ۔ ابھی تک تم نے اس بات کا فیصلہ بھی بلقینی طور پر نہیں کیا کہ آیا زندگی اس قابل بھی ہے کہ انسان اس کا بوجھ برداشت کرے ۔

کوئی اصول تمہارے نزدیک فیصلہ شدہ نہیں اور اگر ہے تو صرف چند منٹ کے لئے۔ افسوس ہے کہ تم لوگ اپنے عارضی مکانوں کی بنیاد تو مستحکم بناتے ہو مگر خیالات کی بنیاد ہمیشہ ہوائی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ متزلزل"۔

میں کچھ کہنے کو تھا کہ ایک طرف سے ایک نہایت خوشنما مسجد نظر آئی۔ شیطان نے مجھے اجازت دی کہ میں تنہا جا کر دیکھ آؤں۔ اندر داخل ہوا تو ایک متبرک صورت پیر مرد وضو میں مصروف ہیں۔ فرشتہ نما لڑکے اور لڑکیاں ایک طرف سبق کی تلاوت کر رہے ہیں۔ مجھے خیال ہوا کہ پہلے شیطان سے ان بزرگ کی ہسٹری معلوم کر وں۔ باہر نکلا۔ شیطان سے پوچھا یہ کون ہیں؟

شیطان۔ یہ ایک گمنام شخص تھا "الصلوٰۃ خیر من النوم" کا سچا عاشق۔ اس راگ کو دوسروں سے سنتا۔ آپ سناتا۔ اور اس پر عمل کر کے دکھلاتا ہر وقت کام میں لگا رہتا تھا۔ چنانچہ ساری عمر اسے کبھی فرصت ہی نہ ملی کہ اپنے لئے متاع دنیا میں سے کچھ جمع کرنے کا خیال بھی کرے۔ شیطان کے ان الفاظ سے خود بخود میری زبان پر لفظ "آبا" آنے کو تھا کہ یکایک مجھے سخت حیرانی ہوئی کیونکہ میں پھر اپنے کمرے میں تھا۔ شیطان اسی طرح میرے سامنے آرام کرسی پر تھا۔ پانی کا گلاس جو ابھی میرے نوکر نے اسے دیا تھا نیم پر تھا۔

شیطان۔ میں نے آپ کو آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا تھا آپ تو سو ہی گئے۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ان حضرت کی شعبدہ بازی ہے۔ مجھے سب کچھ دکھلا بھی دیا اور پھر اپنے آپ کو الگ بھی ظاہر کر دیا۔ گویا کہ نورجہاں وغیرہ کی ملاقات خواب میں میرے ہی خیالات کے تلاطم کا نتیجہ تھی یہ جونہی میرے چہرہ سے ظاہر ہوا تو شیطان بولا۔

شیطان۔ جی نہیں۔ واقعی آپکا قیاس غلط ہے۔ مجھے شعبدہ بازی نہیں آتی۔ مجھے بھی کیا آپ نے پیر یا جوگی مقرر کیا ہے۔

میں۔ اس وقت تو آپ نے میرے دل کی بات معلوم کر لی۔ پھر اور جو کچھ میرے دل میں ہے اسے آپ کیوں پورا نہیں کرتے میں فلسفہ بازی سے سخت گھبراتا ہوں۔ آپ چاہے مجھے ہزار یقین دلائیں کہ آپکی شعبدہ بازی نہیں اور نورجہاں وغیرہ کے متعلق جو کچھ میں دیکھ چکا ہوں وہ میرے پریشان خیالات کا عکس ہے مگر میں خوب جانتا ہوں کہ آپ ہی کی کارستانی ہے۔

شیطان۔ اچھا یونہی سہی۔ میں تو یہی چاہتا ہوں کہ ہر شخص اپنی ہٹ پر قائم رہے مجھے اس سے زیادہ کیا کامیابی ہوگی کہ جس

برائی (ہٹ) کے عوض "معلم الملکوت" کے درجہ سے
میری معزولی ہوئی وہ برائی سب انسانوں میں پیدا ہو۔

میں۔ حضرت۔ یہ چُل کسی اور کو دیجیئے۔ آپ
کیوں خیال کرتے ہیں کہ میں اُن گنوار گھامڑوں میں
سے ہوں جن کے ارادہ میں آپ اپنی چکنی چپڑی
باتوں سے تغیر پیدا کرسکتے ہیں۔ میں طاقت چاہتا
ہوں۔ وہ طاقت جو مجھے نیچر پر غالب کر دے۔
تمام جہانوں میں ایک خدا کی طرح پھروں۔ چاہوں
تو زمین کو سُورج کی غلامی سے۔ چاند کو زمین کی قید سے
آزاد کر دوں۔ قطبی تارے کو جنوب بھیج دوں کہکشاں
سمیٹ لوں۔ مریخ کو زحل۔ زحل کو آفتاب۔ آفتاب
کو پاکٹ لمپ بنا دوں۔ آپ کیا باتیں کرتے ہیں
مجھے اخلاق سے نیکی سے۔ خیالات کی پاکیزگی
سے کیا تعلق؟ میں ان چیزوں سے بالاتر ہونا
چاہتا ہوں۔ وہ طاقت چاہتا ہوں جو اپنے
لئے خود قانون ہو۔ آپ اپنے پُرانے دقیانوسی
وتیرے کو چھوڑیئے۔ انسانی دماغ اب وہ نہیں کہ
دُنیاوی جاہ وحشم کے واسطے شیطان کی مدد کا محتاج ہو
مجھے افسوس ہوگا اگر یہ نتیجہ نکلا کہ اتنے لکھو کھا سال
میں انسان نے تو آخر کچھ نہ کچھ ترقی کی مگر شیطان صاحب
بقول آپ کے وہی مکتب کے مُلّا رہے۔

شیطان۔ اب مجھے تسلیم کرنا پڑیگا۔ کہ
آپ کی گفتگو بڑی پُرلطف ہے۔ جو باتیں ہزاروں
سال ہُوئے مصر میں سُنی تھیں وہ آج پھر ہندوستان
میں ایک نئی شان سے پیدا ہیں۔

میں۔ ہیں! کیا یہ خیالات کبھی پہلے بھی
کسی نے ظاہر کئے ہیں؟

شیطان۔ کئی دفعہ۔ اگر بالکل یہ نہیں تو
ان کے قریب قریب لیکن آپ کو یہ خیال کرکے
اگر خوشی ہوتی ہے کہ یہ خاص آپ کی جدت طبع
کا نتیجہ ہیں تو آپ میری بات باور نہ کیجئے۔ اپنے
خیال پر قائم رہیئے۔

میں۔ جدت ہو یا نہ ہو۔ یہی خیال ہیں جو
ایک بلند حوصلہ انسان کو باقی لکیر کے فقیروں سے
متمیز کرتے ہیں۔ میں طاقت چاہتا ہوں۔ ایسی
جو تمام کائنات کی کایا پلٹ دینے کے لئے کافی ہو۔

شیطان۔ میں آپ کی مدد کے لئے تیار
ہوں۔ وہ طاقت حاصل ہوسکتی ہے۔ صرف
محنت اور وقت درکار ہے۔

میں۔ (بڑے زور سے) محنت کے
لئے تیار ہوں۔ کیسی ہی مشقت کیوں نہ ہو۔ مگر
یہ بتلاؤ کہ وقت کتنا لگیگا؟

شیطان۔ جی زیادہ نہیں۔

میں۔ (بڑی بے تابی سے) پھر بھی کتنا؟

شیطان۔ بس یہی دس بیس لاکھ سال۔

جونہی یہ لفظ مجھے سُنائی دیئے میرا کلیجہ

پاش پاش ہوگیا مگر پھر بھی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور بڑے جوش سے کہا۔

"اچھا کیا ہوا۔ میں مر کر پھر پیدا ہوں گا۔ اور ضرور اس طاقت کو حاصل کرونگا میں انسانی نسل کی صدا ہوں۔ ضرور بالضرور آخرالامر انسان کو وہ خدا بننا ہے جس کی تعریف میں متبرک کتابیں پُر ہیں۔"

اسی جوش اور مایوسی کے صدمے سے میں بیہوش ہوا تھا نہ کہ شراب سے۔ اب میں تھک گیا ہوں اور سوتا ہوں۔

شریر کی ڈائری کا دوسرا حصہ

میری بیوی میری بیماری میں اور کل جب مجھے ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے کی اجازت دی پروانہ وار مجھ پر نثار ہوتی رہی۔ باوجود اس کے کہ میں موقع بے موقع اسے جتلاتا رہتا ہوں کہ وہ سخت پھوڑ ہے۔ نااہل ہے۔ شکل کی سیدھی ہے اسکی اطاعت وفرمانبرداری اور خدمت میں سر مو فرق نہیں آتا اس پر میرے جور و جفا کا کچھ اثر ہی نہیں۔ اگر میں دُنیا بھر میں بہترین خاوند ہوتا تو بھی کوئی بیوی میری اس سے زیادہ خدمت نہ کرتی جو بانو کرتی ہے۔ آج صبح میری طبیعت پھر اصلی رنگ پر تھی۔ عارضی بیماری کی کمزوری قریباً دور ہو چکی تھی۔ واقعی بانو کو محض خفیف کرنے کے لئے اسے میں نے کل کی ڈائری سُنائی اور اس سے ماقبل کے واقعات کا ذکر کیا۔ ڈائری اور سرگذشت سن کر کچھ گفتگو ہم دونوں کے درمیان ہُوئی۔ میرا خیال ہے کہ اس گفتگو سے میری زندگی آئندہ کے لئے بالکل بدل جائیگی۔ بانو نے مجھے وہ دیدیا ہے جو کوئی بادشاہ۔ کوئی ولی۔ کوئی مذہب کا بانی نہیں دے سکتا۔ بانو۔ بانو کس قدر میری عقل پر پردہ تھا۔ اور کس آسانی سے بانو تو نے وہ پردہ دُور کر دیا ہے۔ آئندہ میں تجھے پیار نہیں کرونگا۔ بلکہ تیری پرستش کرونگا۔ تیری گفتگو صرف اس لئے قلمبند کرتا ہوں کہ مجھے اس کا کوئی جملہ بھول نہ جائے۔ اور مجھے یہ بھی یاد رہے کہ میں تو تجھے خفیف کرنا چاہتا تھا مگر تو نے مجھے اسفل السافلین سے اُٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا۔ نہ تیرے دل میں انتقام کا خیال آیا نہ تیور پر بل نہ آنکھ میں آنسو۔ بانو بانو تو عورت نہیں فرشتہ ہے۔

بانو۔ (ڈائری سُن کر) شیطان نے ناحق آپ کے دل میں وسوسہ ڈالدیا ہے کہ آپ میری دل آزاری کرتے ہیں۔ (میرے پاؤں پر سر رکھ کر) اگر کبھی اپنی کسی حرکت سے مجھ بیوقوف نے آپ پر یہ ظاہر کیا ہے کہ آپ میری دل آزاری

کر رہے ہیں تو للہ آپ معاف کریں۔ میں آپ کی
کنیز ہوں۔"

(میں نے جلدی سے بانو کا سر پاؤں سے
ہٹا لیا۔ وہ اپنی دھیمی صادق آواز سے پھر بولی۔)

میں آپ کی ایک محبت کی نگاہ کی قیمت
ساری عمر کی خدمت سے ادا نہیں کر سکتی۔ اور
ایک کیا ایسی سینکڑوں پیار کی نگاہوں کی یاد
میرے دل میں ہے۔ میری جان کے مالک! کیا
آپ کے خیال میں بنتؓ رسولؐ کی نام لیوا
مسلمان خاتونیں ایسی گئی گذری ہوگئیں؟ ہرگز
آپ یہ خیال نہ کریں۔ ہر سمجھدار مسلمان خاتون
کا فرض ہے کہ وہ اپنے شوہر کی خاطر اپنے آپ کو
بالکل محو کر دے۔ مجھ میں تو ہزاروں کمزوریاں
ہیں سخت نامسلم ہونگی اگر جیسے آپ ہیں اس پر
فخر نہ کروں بلکہ اُلٹا گلہ کروں۔ پیار کے جواب
میں، یا پیار کی اُمید میں یا راحت و آرام کے عوض
میں خدمت کی تو کیا کی؟ رنج میں راحت میں۔ بھوک
میں پیاس میں۔ تشدد میں۔ تکلیف میں۔ شوہر کی
سچے دل سے عزت کرنا۔ اس کی غمگسار بن کر اس کی
ہمہ تن خدمت کرنا مسلمان خاتونوں کا خاصہ ہے۔
میں اس نصب العین سے بہت دُور ہوں۔ مگر
یہ میرا مذہب ہے۔ اللہ میری کوتاہیوں کو معاف
کرے آپ کبھی بھول کر بھی خیال نہ کریں کہ میں
ناخوش ہوں۔ یا کبھی ہوئی۔ صرف مجھے اپنی خدمت
کی عزت کا موقع دیتے رہیئے۔ اور میں کچھ نہیں
چاہتی۔ ہاں چاہتی ہوں اپنی گذشتہ غلطیوں کی
معافی۔ آپ کی صحت۔ آپ کی خوشی۔ آپ کی
عزت۔ آپ کے لئے سب کچھ چاہتی ہوں۔
بہت زیادہ چاہتی ہوں۔ اپنے لئے صرف آپ کی
خدمت۔ اگر مجھ سے خدمت میں کوتاہی ہوئی تو
قیامت میں آپ کے والد کو کیا مُنہ دکھاؤں گی؟

میں۔ بانو بانو۔ خدا کے لئے ایسی باتیں
نہ کرو۔ میں تمہارا سخت قصوروار ہوں۔ تم مجھے
معاف کرو۔

بانو نے میرے مُنہ پر اپنا ملائم ہاتھ رکھدیا
اور کہا توبہ توبہ۔ لونڈی سے بھی کوئی معافی مانگتا
ہے" یہ لفظ اس نے بالکل بلاتصنع کہے اسکے
دل سے نکلے۔ آخر میں نے اسکا ہاتھ پرے
کیا اور کہا "بانو! لونڈی نہیں ملکہ بلکہ ہادی۔ اب
زیادہ میں کچھ نہیں کہتا مگر کوشش کرونگا کہ اس
قابل بنوں کہ تمہاری جیسی فرشتہ خصلت بیوی
کے قدم بقدم چلوں۔ اگر اسلام تمہاری جیسی خاتونیں
پیدا کر سکتا ہے تو مسلمان ہونے سے بڑھ کر دُنیا
میں کوئی عزت نہیں۔ آج سے الحاد کو رخصت
بانو بانو۔ تیرا دل خدا نے اپنے ہاتھ سے بنایا
ہے ❖

شریر کی ڈائری کا تیسرا حصہ

میری زندگی ہیں کس قسم کے عجائبات کا ظہور ہو رہا ہے؟ - آج صبح میں اُٹھا تو میرے میز پر ایک خط پڑا تھا حالانکہ میرے کمرے میں کوئی شخص داخل نہیں ہُوا تھا - اس خط کو تین چار دفعہ میں نے شروع سے آخر تک بڑے غور سے پڑھا اور پھر رکھ کر بانو کو بلانے گیا - ابھی کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا کہ مُڑتے مُڑتے اسی جگہ پر نظر کی جہاں خط رکھا تھا - دیکھا تو خط غائب - اب اس کا مطلب قلمبند کرتا ہوں - خط میرے نام شیطان کی طرف سے تھا -

خط

ڈیر مسٹر شریر! - میری خود پسندی - میری غیر معمولی کامیابی سے اور بھی چمک اُٹھی ہے اور میں خلافِ عادت آج ایک انسان کو اپنا محرمِ راز بناتا ہوں -

سُنئے - لاکھوں برس میں اسی دھوکے میں رہا کہ بہشت والے معاملے میں میں مظلوم تھا اور خدا ظالم - بزعمِ خود مجھے یہ سچی شکایت تھی کہ حوا نے مجھے ورغلایا اور اُلٹا مشہور کر دیا کہ میں نے اسے بہکایا - میں دانت پیستا تھا - کہ کس قدر بہتان ہے کہ آدم بہشت سے نکالا گیا - آدم اور آدم کی اولاد نے میرے ذریعہ سے دُنیا میں آکر ہزاروں خود ساختہ باغِ ارم بنائے - جس گھر میں شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے سچے عاشق وہیں بہشت - ایک بہشت چھوڑی اور لاکھوں پائیں - بنی نوع انسان کو میرا ممنون ہونا چاہئیے تھا نہ یہ کہ اپنا مطلب تو نکال لیا اور مجھے بدنام کر دیا -

یہ میرا وہم میری سزا تھی - میرا دوزخ تھا اور اس میرے وہم نے واقعی مجھے شیطان (جیسا کہ میں مشہور ہوں) بنا دیا تھا - خدا کو میں ہمیشہ "بڈھے دشمن" کے جملے سے یاد کرتا اور اس کی ہر بات کو ایک چکمہ سمجھتا - لاکھوں برس انسانی رُوح کا شکار میرا کھیل رہا مگر وہ زمانہ ختم ہو چکا ہے - اور اس کے خاتمے کی داستان بھی عجیب ہے -

غور سے سُنئے - ایک دن محض اتفاقیہ طور پر میں اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈال رہا تھا - اور خیال کر رہا تھا کہ گو خدا سے جنگ کر کے میں نے پے در پے زک اُٹھائی مگر لاکھوں کروڑوں انسانی روحیں تو مجروح کیں اس خیال سے میں خوش رہا تھا کہ الٰہی قہقہہ نے مجھے بدمزہ کر دیا - مجھ پر صاف واضح ہو گیا کہ دراصل ایک روح کا بھی ان لاکھوں سالوں میں کچھ نہ بگاڑ سکا - جو گرا سوا اپنے ہاتھوں - میری شیطنت کا کسی کے

زوال پر کسی کے گناہ پر سر مو بھی اثر نہ تھا۔ لاکھوں سال بیں محض اپنے آپ کو دھوکا دیتا رہا۔ اس دن مجھے پتہ لگا کہ میری ہستی ایک قلمزن شدہ حرفِ غلط سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ ایک آخری کوشش میں نے کی اور وہ یہ کہ ایک واقعی سچی مسلمان دل عورت کے ایمان میں خلل ڈالوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ کیا نتیجہ ہوا؟ ہرگز نہیں وہ نیک نہاد ویسی ہی پاک صاف رہی اور بجائے اس کے کہ وہ مایوس ہوتی اس نے اپنے دشمنوں کے حق میں یہ دعا کی کہ "یا الٰہی میرے دشمن بے سمجھ ہیں انہیں نیک توفیق دے۔ اور شیطان جو انہیں ورغلاتا ہے اسے بھی راستی کی ہدایت کر"

یہ دعا اس نے ایسے وقت کی جب کہ میں اپنے دل میں پیچ و تاب کھا کر یہ کہہ رہا تھا کہ "کمبخت مسلمان قوم مٹتے مٹتے بھی کس قدر دیر لگا رہی ہے۔ نہیں مٹے گی جب تک کہ ایک بھی ایماندار عورت اس قوم میں باقی ہے"

میرا یہ خیال اور ایک نیک عورت کی یہ دعا۔ میں جو کبھی اپنے کئے پر منفعل نہ ہوا تھا جسکی لغت میں ندامت کا لفظ معدوم تھا اس دن مر گیا۔ اس دن سے میرا عہد ہے کہ جہاں کہیں نیک عورت کو پاؤں اسکی خدمت کروں۔ "حوا" پر بدگمانی کرنے کا کفارہ یہی ہے کہ اس کی نیک اولاد کی خدمت کروں۔

یہ وجہ تھی کہ مسز شربد کے اور آپکے درمیان مصالحت کرانیکی آرزو میرے دل میں تھی۔ میں نازاں ہوں کہ مجھے آپ کے معاملے میں کامیابی ہوئی اور پوری"

یہ تھا شیطان کا خط۔ جب ابلیس بھی نیک خاتون کا ممد ہو تو لعنت ہے ان پر جو ایسا خیال کریں جن سے شیطان توبہ کر چکا ہو۔

عبد العزیز

تبدیلِ قسمت

۱

سلطان سنگھ نے استقلال بھرے لہجہ میں کہا "میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کر لونگا"

ساگر چند جوش کی حالت میں تیر کی مانند تن کر کھڑا ہو گیا اور تھرتھرائی ہوئی آواز میں بولا "تم مذاق تو نہیں کر رہے"

"یہ مذاق کا موقعہ نہیں"

"تو تم سنجیدگی سے کہہ رہے ہو؟"

"واقعی"

"تمہیں اُمید ہے کہ ایک سال کے عرصۂ قلیل میں کامیاب ہو جاؤ گے؟"

"سولھوں آنے"

"آج کیا تاریخ ہے؟"

سلطان سنگھ نے دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک میلے سے کیلنڈر کی طرف دیکھ کر کہا "۳۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء"

"تو یکم نومبر ۱۹۱۳ء کا سورج تمہیں غریب نہ دیکھیگا"

"بالکل نہیں"

سلطان سنگھ ان اشخاص میں سے تھا جنہیں لوگ شریف بدمعاش کہتے ہیں۔ کبھی اس نے بہت اچھے دن دیکھے تھے۔ اس کا باپ دولت رام شہر کے ممتاز رؤساء میں سے تھا۔ اس کے پاس روپے کی کمی نہ تھی۔ صدر بازار میں تین دکانیں تھیں۔ دو مکان۔ بنکوں میں روپیہ اس کے علاوہ تھا۔ مگر اتنا ہی نہیں۔ اس کا دل متاع دیانت و حسنِ شرافت سے بھی مالا مال تھا۔ جب تک زندہ رہا۔ اس کے نام کی سارے شہر میں پُوجا ہوتی رہی۔ لیکن اُدھر اس نے آنکھیں بند کیں۔ اِدھر سُلطان سنگھ نے اس کا روپیہ اُڑانے پر کمر باندھ لی۔ دولت رام کی پیش بندیوں نے سُلطان سنگھ کو کبھی حد اعتدال سے متجاوز نہیں ہونے دیا تھا اُس وقت وہ ایک طائر بے بال و پر تھا۔ جس کی بے بسی سے زیادہ دردناک اس کی حسرتِ پرواز تھی دولت رام کی وفات نے اس کو پر لگا دیئے۔ دو سال تک کھُل کر عیش کیئے۔ اور اپنے دِل کے ارمان نکالتا رہا۔ یہ عرصہ اس کی زندگی کا نغمۂ خواب تھا جس کو پامال کرنے کے لئے کوئی بیداری نہ تھی۔ ہفتہ کے ساتوں دِن جلسے ہوتے رہتے تھے۔

اور یہ جلسے کوئی معمولی جلسے نہ ہوتے تھے۔ ایک ایک دن میں ہینکڑوں پر پانی پھر جاتا تھا۔ اس کی ان خوش فعلیوں نے اس کے باپ کی جائداد کو برباد کرڈالا جس طرح برساتی نالے کی پُرآشوب روانی کناروں کے ٹوٹ جانے سے سرسبز کھیتوں کو نگل جاتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود اس کی شکل وصورت سے یہ گمان نہ ہوتا تھا۔ کہ اس میں یہ گُن بھی ہونگے ناواقف آدمی اکثر دھوکا کھا جاتے تھے۔ اور سمجھ بیٹھتے تھے۔ کہ اس کے مُنہ میں تو زبان بھی نہیں۔ اس کی متین نگاہیں جُھکی ہُوئی آنکھیں اور مہذبانہ اطوار دیکھ کر کسی کو خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ یہ شخص اوباش بھی ہو سکتا ہے۔ اس نے نقد روپیہ اُڑا دیا۔ مکانوں کو رہن بھی رکھ دیا۔ لیکن اُنہیں فروخت نہیں کیا۔ عمارت گر گئی تھی لیکن چاردیواری قائم تھی۔ یہ چاردیواری اس کی گذشتہ عظمت کی آخری یادگار تھی۔ جسے قائم رکھنے کے لئے وہ پُورے دل وجان سے کوشش کر رہا تھا۔ انسان اتنا ذلت سے نہیں ڈرتا۔ جتنا اسکی تشہیر سے ڈرتا ہے۔ سُلطان سنگھ نے جو کچھ کیا پردے کی اوٹ میں کیا۔ گو کسی قدر بدنام ہوگیا تھا مگر نہ اس قدر کہ لوگ نفرت کرنے لگیں۔ اس کے باپ کا دبدبہ ابھی تک باقی تھا۔ آدمی مر جاتا ہے اُس کی شہرت زندہ رہتی ہے۔

اسی طرح کچھ سال گذر گئے۔ تب سُلطان سنگھ کی آنکھیں وا ہُوئیں۔ جبتک روپیہ عام تھا۔ تب تک کوئی خیال نہ تھا۔ روپیہ آتا تھا۔ خرچ ہو جاتا تھا بنک سے منگوانے میں کوئی محنت صرف نہ ہوتی تھی۔ ایک پُرزہ کاغذ بھیجنے ہی سے کام چل جاتا تھا۔ لیکن جب وہ خرچ ہوگیا۔ تو بہارِ بے خزاں میں غم کے پہلو نمودار ہُوئے۔ سُلطان سنگھ تذبذب میں پڑ گیا۔ جس طرح ناٹک دیکھنے کے بعد آدمی منڈوے کے باہر کی تاریکی دیکھ کر گھبرا جاتا ہے اسی طرح سلطان سنگھ کے سامنے عسرت نے اندھیرا پھیلا دیا۔ اس عُسرت میں کتنی رِقت تھی، کتنی حسرت۔ سُلطان سنگھ کے دل پر جیسے کسی نے گرم لوہا رکھ دیا۔ ایک دن دیر تک اپنی حالت پر غور کرتا رہا۔ آخر تلملا کر کھڑا ہوگیا۔ اور استقلال بھرے لہجہ میں بولا۔ "میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کر لُونگا"

۲

ساگر چند سُلطان سنگھ کا دوست تھا۔ سُلطان سنگھ کو اس پر پُورا پُورا بھروسہ تھا۔ وہ اپنے پوشیدہ سے پوشیدہ امور میں بھی اسے شریک کرنے سے نہیں ہچکچاتا تھا۔ ساگر چند محض سُلطان سنگھ کے روپیہ کا خواہاں ہو۔ یہ بات

نہ تھی۔ اسے سلطان سنگھ سے عشق تھا۔ عموماً دیکھا گیا ہے۔ کہ بدمعاش لوگوں میں بھی کوئی نہ کوئی صفت نیک ضرور پائی جاتی ہے۔ جس طرح تاریک گھٹا کے گرد سفید دھاری ہوتی ہے۔ ساگر چند چھٹا ہُوا غنڈہ تھا۔ لیکن اس میں بھی ایک خوبی تھی، دوست پروری کا جذبہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھا۔ جب سلطان سنگھ نے خرچ سے ہاتھ کھینچنا شروع کیا۔ تو اسکے احباب غیر حاضر رہنے لگے۔ وہ شریف گھرانوں کے تھے۔ مگر ساگر چند کی سرگرمیوں میں فرق نہ آیا وہ ذلیل کمینہ تھا۔ پلیگ کے دنوں میں جب شہر خالی ہوجاتے ہیں اور لوگ لاشوں کو لاوارث چھوڑ کر جان بچانے کی خاطر بھاگ جاتے ہیں۔ تو خدمت کو وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جو بدمعاش ہوتے ہیں۔

ساگر چند جب سلطان سنگھ کے ارادے سے آگاہ ہُوا کہ وہ ایک سال میں اپنی اصلاح کرلیگا۔ تو اُس کا دل خوشی کے ہچکورے لینے لگا۔ جیسے کنول پانی میں تیرتا ہے اس وقت اسکی آنکھوں میں چمک تھی۔ لبوں پر مُسکراہٹ ہمدردی کے انداز سے آگے بڑھا۔ اور بولا" کیا کروگے"؟

سُلطان سنگھ نے زاہدانہ طریق سے جواب دیا" کوشش کرنا فرض ہے۔ وہ کروں گا۔ دیکھا چاہیئے۔ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

ساگر چند کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے سُلطان سنگھ اس سے بات چھپا رہا ہے۔ اُس کے دِل میں تیر سا لگا۔ افسردہ خاطر ہو کر بولا" مجھ سے نہیں کہو گے۔؟"

سُلطان سنگھ پر اصل حقیقت واضح ہوگئی۔ اُس نے گھبرا کر کہا" میرا یہ مدعا نہ تھا"

"تو بات کھول کیوں نہیں دیتے؟"

"ابھی سُننا چاہتے ہو یا ٹھیر کر"؟

"میرا دل تو ابھی چاہتا ہے۔ جب تک سُن نہ لوں گا۔ چین نہ آئیگا"

سُلطان سنگھ نے احتیاطاً کمرے سے باہر نگاہ دوڑائی۔ اور آہستہ سے کہا" میں بیاہ کروں گا"

"اس کے بعد؟"

"بیوی کی زندگی کا بیمہ کراؤں گا"

"پھر"

"بیوی مر جائے گی"

"اور اگر نہ مرے تو۔"

"نہ مرنے کی وجہ کیا ہے۔ ضرور مریگی"

ساگر چند بالکل بُدھو نہ تھا۔ اس نے

مڈل تک تعلیم پائی تھی۔ سُلطان سنگھ کی مُسکراہٹ دیکھ کر صورت حال سمجھ گیا۔ اور بولا "خوب۔ گویا اسکی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہوگی"

"پورے طور پر۔"

"اس سے آگے کہو"

"وہ مر جائیگی۔ میری قسمت تبدیل ہوجائیگی"

ساگر چند نے چند منٹ تک توقف کیا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ وہ اس سے زیادہ آگے جانے کو بھی تیار تھا۔ لیکن اسے اندیشہ یہ تھا کہیں سُلطان سنگھ اس ارادہ سے متزلزل تو نہ ہوجائیگا۔ یا اُسے اس سے کوئی نقصان تو نہ پہنچ جائیگا۔ اُس نے اس سوال کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا۔ اور کہا "اسکیم تو بڑے غضب کی ہے۔ اگر کامیاب ہوجائے۔ تو واقعی تمہاری قسمت تبدیل ہو سکتی ہے۔ لیکن اس میں خطرات کی بھی کمی نہیں۔"

سُلطان سنگھ نے جواب دیا "بھئی موتی سمندر کی تہ سے ہی نکلتا ہے۔ اس کے لئے موت کے مُنہ میں جانا ہوتا ہے"

اس وقت سُلطان سنگھ ایسا خوش تھا جیسے کوئی سلطنت مل گئی ہے۔

اس کے دو مہینے بعد سُلطان سنگھ کی شادی ہو گئی۔

۳

شام کا وقت تھا۔ سلطان سنگھ اپنے صحن میں آرام کرسی پر بیٹھا ایک ناول دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ملازم نے آکر کہا "سرکار منروا انشورنس کمپنی کا ایجنٹ آیا ہے"

سُلطان سنگھ نے ناول ہاتھ سے رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس وقت اس کے دل میں خیالات کا ہجوم برپا تھا۔ سوچنے لگا۔ کیا کرنے لگا ہوں۔ میرے باپ نے رفاہ عام کے لئے پکی سرائے بنوائی تھی۔ میں اپنے لئے ایک معصوم لڑکی کو قتل کرنا چاہتا ہوں۔ باپ بیٹے میں کس قدر فرق ہے۔ اگر یہ بات کسی طرح کھل گئی تو.....

سُلطان سنگھ کا دل و دماغ گھومنے لگا۔ اس پر از خود رفتگی کا عالم طاری ہوگیا۔ گناہ سے زیادہ خوفناک گناہ کا خیال ہے۔ سُلطان سنگھ کے پائے استقلال متزلزل ہوگئے۔ فیصلہ کیا کہ یہ پاپ نہ کروں۔ مگر اتنے میں ہوس نے سر اُٹھایا ہوا کا رُخ تبدیل ہوگیا۔ سُلطان سنگھ نے جواب دیا "بُلاؤ۔"

گناہ کا راستہ کتنا صاف ہے۔

ایجنٹ نے آکر سلام کیا۔ اور بیٹھ کر کمپنی کے پراسپکٹس سلطان سنگھ کے ہاتھ میں رکھ دیئے سلطان سنگھ نے چند ورق اُلٹ پُلٹ کر دیکھے اور پُوچھا "آپکی کمپنی مستورات کا بھی بیمہ کرتی ہے؟"

ایجنٹ نے قدرے متعجب ہو کر جواب دیا۔ "جی ہاں کرتی ہے۔"

"اُس کے متعلق Rate (نرخ) دکھائیے۔"

"کتنے سال کے لئے؟"

"بیس سال کے لئے۔"

ایجنٹ نے ایک صفحہ نکال کر کہا۔ "یہ ہے۔"

سُلطان سنگھ نے دیکھ کر جواب دیا۔

"بہُت زیادہ ہیں۔"

"عورتوں کے زیادہ ہی ہوتے ہیں۔ کمپنی کو بڑا Risk (خطرہ) ہوتا ہے۔"

"ہوں۔"

"آپ کتنے روپوں کی پالیسی لینا چاہتے ہیں۔"؟

"ایک لاکھ کی۔"

ایجنٹ نے اُچھل کر کہا۔ "ایک لاکھ کی؟"

"ہاں ایک لاکھ کی۔ کتنے روپے ماہوار دینے ہونگے۔"

ایجنٹ نے پہلے یہ تخمینہ لگایا کہ مجھے ماہوار کمیشن کیا ملیگا۔ امید نے چہرہ گلرنگ کر دیا پھر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے کہا۔ "پانسو بارہ روپے ماہوار۔"

"بہُت زیادہ رقم ہے۔ گویا سوا لاکھ کے قریب تو ہم ادا کر دیں گے۔ اور ہم کو ملیگا صرف ایک لاکھ۔ سراسر نقصان کا سودا ہے۔"

ایجنٹ کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ اندیشہ ہوُا کہ کہیں ارادہ رہ ہی نہ جائے۔ پُرجوش طریقہ سے بولا۔ "جناب عالی! کمپنی جو Risk سر پر لے رہی ہے۔ وہ بھی تو تھوڑا نہیں۔ ایک لاکھ کی رقم بھی آخر کوئی چیز ہے۔ ہندوستان میں اس کا رواج نہیں یورپ میں تو ہر ایک شخص بیمہ کرانا فرض سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ وہاں ایک آدمی کی مَوت پر سارا خاندان بھوکوں نہیں مرتا۔"

سلطان سنگھ اپنے خیال میں مگن تھا۔

ایجنٹ نے سمجھا میری تقریر کام کر گئی۔ سنبھل کر بولا۔ "تو فارم پُر ی کر دیجئے گا۔ کل معائینہ ہو جائیگا۔"

کانپتے ہُوئے ہاتھوں نے فارم پُری کی۔ دوسرے دن معائینہ ہو گیا۔ سُلطان سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ کامیابی کے دو مرحلے طے ہو گئے۔ کیا تیسرا ابھی ہو گا۔

۴

چھ مہینے گذر گئے۔ سُلطان سنگھ نے اپنی بیوی ست ونتی کی طرف توجہ نہ کی۔ وہ عموماً مردانے ہی میں رہتا تھا۔ زنانے میں جاتے ہُوئے اُس کی رُوح کانپتی تھی۔ وہ اکثر راتوں کو بھی مردانے میں پڑا رہتا تھا۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ست ونتی سے جتنی کم ہو سکے ملاقات کروں۔ اس کے مُنہ کی

طرف دیکھ کر اس کے ارادے پست ہو جاتے تھے وہ جب کبھی اسکی نشۂ محبت سے سرشار آنکھوں کی طرف دیکھ لیتا تھا تو ہفتوں تک اس کے دل میں ہلچل مچی رہتی تھی۔ اُس کی یہ خواہش کہ بیوی بدصورت ہو۔ پُوری نہ ہُوئی۔ وہ نہایت حسین تھی جیسے سنگِ مرمر کی مُورت۔ اُسے دیکھ کر سُلطان سنگھ حیرت میں آجاتا تھا۔ اس نے خوبصورت سے خوبصورت عورتیں دیکھی تھیں لیکن ایسی خوبصورت عورت آجتک نہ دیکھی تھی۔ اسے شبہ ہونے لگا کہ میں اپنا کام نہ کرسکونگا۔ خوبصورتی نے اپنا کرشمہ دکھایا۔ کہتے ہیں حسن سے درندے بھی رام ہو جاتے ہیں۔ کیا سلطان سنگھ ان سے بھی گیا گذرا ہے۔

برسات کے دن تھے۔ آسمان پر بادل گھرے ہُوئے تھے۔ سُلطان سنگھ شراب کے نشہ میں مخمور ایک شیشی لئے زنانے میں گیا۔ اور ست ونتی سے بولا۔" اسے سنبھال کر رکھنا۔ روز آن صبح اُٹھ کر پیا کرو۔ تمہاری صحت گر رہی ہے ٹھیک ہو جائیگی۔"

یہ دوا ایک دیسی حکیم نے تیار کی تھی جس کا مہلک اثر آہستہ آہستہ ہڈیوں میں سرایت کر جاتا ہے۔ اور معائنہ سے معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ مقتول کو زہر دیا گیا ہے۔ ست ونتی نے خاوند کے مُنہ سے یہ کلمات محبت کے سُنے تو سورگ میں پُہنچ گئی۔ اور مُسکراتے ہُوئے بولی:" یہ کیا ہے شراب تو نہیں؟"

"نہیں طاقت کی دوا ہے۔"

"آپ بھی پیا کریں۔ فکروں نے چہرے کا کیا حال کر دیا ہے؟"

کیسا فقرہ تھا۔ محبت کے رس میں ڈوبی ہُوئی تاثیر۔ سُلطان سنگھ کے ضمیر نے ملامت کرنا شروع کیا۔ لیکن اس نے اپنے جاگتے ہُوئے جذبہ کو اندر ہی اندر دبا دیا اور کہا:" میرے لئے دوسری چیز تیار ہو رہی ہے۔"

اس وقت اس کے سینے میں دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

۵

دن چڑھا۔ مگر سلطان سنگھ کو ہوش نہ تھا۔ ست ونتی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے اس نے گھبرا کر ڈاکٹر کو بلوایا۔ اس وقت سلطان سنگھ بے ہوش پڑا تھا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا ۱۰۶ درجہ کا بُخار۔ ست ونتی سُن کر سہم گئی۔ اُسکی آنکھوں میں پانی آگیا۔ بھرّائی ہُوئی آواز میں بولی:" کوئی خطرہ تو نہیں۔"

"ابھی تک تو نہیں۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بہت جلد نمونیہ ہو جائیگا۔"

ست ونتی کی روکی ہوئی چیخیں نکل گئیں۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

ڈاکٹر نے کہا "اس سے کیا ہوگا۔ احتیاط کرو۔"

بہتا ہوا پانی تھم گیا۔ ست ونتی احتیاط اور خدمت کرنے پر کمربستہ ہوگئی۔ اس نے سمجھ لیا۔ کہ اس وقت رونے سے کام نہ چلیگا۔ لٹتی ہوئی زندگی بچ سکتی ہے تو صرف خدمت سے وہ خاوند کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اور وقت پر دوائی پلائی گئی۔ دن گذر گیا۔ مگر بخار میں افاقہ نہ ہوا۔ رات گذر گئی۔ مگر فرق نہ پڑا۔ ڈاکٹر نے آکر دیکھا۔ اور کہا "جس بات کا اندیشہ تھا۔ وہ ہوگئی۔ نمونیہ ہوگیا ہے۔"

ست ونتی کے کلیجے میں بھالا سا چبھ گیا۔ لیکن اس نے آنکھوں کو بے قابو نہیں ہونے دیا۔ تیمارداری میں مشغول ہوگئی۔ سلطان سنگھ متواتر ایک ماہ بیمار رہا۔ ست ونتی نے دن رات ایک کردیا۔ جب کبھی سلطان سنگھ کو ہوش آتا۔ ست ونتی عقیدت مندانہ انداز سے تیمارداری میں مصروف نظر آتی۔ یہ دیکھ کر اس کو خیال آتا۔ کہ یہ کس قدر نیک ہے محبت کا سوتا۔ اور میں کتنا نیچ ہوں۔ روپے کا غلام۔ اس خیال سے اس کے دل میں خیالات کا ہجوم برپا ہو جاتا تھا۔ جو کام خوبصورتی نہ کرسکتی تھی۔ اسے محبت اور خدمت نے کردیا۔

آخر سلطان سنگھ چارپائی سے اُٹھا۔ اس دن ست ونتی کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اس کا چہرہ اس طرح چمکتا تھا۔ جیسے چودھویں کا چاند۔ ڈاکٹر نے سلطان سنگھ سے کہا۔ میں مبالغہ نہیں کرتا۔ کہ اگر یہ دیوی اس تندہی سے آپ کی سیوا نہ کرتی۔ تو آپ کا جانبر ہونا ناممکن کے قریب قریب تھا۔"

ڈاکٹر چلا گیا۔ تو ست ونتی نے گھونگھٹ اُٹھایا۔ سلطان سنگھ پر جذبے کا عالم طاری تھا۔ وہ جوشِ محبت سے بیتاب ہو کر بولا "ست ونتی"

ست ونتی نے جواب دیا "آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ میری دوا آپ ہی پی لیا کریں۔ کمزوری رفع ہو جائیگی"

سلطان سنگھ کو جیسے کسی نے گولی ماردی گھبرا کر بولا۔

"وہ تم نے پی تو نہیں لی۔"

"نہیں"

"ذرا لے آؤ"

ست ونتی دوڑ کر الماری سے بوتل اُٹھا لائی۔ اور خطاوارانہ نگاہوں سے خاوند کی طرف دیکھ کر بولی "آپ کی بیماری کے باعث مجھے

اس کے پینے کا خیال نہیں رہا۔ اب پی لیا کرونگی"
سُلطان سنگھ نے اُسے زور سے دیوار پر پھینک مارا۔ اور اطمینان کا سانس لیا ست ونتی سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔ اور بولی "یہ آپ نے کیا کر دیا۔ بڑی قیمتی چیز تھی"
سُلطان سنگھ نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ صرف ست ونتی کی طرف دیکھ کر بازو پھیلا دئے۔
یکا یک اس کی نظر کیلنڈر کی طرف گئی۔ اس دن یکم نومبر کا دن تھا۔ اسے ایک سال پہلے کا فقرہ یاد آگیا۔ کہ میں ایک سال کے اندر اندر اپنی قسمت تبدیل کر لونگا۔ اور یکم نومبر کا سُورج مجھے غریب نہ دیکھے گا۔
اور کیا وہ غریب تھا؟ اس کے پاس دولت نہیں۔ لیکن دولت سے بڑھ کر ایسی چیز موجود تھی۔ جس کے حصول کے لئے دُنیا کے شہنشاہ بھی ترستے ہیں۔
تھوڑی دیر کے بعد ساگر چند آیا۔ لیکن اس طرح سہما ہُوا۔ گویا کوئی سزا ملنے والی ہو۔ اُسے خیال نہیں بلکہ یقین تھا کہ جا کر ست ونتی کی موت کی خبر سُنوں گا۔ اس لئے اُس نے دوست کی طرف عجیب انداز سے دیکھا۔ نگاہ نے نگاہ سے سوال کیا۔

سُلطان سنگھ نے مسکرا کر کہا "کیا پوچھتے ہو؟ "ست ونتی کا کیا ہُوا"
"خیریت سے ہے۔"
ساگر چند کے سینہ سے جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو۔ اطمینان کا سانس لے کر بولا "شکر ہے تم نے اپنا عہد پُورا نہیں کیا۔ جب میں اُس غریب لڑکی کو شب و روز گھونگھٹ نکالے ہُوئے عقیدتمندانہ انداز سے تمہاری خدمت کرتے دیکھتا تھا اور اس کے ساتھ ہی تمہارے عہد کا خیال کرتا تھا۔ تو میرا کلیجہ کانپ جاتا تھا"
"مگر میں نے اپنا عہد پُورا کر دیا"
ساگر چند گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے کسی نے اُس کا گلا دبا دیا ہو۔ رُک رُک کر بولا "کیا کہتے ہو۔"
"میری قسمت تبدیل ہو گئی ہے۔ میں اب غریب نہیں ہُوں۔ مگر اس تبدیلِ قسمت کا باعث میری بیوی کی موت نہیں بلکہ زندگی ہے"
یہ کہتے کہتے سُلطان سنگھ نے فرطِ مسرت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اور آرام کُرسی کے ساتھ پیٹھ لگا کر لیٹ گیا۔

سُدرشن

نُدرتِ ذوق ونظر

۳

بنارس کی اک شرمیلی ومسکراتی ہوئی صبح، رشید کے ہذیانِ ادبی کو شاید کبھی فراموش نہ کریگی، جبکہ اک مختصر سے قیامِ سحری کے لئے رودِ گنگا نے اپنے منظر کی تمام دلاویزیوں کو اُس کے واسطے ہدیۂ لطف ومسرت بنا دیا تھا!

فضائے بنارس کی عام دل کشی، صبح اور پھر آبِ گنگا کی وہ شوخیوں سے معمور، تبسم ریز، روانی رشید کے لئے یوں ہی کیا کچھ کم جاذبِ ذوق ونظر تھی کہ منظر کی اور بعض معصوم حیثیتیں، اُس کی فطرت کی بے چینی، اُس کے جذبات کے ہیجان اور اُس کی روح کے فشار کے لئے اک نئی قیامت ثابت ہوئیں!!

بارہا دیکھا گیا ہے کہ وہ اک معمولی سی بات سے متاثر ہو گیا اور پھر پہروں اُسے اپنی خبر نہ رہی دیکھنے والے اندیشہ کرتے کہ یہ صورت تو اختلالِ حواس کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدرت نے اُس کو اک عجیب دل ودماغ عطا کیا ہے۔ جس میں، ودیعتِ عام سے علحدہ کچھ گداز وفکر کا جزوِ غالب ہے کہ مظہرِ مرحمت ہے!!

دُنیا کی ہر چیز، کائنات کا ذرہ ذرہ اور ان سب کا علم وعرفان رشید کی قوتِ تخیل کا موضوعِ تجسس ہے وہ جس شے کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اس قدر قریب سے، اس درجہ عمیق نظر سے کہ جہاں عام نظر و فکر پہنچ ہی نہیں سکتی۔ کوئی چیز سامنے آگئی اُس نے دیکھا۔ دیکھتا رہا، بس دیکھتا رہ گیا، اب ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید یہ صرف دیکھنے ہی کے لئے پیدا ہُوا ہے۔ کسی نے کوئی بات کہی، اس نے سُنا، سُنا اور سوچ میں پڑ گیا اب معلوم ہوگا کہ دُنیا میں یہ فقط سوچنے ہی کے واسطے آیا ہے۔ پھر اِن ہی عنوانات پر اگر کبھی اُس کی زبان کھُل گئی تو اپنے وظائفِ روحی کو کچھ اِس انداز سے حوالۂ تکلم کرتا ہے کہ جذبات کا کیف، اور اظہار کا تاثر، یہ معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی انتہائی گہرائیوں میں ہی ڈوب کر رہیگا +

مظہر شاہد ہے کہ رشید ساحلِ گنگا کے نوادرِ منظر کو اپنی روح کے انہماکِ کامل کے ساتھ دیکھ رہا اور لطف اُٹھا رہا تھا کہ دفعتہً اُس کی نظر کسی اک طرف گئی، گئی اور جم کر رہ گئی اور مُنہ سے صرف یہ نکلا "مظہر دیکھتے ہو قدرت کی نازک ترین

شاعری کے ساتھ کس نوع کا تمسخر و اعراض"؟

میں نے دیکھا چند عورتیں ہیں کہ جنکی ساڑھی سادی ہے اور سیاہ اور کسی قدر گاڑھی، جنکی ادائیں غم میں ڈوبی ہوئی ہیں اور مضمحل، اور جن کے سر پر بال تو شاید قطعاً نہ تھے اپنے فریضۂ پرستش و اشنان ادا کرنے کے لئے گنگا جی کے کسی گھاٹ پر جارہی تھیں، ایسی عورتوں کی ایسی نو عمر لڑکیوں کی ایسے مقامات پر کثرت ہے، جو اپنے سہاگ کو لٹا چکی ہیں اور اب اپنی زندگی کے باقی حصّے کو ان تیرتھ گاہوں کے کسی اک مقدس معبد کے اک سادے سے گوشے میں گذار رہی ہیں، چونکہ ہندؤں میں عقد بیوگان کا رواج نہیں ہے اس لئے ان کی زندگیاں اب سوائے اس نوع کے مصرفِ عبادت و رہبانیت کے اور کوئی پہلو اپنی موجودہ حیات میں ایسا خوشگوار نہیں رکھتیں جس کو کسی دوسرے طریق پر گذارا جاسکے!!

رشید کی طبیعت، رشید کے لطیف ذوق سے یہی متوقع تھا، جیسا اثر اُس پر اس منظر سے ہُوا، وہ یک لخت بیتابِ جذبات ہوگیا۔ اُس کی بیتابی و بے اختیاری بھی اپنی نوعیت میں اک خاص معصومیت کو لئے ہُوئے ہوتی تھی۔ چہرہ پر اک اضمحلال طاری ہوا۔ آنکھوں میں غم کی اک لہر دوڑی۔ ہونٹ ذرا ہلے۔ عام حالت میں اک ذرا کھویا کھویا پن پیدا ہُوا اور اُس نے دل پر ہاتھ رکھا اور اک طرف بیٹھ گیا۔ یہ تھا اُس کا بیتابِ جذبات ہو جانا!!

اس کو عزیز رکھنے والے احباب اُسکی حالت کے ان آثار و علامات سے اس درجہ واقف ہو گئے تھے کہ تغیرِ کیفیات کو اُس کے چہرہ کے خاص لون، اُس کی اداؤں کی خاص تہذیب سے معلوم کر لیتے تھے۔ بسا اوقات چہرے کی خفیف سی زردی سے مظہر نے اُسکے مُبتلائے غم ہونے کا حُکم لگا دیا ہے ہرچند کہ خارج میں کوئی کاوش کی صورت بھی نہ تھی۔ بارہا اُسی قسم کی شکل سے نتائجِ مسرت مستبط کئے ہیں اگرچہ حالات اُس سے مختلف ہوتے تھے اُس کا ملال اُس کی مسرت، اصل یہ ہے کہ کیفِ غم سے تو سروکار رکھتے نہ تھے اُس کی زندگی تو یکسر تخیل تھی، کبھی شدّتِ افکار سے تھک گیا، مضمحل ہوگیا، کبھی خیال آرائیوں نے وسعت عطا کردی بشاش ہوگیا۔ آہ، بوئے گل کی اور شبنم کی زندگی ہی کیا!!

مظہر بنارس کی سیر و سیاحت میں رشید کا رفیقِ سفر تھا وہ بیان کرتا ہے کہ میں نے بہت کم رشید میں اُس نوع کا گدازۂ کیف دیکھا ہے جو بنارس کے قیام میں مَیں نے اُس میں دیکھا۔

اُس نے کہا مظہرؔ، بتاؤ کونسا ظلم ہے جو تمہاری صنف نے اس نازک جنس پر روا نہ رکھا ہو۔

"ابھی یہ سات آٹھ ہی برس کی ننھی کہ مرد کی جنس نے اس کو اسیرِ ازدواج کر دیا اور عمر کا یہ وہ حصہ ہے جس میں اس صنف کا کوئی فرد بھی اس بات سے واقف نہیں ہوتا کہ ازدواج کی رسم میں لطف ہے کس نوع کا، شادی بیاہ اک ہنگامے سے عبارت ہے بچّوں نے دیکھا اور ہنس دیئے؟ اتفاقات نے جب یہ روح فرسا صورت پیدا کی کہ فردِ اعلیٰ اس دُنیا سے کوچ کر گیا تو اب لڑکی کی عمر تیرہ چودہ سال کی ہے بتاؤ وہ ہنسے کہ روئے وہ ماتم کرے کہ آزادی پر مسرور ہو۔ لاریب کہ وہ اک قیامت ہے کہ دو زمانوں کو محیط ہے۔

"آہ! اب لڑکی حقیقتِ ازدواجی سے واقف ہے۔ اُس کی زندگی کی شعریت اب عنفوانِ شباب پر ہے اور اُس کے شبابِ فتنۂ آرزو کی تمام تحریکیں اب جوان ہیں۔

"عورت اپنا بہترین ذخیرۂ حیات مرد
کو دیتی ہے لیکن اُس کے بدلے میں
ویسی ہی جنس گرانمایہ اُس سے چاہتی
ہے　(آسکر وائلڈ)

"جانتے ہو وہ کیا چیز ہے۔ وہ دل ہے۔ وہ وفائے جنسی ہے وہ شرافتِ عہد ہے وہ حُسن مبادلہ ہے۔!"

"مگر آہ! یہ جوان بیوہ یہ معصوم دوشیزہ۔ اسکو جنسِ کرخت کے اولینِ عہدِ الفت میں مجروح ہو جانا نصیب ہُوا۔ اس نے اسی جنسِ بے وفا کو اپنا ذخیرۂ حیات دیدیا تھا اس نے اپنی زندگی کا حُسن اس صنف کے ظالم چہرہ کا وقار بنایا تھا لیکن افسوس لڑکی کی عمر کا پہلا دور بھی کامل نہ گذرا تھا کہ وہ اپنے لطفِ طفلی کے لئے سوگوار ہے اور اپنے شباب کی ماتم داری کے لئے وقف ہے وہ صنفِ قوی کے دوسرے افراد کی نگاہوں میں اب اک بے آب موتی ہے اک محرّف حرفِ وفا ہے اور اک منسوخ عنوان ہے!!

"مظہر بتا تو خدارا مجھے سمجھا تو اس جوان بیوہ، اس مرقدِ شعر کی حیاتِ دوشیزگی کی توہین کیوں روا رکھی جاتی ہے؟ اس کی کیا چیز کم ہو گئی، اُس میں سے کونسی شئے بدل گئی۔ آہ خود پرستو! جب تک مرد زندہ ہے عورت کا فطری لوچ، سمٹاؤ حیاداری سے عبارت ہے؟ جبتک عورت خاوند والی ہے اُس کے حُسن کی کرشمہ آفرینیاں زندہ ہیں؟ جبتک عورت کو اقتدار شوہری نصیب ہے، اُس کا وقار نسوانی تسلیم کیا جاتا ہے؟ مگر جب اُس کا سُہاگ لٹ گیا تو تمام نازک اور حسین ادائیں اک مذموم پختگی سے بدل جاتی ہیں؟

وہی حیا وہی شوخ باحجابی جس سے اسی جنس قومی کے اک فرد کو معراج نتادگی نصیب تھی اب دُنیا کے لئے وہ اک مایوسی ہے کہ مکمل۔ اک احتراز ہے کہ منکسر۔ وہ اپنی آنکھوں کے خوبصورت جھکاؤ میں اپنے تمام فتنہ ہائے حسین دفن کئے رہے تو عافیت ! ؟

"جبتک خاوند موجود تھا عورت کا سر گھمنڈ سے بلند تھا اور اُس کا تاجِ حسن زرانگیز مگر حیف وہ نہ رہا تو سر خاک آلودہ ہوگیا اور جمالِ صورت کی کوئی آن اب دُنیا کے لئے موثر نہ رہی جبتک شوہر زندہ تھا۔ گھر کی چار دیواری میں نسوانی وقار کی ملک کی حکمرانی تھی مگر حیف اُسکے نہ ہوتے اب اس شکست خوردہ رانی کے حال کا کوئی پرسان نہیں۔ بلکہ ہم سن بچکر چلتے ہیں کہیں اسکا منحوس سایہ ہم پر نہ پڑ جائے۔ اقتدار سرنگوں ہے وقار برباد ہے۔ نسائیت اور حسنِ نسوانی پامال ہے جوان بیوہ کی غریب جوانی کیا ہے لُٹے ہُوئے قافلہ کا نشانِ بربادی ہے۔ مظہر! پوچھو اپنے ہمجنسوں سے پوچھو یہ کیا چھوت چھات ہے اور تمہاری اس رسمِ احتراز میں اک خوئے خراب کی پرورش نہیں تو پھر آخر اس سے مقصود کیا ہے؟

"ہائے صنفِ نازک کا شباب بھی تمہارے اقتدار کا شکار ہوا اور اُس کی رہی سہی حیات کے باقی ایام اور اُن کی لذتیں بھی تم ہی نے برباد کیں "عورت نے اولین طلب پر تم کو اپنا سب کچھ دیدیا اور پھر تم نے بدعہدی کی اور رواج میں اک مکروہ شکل کو داخل کیا،" زن بیوہ مکن اگرچہ حور است" کہکر ادبیات میں اپنے خیال کو یادگار بنادیا۔ کس لئے؟ اس لئے کہ بیوہ اک افسانہ کی مدح خوان ہو چکی۔ بیوہ نے اپنی زندگی کی کچھ راتیں راحت سے گذار لی ہیں۔ اس لئے کہ بیوہ اپنے شباب کے لطفِ اول کو مرد کے عہدِ وفا پر تصدق کر چکی ہے۔ ؟ !

"ہاں اب وہ اس قابل کہاں کہ کوئی مرد اُس کو اپنے اضافۂ محبت کا امانتدار قرار دے کسی مرد کی جوانی اور اُس کی راتیں اس بات کو کیونکر جائز رکھیں کہ وہ کسی ایسی غم نصیب کو شریکِ لطف کرلیں، جس کی راتیں آج سے قبل مصروفِ شباب گذر چکی ہیں ہاں مرد کی عصبیت کو ٹھیس لگتی ہے، مردانہ رحم وگداز کی یہ خو کیوں ہو جائے کہ کسی ایسی عورت کو اپنی زیست کی معیت کے لئے منتخب کرلے جس کی شعریت، نظم کی اک فردِ موضوعی سے جُدا اک دوسری بیت کی طرح ڈالنے پر آمادہ ہو! !

"بتاؤ غارت گر کون ہے؟ کس کے گریبان تک معصومیت ہاتھ دراز کرے، لڑکی اور

اُس کی متاعِ عزت کس درجہ بدعہدی کے ساتھ خریدی گئی، حسنِ سلوک کا یقین دلا کر اُس سے کس قدر سنگین فریب کیا گیا، اُس کو کیسا بے وقعت سمجھا گیا اُس کا سودا کیسی کم قیمت پر لے لیا گیا۔ پھر معمولی سی ادائے قیمت عہد پر اُس سے کیسی بدعہدی کی گئی کس طرح یکسر تمام صنف نے اُسکی دادخواہانہ التجاؤں پر اپنے کانوں پر ہاتھ دھر لئے۔ مردوں میں سے کسی نے اپنی زندگی، اپنی زندگی کی خوشنمائیوں، اپنی زندگی کی لطف فرمائیوں کو اپنے بھائی کے ناموسِ شرافت کے حضور پیش نہ کیا۔ ؟!

لڑکی کا حسنِ زندگی اُس کا ذخیرۂ حیات جب لُٹ چُکا تو مردوں نے مل کر اُس کو دیوالیہ قرار دیدیا، اُسکو بے مایہ رسوا کر دیا۔ آہ حسراں نصیب لڑکی! ذی اقتدارِ شباب ہونے کے باوصف سائلانہ اندازِ استرحام کی مظہرِ جمیل ہے۔ اُس کی معصومیت سے، اُس کی سادی سی جوانی سے، اُس کے بھولے بھالے شباب سے ساری دُنیا نے مل کر تمسخر و استہزا کیا ہے اور اب تمہاری بھری بزم میں وہ اک ایسی خوئے مضحک کی حریف ہے، جس کو ساری محفل سمجھ رہی ہے مگر وہ غریب نہیں جانتی کہ مجھ سے یہ کس نوع کا مذاق کیا جا رہا ہے لڑکی کی سادگی سے جس قسم کا فریب چلا گیا اُسکو نہیں معلوم یہ اُس کے حق میں کس قدر نقصان رساں ہے۔ اور طویل مصیبتوں کا پیش خیمہ ہے۔

رشید نے کہا میرا خیال ہے شاید دُنیا میں اک دن یہ انقلاب ہو کر رہیگا کہ عورت سے جب مرد لطف۔ مسرت، امن اور طمانیت و آسودگی کی بھیک مانگے گا۔ اور آج کی طرح روئے گا۔ بسورے گا۔ اور فریاد والحاح کی اک قیامتِ صغریٰ برپا کریگا تو اُس زمانہ میں آج کی طرح عورت، ایسی بیوقوف ایسی نادان۔ نرم دل اور زود عنایت نہ ہوگی، بلکہ وہ ذی فہم۔ ہوشیار، ضابط اور معاملہ دان ہوگی وہ مرد کی صداقت کو پرکھے گی۔ اس کے دل کا گداز ٹٹولے گی، اُس کے آنکھوں کے پانی کا کھاری پن چکھے گی، اور اُس کے اضطرابِ محبت کی سچائیوں کا جائزہ لیگی، جب کہیں بعد آزمائش و امتحان وہ اپنی محبت مرحمت کریگی، اپنا دل عطا فرمائیگی۔

اور ہدیۂ الفت کی عطا کے ساتھ اک شرط یہ بھی ہوگی کہ مرد کی جنس یہ بھی عہد کرے کہ وہ عورت سے پہلے اس عالم سے رخصت نہ ہوگا۔ یا یہ کہ مرنے سے پہلے اپنی جنس کے تمام افراد میں اک سمجھوتہ کرائے کہ آج سے یہ رواج منسوخ ہے کہ کوئی عورت بیوہ کہی جائے۔ جس طرح نسائیت ہمیشہ زندہ ہے، اور جب تک وہ

جزو ہے کسی حیاتِ لطیف کا اُس وقت تک اُسکی پرستش اور اُس کے حسنِ لطف کا احیاء بھی ضروری ہوگا! وہ کبھی حسین اور جمیل ہونے کے ساتھ، معابد کے تاریک و تنہا گوشوں میں تمثیلِ تلخئ رہبانیت نہ بنیگی۔ اُس کے خصوصیاتِ جمال سے کبھی تمسخر نہ کیا جائے گا اُس کے سر کے سیاہ عنبریں بال اُسترے سے اس طرح نہ مونڈے جائیں گے جو عمامہ نمایش مقدس سر کا نشانِ امتیازی ہے۔ اُس پر رنگ کو اور ریشم کو حرام نہ کیا جائیگا۔ وہ باغوں اور تماشا گاہوں سے خارج نہ کی جائیگی۔ وہ تہوارو اور شادی بیاہ کی عام رسومات میں بدشگونی کا عنوان نہ سمجھی جائیگی۔ وہ جوان لڑکیوں میں سہاگ محروم نہ کہی جائیگی۔ اور گھروں کی چار دیواریوں میں اُس سے ایسا ہی برتاؤ ہوگا جو اور جو ان لڑکیوں سے ہوتا ہے، اسکو بھی صبح و شام سنگھار کی اجازت ہوگی۔ اسکو بھی پاکیزہ لباس اور خوشبو کے استعمال کا حق حاصل ہوگا تیل پھلیل سے اُس کو ممانعت نہ ہوگی، ہنسنے بولنے پر اُسکو مطعون نہ کیا جائیگا۔ برسات میں جھولا وہ بھی جھولے گی، ہمجولیوں میں سہاگ کے ترانے اور پی کے راگ وہ بھی گا سکیگی کبھی کوئی مرد اُس کے حضور کوئی ایسا جملہ نہ کہہ سکیگا جس سے اُس کی شعریت متالم ہو، اُسکی موسیقیت زخمی ہوجائے، اور اُس کے وقارِ صنمیت کو صدمہ پہنچے!!"

"اے ارضِ فارس! کاش آج وہ وقت آجائے اور میں باوصف اس کے کہ رسمِ ازدواجی سے متنفر ہوں مگر پھر میں اس بیوہ دوشیزگی کے اضمحلالِ روحی کو اک مرتبہ مسرت و فراغت سے بدل دینے کی کوشش کروں، دنیا میں، خوبرو۔ نرم دل۔ وفاشعار مرد تلاش کروں اور اُنکی آغوش اس بیوگی کی نعمت سے بھردوں، اس لئے کہ زمین کا سنگھار غارت ہورہا ہے۔ انسانی حیات کی راحت، برباد ہورہی ہے نظامِ تمدن کی تمام برکتیں اور حسنِ مدنیت کی تمام عزتیں پامال ہورہی ہیں نہ آئے وہ وقت کہ شیرازۂ امنِ عالم بکھر جائے!"

کون رد کرسکتا ہے کہ اک حسین لڑکی، اک جمیل ترین اقتدارِ نسوانی کسی مرد کو منتخب کرلے اور زمین کا گوشہ گوشہ اپنے اندر کوئی زینت محسوس نہ کرے! کون ہے جو اس کے خلاف کچھ کہہ سکتا ہے کہ مرد اپنی مطمئن راحتوں کو عمر بھر ڈھونڈا کرے مگر اُس کی تلاش بے سود دیکا ہے اگر اُس نے کسی عورت کی محبت پاش نگاہ حاصل نہ کی۔ کس میں بوتا ہے جو اس کی مخالفت میں آواز اُٹھائے کہ اک طرف مرد عالمِ انسانیت

کے ممتاز ترین افراد کو یونہی داغ بیوگی دیتے رہیں اور الگ کرتے رہیں اور دوسری طرف بیوگی اور بیوگی سے احتراز کی رسم یوں پھیلتی رہی، تو ایک دن اچھوتے خیال و مناظر کا پھر کال نہ ہو جائیگا اور نسائیت مع اپنے گداز و تاثر کے غارت نہ ہو رہیگی۔ پھر کیا ہوگا یا صنفِ کرخت کو حقیقی نسائیت سے محروم جینا پڑیگا اور دنیا میں بیوگی کے سوا کچھ ڈھونڈھے نہ ملیگا، یا بیوگی مستقل نمایش بے چارگی میں اک علو، اختیار کریگی، اور اس کی جانب سے صنفِ کرخت کی سرزنش یہ ہوگی کہ وہ اپنی دوشیزگی کو بھی بیوگی میں مدغم کریگی اور پھر دنیا کے حُسنِ فطرت اور اُس کی محرومی کا دیکھنے والا بھی نہ ملیگا!!"

حالت کے یہ انقلاب اور اُس کے اثرات ابھی سے رونما ہیں، دنیا آہستہ آہستہ رنج بیوگی ظاہر کر رہی ہے۔ اور عورت کی دنیا کے احساسات تو ہمارے اس دعوے کے بدرجہ اتم دلیل ہیں عورتوں میں اب مرد بدنام ہے اور اُس کی محبت کی تذلیل و تحقیر شروع ہو چکی ہے مرد کی مخالفت کا یہ جذبہ بتدریج ترقی و تقویت پا رہا ہے صنفِ نازک کی دنیا میں اس کا عام چرچا ہے کہ مرد اب دن بدن بدعہد۔ غاصب اور بے وفا ہوتے جا رہے ہیں، لہذا کوئی عورت، اب اپنے دل کے راز۔ اپنی آنکھ کے آنسو۔ اپنی دل کی دھڑک کا حال کسی مرد کو نہ سُنائے، نہ دکھائے۔ عورت کا اشتراک، اس جنس سے قدرت نے لازمی قرار دیدیا ہے تاہم تجویز ہے کہ قدرت کے حضور اک زبردست احتجاج پیش کیا جائے اور اُس کی عملی صورت یہ ہے کہ عورت ناکتخدائی کا عہد کریگی اور اس خیال کو نہایت اہتمام سے عورت کی دنیا میں مقبول بنایا جائیگا! اور اس تحریکِ احترازِ مناکحت کو بے حد کامیابی ہو رہی ہے کہا جاتا ہے جوں جوں تعلیم عام ہوگی۔ اس خیال کو قوت ہوتی جائیگی۔

مشورہ کیا جا رہا ہے کہ عورت اپنے اعمال ازدواجی سے صداقتِ قلب کو علیحدہ کر دے اور اک نئی سیاست عمل کی اس لطیف فردِ نازک کے ذوق میں شامل کیجا رہی ہے، اب راتوں کا جاگنا اور کسی کے لئے بے قرار رہنا موقوف؛ شوہر اگر سفر میں ہے تو اپنی ضروریاتِ عیش ترک کر دینے کی ضرورت نہیں، اپنے لباس کی زینت اور تزئین کو موقوف کر دینا فضول۔ پتی اگر بیمار ہے تو اُس کو اپنی روح کے مضمحل کر لینے کی حاجت نہیں، اور اس کے وظائفِ تعشق کا عنوانِ ازدواج ترمیم کیا جا رہا ہے۔ کہا جا رہا ہے عورت کی جانب سے اس درجہ فدویتِ عشق کے اظہار و عمل کی ضرورت نہیں ہے۔ ہرچند کہ

ستی ہوجانے کا ولولہ بھی اک مجبورِ عشق زندگی کی ماجرا
طراز روش ہے، اُسکے سامنے بیوگی کا سوز، بیوگی
کی مصیبت تھی۔ وہ جوانی کی نامرادیاں برداشت
نہ کرسکی اور سہاگ کے ساتھ، بیوگی کے سوگ کو لیکر پتی کی
چتا پر اپنے آپکو قربان کردیتی تھی، اور اگرچہ اس تحریک کو
اب کوئی ترقی نہیں مگر پھر بھی کہیں کہیں کبھی سُننے میں آجاتا
ہے اسلئے اب اس سے قطعاً محترز رہنا چاہیئے ذی احساس
عورتوں کا خیال ہے کہ مرد شادی کو اک بیوہار سمجھنے
لگے ہیں۔ نان و نفقہ کی ذمہ داریاں قبول کیں اور شادی
کرلی پاکیٔ نفس کا وہ عہد نہیں کرتے ورنہ فحش مقامات
شہروں کے اُجاڑ نظر آتے، انکی دل لگی و دلچسپی کے
سامان سب موجود و مرتب ہیں پھر کوئی وجہ نہیں اک
عملی ایثار و درد کی عالمگیر تحریک نہ کی جائے اور مردوں
سے اُنکی آمدنی کے اک حِصّہ کا ہی مطالبہ نہ کیا جائے
بلکہ اُن سے دل مانگا جائے اور جبتک وہ عزتِ
ازدواج کی رونمائی دل نہ قرار دینگے اُسوقت تک
ہمارا فیصلہ یہی رہیگا کہ ہم کبھی نرمی۔ ملاطفت اور محبت
نہ برتینگے!

ہم اپنی نسائیت کے حقوق کی خاطر نہ صرف
اپنی شعریت کو، اپنی شگفتگی کو برباد کردینگے بلکہ اپنے
سوز دلی کی لپیٹ میں دنیائے رجالیت کے بے مہر
استبدادی بتوں کو بھی خاکستر کردینگے۔" رشید نے کہا
"ذرا احساس کی ضرورت ہے خوب سمجھ رکھو۔

مظہر! اس کشمکش احتراز و محبت کا انجام بُرا ہے،
دُنیا اپنے تمام روپ کو جب کھودیگی تو بتاؤ کائنات میں
پھر کونسی رنگینی لاؤگے؟ جس سے الفت و اتحاد کے
چہرے منور و روشن ہونگے۔ ورنہ میں تو یہی کہوں گا
توازن عمل دنیا کبھی پیش نہیں کرسکتی تم بھی مظہر!
خلاصتہً یہی کہدو کہ اب سے کوئی بیوہ ہی نہ ہو، رشید
کے عقاید ادبی کی پیروی ہونا چاہیئے، جہاں رسم مناکحت
و ازدواج کی پابندیاں نہیں ہیں ہاں ذرا نفس کے
علو اور خیال کے ارتقاء کی ضرورت ہے +

اُس مسرتِ دو روزہ سے جسکو لطفِ ازدواج
کہتے ہیں بہتر تو یہی ہے کہ انسان اپنے نفس کے کام و
دہن کو اس لذت سے آگاہ ہی نہ کرے۔ ورنہ پھر
یہ تو غیر ممکن ہے کہ کوئی کبھی اس دنیا سے نہ سدھاریگا۔
جنسِ قوی اگر طمانیت سے محروم ہوئی تو اور
صنفِ نازک اگر توثیقِ ودیعت سے محروم ہوئی
تو بہر نوع دونوں کے لئے یہ اک داغ ہے
مفارقت کا۔ جس کا اثر رقیق القلب اور ذکی الحس
انسان پر مدۃ العمر رہتا ہے!!

"خلیقی"

محفلِ ادب

جاپان کا رہبرِ اولیں۔ تاریخ نے ہمیشہ اس حقیقت کو دُہرایا ہے کہ جب فطرت کسی قوم میں کوئی خوشگوار انقلاب پیدا کرنا چاہتی ہے تو وہ اس میں سے ایک مخصوص ہستی کا انتخاب کر لیتی ہے اور پھر اسی کو اپنا مظہر قرار دیکر ساری قوم کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں دیدیتی ہے اچنانچہ اسی اصول کے ماتحت جاپان نے بھی جو عظمت حاصل کی ہے، وہ صرف مکاڈو مٹسوہیٹو کی صحتِ فکر کا نتیجہ ہے جس نے صرف ۴۵ سال کے اندر (۱۸۶۷ء - ۱۹۱۲ء) ملک میں ان اصلاحات کو مقبول بنا دیا کہ جاپان دفعتہً جاہلیت کا لباس اُتار کر دُنیا کی قابل ترین قوموں کی صف میں جگہ پانے کا مستحق ہو گیا۔

مکاڈو بے انتہا ذہین اور علم دوست بادشاہ تھا اور مضطرب رہتا تھا کہ کیونکر جلد سے جلد اپنی قوم کو قدیم بندشوں سے نکال کر تہذیب و تمدن کی جادہ شاہراہ پر لگا دے، چنانچہ جب وہ تخت نشین ہُوا تھا تو اُسی وقت اُس نے ایک ایسا زبردست تاریخی خطبہ پڑھا تھا کہ جب اُس کی خبر مغربی ممالک میں پہنچی تو یورپ کے ایوانِ سیاست میں زلزلہ پڑ گیا اور وہاں کی سفید آبادی ایشیا کے اس "زرد خطرہ" سے رعشہ براندام ہو گئی۔

اس خطبہ کی حقیقی رُوح یہ تھی کہ اس میں شخصی اقتدار کے خلاف نہایت پر زور دلائل پیش کئے گئے تھے اور قوم کو اتفاق و اتحاد اور اشتراکِ عمل کی دعوت دیکر نہ صرف دستوری حکومت کی طرف مائل کر دیا گیا۔ بلکہ اصلاح اعمال اور اشاعتِ علوم و فنون کو بھی قوم کا اولیں فرض قرار دیا گیا تھا۔ پھر یہ سب کچھ زبانی پند و نصیحت نہ تھی بلکہ صدائے عمل تھی جو اُس کے سینہ سے بلند ہو رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ آج یہ کہنے والا کل کچھ کر کے دکھا دینے والا ہے اور آخر کار یہی ہُوا کہ ۱۸۸۹ء میں خود اُس نے اپنے ہاتھوں سے استبداد کا ملعون تاج سر سے اُٹھا کر پھینک دیا اور ایک عام دستوری حکومت کا اعلان کر دیا۔ کیا دنیا کے بادشاہوں میں کوئی مثال ایسی مل سکتی ہے کہ کسی حکمران نے خود شخصی اقتدار کو پامال کیا ہو؟؟

نگار (آگرہ)

مساوات پسندی

حضرتِ عائشہ وہ شمعِ حریمِ نبوی
جن سے روشن ہے نہانخانۂ اخبارِ رسُول
مدح میں جن کی ہیں انگشت بلب اہلِ کمال
وصف میں جنکے ہیں حیرت زدہ اربابِ عقول
علم کا جن کے یہ عالم تھا کہ اصحابِؓ کبار
بیشتر قول سے انکے نہیں کرتے تھے عدول
جن کو خالقؔ نے عطا کی تھی طلاقت بیشل
جنکی باتیں تھیں کہ تھے باغِ فصاحت کے وہ پھول
جن کی پاکیزگیٔ نفس کا قرآں ہے گواہ
سورۂ نور کا دیکھو تو سہی شانِ نزول
جن کا دربارِ نبوت سے تھا صدیقہ لقب
جن کو کہتے تھے حمیرا محبت سے رسُولؐ
جن کا آغوش تھا بالینِ پیمبر دمِ نزع
جن کے حجرہ میں ہُوئے دفن رسُولِ مقبول
جو تھیں دُنیا میں بھی اور جنتِ فردوس میں بھی
حرمِ فخرِ رسل ہوں گی علیٰ رغمِ جہول
ان کو ملتا تھا وظیفہ جو گذارے کے لئے
جسپہ تھا اہلِ رسالت سے برابر معمول
خرچ کو ان کے وہ کافی نہیں ہوتا تھا مگر
فقر سے تھیں نہ وہ دلگیر نہ فاقہ سے ملول
عہد میں اپنے جو فاروقؓ نے دیکھا یہ حال
کر دیا ان کے وظیفہ میں اضافہ معقول
لے کے جب اسکو گئے حضرتِ صدیقہ کے پاس
بولیں یہ کہ نہیں سکتی ہوں اضافہ کو قبول
جملہ ازواج کو حضرت نے مساوی رکھا
اب یہ تفریقِ مدارج ہے بہم ان میں فضول
اپنی ہمچشموں سے کچھ بڑھ کے نہ لونگی ہرگز
میں نہ توڑوں گی مساوات کا پاکیزہ اصول
اہلِ بیتِ نبوّی پر ہو خدا کی رحمت
جن سے اُمت میں ہوئے ایسے فضائل منقول

(رشیدہ)

(عصمت دہلی)

کُتّے۔ علم الحیوانات کے پروفیسروں سے پوچھا۔ سلوتریوں سے دریافت کیا۔ خود سر کھپاتے رہے۔ لیکن کبھی سمجھ میں نہ آیا۔ کہ آخر کُتوں کا فائدہ کیا ہے؟ گائے کو لیجئے۔ دودھ دیتی ہے۔ بکری کو لیجئے۔ دُودھ دیتی ہے۔ مینگنیاں بھی۔ یہ کُتّے کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگے۔ کہ کُتّا وفادار جانور ہے۔ اب جناب وفاداری اگر اسی کا نام ہے۔ کہ شام کے سات بجے سے جو بھونکنا شروع کیا۔ تو لگاتار بغیر دم لئے باری باری صبح کے چھ بجے تک بھونکتے چلے گئے۔ تو ہم لنڈورے ہی بھلے۔ کل ہی کی بات ہے کہ رات کے گیارہ بجے ایک کُتّے کی طبیعت جو ذرا گدگدائی تو اُنہوں نے باہر سڑک پر آکر طرح کا ایک مصرعہ دیدیا۔ ایک آدھ منٹ کے بعد سامنے کے بنگلے میں سے ایک کتّے

نے مطلع عرض کر دیا۔ پھر تو جناب ایک کہنہ مشق اُستاد کو جو غصہ آیا۔ ایک حلوائی کے چُولھے میں سے باہر نکلے اور بھنا کے پُوری غزل مقطع تک کہہ گئے۔ اس پر شمالِ مشرق کی طرف سے ایک قدر شناس کُتّے نے زوروں کی داد دی۔ اب تو حضرت وہ مشاعرہ گرم ہُوا کہ کچھ نہ پُوچھئے۔ کمبخت بعض تو دو غزلے سہ غزلے لکھ لائے تھے۔ کئی ایک نے فی البدیہ قصیدے کے قصیدے پڑھ ڈالے۔ وہ ہنگامہ سرگرم ہُوا۔ کہ ٹھنڈا ہونے میں نہ آتا تھا۔ ہم نے کھڑکی میں سے ہزاروں دفعہ آرڈر۔ آرڈر پکارا۔ لیکن ایسے موقعوں پر پردھان کی بھی کوئی نہیں سُنتا۔ اب ان سے کوئی پوچھے۔ کہ میاں تمہیں ایسا ہی ضروری مشاعرہ کرنا تھا تو دریا کے کنارے کھُلی ہوا میں جا کر طبع آزمائی کرتے یہ گھروں کے درمیان آ کر سوتوں کو ستانا کونسی شرافت ہے ؎　　ہزار داستان

خدا کی تلاش ۔ میں تجھے پر فضا گوشوں میں پھولوں کے پیڑوں تلے تلاش کر رہا تھا، لیکن تو مصیبت زدہ غریبوں کے جھونپڑوں میں میرا منتظر تھا۔

میں تجھے دلکش نغموں میں ڈھونڈھ رہا تھا۔ لیکن تو کسی کی آہ بن کر مجھے بلاتا تھا۔

کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا۔ تو میری مراد آنِ واحد میں پوری ہو جاتی۔

۲۔ میری آنکھیں تیری تلاش میں عالیشان مندروں میں بھٹک رہی تھیں، لیکن تو جاں بلب مریض کے سرہانے بیٹھا میرا ہی رستہ تک رہا تھا۔

تو میری ہی خاطر کسی کی آنکھ سے آنسو بن کر اُس کے رخسار پر بہہ رہا تھا۔ لیکن میں تجھے اپنی محبوبہ کے گورے اور نکھرے ہُوئے رنگ میں تلاش کر رہا تھا۔

کاش میری آنکھیں کھُل جاتیں۔ تو میری مراد آنِ واحد میں پوری ہو جاتی۔

۳۔ میں تجھے بہشت میں ڈھونڈتا تھا۔ لیکن تو غریب محنتی مزدوروں کے درمیان کھڑا تھا۔

تو نے مجھے اپنے تک پہنچنے کے ہزاروں موقعے دئے۔ لیکن میں نے ان سب کو کھو دیا۔

کاش میں یہ جان سکتا۔ کہ میں تجھے قول میں تلاش کر رہا ہوں، حالانکہ تو فعل میں ہے۔ تو میری تلاش کتنی جلدی ختم ہو جاتی۔ اور میں کس آسانی سے اپنے مقصود کو پا لیتا۔　　یگانتر (ہندی)

ایڈیٹر ۔ ایڈیٹر دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو گمنام رہتے ہیں اور "ہم" کے پُر سحر پردے کے پیچھے سے تار ہلاتے رہتے ہیں۔ اُن کو لوگ نہیں جانتے۔ مگر وہ اُن کے دماغ پر حکومت کرتے ہیں۔ "ہم" چھوٹا ہے یا بڑا، کمزور ہے یا تندرست۔ ان امور سے عوام قطعاً ناواقف

ہوتے ہیں۔ وہ صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ "ہم" ہے۔ جو ہفتہ وار یا روزانہ اُن کے پاس آتا ہے اور دنیا بھر کے واقعات پر رائے زنی کرجاتا ہے۔ اراکینِ حکومت کے خلاف بول جاتا ہے اور مستقبل کے لئے عجیب عجیب پیشگوئیاں کرجاتا ہے۔ عوام کے دلوں پر پھر اس "ہم" کا اتنا گہرا اثر ہوتا ہے۔ کہ وہ اُس کی آرا کو بلا تامل قبول کرلیتے ہیں۔ اور اپنے دل میں اُس کی فرضی تصویر بنا لیتے ہیں۔

دوسری قسم کے ایڈیٹر وہ ہیں۔ جو اپنے آپ کو فوراً ظاہر کردیتے ہیں۔ دُنیا کی سرگرمیوں میں حصّہ لیتے ہیں اور جس پر حملہ کرتے ہیں، کھُلے طور پر کرتے ہیں۔ انگلستان میں مسٹر ڈبلیو ٹی سٹیڈ اسی قسم کے ایڈیٹر تھے۔ ہندوستان میں اس وقت مہاتما گاندھی، بابو موتی لال گھوش۔ مولانا محمد علی اور لالہ لاجپت رائے اسی جماعت سے متعلق ہیں۔

اوّل الذکر جماعت کے ایڈیٹر اپنی ہستی کو فنا کردیتے ہیں اور اُس کی قبر پر اخبار کی شاندار عمارت تعمیر کرتے ہیں۔ ان کی ذات کے باعث اخبار کی توقیر ہوتی ہے۔ لیکن اُن کی ذات سے عوام ہمیشہ ناآشنا رہتے ہیں۔ ایڈیٹر کوئی ہو۔ اُس کی پالیسی لفظ "ہم" میں پوشیدہ رہتی ہے اور اسکے ناظرین صرف "ہم" کو جانتے ہیں۔ اس لئے ایسے اخباروں کی شہرت اُس وقت تک قائم رہتی ہے۔ جب تک اُس کی ادارت "ہم" کے ہاتھ میں ہے۔ انگلستان کے مقتدر اور ذی اثر اخبارات کے ایڈیٹر عموماً "ہم" ہی ہیں۔

دوسری جماعت کے ایڈیٹر اپنے وقت میں کام بہت کرجاتے ہیں۔ لیکن اُن کے اخبار کی ہستی نہیں بنتی۔ اُن کی علٰحدگی کے ساتھ ہی اخبار کی موت ہوجاتی ہے۔ لوگ اخبار کو اس وجہ سے نہیں خریدتے کہ اخبار عمدہ ہے۔ بلکہ اس وجہ سے کہ اخبار کا ایڈیٹر ایک خاص وجاہت کا مالک ہے اپنے وقت میں اس جماعت کے ایڈیٹر کام بلا شبہ بہت کرجاتے ہیں۔ اور ان کے اخبارات کی اشاعت بھی نسبتاً زیادہ ہوجاتی ہے۔ لیکن اُن سے ایڈیٹر کا تعلق منقطع ہونے کے ساتھ ہی اخبار خشک رہ جاتا ہے۔ اور لوگ اُس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے

گمنام ایڈیٹر خود ذریعہ بنتا ہے اخبار کو مقصود بناتا ہے حالانکہ دوسری قسم کا ایڈیٹر اخبار کو ذریعہ بناتا ہے اور خود کو مقصود۔ (مریادا بنارس رہندی)

تنقید کی اہمیت۔ کسی زبان کا لٹریچر ترقی نہیں کرسکتا۔ تاوقتیکہ اُس میں زبردست اور نڈر نقاد نہ ہوں۔ اُن کی عدم موجودگی میں نالائق مصنفوں کو میدان میں اُترنے کی جرأت ہوجاتی ہے۔ اور ناقابلِ مطالعہ کتب لٹریچر کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جہاں عمدہ کُتب تیار کرانا علم ادب کی بہترین خدمت

سرانجام دینا ہے۔ وہاں لغو اور بے پردہ کتب کے خلاف رائے عامہ پیدا کرنا بھی کم ضروری امر نہیں۔ نقاد کو ایسی کتب پر اس زور سے نکتہ چینی کرنا چاہیئے کہ اُن مصنفوں کو دوبارہ کتاب لکھنے کا حوصلہ نہ ہو سکے سپارٹا میں لائی کرگس نے قانون بنا دیا تھا۔ کہ جو بچے کمزور ہوں۔ اُن کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دیا جائے۔ تاکہ ملک میں صرف مضبوط اور تنومند آدمی ہوں۔ ہمارے خیال میں دُنیائے کتب میں یہ اصول بہترین اصول ثابت ہوگا۔ تاکہ لٹریچر میں صرف وہی کتابیں دکھائی دیں۔ جو اپنی خوبی کے لحاظ سے زندہ رہنے کے قابل ہوں۔ بقیہ کتب کو فوراً تلف کر دینا ملک و قوم کی بہترین خدمت ہے۔ اور اس کے لئے بلا رو رعایت تنقید ہی ایک ایسا حربہ ہے۔ جو حالات موجودہ میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بنگ سمپت (بنگالی)

میرا پھول۔ میرے باغیچہ میں بہت سے پھول تھے۔ لیکن اُن میں سے ایک خاص طور پر ایسا دلکش اور حسین تھا۔ کہ میری نگاہیں اُس کی طرف خود بخود اُٹھ جاتی تھیں ——— میں کہتا تھا یہ میرا پھول ہے اُسے دیکھ کر میرا دل رقص کرنے لگتا تھا۔

ایک دن میں باغیچہ میں گیا۔ مجھ پر بجلی سی گر پڑی۔ وہ پھول وہاں نہیں تھا۔ باقی باغ اُسی طرح حسن آباد بنا ہوا تھا۔ لیکن میرا پھول کہاں تھا؟

میں نے آہ سرد بھری اور آنسو پونچھتے ہُوئے باغ سے باہر نکل آیا۔ حالانکہ وہاں پھولوں کی کمی نہ تھی۔ مگر وہ میرا پھول تھا۔ جو کسی کے ظالم ہاتھوں نے ٹہنی سے توڑ لیا تھا۔

پال مال میگزین (لنڈن)

ناکام عشق۔ اے حسینہ! کیا تجھے وہ دن یاد ہے۔ جب میں ہچکچاتے ہُوئے قدموں سے تیرے نیم وا دروازے پر پہنچا۔ اور رعب حسن سے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے تیرے حضور میں شرف باریابی کا طلبگار ہُوا۔

تو اس وقت مسکرا رہی تھی۔

میں تیرے سامنے گیا اور اپنی زندگی کے بیش بہا تحفے تیرے قدموں پر ڈال دئے۔ اُن میں معصومیت تھی، ایمان تھا، محبت تھی، صداقت تھی اور ان سب پر ہوا کی مانند چھائی ہُوئی محبت تھی۔

تو نے ان سب چیزوں کو دیکھا۔ اور بچوں کے سے اضطراب سے پوچھا" کچھ اَور؟"

مَیں نے تیرے برف سے سفید چہرے کی طرف نگاہ کی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ میری زندگی کے دیرینہ خواب مایوسی میں تبدیل ہوگئے،

تو نے جواب دیا" یہ اشیاء میرے کس

مصرف کی ہیں؟"

میں نے اپنے نامنظور شدہ تحفوں کو اُٹھایا اور روتا ہوا جنگل کو چلا گیا۔ وہاں میں نے ایک درخت کے نیچے ان سب کو دفن کر دیا اور اپنی زندگی کے خوابوں کو اُس کے ساتھ بہنے والی تیز رفتار ندی کے پانی میں بہا دیا۔

اب تو مجھے دیکھتی ہے تو تیرا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا ہے۔ مگر کیا تجھے وہ دن یاد نہیں۔ جب میں اپنی زندگی کے بہترین تحفے لیکر تیرے پاس گیا تھا۔ اور تو نے اُن سب کو نامنظور کر دیا تھا۔

لوگ میرے افعال دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ یہ شیطان ہے۔ لیکن اے حسینہ! کیا تجھے معلوم ہے۔ کہ اس کا موجب تو اور صرف تو ہے۔

ہارپر (امریکہ)

لطائف ۔ ایک انگریز ایک امریکن کو اسٹیشن سے اپنے گھر کو لے جا رہا تھا۔ راستہ میں ایک عالیشان عمارت دکھائی دی۔ امریکن نے پوچھا "یہ کیا ہے؟"

انگریز نے جواب دیا "یہ عدالت عالیہ کی عمارت ہے۔ تین سال میں تعمیر ہوئی ہے"

"مگر ہمارے ہاں تو ایسی عمارات دو دو دن میں تیار ہو جاتی ہیں"

انگریز اس تعلّی پر سٹپٹا گیا۔ مگر موقعہ کا منتظر رہا

رستے میں ایک اور عمارت نظر آئی۔ یہ نسبتاً چھوٹی تھی۔ امریکن نے پھر پوچھا "کیوں صاحب! یہ کونسی جگہ ہے؟"

انگریز نے حیرت ظاہر کی اور جواب دیا "میں نہیں کہہ سکتا۔ کہ یہ کونسی عمارت ہے۔ کیونکہ جب آپ کو لینے کے لئے اسٹیشن کو گیا تھا۔ اُس وقت یہ تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران میں تیار ہوئی ہے"

امریکن کو جواب مل گیا۔

۲۔ بیوی۔ آدمی بعض وقت کیسی کیسی غلطی کر بیٹھتا ہے
شوہر۔ یعنی شادی کر لیتا ہے۔

۳۔ ایک پادری نے ایک لڑکے کو اتوار کے روز پتنگ اُڑاتے دیکھ کر پوچھا "صاحبزادے! تم اتوار کے روز پتنگ اڑاتے ہو۔ تمہیں اپنے مذہب کا کیا بالکل خیال نہیں؟"

لڑکے نے سادگی سے جواب دیا۔ "مگر یہ پتنگ اتوار ہی کے اخبار سے تو بنایا گیا ہے۔"

۴۔ پادری۔ (ایک لڑکے سے) گناہ بخشوانے کے لئے سب سے پہلے کس چیز کی ضرورت ہے؟
لڑکا۔ گناہ کرنے کی۔

۵۔ انسپکٹر۔ اخبار پڑھنے کا کیا فائدہ ہے؟
طالب علم۔ گھر میں ردّی جمع ہو جاتی ہے۔
انسپکٹر۔ نہایت نامعقول ہو (دوسرے طالب علم سے) سگرٹ پینے کا کیا نقصان ہے؟
دوسرا طالب علم۔ دیا سلائیاں بہت خرچ ہوتی ہیں۔ نیوز مجلات (آسٹریلیا)

حصۂ نظم

گرمی

پھر زمانہ جون کا آیا درِ دوزخ کھلا — آگ برسی غیض سے پھر تمتما اُٹھی فضا
خون کھولا، ہر بنِ مو سے پسینہ پھر چلا — پھر بخاراتِ زمیں اُمڈے تلاطم آ گیا

خیر ہو یا رب کہ پھر برہم مزاجِ نار ہے
جو کرن ہے، خون میں ڈوبی ہوئی تلوار ہے

دہکے انگارے سے آنکھوں میں رگوں میں گرم خون — چل گیا پھر اک زمانہ پر تمازت کا فسوں
شیرنی کی طرح پھر چنگھاڑتی پھرتی ہے لُون — آگ برسانے لگا گرمی کی دیوی کا جنون

دھوپ نے کھولا کے موجوں کو جہنم کر دیا
آتشِ سیّال سے دریا کا سینہ بھر دیا

پھر زمیں سے آنچ سی اُٹھنے لگی، بھڑکے تنور — لُو کے جھونکے دوپہر تک بن گئے طوفانِ صور
پھر گھنیرے پیڑوں کے پتوں میں چھپ جا کر طیور — انتہا پر آ گیا پھر تیز سورج کا غرور

کوہ کی چوٹی پہ جتنا برف تھا سب گھل گیا
بادشاہِ شرق کا پھر سرخ پرچم کھل گیا

فصلِ گل کا خشک پتوں سے کفن سلنے لگا — جل گئے سینے کے ٹانکے زخمِ دل کھلنے لگا
پھر زمیں کو زلزلہ آیا، فلک ہلنے لگا — مہرِ عالمتاب پھر جھک کر گلے ملنے لگا

لڑکیاں پھولوں سے پھر کورے گھڑے سجنے لگیں
پھر ہوا سے روزنوں میں سیٹیاں بجنے لگیں

خشک کلیاں ہو گئیں مرجھا گئے سب برگ و بار — پھر چڑھا ہے دھوپ کی تیزی سے دنیا کو بخار
چرخ پر چھایا ہوا ہے صبح سے گرد و غبار — کتنا آتش ریز ہے اے جون تیرا ابرِ نار

ابرِ مصنوعی نے گم کی آب و تابِ آسماں
یہ غبارِ زرد ہے گویا سرابِ آسماں

حلق میں کانٹے پڑے، ہونے لگا پھر رنگ زرد — لب پہ خشکی، طبع میں آشفتگی، آنکھوں میں گرد
کنپٹی کی رگ چلی سہم اٹھا پھر سر میں درد — حد سے گرمی بڑھ گئی پھر ہو گئے جذبات سرد

کس سے وحشت کیجئے، کس کی تمنا کیجئے
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ اب کیا کیجئے

اُس جگہ بالو ہے بہتے تھے کبھی دریا جہاں — اوڑھ کر زر رنگ چادر سو گئی ہیں ندیاں
دوپہر کا اژدہا ہے غیض میں کف در دہاں — یہ زمیں جھلسی ہوئی تپتا ہوا یہ آسماں

پتیوں کے سائے میں بھونرے یہ تھراتے ہوئے
یہ بگولے خشک میدانوں میں بل کھاتے ہوئے

ایک ہنگامہ سا برپا ہے زمیں سے تا فلک — رنگ سبزے سے اُڑا ہے سینۂ گل سے مہک
سرخ ذروں کی حرارت گرم سورج کی پلک — چارپائے جھیل میں ڈوبے ہوئے گردن تلک

خوابگاہیں نوجوانی کی بھی اب بھاتی نہیں
کُنج میں ہے اور چرواہے کو نیند آتی نہیں

گرم پنکھے کی ہوا ہے خشک ہیں ہوش و حواس — ہر بنِ مو ایک چنگاری ہے تپتے ہیں لباس
ہو گئے ہیں پھول سے چہرے حسینوں کے اداس — ٹٹیاں چھڑکی گئیں بستر ہیں دروازوں کے پاس

نازنیں تلخیٔ موسم کے مزے چکھے ہوئے
سو رہے ہیں ٹٹیوں کے پاس منہ رکھے ہوئے

جوش ملیح آبادی

دولت کا خطاب

پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلوی نے "دولت" کے سات خطاب سات مختلف شخصوں کی طرف سات بندوں میں نظم کئے ہیں ہر بند سبق آموز ہے ذیل کا خطاب ایسے شخص کی جانب ہے۔ جو زندگی کے شروع ہی میں بہت بڑا مالدار بننے کا آرزومند ہے دولت کا دوسرا روئے سخن اُس کاہل الوجود انسان کی طرف ہے جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر ہی متمول بننا چاہتا ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں باقی بند بھی شائع کئے جائینگے۔ اڈیٹر

تو مرے واسطے اس درجہ پریشاں کیوں ہے — دور سے دیکھ کے صورت مری حیراں کیوں ہے
قول یہ یاد ہے کہ آدمی کے ہیں پیر شدی — میرے ملنے کا ابھی سے تجھے ارماں کیوں ہے
دن کبھی کاموں میں لگتا دل کہ سویرا ہے ابھی — استراحت کا یہ پوچھے ہی سامان کیوں ہے
مجھکو سمجھا ہے مگر منہ کا نوالا کوئی — اسقدر بیتاب تو اے بندۂ آساں کیوں ہے
چپ سے ہاتھ آؤنگی تو جھٹ سے پسٹک جاؤنگی — رنج و محنت سے تجسس سے گریزاں کیوں ہے
ٹھنڈے دل سے تو ذرا جھیل تو نے سوز فراق — برق بیتاب صفت شعلہ بداماں کیوں ہے
پہلے دامن تو وہ پیدا ہو سماؤں جسمیں — جوش وحشت میں عبث چاک گریباں کیوں ہے
کام ہے ٹھیک ہی وقت پہ جو ہوتا ہے — اپنی تعجیل مزاجی سے پریشاں کیوں ہے
امتحاں میں نہیں منظور کہ ڈالوں تجھ کو — صبر کر دم نے ذرا اسقدر ہراساں کیوں ہے
دلنوازی ہے مری درخور ظرف طالب — تو سوا اس سے مرے لطف کا خواہاں کیوں ہے

قابل اور اہل جب اے دوست تجھے پاؤنگی
بن بلائے میں ترے پاس چلی آؤنگی

کیفی دہلوی

تو نے میرے لئے گر رنج اٹھایا ہوتا — میرے الطاف کا سر پر ترے سایہ ہوتا
سر جھکائے رہا پیشانی کی تحریر پہ تو — کبھی دریائے عرق اس پہ بہایا ہوتا
تجھکو تدبیر سے پرہیز ہے کوشش سے گریز — دل کبھی رنج و مشقت سے لگایا ہوتا
نیک تدبیر سے تقدیر بدل جاتی ہے — لوح دل پر کبھی نقش اسکا بٹھایا ہوتا
بیگماں گوہر مقصود تجھے مل جاتا — غوطہ محنت کے سمندر میں لگایا ہوتا
سبز البتہ تری کشت تمنا ہوتی — خون گرم اپنا اگر اسکو پلایا ہوتا
بنکے اکسیر ترے ہاتھ میں خود آجاتی — خاک میں آپکو گر تو نے ملایا ہوتا
تنگ و دو سے ہے گریز اور مشقت سے حذر — کیونکر اونچا تری تقدیر کا پایا ہوتا
رہا آساں طلبی مفت بری کا پکا — ہاتھ سے کام کبھی کر کے دکھایا ہوتا
جستجو میری ز خود رفتہ تجھے کر دیتی — شوق میرا جو ترے دل میں سمایا ہوتا

پاس پیاسے کے بھی ناداں کنواں آتا ہے
گرتا پڑتا وہاں وہ آپ پہنچ جاتا ہے

کیفی دہلوی

اسیر قفس

اے قید قفس چشم بصیرۃ سے ذرا دیکھ!
تو دام سمجھتا ہے جسے دام نہیں ہے

لائیگا کبھی رنگ ترا رنج اسیری
اک رنگ پہ یہ ابلق ایام نہیں ہے

"الیسر مع العسر" اگر سچ ہے تو پھر کیا
اس صبح مصیبت کی تری شام نہیں ہے؟

آزادی کامل تجھے ہوگی کبھی حاصل
یہ تیری تمنا ہوس خام نہیں ہے

صیاد نے گر قید میں رکھا تو ہوا کیا
پابند قفس گردش ایام نہیں ہے

تاجور

جذباتِ عالیہ

ذیل کی غزل مجددِ عصر ڈاکٹر اقبال کی فرمائش سے لکھی گئی۔

غالب

آں راز کہ در سینہ نہانست نہ وعظ است — بر دار تواں گفت بمنبر نتواں گفت

گرامی

عشق آمد و از عقل فسونگر نتواں گفت — پیداست کہ از پنبہ و اخگر نتواں گفت

ما خم کشِ دیرینۂ سرجوش الستیم — با ما سخن از شیشہ و ساغر نتواں گفت

با دلشدگاں قصۂ محشر نتواں کرد — با سوختگاں حرف ز کوثر نتواں گفت

آں طفل رہِ دل زدو رہزن نتواں خواند — در کعبہ زند آتش و کافر نتواں گفت

منصور کہ مستانہ برآمد بسرِ دار — خوش گفت کہ ہر نکتہ بمنبر نتواں گفت

آں راز چہ راز ست کہ در پردۂ میم ست — آں راز الٰہی ست مکرر نتواں گفت

آں رمزِ جلیل ست ابوجہل چہ فہمد — آں سرِّ خلیل ست بآذر نتواں گفت

آنرا کہ دریں دشت نہ صید ست نہ صیاد — شاہین نتواں گفت کبوتر نتواں گفت

در سینہ بمیرد دل بیدرد کہ آنرا — ماہی نتواں گفت سمندر نتواں گفت

بسم اللہ ترا ایں مژہ آں ابروئے خونریز — برخیز کہ از دشنہ و خنجر نتواں گفت

با دوست حدیثِ دلِ غمدیدہ چہ گویم — وارفتگیِ ذرّہ با اختر نتواں گفت

در دیدۂ معنی نگہاں حضرتِ اقبال — پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

اینست سخنہائے گرامی اگر اینست

شاعر نتواں خواند سخنور نتواں گفت

تپش

عالمِ دل ہے نورِ دیدۂ شوق — میری ہستی ہے آفریدۂ شوق

مدّعائے نظر ہے حسنِ نظر — ہمہ تن بن گیا ہوں دیدۂ شوق

تارِ دامن ہوئے گریباں گیر — مدد اے دستِ نارسیدۂ شوق

دیدہ براہِ خارِ حسرت ہے — پلسئے وحشت زدہ خلیدۂ شوق

ہے تمنائی نیازِ جبیں، — سر راہِ وفا خمیدۂ شوق

ہائے کیونکر ہوا اعتبارِ خیال — مدعا اور برگزیدۂ شوق!

چشمِ اشک آفریں کو لیا کیئے — جامِ لبریز ہے دمیدۂ شوق

ہو گیا آخرش نصیبِ خزاں — اے گلِ مدّعا نچیدۂ شوق!

آہوئے دشتِ قیس کی ہے تلاش — دیدۂ شوق ہیں رمیدۂ شوق

غنچۂ دل سے باز پرس نہ کر — اے نسیمِ وفا وزیدۂ شوق

ہو گئیں کل امیدیں جذبِ فنا — مٹ گیا دل سے سب عقیدۂ شوق

نہ کھلی چشمِ منتظر نہ کھلی — مرحبا! جاں بلب رسیدۂ شوق

خوف کیا اب شکستہ رنگی کا — صورتِ حال ہے کشیدۂ شوق

چشم پوشی کی ہے طلب یعنی — پیرہن ہوں مگر دریدۂ شوق

ہے غزل میں تپش شباب کا جوش

لکھ رہا ہوں ابھی قصیدۂ شوق

وقار الاعظم شرف

دل سے کہ ہیں دل کے ارمان سے کیا مطلب؟
تم جان سے پیارے ہو تو جان سے کیا مطلب؟
اِس عشق کی مشکل سے آسان سے کیا مطلب؟
ہم درد کے طالب ہیں درماں سے کیا مطلب؟
توحید کا دریا بھی سرچشمۂ رحمت ہے
سرچشمۂ رحمت کو طوفان سے کیا مطلب؟
اک ہیں کہ مجھے حسرت۔ حسرت ترے ملنے کی
اک تو کہ تجھے میرے ارمان سے کیا مطلب؟
دُنیا مجھے کہتی ہے دیوانہ ہے دیوانہ
لیلےٰ ترے مجنوں کو اوسان سے کیا مطلب
بت خانہ میں کافر ہوں کعبہ میں مُسلماں ہوں
تم سے مجھے مطلب ہے ایمان سے کیا مطلب
کچھ دل میں مرے یارب کانٹا سا کھٹکتا ہے
کیا چیز بنائی ہے ارمان سے کیا مطلب
آپ اور خطا زاہد توبہ ہے مری توبہ
حضرت تو فرشتہ ہیں انسان سے کیا مطلب؟
سب چل دیئے مرقد سے مٹی مجھے دے دے کر
اب جان نہیں باقی پہچان سے کیا مطلب؟
فریاد جو کی میں نے تو درد نے لی چٹکی
یہ رازِ محبت ہے اعلان سے کیا مطلب؟
پردے کی ترے بولی بندوق کی ہے گولی
اب جان کہاں مجھ میں؟ اب جان سے کیا مطلب؟
میں نے جو کہا کافر کہتا ہے کہ تم کافر
کافر کی محبت سے ایمان سے کیا مطلب؟
اُن کا ہے شرف اُن کا پوچھیں کہ نہ پوچھیں وہ
اللہ کے بندہ کو اس دھیان سے کیا مطلب؟

خورشید

ہُوئی جوں جوں ترقی عرصۂ چاک گریباں میں
جنوں کے راستے کُھلتے گئے خود ہی بیاباں میں
نواسنج فغاں رہنا مرا ہر وقت زنداں میں
جگا دیگا کبھی تو ہم صفیروں کو گلستاں میں
قیامِ موجِ غم کب تک؟ اگر راحت کو گردش ہے
ہُوا کرتے ہیں ایسے جزر و مدہستی کے طوفاں میں
مرا حال زبوں آنکھوں سے اب دیکھا نہیں جاتا
نگاہیں آپ پردہ بن گئی ہیں چشمِ گریاں میں
سکونِ دل ہُوا حاصل طفیلِ دشت پیمائی
علاج آبلہ پائی ملا خارِ مغیلاں میں
جنونِ عشق نے کی رہبری کتنوں کی منزل تک
تلاشِ خضر میں کی راہ گم میں نے بیاباں میں
ترے دیوانے کے گرد ایک خلقت جمع رہتی ہے
یہ جمعیت مُبارک ہو اسے حالِ پریشاں میں
اثر ہے وحشت انگیز اس قدر بادِ بہاری کا
کہ پیدا ہوگئی جُنبش سی ہر تارِ گریباں میں
دلِ خورشید کو اللہ نے کیا داغ بخشا ہے
نہ شوکت ایسی لالہ میں نہ یہ ضو ماہِ تاباں میں

تقریظات

ہیر رانجھا جدید مصنفہ منشی مولا بخش صاحب کشتہ امرتسری

ہیر رانجھا کے موضوع پر اگرچہ آجتک بیشمار قصے مختلف اوقات اور مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور اُن میں سید وارثشاہ کی ہیر کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے لیکن زیر تقریظ کتاب اپنے طرز بیان اور اعلیٰ تخیلات کی بنا پر پسندیدہ اور قابل قدر ہے کشتہ صاحب نے اگرچہ پنجابی نظم میں بطرز وارثشاہ اس قصہ کو لکھا ہے مگر اسمیں طبی اخلاقی اور علمی نکتے بھی خوب بیان کئے ہیں زبان ٹھیٹھ پنجابی ہے انداز بیان پُر لطف اور دلچسپ لکھائی چھپائی نفیس۔ اور کاغذ چکنا ولیسی حجم قریباً دو سو صفحہ۔ قیمت .. .. عہ ر

ملنے کا پتہ:۔ منشی مولا بخش کشتہ اینڈ سنسز تاجران کتب امرتسر

آنریری مجسٹریٹ۔ ایک مختصر مذاقیہ ڈرامہ مصنفہ فطرت نگار سدرشن مصنوعی طرز تکلم سے پاک مقفےٰ نثر سے مبرا افرادِ ڈرامہ کی باہمی گفتگو بالکل بے تکلفانہ اور مطابق فطرت ہے کاش دوسرے ڈرامہ نویس بھی فطرت نگاری میں سدرشن کی تقلید کریں۔ قیمت ۴ ر رام کٹیا لاہور سے طلب کریں۔

نگار۔ ماہوار علمی و ادبی رسالہ زیر ادارت حضرت نیاز فتحپوری و جناب مخمور اکبرآبادی آگرہ سے شائع ہورہا ہے متعدد نمبر دیکھنے کے بعد تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو ادبی رسائل میں نگار سب سے زیادہ ممتاز ہے اسکے ادبی مضامین خاص پایہ کے ہوتے ہیں علمی و تاریخی مضامین کا ذخیرہ بھی امتیازی شان رکھتا ہے۔ ل احمد کا ترجمہ مضمون "لالہ رخ" جو متعدد نمبروں میں مسلسل شائع ہورہا ہے اردو ادب کا بہترین سرمایہ کہا جاسکتا ہے۔ نگار کو دیکھ کر حضرت نیاز کے ہر فنی ہونیکا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ حضرت نیاز نے اپنے بہار آفریں قلم سے نگار کو اسم بامسمّٰی بنادیا ہے۔

ہماری آرزو ہے۔ کہ اُردو کے ہر شہر سے ایک ایک نگار شائع ہو۔ قیمت سالانہ پانچروپیہ .. صہ ر

حُرّیت۔ یہ ہفتہ وار سیاسی ادبی اخبار زیر ادارت مولوی عنایت اللہ خانصاحب لاہور سے شائع ہورہا ہے۔ نام کو تو یہ اخبار ہے لیکن درحقیقت ایک سیاسی ادبی رسالہ ہے۔ مولویصاحب موصوف مولنا ظفر علی خانصاحب کے بھائی ہیں۔ اس خاندان کے اردو اخباری دنیا پر گرانقدر احسانات ہیں۔ دراصل ہندوستان بھر میں اخباری مذاق زمیندار کے ذریعہ پھیلا۔ اخبار حریت کی شگفتہ زبان دلکش ادائے بیان زمیندار کے عہد شباب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ہر نمبر میں بڑے سائز پر کسی اسلامی رہنما کی پوری تصویر شائع ہوتی ہے ان تصاویر پر اگرچہ بیشمار روپیہ صرف ہوتا ہوگا مگر اخبار کا ہر نمبر بیحد جاذب توجہ بنجاتا ہے۔ ابتک خلیفۃ المسلمین غازی مصطفےٰ کمال پاشا غازی انور پاشا۔ غازی امیر امان اللہ خاں۔ مولانا ظفر علیخانصاحب وغیرہ کی تصاویر شائع ہوچکی ہیں۔ ہر نمبر میں دلفروز ادبی و سیاسی نظمیں دلچسپ معلومات۔ سیاسی کارٹون شائع ہوتے ہیں۔ غرضیکہ صوبہ بھر کے ہفتہ وار اخباروں میں اپنا جواب نہیں رکھتا چندہ سالانہ آٹھ روپے ششماہی للعہ۔ سہ ماہی عہ ر دفتر اخبار حریت سے طلب کیجئے۔

ہزار داستان۔ پندرہ روزہ ادبی رسالہ زیر ادارت حکیم احمد شجاع صاحب بی اے (علیگ) مقام اشاعت لاہور قیمت سالانہ آٹھ روپے۔

اگرچہ پہلے نمبر پر اظہار رائے اسکے مستقبل پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا لیکن بمصداق "سالے کہ نکوست از بہارش پیدا است" حسن آغاز، انجام بخیر سنا رہا ہے۔ کوئی گرانپایہ ادبی رسالہ جاری کرنیکے لئے اسکے مالک میں تین صفتوں کا ہونا ضروری ہے۔

اول یہ کہ وہ بے اندازہ دولت رکھتا ہو ثانیاً ضرورت سے زیادہ ناعاقبت اندیش ہو۔ ثالثاً ادبی ذوق سے بہرہ ور ہو۔

ہمارا ذاتی علم اور ہزار داستان کا حسن معنوی حکیم صاحب کے ادبیات لطیف سے والہانہ محبت پر شاہد ہیں۔ مقدم الذکر دو صفات کا ثبوت رسالہ کی نظر فریبی سے مل سکتا ہے۔ ہزار داستان باتصویر ہے حسنِ طباعت کے ساتھ حسنِ کتابت سے بھی مالا مال ہے۔ ہزار داستان زیادہ تر افسانوں کا مجموعہ ہے اور اسی غرض کیلئے جاری کیا گیا ہے۔ ایک سرسری نظر میں ہم نے اسے دلچسپ پایا۔ زبان و محاورات کی بعض لغزشوں اور نظم کے کچھ حصے سے قطع نظر کر لی جائے تو ہزار داستان ان رسالوں میں شمار ہونیکے قابل ہے جنکی دنیائے اردو کو ضرورت ہے۔ "کتے" کے عنوان سے جناب پطرس کا مضمون ایسا قہقہہ انگیز ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ کے بل خم گیسو بن جاتے ہیں۔ سید امتیاز علی صاحب تاج نے "ساون رین کا سپنا" اور "لیلے" کے نام سے لارڈ لٹن اور شکسپیر کے ناول اور ڈراما کا ترجمہ مسلسل طور پر شائع کرنا شروع کیا ہے۔ یہ دونوں ترجمے بہت دلکش ہیں۔ کاش ڈرامے کا نام کچھ اور ہوتا۔ خود ایڈیٹر صاحب کے قلم سے بھی "ہیرے کی چوری" کے عنوان سے ایک مختصر سا افسانہ شائع ہوا ہے۔ "خندۂ تقدیر" والے مضمون کی عبارت پر اگر نظر ثانی کر لی جاتی تو زیادہ مناسب ہوتا۔ ایسے ہی "امینہ کا گیت" درج کرکے جسٹس محمود مرحوم کو زبردستی شاعر نہ بنایا جاتا تو بہتر تھا جسٹس محمود کا تبحر علمی۔ قانونی قابلیت اور عدیم المثال ذہانت یہ اوصاف کیا کم تھے؟ کہ انہیں کشاں کشاں دخل در معقولات کی حیثیت دیگر شاعروں کی قطار میں بھی لا کھڑا کیا۔ معمولی فروگذاشتوں سے جو عام طور پر ہر رسالہ میں ناگزیر ہوتی ہیں۔ قطع نظر کر لی جائے (اور ضرور کر لینی چاہیئے) تو ہزار داستان اس قابل ضرور ہے کہ اردو دنیا اسکی قدر کرے۔ ہم اپنے باوقار معاصر کا دلی خیر مقدم کرتے ہوئے پبلک سے استدعائے قدر شناسی کرتے ہیں۔

نونہال - بچوں کا ایک ہفتہ وار باتصویر اخبار قیمت چھ روپیہ سالانہ مقام اشاعت لاہور۔ زیر ادارت ایڈیٹر صاحب ہزار داستان ہندوستان بھر میں بچوں کیلئے اردو کا ہفتہ وار باتصویر اخبار اس شان و شکوہ کا اس سے پہلے کبھی شائع نہیں ہوا ہمایوں کے سائز پر حجم بیس صفحات خط جلی اور خوبصورت، کاغذ اعلیٰ چھپائی خوب، سرورق نہایت قیمتی اور باصرہ فروز جس پر پورے سائز میں ایک رنگین تصویر ہے۔

اس رسالہ میں ہر قوم کے بچوں کیلئے مذہبی۔ اخلاقی۔ تاریخی عام فہم کہانیاں شائع ہوتی ہیں۔ منہ کا مزہ بدلنے کیلئے کہیں کہیں دلپسند لطیفے اور نظمیں بھی درج کیجاتی ہیں بحیثیت مجموعی یہ اخبار اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی بچہ کے ہاتھ میں ہو۔

نونہال کی زبان "پھول" کی طرح توتلی نہیں ہے یعنی نونہال اسکولوں کی ہائی جماعتوں میں پڑھنے والے طلباء کیلئے زیادہ مفید ہوگا پھر بھی اسکی عبارت موجودہ صورت سے زیادہ سلیس اور آسان ہونی چاہیئے۔ امید ہے آئندہ کہانیوں کے ذریعہ بچوں کو حب الوطنی کی تعلیم دینے کا زیادہ اہتمام کیا جائیگا۔

اخبار تعلیم لاہور - یہ اردو زبان کا ہفتہ وار تعلیمی اخبار زیر ادارت منشی طالب علی صاحب پابند سابق ایڈیٹر رسالہ رہنمائے تعلیم لاہور سے شائع ہوتا ہے۔ اخبار تعلیم اپنی نوعیت کا صوبہ بھر میں ایک اخبار ہے اور اسکے لئے منشی صاحب سے بہتر کہنہ مشق ایڈیٹر نہیں ملسکتا تھا اس اخبار کے ہر نمبر میں سررشتۂ تعلیم کے معلموں کی حالتِ زار کا دردناک نقشہ نظر آتا ہے صوبۂ پنجاب کے تعلیمی شعبوں کے مفصل حالات درج ہوتے ہیں طالب علموں کے لئے مفید اخلاقی معاشرتی و تعلیمی مضامین شائع ہوتے ہیں غرضیکہ منشی صاحب اخبار تعلیم کو مفید اور دلچسپ بنانے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔

یہ اخبار محکمۂ تعلیم پنجاب کی خاص توجہ کا مستحق ہے
قیمت سالانہ چار روپے
دفتر اخبار تعلیم۔ متصل پیسہ اخبار لاہور

(تاجور)

دو نہایت قیمتی اور دلچسپ سوال

جو ہر خوش نصیب آدمی کو غور اور توجہ کے ساتھ حل کرنے چاہئیں

(۱) کون شخص دنیا میں کامیاب. نامور اور بامراد زندگی بسر کر سکتا ہے

(۲) کیا میرا شمار بھی ایسے خوش نصیب لوگوں میں ہے؟ یا ہو سکتا ہے؟

اگر جناب کو ان دو سوالوں سے ذرا بھی دلچسپی ہے اور نہ صرف اُن اصولوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔ جو دنیا کے ناموروں اور اقبالمندوں کی **کامیاب زندگی** کی جڑھیں۔ بلکہ ساتھ ہی اپنے اندر ایک بجلی کی سی لہر پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ جو جناب کو کامیابی و مرادمندی کی منزل مقصود پر پہنچا سکے اور ہمیں یقین ہے کہ آپکی موجودہ کاوش و محنت اور سینکڑوں ہزاروں کا صرفِ زر اسی لئے ہے۔ کہ آپ اپنے ارادہ میں کامیابی اور کمالیت حاصل کریں۔ اگر آپ اپنی زندگی کے آنیوالے سالوں کو **کامیابی عزت و ناموری**، اور **دولت و اقبال** جیسی نعمتوں سے مالامال بنانا چاہتے ہیں۔ تو آیئے آج اپنی عمر کے چند لمحے کتاب **کامیابی** کے بغور مطالعہ کرنے میں، ہماری سفارش پر ضائع کر ڈالئے یہ کتاب مشاہدات کی بنا پر ایک عجیب روح بخش لہجہ میں، جناب کو بتائیگی۔ کہ **دنیا میں بڑا بن جانا**، دولت و عزت حاصل کر لینا، کسی کی میراث یا ملکیت نہیں۔ بلکہ یہ آدمی کے اپنے ہاتھ کے کھیل ہیں۔ اور اگر آپ بھی چاہیں تو صرف چند اصولوں پر چلکر کچھ کا کچھ بن سکتے ہیں۔ نہایت محنت اور ابنائے ملک کی سچی ہمدردی سے لکھی گئی ہے۔ ایک ایک لفظ قیمتی ہے۔ جناب کے صدہا ساتھی ضرور اس سے فائدہ اُٹھائینگے آپ بھی اپنی کامیابی میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھیں۔ کتاب کے ملاحظہ سے گذرنے کے بعد آپ ہم سے کہیں زیادہ اسکی قدر کرینگے۔ نہایت مؤثر اور دلچسپ سات ابواب پر مشتمل۔ لکھائی خوشخط سلیس۔ چھپائی عمدہ۔ کاغذ نفیس۔ خوبصورت جلد بندھی ہوئی۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ایکروپیہ پانچ آنے عہ/

اگر منگوانی ہو تو فرمائش جلدی روانہ فرمادیں۔ دوسرے ایڈیشن کا انتظار نہ کرنا پڑے۔ پتہ یہ ہے۔

فرمایش کے ساتھ رسالہ ہذا کا حوالہ ضروری ہے

حافظ غلام رسول سوداگر "کامیابی ڈپو" وزیرآباد (پنجاب)

خریداران ہمایوں

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری ضرور تحریر فرما دیں

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نویدِ دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ محزوں شد

بیادگار عمدۃ الافصح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ
میاں بشیر احمد بی۔اے۔(آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر
مولینا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق مینیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا
(عبدالمجید خوشنویس لاہور)

ہمایوں

جلد ۲ ستمبر ۱۹۲۲ء نمبر ۳

دوشیزۂ فرانس

ندائے غیب کا پیام اولیں

کسی نے سچ کہا ہے کہ سانچ کو آنچ نہیں؟

دوشیزۂ فرانس جو پندرھویں صدی کے آغاز میں بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں جل کر ایک جادوگرنی کی موت مری آج پانچسو برس بعد اک ایسے زمانے میں جبکہ اعتقاد و مذہب کی بنیادیں متزلزل ہو چکی ہیں اولیا کے مرتبہ کو پہنچ گئی ہے۔

کلیسا جو اس بے رحمی کی موت میں شریکِ ستم تھا اُسے سینٹ (ولی) کا لقب دے کر مسیحی اولیاؤں کے زُمرے میں فخر کے ساتھ اُس کا شمار کرتا ہے اور فرانسیسی اور انگریز، کبھی اُس کے بے پرواہ دوست اور جانی دشمن، دونوں دورانِ جنگ میں اُسکی عظمت کا اعتراف کرتے ہیں کہ وہ ایثارِ نفس کا بت اور حب الوطنی کی سچی تصویر تھی؟

دُنیا میں جب کبھی حُسنِ ایثار کی سچی داستان لکھی جائے گی کم سن غازیۂ فرانس کا نام اُسکے سرورق پر سُنہری حرفوں میں منقوش نظر آئیگا!!

یوں تو روئے زمین پر لاکھوں عورتیں ایسی گذری ہونگی جنہوں نے اپنی گرانقدر زندگی کو

اپنے متعلقین کی خوشیوں پر قربان کر دیا، ہزاروں ایسی ہونگی جو اَوروں کے بغض و حسد کی بھڑکتی ہُوئی آگ میں کُود کر سونے چاندی کی طرح چمکیں، سینکڑوں ایسی بھی ہیں جن کے جوہر گھر کی مٹی میں مل کر مٹی ہوگئے جنہیں اس تاریک زندانِ ہستی میں موقع نہ ملا کہ وہ میدانِ زیست میں قدم رکھ کر مردوں کے مقابل میں اپنی صنف کی برابری کا ثبوت دے سکتیں اور بیسیوں وہ جو اس معرکے میں پُوری اُتریں جنہوں نے اپنی جنس کی کمتری کے سنگین بُہتان کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا اور جنسِ غالب کے دل پر اپنی مساوی قابلیت کا پُورا سکہ بٹھایا ـــــ لیکن شاید صرف اِک دوشیزۂ فرانس تھی جس نے نہ محض یہی کہ غیروں کے عیش و آرام کو اپنے سکون و اطمینان سے زیادہ عزیز جانا، اِک بے فکری کی زندگی سے دامن چھُڑا کر ایسی لوٹ مار کے زمانے میں جب قوی ہیکل مرد بھی گھر سے باہر قدم رکھنا موجبِ ہلاکت سمجھتے تھے ماں باپ کے گھر کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہی اور جو خانہ داری کے لُطف و مسرت اور معاشرتی زندگی کے رسم و رواج سے کنارہ کش ہو کر نا شائستہ مردوں کے درمیان اپنی پاکیزگی و پاکدامنی کے ساتھ عمر بسر کرنے کو چل نکلی، بلکہ جس نے ایسے وقت میں جبکہ اندوہ و حرمان کی کالی گھٹائیں اُس کے وطن پر اک نہ ٹلنے والی بلا کی مانند چھائی ہُوئی تھیں دلوں کو چیر دینے والی بجلی کی طرح فضائے تاریک کو اپنی آسمانی روشنی سے زندہ و پُر نور بنا دیا، ایسے زمانے میں جب مردوں کے حوصلے میدانِ جنگ کی پے در پے شکستوں سے ٹوٹ کر اُن کے دل پست ہو چکے تھے، وہ فتح کو دشمن کا مُقدر اور شکست کو اپنا نصیبہ سمجھ چکے تھے، نصف سے زیادہ ملک غنیم کے حوالے کر کے باقیماندہ حِصّے پر قابض رہ جانا معراجِ کامیابی تصوّر کرتے تھے، اُس نے گھر کی دُنیا سے نکل کر ایک دلوں کو دہلا دینے والا نعرہ مارا کہ نامردو! مرد بنو، فرانس تمہارا وطن ہے غنیم کا نہیں، جس سرزمین میں تم پیدا ہُوئے اُس کی حُرمت کو کھو کر اُس کی آغوش میں غفلت کی نیند سوئے رہنا یہ اُن کا کام ہے جو اپنے فرائض کو بھُول چکے ہوں، اپنی ہستی کو بھُول چکے ہوں اپنے خدا کو بھُول چکے ہوں، تمہارا کام اُس کی کھوئی ہُوئی آزادی کا حاصل کرنا اُس کی کھوئی ہُوئی عزت کا پھر پالینا اور یہ نہ ہوسکے تو اُن کو ڈھونڈنے اور ڈھونڈ نکالنے کی سعیِ مُسلسل میں لڑنا اور لڑتے لڑتے مر جانا ہے!"، اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس جنگ ناآشنا دوشیزہ نے

اپنے ہزیمت خوردہ ہم وطنوں کو یہ کہہ کر ایک مکمل اور یقینی کامرانی کی بشارت دی کہ میں خدا کی چُنی ہُوئی اور خدا کی بھیجی ہُوئی ہوں مجھے اُس نے اس کام کے لئے چُن لیا ہے کہ اُس کی مرضی ایسی ہی ہے اور اس کام کے پُورا کرنے کو اُس نے مجھے تمہارے درمیان بھیجا ہے کہ اُس کی مرضی تمہیں فتح و ظفرمندی کی بلند چوٹیوں پر لے جانا اور تمہارے دشمن کو ذلت و ناکامی کے ہولناک سمندر میں دھکیل دینا ہے، اُس کا پیغام جو میں لائی ہوں سُنو، میں جو کچھ کہوں تم کرو کہ میں تم سے وہی کہونگی" جو آسمان کی آوازیں" مجھے کرنے کو کہتی ہیں!!

جب یہ غازیہ پیدا ہُوئی، فرانس اُس کا وطن اک حالتِ زار میں مبتلا تھا۔ فرانس اور انگلستان کے مابین "جنگِ صد سالہ،" کو شروع ہُوئے تین چوتھائی صدی ہو چکی تھی۔ فرانس پر انگریزوں کے اس حملہ کی بنیاد دراصل انگلستان پر فرانسیسوں کا وہ حملہ تھا جو اس سے تین سو برس پیشتر واقع ہُوا جب فرانسیسی صوبۂ نارمنڈی کے مشہور ڈیوک ولیم فاتح نے ۱۰۶۶ء میں انگلستان پر یورش کر کے اینگلو سیکسن قوموں کو اپنے زیرِ نگیں کیا اور لندن میں اپنی موروثی حکومت قائم کر لی (انگلستان کے موجودہ حکمران اُسی کی نسل سے ہیں) وہ فرانس میں نارمنڈی کا ڈیوک اور اس لحاظ سے شاہِ فرانس کا اطاعت گذار تھا لیکن انگلستان میں وہ ایک خود مختار تاجدار تھا جس کا حقِ حکومت دراصل زورِ شمشیر پر مبنی تھا۔ اُس کے جانشینوں نے دوسری تیسری پشت میں فرانس کے مختلف صوبہ داروں سے خاندانی تعلقات قائم کر کے اپنے فرانسیسی علاقے کو وسعت دی یہانتک کہ ہنری دوم (۱۱۵۴ء تا ۱۱۸۹ء) نے اپنے ماں باپ اور بیوی کے حقوق کے ذریعے سے قریب قریب نصف فرانس پر اپنا تسلط جما لیا لیکن شاہِ جون نے آئندہ صدی کے آغاز میں اس وسیع سلطنت کو اپنی کوتاہ اندیشی سے کھو دیا۔ ۱۳۲۸ء میں چارلس چہارم کی وفات کے ساتھ فرانس کے اصلی کاپیتی خاندان کا کوئی نرینہ رُکن باقی نہ رہا۔ سالی قانون کے مطابق کوئی عورت تخت کی دعوے دار نہ ہو سکتی تھی لیکن انگلستان کا بادشاہ ایڈورڈ سویم (۱۳۲۷ء تا ۱۳۷۷ء) جس کی ماں اسی کاپیتی خاندان سے تھی۔ اس بنا پر تختِ فرانس کا حق دار بن بیٹھا کہ اگرچہ اک عورت خود مالکۂ تاج نہیں ہو سکتی مگر وہ تاجداری کے حق کو اپنی نرینہ اولاد کی طرف منتقل کر سکتی ہے۔ اس دعوے کا نتیجہ وہ لڑائی ہُوئی جسے

مورخین جنگ صد سالہ کہتے ہیں۔ یہ خون ریز اور بظاہر بے سود جنگ[1] ۱۳۳۸ء سے لے کر ۱۴۵۳ء تک جاری رہی اور دونوں مُلکوں کی خوشحالی کو اس سے غایت درجہ نقصان پہنچا۔ ایڈورڈ سوم کا یہ دعوے ہمیں کتنا ہی مضحکہ خیز معلوم کیوں نہ ہو انگریزوں کا سو برس تک یوں فتح فرانس پر تُلے رہنا آج کل کیسا ہی نفرت انگیز نظر کیوں نہ آئے اس میں شک نہیں کہ اُن وقتوں کے حالات اور زمانۂ حال کے خیالات میں زمین آسمان کا فرق آ گیا ہے۔ انگلستان اور فرانس کا اِک جُداگانہ مرتبہ اور یہ جداگانہ حالت نہ تھی۔ صرف تین صدیاں پیشتر شمالی فرانس کے حُکمران نے رُودبار سے گذر کر انگلستان کو بزورِ شمشیر فتح کیا تھا۔ اُس کے جانشین ڈیڑھ سو برس تک اپنی فرانسیسی ریاست پر متمکن رہے اور اُسے محض اپنی کوتاہی اور جہالت سے کھو دیا۔ فرانس اور انگلستان کے باشندے جُدا جُدا قومیت رکھتے تھے لیکن تاجدارِ انگلستان اپنے فرانسیسی مقبوضات کو بغیر انتہائی جدوجہد کے کھو دینے پر راضی نہ ہو سکتا تھا۔ اُن دونوں ملکوں کی قسمت کا صرف نسل و قومیت کی بنا پر فیصلہ نہ ہوتا تھا بلکہ بسا اوقات حکمرانوں کے ذاتی حقوق اور خواہشات پر انحصار تھا۔ سلطنت بادشاہ کی ملکیت تھی نہ کہ قوم کی۔ اور اگرچہ فرانس اور انگلستان میں کچھ مدت سے جذبۂ قومیت کے آثار نمایاں طور پر ظاہر ہو رہے تھے تاہم قومیت ابھی اُس درجۂ پختگی کو نہ پہنچی تھی جو اُسے صدیوں بعد میں نصیب ہُوا +

لیکن یہی دوشیزۂ فرانس کی عظمت ہے کہ اُس نے اِک ایسے وقت میں جبکہ فرانساوی زندگی صوبوں کے تفرقوں اور طبقۂ اُمرا کے حاسدانہ کارناموں سے عبارت تھی قوم فرنساوی کے رفیع ترین جذبات کو اپنے سینے میں محسوس کیا اور اپنے قول و عمل سے اپنے ہم قوموں کے لئے حُبّ الوطنی کی ایک ایسی زندہ مثال بن گئی کہ فرانس کے لوگ آج بھی اُسکی آتش افروزیاں

---

[1] جنگِ صد سالہ کو چار زمانوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے (۱) ۱۳۳۶ء تا ۱۳۵۴ء انگریزی ظفر مندی کا زمانہ۔ (۲) ۱۳۵۴ء تا ۱۳۸۰ء جب فرانسیسیوں نے چند علاقے پھر واپس لے لئے (۳) ۱۳۸۰ء تا ۱۴۲۹ء اس دور میں انگریز پھر فتوحات حاصل کرتے رہے (۴) ۱۴۲۹ء تا ۱۴۵۳ء جب انگریزوں کو پے در پے شکستیں ہُوئیں اور وہ فرانس سے باہر نکال دیئے گئے۔

اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں! فرانس ژان دارک[1] کے آنے سے پہلے کچھ اور تھا اُس کے آنے کے بعد اَور کا اَور ہوگیا!!

جنگِ صد سالہ کے آخری دَور کا آغاز اس طرح ہُوا کہ ہنری پنجم شاہِ انگلستان نے یہ دیکھ کر کہ شاہِ فرانس چارلس ششم مخبوط الحواس ہے اور فرنساوی حقوق کی نگہداشت کے قابل نہیں رہا اپنے جد امجد کے حقوق کا اعادہ کیا اور فرانسیسیوں کے باہمی عناد و مخاصمت کا فائدہ اُٹھا کر (سنہ ۱۴۲۰ء) میں ڈیوک برگنڈی کی اعانت سے بمقام ترُوآ حکومتِ فرانس سے ایک معاہدہ کیا جس کی رُو سے شاہِ انگلستان نے فرانس کی شہزادی کو اپنے عقد میں لے لیا اور شاہِ مفقود الحواس کی وفات پر ہنری کو اُس کا جانشین تسلیم کیا گیا۔ اس معاہدہ کی تکمیل میں ملکۂ فرانس آئزبلا نے بڑے شدّ و مد سے حصّہ لیا گویا خود ہی اس امر کی تصدیق کر دی کہ اُس کا بیٹا فی الحقیقت شاہِ فرانس کا بیٹا نہیں + اس معاہدے سے فرانس فقط حکمرانِ انگلستان کا ایک ماتحت صوبہ بن گیا اور اس کی جداگانہ ہستی ملیامیٹ ہوگئی + اس الحاق کے کیا نتائج ہوتے اُن کا صحیح صحیح اندازہ کرنا دشوار ہے لیکن اس میں کچھ شبہ نہیں کہ شاہِ انگلستان کی طاقت کا یوں خوفناک طور پر بڑھ جانا دونوں مُلکوں کی آزادی کے لئے ضرر رساں ثابت ہوتا، شاہِ مشترک دونوں مُلکوں میں زیادہ مُطلق العنان ہوجاتا، اُسے کسی خاص مجلسِ شورےٰ کی رضامندیوں کے لئے آئے دن گداگری نہ کرنی پڑتی، وہ ایک مُلک کو دُوسرے مُلک کی قوت سے دبانے اور بوقتِ ضرورت نیچا دکھانے میں بآسانی کامیاب ہو سکتا، اگر ایسا ہوتا تو تاریخ یورپ اور طرح

---

[1] دوشیزۂ فرانس جسے عام طور پر جون آف آرک کہا جاتا ہے دراصل ژان دارک نام رکھتی تھی + غلط العام نام میں دو صریح نقص ہیں۔ اوّل تو یہ اصلی فرنساوی نام کا انگریزی ترجمہ ہے اور ظاہر ہے کہ نام کا ترجمہ قطعی ناجائز ہے بالخصوص جب اُس زبان میں جس میں کہ ترجمہ کیا جائے کوئی ایسا نام موجود نہ ہو۔ دوسرے ژان کو تو جون کہہ لیا کہ یہ انگریزی صورت اس لفظ کی ہے لیکن دارک کے لفظ کا طوعاً و کرہاً تجزیہ کر کے دو فرضی لفظ بنا لینا اور پھر اُن کا ترجمہ کرنا جہلِ مرکب سے کم نہیں + انگریزی مورخین بھی اب اصلی نام کو نقلی پر ترجیح دیتے ہیں۔ لہٰذا انتہا درجہ کی ستم روائی ہوگی اگر ہم اک ایسی مجسمۂ ایثار ہستی کو اُس کے مسخ شدہ نام سے پکاریں اور اتنی زحمت بھی گوارا نہ کرسکیں کہ اُس کے اصلی نام سے اُسے یاد کریں + لُطف یہ ہے کہ ہم لوگ فرنساوی تلفظ کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں!

لکھی جاتی، دُنیا میں قومیت کی تحریک یُوں ترقی نہ پاتی، تہذیب موجودہ یوں جمہوریت کی دلدادہ نظر نہ آتی ـــ لیکن قدرت کو کچھ اَور منظور تھا، وہ آزادی کے جذبات کو کہیں نہ کہیں ضرور زندہ رکھنا چاہتی تھی، وہ استبداد کی کہانی کو دنیا کے سامنے دوبارہ سہ بارہ دُہرانا دُنیا کے لئے ترقی معکوس سمجھتی تھی +

اہلِ فرانس کی ایک جماعت نے اِس معاہدے پر کاربند ہونے سے اِنکار کردیا اور دوفین (اپنے ولیعہدِ سلطنت کو فرانسیسی دوفین کہتے تھے) کی حمایت میں اپنی تلواریں کھینچ لیں + اُدھر انگلستان کی مجتمعہ قوت اور ڈیوک برگندی اور دیگر فرانسیسیوں کی حاسدانہ اِمداد تھی۔ اِدھر ایک بے عقل شہزادے کے کاہل و زیاں کار درباری اور پست حوصلہ ہمراہی تھے جو دریائے لُوار کے پار فرانس کے جنوبِ مغرب میں انگریزی فوجوں سے بچ کر پناہ لئے رہنا غنیمت تصوّر کرتے تھے + فرانس کے لئے زمانۂ حال تاریک تھا اور مستقبل اُس سے زیادہ یاس خیز و ہولناک! لیکن ـــ غیرتِ حق کو یکایک حرکت ہُوئی ـــ غیبی امداد آپہنچی اور ایسے مقام سے آئی جس کا دوست دشمن کسی کو گمان بھی نہ تھا! ـــ ژان دارک جس نے یُوں فرانس کی آزادی کا جھنڈا بلند کیا کون تھی؟

× × × × × × × × × × × × × × × × × × × ×

فرانس کی مشرقی سرحد پر عین اُس جگہ جہاں فرنساوی علاقہ جرمنی کی سلطنت سے مِلتا ہے۔ ایک چھوٹا سا گاؤں دومرمی آباد ہے پندرھویں صدی کے رُبع اوّل میں یہ گاؤں جو بالعموم نہایت پُرسکون تھا لڑائی کی کشمکش کو اپنے دیہاتی گلی کوچوں میں محسوس کررہا تھا۔ یہ دریائے مز کے کنارے اُس شاہ راہ پر واقع تھا جو فرانس سے جرمنی کو جاتی تھی۔ اس لئے یہاں کے رہنے والوں کو اکثر بڑے شہروں کی نسبت ملک کے خارجی تعلقات سے زیادہ واسطہ پڑتا تھا+ کبھی کوئی جاگیردار اپنے جنگجوؤں کے ساتھ قریب سے ہوکر گذرتا تو گاؤں والے اُسے ایک دلچسپ واقعہ سمجھ کر گھروں سے باہر نکل پڑتے۔ کبھی کوئی راہب آنکلتا تو وہ اُن کے لئے دنیا بھر کی خبریں لاتا، میدانِ کارزار کے حالات اور انگریزوں کے مظالم کی داستانیں اُنہیں سُنائی جاتیں تاکہ قومی ہمدردی کے خیالات اِن دور دراز سرحدی علاقوں میں بھی موجزن ہوتے رہیں+ "صد سالہ جنگ" کے دَوران میں یہ گاؤں پہلے سے بھی زیادہ جنگ آشنا ہوگیا۔ پاس کے گاؤں اکثر انگریزوں اور برگندیوں کا قبضہ تھا لیکن چھوٹا دومرمی بدستور شاہِ فرانس کا جانبدار تھا۔ ایک دفعہ

جب کہ ژان بچہ ہی تھی اُس کے گھر والوں کو سخت آفت کا سامنا کرنا پڑا برگنڈیئے ناگہاں گاؤں پر آپڑے اپنا اختر بختر سمیٹ کر وہ سرحد کے پار بھاگ گے جہاں اچھے لورینیوں نے انہیں اپنے ہاں پناہ دی یہاں تک کہ یہ طوفان فرو ہو گیا اور وہ اپنے گھروں میں پھر آکر آباد ہوئے۔ دومرمی کے دیہاتی کسی جاگیردار کے ماتحت نہ تھے وہ بلاواسطہ بادشاہ کی رعایا تھے۔ وہ شاہ فرانس کو اپنا حقدار بادشاہ سمجھتے تھے، کسی ہمسایہ گاؤں سے بغیر لڑے بھڑے اپنی مطمئن دیہاتی زندگی میں خدا کی عبادت اور بادشاہ کی اطاعت کرتے اور کسی اور شئے کی پروا نہ رکھتے تھے۔ لیکن مُلک کی خانہ جنگیاں انہیں کب چین سے بیٹھنے دیتی تھیں اُن کی یہ سادہ زندگی اور یہ بظاہر صلح پسند خیالات ہی بالآخر ایک عظیم الشان برہمی کا باعث ہوتے۔ ژان دارک ۵ جنوری ۱۴۱۲ء کو پیدا ہوئی۔

ژان کے باپ ژاک دارک سے زیادہ متمول شخص غالباً دومرمی میں کوئی نہ تھا۔ وہ ایک شریف کسان تھا جس کے پاس تھوڑا سا روپیہ اور بکریوں بھیڑوں اور چراگاہوں کی شکل میں بہت سی دیہاتی جائداد تھی۔ اُس کے تین لڑکے تھے اور دو لڑکیاں جن میں بعض کے نزدیک ژان دارک بڑی تھی بعض کے نزدیک چھوٹی۔ لڑکیاں عام طور پر گھر ہی کے اندر خانہ داری کے کاموں میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھیں غریب کسانوں کی لڑکیوں کی طرح کھیتوں میں کام کرنے کو نہ جاتی تھیں مصوروں نے ژان کو اس طرح دکھایا ہے کہ وہ اپنے باپ کی بھیڑیں چرا رہی ہے لیکن خود ژان نے بعد میں اس کی تردید کی البتہ یہ کہا کہ "کبھی کبھی خطرے کے وقت اپنی باری پر میں انہیں کسی جائے پناہ میں لے جایا کرتی"۔ اُس کی ماں اِزابو نے اُسے خانہ داری کے سب کام اچھی طرح سکھائے اور بالخصوص سینے پرونے میں اُسے مشاق کر دیا۔ ژان کا وقت زیادہ تر اسی شغل میں گذرتا تھا بعد میں جب اُس سے پوچھا گیا کہ کیا تم نے کوئی ہُنر یا کسب سیکھا ہے تو اُس نے جواب دیا کہ "ہاں! میری ماں نے مجھے سینا پرونا اور کاتنا سکھایا تھا اور ایسا اچھا کہ میں نہیں جانتی رُدآں بھر میں ایک عورت بھی ایسی ہوگی جو اب مجھے کچھ سکھا سکے"! قدیم گرجاؤں کی خوب صورت پُرانی زردوزیاں اکثر ایسی ہی ہُنرمند دیہاتیوں کے ہاتھوں کی ساختہ ہوتی تھیں۔ یہ مادرانہ تربیت ہی اُس کی ساری تعلیم تھی۔ جیسا کہ اُس نے بعد میں کہا وہ فرانسیسی کا الف بے تک نہ جانتی تھی نہ اُس زمانے میں اُن سے زیادہ متمول گھرانوں میں بھی تعلیم کا کچھ چرچا تھا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ اسکی

ماں نے بچوں کو بعض وہ مشہور دُعائیں جو خاص و عام میں مقبول تھیں اور جن کو بڑے سے بڑے حکما بھی اپنے علم و قابلیت سے زیادہ فصیح نہ بنا سکتے تھے ازبر پڑھادی تھیں "ہمارا خدا جو آسمان میں موجود ہے" "اے مریمؑ اے لبریز رحمت" ننھی ژان بھی اَوروں کے ساتھ یہ آسمانی گیت دُہرایا کرتی تھی!

جب یہ لڑکیاں میز پر اپنا چمکتا ہُوا ریشم اور سُنہری تاگا رکھے ہُوئے دریچے کے قریب بیٹھی ہوتی تھیں تو اُن کی ماں یہ خاموش ساعتیں دلچسپ کہانیاں سُنا سُنا کر گزارتی۔ سب سے زیادہ مسیحی اولیاؤں کی کہانیاں اور انجیل کی حکایات اُن جنگی واقعات کے ساتھ جو کبھی کبھی دیکھے اور سُنے جاتے تھے مثلاً زخمیوں کا قریب کے گاؤں میں لے جایا جانا تاکہ اُنکی مرہم پٹی ہوسکے، فتحمندوں کا خوشی کے نعرے مارتے ہُوئے گزرنا اور شکست خوردوں کا جان بچانے کے لئے اپنے گھوڑوں کو سرپٹ دَوڑانا، پھر سیاہ دل برگندیوں اور خوفناک انگریزوں کے قصّے تھے جنہیں سُن کر چھوٹے بچّے کانپ جاتے۔ یعنی حملہ آوروں کی وہ ہولناک تصویر کھینچی جاتی تھی جو ہر حملہ آور کی خواہ وہ اچھا ہو یا بُرا کھینچی جاتی ہے۔ یورپ نے ترکوں کو "تباہ کن" کا لقب کیوں دیا ہے؟ محض اِس لئے کہ وہ یورپ کے ایک حِصّے کو مُسخر کرنے میں کامیاب ہُوئے اور پھر بدقسمتی سے اُس پر حکومت بھی کرتے رہے!

ژاک دارک فقط متموّل ہی نہ تھا وہ اور اُسکی بیوی بچّے گاؤں کے مُصیبت زدہ لوگوں کے دردو رنج میں بھی شریک تھے۔ ہر غریب و نادار کی مدد پر کمربستہ اور ہر دُکھتے ہُوئے دل کی ہمدردی میں جان چھڑکتے تھے۔ ایک بادیانت ایماندار مزدور نے ژان کی وفات کے مدت بعد اُسکے دوسرے مقدمے میں اُس کی پاک طینتی کی شہادت دیتے ہُوئے کہا کہ "مَیں اُس وقت ایک بچّہ تھا اور اُس نے علالت میں میری تیمارداری کی"۔ ژان کی ایک سیرت نگار لکھتی ہے کہ وہ یوں بھی بھلے لوگوں کا زمانہ تھا جب اعتقاد میں فلسفہ اور سائنس رخنہ انداز نہ تھے اور ہر شخص اپنے ایمان کے ساتھ مطمئن رہتا تھا۔ ژان ان میں خصوصیت کے ساتھ ممتاز تھی۔ صبح کے وقت وہ گاؤں کے چھوٹے سے گرجا میں جاکر اپنے پروردگار کے آگے جھکتی جہاں کبھی میکائیل اپنی چمکتی ہُوئی زرہ پہنے اپنا برچھا افعی کے سر میں بھونکتے ہُوئے نظر آتا، کبھی وہ مشہور ادلیا مارگریٹ

دکھائی دیتی کہ فقط اپنی صلیب ہاتھ میں لئے ہُوئے اس عدوئے انسانیت پر غالب آجاتی ہے +
ژان اپنے گھر کی دہلیز پر یا باہر درختوں کے سائے میں بیٹھ کر اکثر سینے پرونے میں مشغول رہتی تھی، یہ اک ایسا نسوانی شغل ہے کہ بالعموم نت نئے خیالات سینے میں اُبھارتا ہے۔ کام کرنے والی گئے گزرے دنوں کے خواب دیکھتی ہے۔ آنے والے زمانے کی ممکنات پر غور کرتی ہے اور بعض اوقات ایسے تصوّرات کے ساتھ بھی پرواز کرتی ہے جن کا صحیح صحیح نقشہ خود اُسکا دماغ بھی نہیں کھینچ سکتا + خاموشی میں یوں کام کرتے ہُوئے وہ دیہاتی گرجا کے گھنٹے کی شیریں آوازیں سنتی۔ ان سے وہ اِس قدر مانوس تھی کہ گھنٹہ بجانے والے کو گاہے گاہے چھوٹے چھوٹے تحفے تحائف بھی دے دیا کرتی تھی تاکہ وہ اپنے فرض کی ادائگی میں ضرورت سے زیادہ مستعد رہے + اس باغ کے قریب ہی جہاں وہ بیٹھ کر کام کیا کرتی شاہ بلوط کے درختوں کا گھنا جنگل تھا جہاں دیہاتیوں کے اعتقاد کے مطابق پریاں رہتی تھیں اور ایک جادو کا کُواں تھا + اُس کے دُشمنوں نے بعد میں یہ الزام تراشا کہ وہ ان گمنام جنگلی پریتوں کی معتقد تھی۔ یہ دُرست ہے کہ وہ سال میں ایک دفعہ پادری کے پیچھے اُس جلوس میں شامل ہُوا کرتی تھی جو جنگل سے گزر کر پریوں کے کوئیں کی طرف جاتا اور جہاں پادری اپنی جھاڑ پھونک سے بلاؤں کا قلع قمع کرتا تھا + لیکن ژان کو ایسی رسمی تحریکوں کی حاجت نہ تھی۔ اُس کے اولیا اُس کے لئے بالکل کافی تھے۔ اُس زمانے میں ان کے قصے پریوں کی داستانوں سے کچھ کم نہ تھے + ژان پر محبّت و مسرّت کے افسانوں نے چنداں اثر پیدا نہ کیا۔ اُس کا دل اُن ایثار و شجاعت و دردمندی کی کہانیوں سے لبریز ہو گیا جن کا انجام قربانی ہُوا کرتا ہے +

لہلہاتے کھیتوں اور گنجان جنگلوں کے قرب و جوار میں رہنے والی، گاؤں کے چھوٹے سے گرجا کے شیریں آواز گھنٹے کی موسیقی میں محو ہونے والی، اپنی سلیقہ شعار ماں کے قدموں میں بیٹھ کر دلفریب کہانیاں سُننے والی، اپنے خُدا کے حضور ہر صبح ایک معصوم و پاک دل کا ہدیہ لے جانے والی یہ لڑکی سوائے گھر بار کا سادہ کام کرنے کے اور کیا کر سکتی تھی؟ یہ سب کچھ کرتی ــــ لیکن گاہے گاہے دل میں ایک ننھّا سا شعلہ بھڑک اُٹھتا، وہ نہ جانتی یہ کیا ہے اور کس لئے؟ دُنیا تو شہروں میں رہتی ہے اُسے اُس بڑی دُنیا سے کیا غرض؟ وہ اُس کے لئے کر بھی کیا سکتی ہے؟

ہاں یہ سُنتی تھی کہ اجنبی مُلک میں گھُس آئے ہیں، شہزادۂ فرانس دریائے لُوآر کے پار اپنی جمیعت کے ساتھ مارا مارا پھرتا ہے، جائے شرم ہے کہ ابھی اس کی تاج پوشی بھی نہیں ہُوئی۔ ہمسایہ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں بعض دفعہ اُن سے لڑتے بھِڑتے کیونکہ وہ بادشاہ کے برخلاف دُشمن کا دم بھرتے تھے، تعجب ہے کہ اپنے ہی مُلک کو پاؤں تلے روندتے ہیں اور غنیم کا ساتھ دیتے ہیں۔ اس حالت میں مُلک کو بچانے والا ایسے حال میں شہزادے کو تاج پہنانے والا کون ہو؟؟

انہیں خیالات میں ڈُوبی ہُوئی اور خدا جانے اَور کن تصوّرات کی فضاؤں میں اُڑتی ژاں، کم سِن، بھولی بھالی، پاک دل، نیک خیال، ژاں، بیماروں کی تیمار دار، ناداروں کی مددگار، سادگی اور سچائی کی پُتلی، اپنے سپنے پرونے میں مشغول تھی؛ ابھی عُمر کے تیرہ برس بھی پُورے نہ ہُوئے تھے نیکی و معصومیت کی تصویر یہ نت نئے خواب دیکھنے والی اپنے باغیچہ میں بیٹھی تھی، گرمیوں کے دن تھے اور سہ پہر کا وقت ایک ایسا وقت جب تخیّل بے پر ہلائے ہوا میں اُڑتا ہے اور پاکیزہ ہستیاں اپنے آپ میں منہمک ہوتی ہیں! —— اچانک اُس کے اور گرجا کے درمیان داہنی جانب فضا میں ایک روشنی نمودار ہُوئی ایسی کہ ژاں کی آنکھوں نے کبھی اِس سے قبل نہ دیکھی تھی اور اُس کے اندر سے ایک آواز ایسی ہی نامعلوم اور حیرت انگیز سُنائی دی! —— آواز نے کیا کہا؟ صرف یہ سادہ سے سادہ بات، ایسے لفظ جو ایک ننھے بچّے کے لئے موزوں ہوں، نہ ایسا کوئی پیغام جو اُس کی فہم سے بالاتر ہو! کیا؟ یہی: "ژاں! اچھّی اور نیک بچّی بن، گرجے اکثر جایا کر، ژاں! نیک بن! ہاں اس سے زیادہ کوئی آسمانی فرشتہ اس سے کم کوئی سمجھدار ماں کیا کہے گی کہ ژاں! نیک بن! چھوٹی لڑکی پہلے ڈری سہمی لیکن پھر جلد ہی سنبھل گئی، آواز ضرور آسمانی ہوگی اور پاک! یہ جو اس طرح بولی ہے! اُس نے کسی سے نہ کہا کہ کیا دیکھا کیا سُنا، بات ہی ایسی تھی جیسے اک بچہ اصل اور نقل میں تمیز نہ کرسکنے کے باعث شرم و حجاب کے ساتھ پوشیدہ رکھے!

اس کا ہمیں علم نہیں کہ یہ سپنا پھر کب اور کن حالات میں نظر آیا۔ لیکن بالعموم گھر سے باہر باغ کی خاموشی یا کھیتوں کی آزاد تنہائی میں وہ دکھائی دیا کرتا۔ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد آسمانی روشنی صورت و شکل اختیار کرنے لگی یہاں تک کہ ایک شبیہ بالکل مردانہ لیکن پر دار اور تاج دار

ایسی جیسا کہ ایک "واقعی باتمکین انسان" ہو نظر آئی۔ وہ ایک ملکوتی صورت تھی جس کے سامنے چھوٹی لڑکی لرزہ براندام ہو گئی لیکن اُس کی پاکیزہ و شاہانہ نظر سے اُس کی ڈھارس بندھ گئی + نورانی ہستی نے دوبارہ اُسے نیک بننے کی ہدایت کی اور کہا "خدا تیری مدد کریگا" پھر اُس نے ژان کو اُس کے دکھیا ملک کی دردبھری کہانی سُنائی کہ "مملکتِ فرانس پر کیسی حسرت برس رہی ہے" + ژان کا نوجوان دل پہلے ہی حسرتوں سے لبریز تھا وہ پہلے ہی سے اپنے بے یارو مددگار ملک کے لئے غمگین رہا کرتی تھی۔ اوّل اوّل اسے کچھ شک و شبہ تھا کہ یہ میکائیل فرشتہ ہے یا کون لیکن بتدریج اُس کی ہدایات و مکاشفات کو سُن دیکھ کر اُسے یقین ہو گیا کہ یہ وہی ہے + یہی جنگجو فرشتہ تھا جس نے انجام کار اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا اور اُس کے منصبی کام سے اُسے آگاہ کیا۔ وہ بولا "اے ژان! لازم ہے کہ تُو شاہِ فرانس کی اعانت کو جائے اور تُو ہی ہے جس کی مدد سے وہ اپنی مملکت کو پھر پالیگا" وہ کانپنے لگی اور اپنے دل سے پوچھا کہ آخر اس بات کا کیا مطلب ہے؟ پہلے کچھ گھبرائی پھر دل کو کڑا کر کے بولی "حضور! میں تو صرف اِک مسکین لڑکی ہوں، میں گھوڑے کی سواری نہیں کر سکتی، میں جنگجوؤں کی سالار نہیں بن سکتی"!! سُننے نے اِس گزارش کی چنداں پروا نہ کی۔ فرشتہ اُسے چھوٹی چھوٹی سی ہدایات دینے لگا کہ تُو بدری کُور کے پاس جا جو دُکولر کا کپتان ہے وہ تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیگا سینت کاترین اور سینت مارگریت تیری مدد کو آئینگی! ان مکمل ہدایتوں سے ژان قطعی مغلوب ہو گئی کیونکہ اب اُسے صاف و صریح حکم مل گیا کہ وہاں جا اور یہ کچھ کر + وہ بے اختیار ہو کر چلّانے اور رونے لگی، اُس کی رُوح پر خوف طاری ہو گیا، وہ بیچاری کیا تھی کہ اُسے یہ کچھ کرنے کو کہا جائے؟ ایک چھوٹی سی بچی جو اپنے کمزور ہاتھوں میں اپنی سوزن یا عصا پکڑ سکتی تھی، یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ کسی بیمار بچے کے سرہانے بیٹھ جائے! لیکن اُس کے اس سارے خوف اور تامل کے عقب میں اُس کا حساس دل اس جذبۂ بے پناہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا کہ مملکتِ فرانس پر کیسی حسرت برس رہی ہے" وہ کتنی سچی ہمدردی کے لائق ہے، دل اس خیال کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکتا تھا، بتدریج یہ حالت ہو گئی کہ اُس کے دل میں سوائے اس خیال کے اور کچھ باقی نہ رہا اور اُس کی مختصر زندگی صورتِ آسمانی کی یاد و انتظار میں سراپا

اضطراب بن گئی جو ناگہاں کسی لمحے جب وہ اپنے معصوم کھیل کھیلتی ہو یا جب وہ باپ کے گھر کے سامنے دہلیز پر یا باغ میں بیٹھی سی پرو رہی ہو اُس پر اپنے پیغام لیکر نازل ہو جاتی تھی +
کچھ مُدّت کے بعد وہ "واقعی با تمکین انسان" شاذ و نادر ہی آتا۔ اَور صورتیں جو اُس کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتی تھیں عورتوں کی نرم و نازک صُورتیں، سفید و تاباں، چاندی سونے کے خوشنما زیور پہنے، دائرۂ روشنی میں نظر آتیں اور اپنا سر جُھکا کر گویا اِک ہم رُوح ہستی سے مخاطب ہوتیں، اپنا نام بتاتیں کہ ہم کاترین اور مارگریٹ ہیں!' اُنکی صدائیں نرم و شیریں تھیں کہ سُن کر انسان کا جی رونے کو چاہے۔ یہ دونوں شہید خاتونیں اس بھولی بھالی لڑکی کو جسے اک روز انہیں کے زُمرے میں جا ملنا تھا نیکی کی ترغیب دیتیں اور اُس کی ہمت بڑھاتیں اور کہتیں کہ "آسمان میں ایک خاتون ہے جو تجھ سے محبّت رکھتی ہے"! جب یہ پیاری صورتیں نظر سے اوجھل ہو جاتیں تو ننھی دوشیزہ اپنے بھولے پن کی جانکنی میں رو پڑتی کہ کاش وہ مجھے اپنے ہمراہ لیجاتیں۔ ژان ہمیشہ اُنہیں "میری آوازیں" کہہ کر پکارتی تھی جس سے ظاہر ہے کہ شکلوں کی نسبت آوازیں اُس کے لئے زیادہ صاف و صریح ہوتی تھیں"۔ وہ حسرت جو فرانس کے لئے اُن کے دلوں میں اُٹھتی تھی دیہات کی ساری فضا میں اک اُداس خوشبو کی طرح پھیل گئی، ننھی ژان کے سازِ دل کا تار تار اُس کے اثر سے لرزتا تھا وہ ایسا محسوس کرتی گویا اُس کی پیاری ماں اُس کی آنکھوں کے سامنے جان توڑ رہی ہے!!

کتنی تعجب انگیز تھیں یہ ملاقاتیں! کسے خبر تھی کہ اِس دُور دراز دیہات میں ایک کسان لڑکی رہتی ہے نو عمر معصوم اپنے کام میں مشغول بعض اوقات جب وہ سینے پرونے میں لیکن در اصل اپنے نت نئے خیالوں میں منہمک ہوتی تو اُس کی ماں ذرا درشتی سے اُسے پکارتی! شرمیلی، نیک دل، خدا کی سچّی بندی، جب کوئی اجنبی اُس سے بات کرتا تو وہ شرما کر اپنا سر جھکا لیتی! گرجا میں ہر صبح سویرے سب سے پہلے وہی نظر آتی اور جب گاؤں میں کوئی اُسکی ہنسی اُڑاتا کہ یہ پجارن اپنے وقت سے پہلے ہی آجاتی ہے تو شرمساری سے خُون اُس کی رگوں میں دوڑتا اور اُس کا چہرہ سُرخ ہو جاتا لیکن سوائے اِس کے اور اُس کی سادہ زندگی میں کچھ نہ تھا جس سے اُسے شرمانے کی ضرورت ہوتی +

تعجب کی بات ہے کہ نہ اپنے ماں باپ سے نہ پادری ہی سے جس کے سامنے وہ رسمیؔ "اعترافِ گناہ" کیا کرتی تھی کبھی اُس نے اپنے ان عجیب مشاہدات کا تذکرہ کیا اور آخر اُس وقت جب وہ اپنے دل میں اس شعلۂ آسمانی کو سما نہ سکتی تھی اُس نے انکشافِ راز کا تہیہ کیا۔ وہ صرف تیرہ۱۳ برس کی تھی جب اُسے یہ الہامی پیغام نازل ہونے شروع ہوئے اور سترہ برس کی عمر تک بدستور یہ اُس کے سینے میں مدفون رہے۔ اُس کی آوازوں کی طرف سے اُسے کوئی ہدایت یا تنبیہ نہ تھی کہ وہ یہ بھید چھپائے رکھے یا ظاہر کردے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ بچپن کے انتہائی شرمیلے پن نے اور اس عہدِ زندگی میں نقل و اصل میں تمیز نہ کرسکنے کے باعث اُس نے یہ باتیں اپنے دل ہی میں دبائے رکھیں۔ پھر اچنبھا ہے کہ اِس ضبط کے باوجود وہ تُرش رُو نہ تھی کہ دُنیا سے الگ تھلگ ہوکر تنک مزاج ہوجاتی اور ملنا جُلنا چھوڑ دیتی۔ اُس کی طبیعت میں نوجوانی کا جوش اور میل جول کا سچا شوق موجود تھا۔ ہمجولیاں اُس کے ہاں آتیں، رات رات بھر اُس کے گھر رہتیں اور ایک ہی کمرے میں ایک ہی بستر پر اُس کے ساتھ سوتیں، وہ ہر قسم کے سچے جذبات سے لبریز تھی، اپنی سہیلیوں کو ہر طرح خوش کرنے کی کوشش کرتی، غریب سے غریب عورت اُسے بُلا بھیجتی تو خوشی کے ساتھ جاتی۔ الغرض اپنے ہمجنسوں کی خدمت گذاری میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑتی۔

بالآخر اُس کی دوگانہ زندگی کا راز، ہم نہیں جانتے کس طرح، افشا ہوگیا؟ یہ ظاہر ہے کہ اپنی "آوازوں" پر روز بروز غور کرنے، آسمانی صورتوں کے پیغامات سننے اور اُن کے غایت درجہ اصرار سے مجبور ہوکر آخر اِن سمجھنے لگی کہ یہ محض وہم و خواب نہیں بلکہ ایک ایسی بات ہے جو عمل میں آسکتی ہے، اِک ایسا حکم ہے جس سے سرتابی کرنا قطعی گناہ ہے! اب جنگ کی خبریں اُس کے لئے پہلے سے کہیں زیادہ دلچسپ بلکہ دلفریب ثابت ہوتیں۔ حملہ آوروں کے ظلم و ستم، شاہِ فرانس کی حالتِ زار، وہ جسے دُنیا جہان کے بادشاہ نے فرانس کا محافظ مقرر کیا ہے، یہ سب کچھ سُنتی تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے اور دل پاش پاش ہوجاتا کہ اے پیارے وطن! تیرا یہ حال ہونا تھا تجھے یُوں پائمالِ ستم ہونا تھا کہ مدد کرنے والا کوئی نہ ہو دم بھرنے والا کوئی نہ ہو؟ وہ اپنی آسمانی آوازوں کے پیغاموں میں اِک قابلِ عمل حقیقت دیکھنے لگی، اُس ضرورتِ سخت کا احساس کرنے

لگی جو اُسے میدانِ کارزار کی طرف کھینچتی تھی، اُس یقینی آزادی پر ایمان لے آئی جو فرانس کے لئے کردگارِ حقیقی کے عدل نے مخصوص کر رکھی تھی!!

یہ درست ہے کہ عوام میں مُدت سے یہ اعتقاد تھا کہ فرانس کو تباہی سے بچانے کے لئے صوبۂ لورین سے ایک کنواری لڑکی نمودار ہوگی لیکن ہمیں ژان کی یہ بات ماننی پڑے گی کہ اُس نے کبھی یہ پیشینگوئی نہ سُنی تھی۔ البتہ جب وہ گھر کو چھوڑ کے نکلی تو اُس نے کئی لوگوں سے کہا کہ "میں نے سُنا ہے کہ فرانس ایک عورت کے ہاتھوں برباد ہوگا اور پھر ایک کنواری کی مدد سے ازسرِنو زندہ ہو جائے گا"!

ژان اب اس کشمکش میں تھی کہ کس طرح خدا کے احکام پر عمل کرے؟ جو دل میں ہے کس سے کہے؟ اپنے ایک بے تکلف ہم عمر ژیرار سے جو بدِمقابل کا معاون تھا اُس نے کہا "اگر تم برگزیدہ نہ ہوتے تو میں تم سے ایک بات کہتی"۔ ژیرار سمجھا کہ غالباً یہ شادی کی تجویز ہے اور یہ سمجھنا اُس غریب کے لئے قدرتی بات تھی۔ اِن دنوں جب وہ سخت کاوش کی حالت میں تھی، اُس کی آوازیں اُسے روز و شب ترغیب دیتی تھیں کہ جا اور وہ کام کر جو خدا نے تیرے لئے متعین کیا ہے اور اُس کی قوتِ ضبط زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکتی تھی تو مشیتِ ایزدی آخر اُس کی مدد کو آئی۔ اُس کا ماموں دیوراں لاکسار اُن کے گھر چند دنوں کے لئے آیا۔ ژان نے اُسے الگ ہو کے کہا کہ وہ اُس کے ماں باپ سے اجازت لے کر اُسے اپنے ہمراہ لے چلے۔ لاکسار کا گاؤں وُکوُلر کے قریب تھا جہاں بدری کوُر رہتا تھا۔ رستے میں ژان نے ماموں کو اپنا رازِ دل کہہ سُنایا کہ میں تو فرانس جانا چاہتی ہوں دوفیں کے پاس، تاکہ وہاں اُس کی تاج پوشی کروں ماموں اُس کا مُنہ تکنے لگا کہ یہ نادان لڑکی کیا کہہ رہی ہے؟ جو کہتی ہے نہیں جانتی اس کے معنے کیا ہیں؟ لیکن یہ بھی جانتا تھا کہ وہ لغوگوئی کی خوگر نہیں بلکہ فی الحقیقت ایک نیک بخت پیاری سی بچّی ہے جو سوائے نکوکاری کے اَور کسی بات کی جرأت نہیں کرتی۔ ژان نے کہا "کیا آپ نے کبھی نہیں سُنا کہ فرانس کو ایک عورت تباہ و برباد کردے گی اور پھر ایک کنواری لڑکی کے ہاتھوں وہ دوبارہ زندہ ہوگا"؟ ماموں لاجواب ہوگیا؟

۱۳رمئی ۱۴۲۸ء کو لاکسار اپنی بھانجی کو لے کر وُکوُلر پہنچا اور کپتان بدری کوُر سے ملاقات

کی۔ کپتان نے اس "جاہلانہ" درخواست کو سن کر قہقہہ مارا اور کہا "دو تھپڑ مارو اور اُسے ماں کے گھر بھیج دو"
بیوقوف لڑکی! وہ کیا جانے انگریز کیسے خوفناک جنگجو ہیں کہ اپنی جگہ پر اَڑ کر ذرا پیچھے نہیں ہٹتے اور
بجائے میدان میں مردِ میدان کی طرح قدم مارنے کے طرح طرح کے داؤ کھیلتے ہیں۔ وہ ایک لڑکی
فرانس کو کیا آزاد کرائے گی؟ بیچارہ لاکسار اپنا سا مُنہ لے کر مُڑ آیا۔ ژان سے کیا کہتا۔ اُسے
تھپڑ مارنے کا خیال بھی اک گستاخی تھا + لیکن ژان کپتان کی اِس پھبتی سے ذرا نہ جھجکی۔ جب
سے وہ اپنے باپ کے گھر سے چلی تھی اُس کے رویّہ میں اک عظیم الشان انقلاب واقع ہو چکا
تھا۔ سلطنت کے وہ بڑے بڑے عہدہ دار جن کے آگے کسان اور زمیندار کانپتے تھے ژان
پر اپنا رُعب نہ جما سکتے تھے، اب تو وہ سمجھتی تھی کہ یہ فقط خدا کے دئے ہُوئے ذرائع ہیں جنکے
وسیلے سے اُسے اپنا کارِ منصبی انجام دینا ہے + باپ کے گھر کا چھوڑنا اک سخت دشوار مرحلہ تھا
وہ ہو لیا تو پھر ان چھوٹی چھوٹی رُکاوٹوں پر جھجکنے کی کیا ضرورت تھی؟ پانچ برس کی وہ مشقت
جو اُسے جھیلنی پڑی کسے علم تھا کہ اُس میں دل کے لئے کتنی کچھ جانکنی تھی؟ وہ آنسو! وہ ڈر
سے کانپنا! وہ عاجزی کہ "حضور میں اک نادار لڑکی ہوں، میں تو گھوڑے پر بھی سوار نہیں ہو سکتی"؛
اب اک عزمِ مستقل سے تبدیل ہو چکی تھی؛ اُس کی آوازیں اب صاف وصریح تھیں اور اُن کا مفہوم
روشن وواضح؛ وہ روز وشب اُس کی ہمدرد اور مشیر کار تھیں، اُن کے ہوتے زندگی کی مشکلیں
آسان اور دُنیا کا رستہ صاف تھا!!

اس کے بعد اُس موٹے پھپس کپتان کی کیا حقیقت تھی؟ —— جب وہ اُن اکھڑ سپاہیوں
کے سامنے آئی تو اُن کا تمسخر واستہزا سب بند ہو گیا۔ اپنی سنجیدگی سادگی اور خوش اخلاقی
کے ساتھ وہ بولی کہ "میں کپتان کے پاس اپنے آقا کے ہاں سے آئی ہوں، میرا پیام یہ ہے کہ آپ
شہزادے کو کہلا بھیجیں کہ وہ مطلق خوف نہ کھائے کیونکہ مہربان آقا اُسے ماہِ "رمضان"[1] کے
وسط سے پہلے پہلے اپنی مدد بھیجیگا"۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ "فرانس شہزادے کی ملکیت نہیں ہمارے
آقا کی ہے، شہزادہ صرف اُس کا امین ہے"، اور آخر میں کہا کہ "شہزادے کے دشمن سینکڑوں ہیں
لیکن میں خود ہمراہ جا کر اُس کی رسمِ تقدس ادا کروں گی"! + کپتان نے سوال کیا کہ "تیرا یہ آقا کون ہے"؟

[1] لینٹ:۔ عیسائیوں کا رمضان

ژان نے کہا، آسمانوں کا بادشاہ"!

اس کے بعد وہ اپنے ماموں کی مصاحبت میں اپنے گاؤں کو لوٹی۔ اتنے میں یہ خبر آگ کی طرح دُور دُور پھیل چکی تھی۔ لوگ آپس میں یہی باتیں کرتے تھے، ماں باپ کو بھی اُس کے گھر آنے سے پہلے ہی خبر ہو چکی تھی۔ ژاک دارک اک سچے فرانسادی کسان کی طرح اپنی لڑکی کے ان خیالات کو آوارگی کی خواہش پر محمول کرتا تھا۔ اپنی لڑکی پر طرح طرح کے شک کرتا اور بے آبروئی کے خیال سے کانپ اُٹھتا کہ اِس جہالت کا کیا انجام ہوگا؟ جب وہ گھر پہنچی تو رات کو اُس کے باپ نے خواب میں دیکھا کہ وہ مُسلح آدمیوں کے حلقے میں ہے۔ یہ کیسے گمان ہو سکتا تھا کہ اُسے سپاہیوں میں معمولی سپاہی نہ بننا تھا بلکہ اُن کا سرکردہ بن کر اُنہیں دشوار ترین مہموں میں لے جانا اور فتحمندی کا سہرا پہننا تھا۔ صبح اٹھ کر باپ نے اپنا خواب بیوی اور بچوں کو سُنایا اور کہا کہ "اگر مجھے پختہ یقین ہو جائے کہ یہی کچھ ہونے والا ہے جو میں نے دیکھا ہے تو میرا جی چاہے گا کہ وہ ڈوب کر مر جائے اور اگر تم اُسے نہ ڈبوؤ گے تو میں خود اپنے ہاتھوں سے اُسے دریا میں غرق کر دوں گا"۔ اگر واقعی اُسکے سر میں یہ خبط سما جاتا تو فرانس اپنی دردناک بیوگی کی حالت میں کس قدر قابلِ رحم و حسرت ہوتا! ماں کی مامتا اِس خیال سے کانپ اُٹھی بات ٹالنے کے لئے عورتوں کی سی چال چلی اور شوہر سے کہا کہ بہتر ہوگا کہ اسے خواب کی بجائے کوئی اور خواب سُنایا جائے۔ اِزابو گاؤں کے کسی نوجوان کو جانتی تھی جو ژان کی زوجیت کو معراجِ شادمانی تصور کرتا۔ اِس سے ژان کے آوارہ گرد خیالات بھی سُدھر جائیں گے، جی میں آیا اُسے سبق پڑھائے کہ وہ طُول کے اسقف کے سامنے جاکر قسم کھائے کہ بچپن سے اُس کے ساتھ ژان کے متعلق قول و قرار ہو چکا تھا۔ خیال تھا کہ ایسی خدا ترس، اپنے مذہب کی پکی، پادریوں کا کہا ماننے والی اسقف کے سامنے ڈر جائیگی اور انکار نہ کرے گی مگر شرمیلی ژان کا سینہ اب نااُمیدی کی سرگرمی کے ساتھ بے خوف ہو چکا تھا اُس نے کسی بڑے چھوٹے کا رعب نہ مانا اور صاف انکار کر دیا۔ ہمیں اس زمانے کے تفصیلی حالات نہیں پہنچے لیکن یہ ظاہر ہے کہ سردیوں کے یہ مہینے غریب ژان کے لئے نہایت سخت گذرے ہونگے، گھر میں آئے دن بحثیں ہوتی ہونگی۔ اُدھر گاؤں والے یہ نیا جھگڑا سُن سُن کے حیران ہوتے ہونگے کہ اُن کے گرجا کی سب سے زیادہ پابند پجارن یہ کیا ان سُنی باتیں کہتی ہے؟ ژان اپنی جگہ

"رمضان" کی آمد آمد کا انتظار کر رہی تھی۔ اُس کی آوازیں اُسے ہر روز اُس کا مقررہ کام یاد دلاتیں اور اُس کے گھر چھوڑنے پر بار بار اصرار کرتیں۔ اُن کے اس تواتر اور تاکید نے اُس کے دل سے ماں باپ کی اطاعت کا جانگزا خیال محو کر دیا اور آخر کار وہ ترکِ وطن پر آمادہ ہو گئی!

رمضان کا شروع تھا جب اُس نے گھر کو الوداع کہی اور "فرانس جانے کا" قصد کیا۔ ماہِ جنوری میں بدری کُور کو پھر ملنے کی غرض سے وہ اپنے ماموں کے ہمراہ گئی۔ اُس کا لباس کسان لڑکیوں کی طرح سادہ اور خود ساختہ تھا۔ غالباً کپتان سے اُس کی متعدد مُلاقاتیں ہُوئیں کیونکہ وہ وکُولر میں تین ہفتوں تک مقیم رہی۔ اِس اثناء میں وہ سینٹ نکولس کی خانقاہ کی زیارت کو گئی اور ڈیوک لورین سے بھی ملی۔ کپتان حیران و سرگریباں تھا کہ کیا کرے اور اس جوشیلی لڑکی کو کس طرح ہوش میں لائے؟ اُن وقتوں کے خیالات کے مطابق اُس کو یہی خیال ہو گیا ہو گا کہ یہ کوئی جادوگرنی ہے جس کی صحبت بھی پُر از خطرہ ہے۔ اُس نے قصبے کے پادری سے مشورہ کیا۔ پادری نے قصہ سُنا تو وہ بھی کپتان کی طرح ششدر رہ گیا۔ باہمی مشاورت سے یہی قرار داد ہُوئی کہ اس حواس باختہ لڑکی پر جھاڑ پھونک کا عمل کیا جائے اور ساتھ ہی اِسے خوب ڈرایا دھمکایا جائے تاکہ اس کی رُوح جادو کے پنجے سے چھُوٹ جائے! کپتان اور پادری دونوں مل کر گاڑیبان کے گھر جا دھمکے جہاں ژان اور اُس کا ماموں رہتے تھے۔ پادری نے کلیسانہ انداز میں کچھ منتر پڑھا اور پھر چلّایا کہ کوئی بھُوت پریت اس لڑکی کے اندر ہے تو وہ دُور ہو۔ ژان اطمینان کے ساتھ بیٹھی ہُوئی خاموش اور مُسکراتی ہُوئی نظروں سے دیکھتی رہی کہ یہ حضرت کیا کر رہے ہیں؟ باہر لوگوں کا اک جمگھٹا گھر کو ہر وقت گھیرے رہتا تھا ژان گر جاتی تو وہ اُس کے پیچھے ہو لیتے، آتی تو اُس کے ساتھ آتے۔ ایک روز اک نوجوان بازار میں سے گذر رہا تھا کہ اُس نے بھیڑ دیکھ کر چاہا کہ وہ بھی لڑکی سے کچھ کہے "تم یہاں کیا کر رہی ہو میری اچھی؟" وہ بولا "کیا بادشاہ مُلک سے باہر نکال دیا جائیگا؟ اور کیا ہم سب انگریز بن جائیں گے؟" ژان نے جواب دیا "بدری کُور کچھ سُنتا سُناتا نہیں پھر بھی بشرطِ زندگی وسطِ رمضان سے پہلے پہلے مجھے ضرور بادشاہ کے پاس پہنچنا ہے کیونکہ دُنیا میں کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ ہو یا ڈیوک یا شاہِ سکاٹلینڈ کی بیٹی کوئی بھی میرے سوا مُملکتِ فرانس کو نہیں بچا سکتا۔ یُوں تو میرا جی یہی کہتا ہے کہ اپنے گھر چل اور

اپنی غریب ماں کے ساتھ بیٹھ کے چرخہ کات کیونکہ یہ میرا کام نہیں ہے لیکن اب کیا کروں مجھے جانا ہے اور ضرور یہ کام کرنا ہے کہ میرے آقا کی مرضی ایسی ہی ہے"! "اور تمہارا یہ آقا کون ہے؟" اُس نے پوچھا۔ "خدا" لڑکی نے کہا۔ نوجوان اک تنکے کی طرح ہوائے شوق میں اُڑ گیا۔ اُس نے انبوہ میں سے نکل کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر حلف اُٹھایا کہ "میں خود تمہیں بادشاہ کے حضور لیچلوں گا"۔ پھر پوچھا کہ "تم کب چلنا چاہتی ہو؟" "کل چھوڑ آج" ژان نے جواب دیا؟

یہ دوشیزہ کا دُوسرا معتقد تھا۔ پہلا وہ اچھا کسان اُس کا اپنا چچا، دوسرا یہ شریف معزز شہری جو بعد میں ژان دَمیتز کہلایا۔ وہ دوشیزہ کے جوش سے ایسا متاثر ہُوا کہ اُس نے فوراً سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ پہلے اُن میں یہ گفتگو ہُوئی کہ لباس کیسا پہننا چاہیئے۔ سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ ژان کو مردوں یا لڑکوں کا لباس زیب تن کرنا مناسب ہے۔ ژان کا قد ضرور لانبا ہو گا ورنہ مردوں کا لباس پہن کر وہ پست قامت نظر آنے لگتی لیکن اس کا کہیں ذکر نہیں۔ لوگ روز بروز اِس عجیب وغریب ہستی کی باتوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگے تھے کہ ایک تعجب انگیز واقعہ نے اس دلچسپی کو اعتقاد کی حد تک پہنچا دیا۔ عورتیں تو پہلے ہی اُسکی نام لیوا تھیں اب مرد بھی اُسکی صداقت کو ماننے لگے۔ صوبۂ لورین سے واپس آنے کے بعد دوسرے روز (۱۲ فروری ۱۴۲۹ء کو) ژان نے خاص وعام اور بالخصوص بدری کُور کو علی الاعلان کہہ دیا کہ آج بادشاہ کو بمقام اورلیاں فاش شکست ہُوئی ہے اور اب لازم ہو گیا ہے کہ اُسے جلد بادشاہ کے پاس لیجایا جائے۔ کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ یہ شکست فی الحقیقت اُسی ساعت میں واقع ہُوئی تھی جب کہ ژان نے اعلان کیا تھا۔ اس پیشینگوئی سے اُس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے!

اُوپر گذر چکا ہے کہ وہ دیوک لورین کی ملاقات کو گئی۔ در اصل دیوک نے اُس کی آمد کی خبر سُن کر اُسے طلب کیا تھا کہ شاید اُس کی علالت میں وہ کچھ مدد دے سکے۔ بجائے تعویذِ صحت دینے کے ژان نے اُسے یہ تلخ نصیحت کی کہ اگر تم عذابِ الٰہی سے بچنا چاہتے ہو تو جلد اپنی بیوی سے صُلح کر لو۔ دیوک ژان کی نیک نیتی اور بلند اخلاق سے بہت متاثر ہُوا اور اُسے چار فرانک ہدیتہً دیئے جن سے اُس کے ماموں نے اُس کے لئے ایک ملبوس تیار کروایا۔ دیوک کی ماں رشتے میں شہزادۂ فرانس کی ساس ہوتی تھی۔ اغلباً اُس نے اپنی

ماں کے پاس ژان کی تعریف کی کیونکہ ژان کے وُکولر پہنچنے کے چند ہی روز بعد شینوں سے جہاں شہزادے کا دربار تھا ایک قاصد شاہی طلبی کا پیغام لے کر آیا۔ دربار میں خواتین کا معتد بہ عنصر تھا۔ شہزادے کی اس نازک سیاسی حالت میں اعانت یا امیدِ اعانت کا کہیں سے بھی آجانا بسا غنیمت تھا۔

لوگوں کے جوش و خروش اور صداقتِ اعتقاد کی اب کوئی انتہا نہ تھی لیکن ژاک دارک اپنے خیالات و تعصبات کے ساتھ یقین کئے ہوئے تھا کہ اُس کی آوارہ گرد لڑکی نے اُس کو سخت بدنام کر دیا ہے، اُس کا دل درد و کرب سے پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ اُدھر ژان کو بدری کوُر کے اِستہزا یا پادری کے جھاڑ پھونک سے اتنی روحانی تکلیف نہ پہنچی تھی جتنی اپنے گھر والوں کی سرد مہری اور خفگی سے دلی رنج ہو رہا تھا۔ وہاں سے حکم آتا تھا کہ فوراً واپس چلی آؤ۔ اُس پر لعنتیں بھیجی جاتی تھیں کہ تم نے ماں باپ کے نام کو بٹہ لگایا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر جلد ہمارے پاس نہ آؤ گی تو سمجھو کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے چھُٹ جاؤ گی! بیچاری ماں کا جی اپنی عزیز بیٹی کو چھوڑنے پر راضی نہ ہو سکتا تھا۔ اُسے کامل یقین تھا کہ اُس کی عصمت شعاری اور استقلال بُرے سے بُرے حالات میں بھی ایک بحری چٹان کی طرح قائم رہیگا۔ ژان کا ایک بھائی پیئر باپ کی اس دُرشتی سے برہم ہو کر گھر چھوڑ کے چل نکلا اور اپنی بہن سے جا مِلا۔

آخر کار شہزادے کی اجازت مل گئی اور ژان ۲۳ فروری ۱۴۲۹ء کو وُکولر سے چلی۔ اُسکے ہمراہ اُس کا معتقد دَمینز اور دَمینز کا دوست دَپولینی تھے اور اُن کے دو خادم۔ دَمینز نے ژان کو اپنے ایک مصاحب کا ملبوس اور اُس کے حسبِ حال چھوٹی سی زرہ دی۔ شہریوں نے بھی مل کر اُسے ایک اَور ملبوس بطورِ ہدیہ دیا اور ایک گھوڑا بھی پیش کیا۔ بدری کوُر نے اُسے ایک تلوار تحفتہً دی اور یُوں اپنی سادگی اور ان سادہ تحفے تحائف کے ساتھ ژان "فرانس کو" چلی۔ رخصت کرتے وقت بدری کوُر نے کہا "جا اور جو ہونا ہو ہونے دے"! وہ چلنے کو تھی کہ انبوہ میں سے ایک شخص شاید ایک عورت نے چلا کر کہا کہ "ایسے خطرناک رستوں سے کیونکر گزرو گی؟" دلیر دوشیزہ نے جواب دیا "انہیں خطروں کے لئے تو میں پیدا ہوئی تھی"! آخری کام جو ژان نے کیا یہ تھا کہ اپنے ماں باپ کو ایک خط لکھا کہ اگر میں نے آپ کے حکم سے

سرتابی کی ہے تو معاف کیجئے کہ میں نے اک ایسے فرمان کی تعمیل کی ہے جو آپ کے حکم سے بالاتر ہے"
اور اخیر میں اُنہیں خدا حافظ کہا!!

اِس طرح یہ اعتقاد و اُمید کا کارِرواں اپنے سفرِ عظیم کو چلا! رستہ ہر طرف خطرناک و ہولناک تھا۔ وہ عموماً راتوں ہی کو سفر کرتے تھے تاکہ انگریزوں اور برگنڈیوں کے ہاتھوں گرفتار ہو جانے سے محفوظ رہیں۔ ہمراہیوں کو بعض اوقات شک گذرتا کہ کہیں یہ لڑکی دراصل اک مکارہ ہی ثابت نہ ہو کہیں وہ اُس کے ناپاک جادو سے ملیا میٹ ہو کے مردود نہ ہو جائیں۔ ڈمیتز کہتا ہے کہ ژان ہمیں بارہا یقین دلاتی تھی اور کہتی تھی "جی میں شک نہ لاؤ۔ میں وہی کام کرنیکی غرض سے بھیجی گئی ہوں جو کہ میں کر رہی ہوں۔ میرے جنتی بھائی ہر کام میں میری رہنمائی کرینگے" پھر کہتی کہ "پچھلے چار پانچ برس سے میرے جنتی بھائی اور میرا پروردگار مجھ سے کہتے رہے ہیں کہ میدانِ جنگ کی طرف جا اور مملکتِ فرانس کو غارت ہونے سے بچالے"! یہ پہلی دفعہ تھی کہ اُس نے اپنے "جنتی بھائیوں" کا تذکرہ کیا۔ اب دُنیا میں کوئی متنفس اُسے اظہارِ صداقت سے نہ روک سکتا تھا، جو کچھ اُس کے جی میں تھا اب اُسے کہہ دینے سے وہ باز نہ رہ سکتی تھی، اُس کی رُوح میں اک سکونِ مُطلق جاگزیں تھا! ------ آخر اُس نے اپنا کارِ عظیم شروع کر دیا تھا۔ اُس نے کبھی یہ سوچا نہ کبھی اپنے جی سے پوچھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا!! ایک بار جب وہ خلافِ معمول ایک شہر میں داخل ہوئے اُس نے گرجا جانے پر اصرار کیا اور اپنے ہم سفروں سے کہا "ڈرتے کیوں ہو؟ میرا خُدا میرے لئے رستہ صاف کرتا ہے؟ میں اسی کے لئے تو پیدا ہوئی تھی!" اور وہ خطروں سے بے خطر ہو کر اپنا سفر کرتے رہے یہاں تک کہ گیارہ دن کے بعد وہ منزلِ مقصود پر پہنچ گئے!!

(باقی)

بشیر احمدؐ

فنِ قصہ نویسی

(گذشتہ سے پیوستہ)

پلاٹ

سادہ مگر وسیع الفاظ میں پلاٹ ایک تدبیر۔ منصوبہ۔ خیال۔ دلیل یا کہانی کا فعل ہے جسکی نسبت پروفیسر بلس پیری[1] رقمطراز ہے کہ "پلاٹ اُن واقعات کا نام ہے جو افرادِ قصہ کو پیش آئیں" ایک اَور صاحب نے ذرا بے ڈھنگے الفاظ میں اسے "بیرنگِ زندگی" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ڈاکٹر جے۔ برگ۔ ایزنوین نے لکھاہے کہ "فسانہ کا پلاٹ اُن سلسلہ وار واقعات کا نام ہے۔ جو اشخاصِ قصہ کو پے در پے پیش آئیں" یا بالفاظِ دیگر نہایت سلیس زبان میں کہانی کو کھول کر فرشِ قرطاس پر پھیلا دینا ہی پلاٹ ہے۔ مگر صرف اُن سلسلہ وار واقعات کا قلمبند کر لینا ہی کہانی نہیں کہلا سکتا کیونکہ بقول پو[2] یہ ایک ایسا فعل ہے جس میں کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور اس میں بھی کلام نہیں کہ بغیر پلاٹ کے کوئی کہانی۔ کہانی کہلائے جانے کی مستحق نہیں۔

مارچ ۱۸۹۷ء کے "بُک مین" میں رابرٹ بار[3] پلاٹ پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "فسانہ نویسی میں میرا راہبر اقلیدس ہے۔ جس کی مشہور شاندار کتاب "علم ہندسہ[4]" سو وقت تک زندہ رہیگی جسوقت تک ہم سب جو اُس کی اشکال حل کرنے میں دماغ سوزی کر رہے ہیں۔ اس دُنیا سے ناپید ہو جائینگے۔ اقلیدس اپنا منصوبہ یا پلاٹ سامنے رکھ دیتا ہے اور خود اُسکے حل کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا مجال کہ کوئی ایسا واقعہ جو اُس کے تخیل کی لڑی میں منسلک نہ ہو سکتا ہو اُس کے اندر گھُس سکے۔ جس وقت اُس کا سوال حل ہو جاتا ہے وہ وہیں اُسے ختم کر دیتا ہے۔ اور یقیناً ہم اقلیدس کی پیروی کرنے سے اعلیٰ پایہ کے فسانہ نگار بن سکتے ہیں"

[1] سٹڈی آف پروز فکشن۔ صفحہ ۱۲۹۔ [2] امریکن ڈرامہ۔ [3] ایک امریکن فسانہ نگار [4] جیومٹری

اس امر کی چہرہ کشائی کرنے کے لئے کہ فسانہ کا پلاٹ کسے کہتے ہیں؟ کہانی اور پلاٹ میں کیا مناسبت ہے؟ میں مندرجۂ ذیل پلاٹ سے واضح کرتا ہوں جو انگریزی کے ایک (۳۵۰) صفحات کے ناول سے اخذ کیا گیا ہے:۔

"ایک جہاز میں دو دوست ہمسفر تھے۔ ایک طالب علم اور دوسرا مُصَوِّر۔ اتفاقاً وہ دونوں ایک خوبصورت لڑکی کی زلفِ گرہ گیر میں گرفتار ہو گئے جو اُسی جہاز میں سفر کر رہی تھی۔ اگرچہ کسب کمال بالعموم مشتاق طبائع پر قابو پا لیتا ہے مگر بالآخر جیت حُسنِ خداداد کے ہاتھ آتی ہے اور اس محبت کی تگ و دو میں وجیہہ طالب علم ہی بازی لے گیا۔ بدقسمتی سے بادوباراں کے ایک سخت طوفانی صدمہ کے سبب جہاز کسی تۂ آب چٹان سے ٹکرا کر غرقاب ہو گیا۔ مصوّر اور وہ ماہ پارا لڑکی ایک تختے پر بہتے ہوئے کسی جزیرہ کے کنارے جا لگے۔ جہاں پہنچ کر اُس نے لڑکی کو یقین دلایا کہ اُسکا منظورِ نظر گذشتہ شب طوفان کی غضبناک موجوں کے تھپیڑوں میں ہلاک ہو گیا تھا۔ قسمت کی رسائی سے طالب علم بھی ایک کشتی میں سوار ہو کر خشکی کے کنارے جا لگا اور کچھ عرصہ بعد ایک گرجا میں نائب پادری مقرر ہو گیا۔ حُسنِ اتفاق سے مصور اور لڑکی نکاح پڑھانے کی غرض سے اُسی گرجے میں پہنچے مگر اُن دنوں پادری صاحب نہایت علیل تھے اُنہوں نے اپنے نائب (طالب علم) کو نکاح خوانی کے لئے بھیجدیا۔ جس وقت وہ اُن دونوں کے روبرو کھڑا ہو کر مُقدس انجیل کی دُعائیں پڑھنے لگا تو لڑکی نے جھٹ اپنے عاشق کو پہچان کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ دیکھتے ہی مُصوّر خجالت و شرمندگی کے بھاری پتھروں میں دب گیا۔ جوشِ رقابت اور دماغی حدّت سے اُس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ آخر مُنہ چُھپا کر قربانگاہ سے بھاگ نکلا۔ تھوڑی دیر بعد وہی آدمی جو اُس پری پیکر کو کسی اور شخص کی قسمت کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتا تھا اب خود اُس کا شوہر تھا۔"

ایک فسانہ نویس کے نقطۂ نگاہ سے یہ بیان کرنا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ (۳۴۹½) صفحات کے لکھنے میں اتنی محنت و دقت نہیں برداشت کرنی پڑتی جس قدر کہ آدھ صفحہ کا پلاٹ سوچنے میں دماغی کاوش کا سامنا ہوتا ہے۔ پلاٹ اور کہانی کو ایک دوسرے سے وہی مناسبت ہے جو تخیّل کو دماغ سے۔ قلب کو حرکت سے یا روح کو جسم سے ہوتی ہے۔

اس امر پر بحث کرنے سے پیشتر کہ پلاٹ کس طرح بنایا جاتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ پلاٹ کے اقسام بالتشریح بیان کر دیئے جائیں۔ مختلف نقادانِ فن اس بات پر ہم آہنگ ہیں کہ پلاٹ کا دائرہ تقسیم محدود کر دینا ہی واجب و انسب ہے۔ بعض کے نزدیک محبت۔ تعارف۔ اشتیاق اور فنا ہی کافی و افی ہیں مگر بعض تیرہ اقسام کے پلاٹ پر مصر نظر آتے ہیں جن کے نام یہاں بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ لیکن بہت سے اساتذۂ فن نے مندرجۂ ذیل چھ اقسام کو تمام قصہ کہانیوں پر حاوی سمجھا ہے:۔

پلاٹ جنکی بُنیاد

(۱) تحیّر پر ہو
(۲) کسی معمّہ پر ہو
(۳) کسی راز پر ہو
(۴) جذبات و محرّکات پر ہو
(۵) موازنۂ اطوار پر ہو
(۶) محاکات پر ہو۔

(۱) تحیّر:۔ ایک مبتدی قصہ نویس کے لئے اس سے زیادہ اور کوئی قباحت کی بات نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے پلاٹ میں ایک ایسے غیر متوقع امر کا ذکر کردے جنکا انجام قدرتی نتائج کے بالکل برعکس ہو۔ یہ اعلےٰ لٹریچر اور عمدہ فسانہ نویسی کے لئے سمِ قاتل سے بڑھ کر اثر رکھتا ہے۔ اس قسم کا پلاٹ اختراع کرنا نہایت مشق اور تجربہ کا کام ہے جس کے اختتام پر پڑھنے والا اپنے آپ کو مسرت کے پُر بہار چمنستان میں پائے۔ جہاں اُس کا مسحور دماغ مصنف کے پُرزور قلم کی دلاویز گلکاریوں پر متاعِ دل لُٹا کر کفِ افسوس مل رہا ہو کہ قصہ کیوں ختم ہوگیا۔

مندرجۂ ذیل تمثیلی قصہ[1] سے تحیّر کا پلاٹ بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے:۔

"ایک مالدار لڑکی ایک مفلس لیکن خوبصورت آدمی سے محبت کرنے لگتی ہے۔ مگر والدین کے دباؤ سے جو ایک بے نوا کے ساتھ اُس کا بیاہا جانا پسند نہیں کرتے۔ وہ اپنا رشتۂ الفت توڑ لیتی ہے۔ چند سال بعد لڑکی کو کسی دوسرے شہر میں جانیکا اتفاق ہوتا ہے جہاں ایک دن دوپہر کے بعد وہ کسی سہیلی سے ملنے جاتی ہے، جس کے مکان پر اُسکے پُرانے عاشق سے رسمی طور پر اُس کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ زخمِ دل پھر ہرا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اب مرد بھی ایک متوسط درجہ کا مالدار بن جاتا ہے لڑکی اُس سے ملنے یا سیر و تفریح کے لئے اُس کے ساتھ باہر جانے

---

[1] شارٹ سٹوری رائیٹنگ از بیرٹ۔

میں پس و پیش نہیں کرتی۔ اخلاقی طور وہ دونوں اپنی گذشتہ زندگی کے اُن رنجیدہ واقعات کا بالکل ذکر نہیں کرتے جن کے باعث وہ ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے تھے۔ آخر کار وہ اُس سے شادی کی درخواست کرتا ہے جسے لڑکی خندہ پیشانی سے منظور کر لیتی ہے۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد لڑکی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اُس کا منگیتر اُس کا پرانا چاہنے والا نہیں بلکہ اُس کا توام بھائی ہے۔ جس کی بود و باش کے متعلق وہ بالکل بے خبر تھی۔ اسی اثنا میں وہ بدقسمت شخص بھی وہیں آ نکلتا ہے مگر لڑکی کا دل دونوں کی طرف سے تنفر پذیر ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے دل میں کسی ایک کی بھی محبت قائم نہیں رہتی" +

(۲) **معمہ:**۔ ۱۸۸۳ء میں سٹوکٹن نے سینچری میگزین میں ایک کہانی بنام "دی لیڈی آر دی ٹائیگر" لکھی تھی جو اس قدر مقبولِ عام ہوئی کہ تمام ملک میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھی گئی۔ اس تتبع میں امریکہ کے نوجوان مصنفین نے اس موضوع پر اس قدر کہانیاں لکھیں کہ غریب ایڈیٹر تنگ آ گئے آخر کار انہوں نے اپنے صفحات میں اعلان کر دیا کہ آئندہ معمہ کی قسم کے افسانوں پر کسی قسم کی توجہ نہیں دی جائیگی۔ معمہ کی کہانیاں اگرچہ اتنی دلپسند نہیں ہوتیں جسقدر کہ وہ جو تحیر[1] پر مبنی ہوں مگر اول الذکر میں قصہ نویسوں کے لئے زیادہ وسیع میدان نکل آتا ہے قصصِ معمہ لکھنے میں بہت احتیاط مدِ نظر رکھنی پڑتی ہے کیونکہ تین بڑے خطرات کا مصنف کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اوّل۔ ممکن ہے کہ وہ معمہ جو مصنف قارئین کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہے اس میں اتنی دلچسپی نہ ہو جو پڑھنے والے کی تمامتر توجہ اپنی طرف مبذول کر لے۔

دوئم۔ اغلب ہے کہ اُس کا حل شروع ہی سے سمجھ میں آنے لگے۔

سوئم۔ شاید مصنف کا حلِ معمہ۔ قصہ خواں کے لئے غیر تسلی بخش ہو +

بعض اوقات اعلےٰ پایہ کے جادو نگار فسانہ نویسوں کے قلم سے بھی ایسی کہانیاں لکھی گئی ہیں جن میں بہت سے نقائص اور خامیاں ہوں۔ مثال کے طور پر "ہوّاز نمبر دن" ایک ایسی کہانی ہے جسے امریکہ کی نصف سے زیادہ آبادی یا تو متحرک[2] تصاویر کے تھیٹروں میں دیکھ

---

[1] تحیر [2] یہ فلم لاہور میں بھی دکھائی جا چکی ہے +

چکی ہے یا کتابی صورت میں پڑھ چکی ہے اگرچہ اس قصہ میں سالخوردہ مصنف نے بلا کی دلچسپی بھر رکھی ہے مگر پھر بھی اس کے نتیجہ سے کوئی شخص مطمئن نہیں ہوتا اور قدر افزائی کا یہ عالم کہ "پیرا ماؤنٹ پکچر پلے کارپوریشن" نے ۸۴ لاکھ کی گرانبہا رقم صرف کرکے اسے فلم کیا ہے" +

(۳) راز:۔ قصص سراغرسانی۔ قصص ارواح سفلی و علوی۔ اور قصص رازداری تینوں بجائے خود ایک مستقل مبحث کی صورت اختیار کر سکتے ہیں مگر افسوس یہاں ان موضوعات پر مفصل بحث کرنے کے لئے جگہ نہیں +

بہت تھوڑے مصنف ایسے ہیں جنہوں نے سراغرسانی کے افسانے لکھے ہیں۔ جن میں سے ایڈگر ایلن پو۔ اے کانن ڈائل۔ آرتھر بی ریو۔ فلپ اپن ہام۔ اور چارلس ہلے لوگ کے نام قابل ذکر ہیں۔ صحیح معنوں میں ہندوستان کے کسی مصنف نے سوائے منشی عبدالغفور صاحب مرحوم کے اس موضوع پر طبع آزمائی نہیں کی۔ سراغرسانی کے جتنے قصے کہانیاں میری نظر سے گذری ہیں وہ تمام کی تمام مندرجہ بالا مصنفین کے ناولوں کے تراجم ہیں اور خدا مغفرت کرے منشی صاحب مرحوم ہی ایک فرد واحد تھے جنہوں نے اپنی جدت پسندی۔ محنت و ذہانت طبع سے ایسے شاندار اور نایاب قصے تصنیف کئے +

ہندوستان کو چھوڑ کر جو اس قسم کی تصنیفات سے بے نیاز ہے۔ موجودہ زمانہ کے قصہ نویس اس فن میں پو کو قصص سراغرسانی کا اُستاد تسلیم کرتے ہیں۔ عموماً اس قسم کی کہانیوں میں مصنف تخیلی سراغرسان کو اپنے پیش کردہ معمہ یا راز سلجھانے میں مصروف کر دیتا ہے بطور ایک فرد قصہ اگرچہ سراغرسان۔ مصنف کے لئے تار کی کٹ پتلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ مگر پھر بھی موخرالذکر کے دماغ پر ایک سادہ قصہ لکھنے کی بجائے سراغرسانی کا فسانہ لکھنے سے زیادہ بار پڑتا ہے۔ مصنف سراغرسان کے لئے ایک ایسا سوال یا راز پیش کرتا ہے جس کا حل بادی النظر میں غیر ممکن معلوم ہو اور اس میں خوبی یہ ہو کہ تمام واقعات پر نظر غائر ڈالنے سے پڑھنے والا خود اس معمہ کو حل نہ کر سکے یا اس سے بھی زیادہ دلچسپی اس بات میں پیدا ہو سکتی ہے کہ قصہ خواں کے حل سے بہتر اور پُر لطف حل سراغرسان ہی پیدا کرے جو عموماً پڑھنے والے کے دل میں دلچسپی اور مسرت کے انبار لگا دیتا ہے۔ اس میں کوئی شک

نہیں کہ سراغرسان ہر موقع پر مصنف کے خلاف بازی لے جاتا ہے اور یہی بات قارئین کے لئے موجبِ بہجت ہو سکتی ہے +

کسی پُر اسرار قتل میں مقتول کو ناول بین کی پوری ہمدردی حاصل کرنیکا موقعہ دینا قصہ میں ایک انقلاب پیدا کر دینے کا مترادف ہے۔ ایسے افسانوں میں عموماً سراغ کسی ایسے بے گناہ آدمی کی طرف اشارہ کرتا ہے جو اس خون میں نہایت دلچسپی لے رہا ہو۔ اور پڑھنے والے کو ہر لحظہ یہی خدشہ رہے کہ کہیں وہی مرد یا عورت قاتل ثابت نہ ہو جائے مگر اس قسم کی کہانیاں لکھنا نہایت ہوشمندی اور عقل و فہم کا کام ہے۔ جس کے پلاٹ متحرک تصاویر کے تھیئٹروں میں کثرت سے دیکھے جا سکتے ہیں۔

افسانہائے ارواح ہمارے لئے بقول جولین ہاتھارن نہایت دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں مگر صرف اُسی حالت میں جبکہ قصہ نویس ایسی روحوں پر یقین رکھتا ہو بہ خلاف اس امر کے کسی ایسے موضوع پر طبع آزمائی کرنا یقیناً تضیع اوقات سمجھنا چاہیئے۔ اس قسم کی کہانیاں لکھنے کے لئے بہت مطالعہ کی ضرورت ہے۔ امریکہ کے ایک ہونہار مصنف نے اس قسم کے قصص لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو راستے میں سینکڑوں قسم کی مشکلات پائیں سوائے ہیملٹ[2] کے اُسے کوئی اور زیادہ دقیع راہبر نہ ملا۔ مگر بہت تلاش و تجسس کے بعد اُسے معلوم ہو گیا کہ اس قسم کی کہانیاں فرانس میں لکھی گئی ہیں اور اُسی مُلک میں ارواح علوی و سفلی پر یقین رکھنے والے لوگ بکثرت موجود ہیں۔ نئی معلومات کا خبط۔ قصہ نویسی کا شوق اور شہرت و عزت کا خیال اُسے کشاں کشاں فرانس لے گیا۔ جہاں پہنچ کر اُس نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اُسکے تحیر و دلچسپی کی کوئی حد نہ رہی جب ایک شب اُس کے فرانسیسی ملازم نے دورانِ گفتگو میں اُس سے بیان کیا کہ ہوٹل سے دو میل کے فاصلہ پر آبادی سے دور ایک امیر زادہ نے اپنی سکونت کے لئے نہایت شاندار بنگلہ بنایا تھا۔ مگر افسوس وہاں خبیث رُوحوں کا قیام ہے۔ جنہوں نے اُس کے کئی آدمی ہلاک کر دیئے اور اُس کا بہت سا نقصان کر دیا۔ اب جو بھی اُسکے اندر جاتا ہے زندہ واپس نہیں آتا۔ یہ سُن کر قابل مصنف نے سر کھجلایا۔ اُس کے اشہب فکر

---

[1] رڈل شو برز (معمی کہانیاں) تتمہ۔ الف۔ ۸ [2] شکسپیئر کا ایک ڈرامہ ہے۔

کو اور مہمیز لگی۔ وہ ایک منٹ سوچ کر کہنے لگا "تو گویا وہ جگہ اب ویران پڑی ہے"۔

ملازم نے ایک کامرانہ لہجے میں جواب دیا "بالکل۔ اور اُس کے اندر جانا تو کجا۔ کوئی شخص اُس کے پاس سے گذرنے کا بھی حوصلہ نہیں کرتا"۔

یہ سُنتے ہی مصنف کے دل کو نئی معلومات کے شوق نے گدگدایا۔ وہ دو منٹ کے توقف کے بعد بولا "اچھا تو میں کل رات وہیں شب باش ہونگا"

ملازم کے پاؤں تلے کی زمین نکلنے لگی۔ اُس نے اپنی گرم مُٹھیاں بند کر کے کہا "صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہاں سے آجتک کوئی زندہ بچ کر نہیں آیا"

مصنف کی آنکھیں فرش پر جم گئیں۔ اور سوائے ایک چھوٹے سے "ٹائم پیس" کے جو میز پر پڑا ٹک ٹک کر رہا تھا کوئی چیز ان دونوں کے سکوت کو توڑنے والی نہ تھی۔ پھر یکلخت اُس نے سر اُٹھا کر کہا "کچھ پروا نہیں میں ضرور جاؤنگا"

طلوعِ آفتاب سے پیشتر یہ خبر ہوٹل کے جُملہ مکینوں تک پہنچ گئی۔ بلکہ گرد و نواح میں بھی برق آسا تیزی کے ساتھ پھیلی اور بہت سے پُر اشتیاق اور بے صبر مرد و زن نوجوان مصنف سے ملنے آئے۔ مگر وہ تہیہ کرچکا تھا کہ خبیث روحوں کے مسکن میں ایک رات بسر کر کے یا تو نئے تجربات و مشاہدات سے کامران واپس آئیگا یا بے بسی سے وہیں جان دیدیگا

دوسرے روز اُس نے بہت سی سوختنی لکڑیاں اُس مکان کے اندر ہال کمرہ میں انبار کرادیں۔ اپنی تلوار سان پر تیز کر کے سات گولی کا پستول بھر کر تیار کرلیا۔ شام ہوتے ہی وہ اُس بڑے کمرہ میں جا پہنچا۔ تمام کواڑ اندر سے بند کر کے اُنکی چٹخنیاں چڑھا دیں۔ لکڑیوں کے ڈھیر کو آگ دکھا کر خود کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوگیا۔

دو بجے کے قریب ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ تمام کواڑ اور کھڑکیوں کے در خود بخود کھل گئے اور عجیب و غریب آوازوں نے ایک قسم کا شورِ محشرستان بپا کر دیا۔ بہادر مصنف کے دل میں کسی قسم کا خوف و ہراس پیدا نہ ہُوا بلکہ وہ اور مستعدی اور ہوشیاری سے نتیجہ کا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مقابل کے دروازہ سے اُسے ایک دیو پیکر شخص گذرتا ہُوا دکھائی دیا جس کے ہاتھ میں من من بھر کے وزنی آتشیں گولے تھے جنہیں وہ نہایت بیباکی

سے اُچھالتا آرہا تھا اور جن سے ہر بار آگ کے شرارے نکل نکل کر اِدھر اُدھر پھیل رہے تھے۔ یہ بالکل دو تین منٹ کی کارروائی تھی کہ یکایک اُس کمرہ میں ہڈیوں کی بارش ہونی شروع ہوئی اور ایک انسان کا کٹا ہُوا ہاتھ اُس کے نزدیک آگرا جسے اُٹھا کر اُس نے الگ پھینک دیا پھر دوسرا ہاتھ ایک ٹانگ۔ کسی انسان کا سر گرا جس سے تازہ لہو ٹپک رہا تھا۔ یہ دیکھتے ہی مصنف کی رنگت فق ہوگئی۔ خوف و ہراس سے اُس کی رگ ہائے دماغ میں تمام جسم کا خون جمع ہوگیا۔ اور اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ وہ اُن خبیث رُوحوں کے مسکن سمیت بہت جلد کسی نامعلوم آسمان میں اُڑ جانے والا ہے۔ کامیابی و فتحمندی کا ولولہ انگیز خیال اُسے ایک ریت کے قلعہ کی طرح مسمار ہوتا نظر آیا۔ یکایک ایک سخت دھماکے کی خوفناک آواز سے اُس کے دماغ کا منجمد خون اُس کی رگوں میں حرکت کرنے لگا۔ دل و دماغ کی زائل شدہ قوت پھر عود کر آئی اور اُس خیال سے کہ اگر ان کی فی الواقع کوئی حقیقت ہوتی تو مجھے ضرور کسی قسم کا جسمانی گزند پہنچتا۔ وہ غیر معمولی استقلال و حوصلہ مندی سے ہر قسم کے حوادثات و مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہوگیا +

وہ ابھی کُرسی پر اپنے پریشان دماغ کو سنبھال کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک نہایت زرد رو انسان جس کے چہرہ پر مُردنی چھائی ہُوئی تھی مگر آنکھ سے شعلے نکل رہے تھے۔ از سرتاپا سفید لباس میں ملبوس عین اُس کے بالمقابل آکر کھڑا ہوگیا اور نہایت آہستہ آواز میں کہنے لگا "نوجوان دوست۔ اب بھی وقت ہے یہاں سے زندہ و سلامت نکل جاؤ ورنہ تمہاری جان کی خیر نہیں تمہاری بہادری اور دلاوری کا میں قائل ہوں مگر تم غیر فانی ہستیوں کا راز معلوم کر کے اُسے کبھی فانی دُنیا کے سامنے پیش کرنے کے لئے یہاں سے زندہ نہ نکل سکو گے"۔ یہ کہکر وہ رُوح نہایت آہستہ لمبے لمبے ڈگ بھرتی اُس کی طرف گامزن ہُوئی۔ مصنف نے اپنا پستول سنبھال کر اُس پر وار کرنا چاہا۔ مگر طپنچہ بالکل جواب دے گیا۔ ایک۔ دو۔ تین۔ یکے بعد دیگرے سب گولیاں چل گئیں۔ مگر نہ تو چلنے کی آواز۔ نہ دھوئیں کا نشان۔ عجب حیرت تھی کہ اسے کیا ہوگیا۔ اب تو اُس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑنے لگے۔ موت کا سماں آنکھوں کے سامنے کھچ گیا۔ ایسی رُوحوں سے تمام ہال کمرہ پُر ہو رہا تھا۔ ڈر کے مارے مُصنف کے اوسان خطا ہوگئے۔ اُسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ

اُس وسیع و عریض کمرہ کی چھت اُس پر گر کر اُس کی ہڈیوں کو سُرمہ بنا دیگی۔ وہ خوف و ہراس سے پیچھے ہٹنے لگا۔ روحوں نے اُسے اب چاروں طرف سے گھیر لیا اور اپنی چادروں سے سنگین سفید ہاتھ باہر نکال کر مصنف کا گلا گھوٹنا چاہا۔ یہ دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں میں وحشت کی تیرگی پھیل گئی۔ جس طرح مجروح شیر اپنے شکاری پر آخری وار کرنے کے لئے تمام قوت یکجا جمع کر کے ایک ہی حملہ میں صرف کر دیتا ہے بعینہٖ مصنف نے اپنی تلوار سنبھالی اور ایسے زور سے گھمائی کہ خبیث روحوں کا تنگ دائرہ بہت حد تک وسیع ہو گیا۔

نوجوان مصنف ایک شیرانہ نعرہ لگا کر آگے بڑھا اور اُس رُوح کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا" اگر جی میں کوئی بہادری کی اُمنگ ہو تو نکال لو" مگر بجائے اس کے کہ تمام رُوحیں اُس پر بیدردی سے ٹوٹ پڑتیں وہ خوفناک آوازوں سے چیختی چلاتیں دیگر ملحقہ کمروں میں غائب ہو گئیں۔ مگر مصنف نے اپنے شکار کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر ایک دیوار کے پاس پہنچ کر وہ رُوح دوزانو ہو گئی اور نہایت منت و لجاجت سے ہاتھ باندھ کر کہنے لگی" لِلّٰہ معاف کرو ہم بھی تمہاری طرح اِنسان ہیں"

" اِنسان ہیں" مصنف نے حیرت و استعجاب سے مُنہ پھاڑ کر کہا" یہ تمام شعبدے دکھانے سے تمہارا کیا مطلب اور کیوں تم نے اتنے بے گناہوں کا خون اپنی گردن پر لے رکھا ہے۔ مگر سب سے پہلے یہ بتاؤ کہ میرا پستول کیوں نہیں چلا؟"

خبیث رُوحوں نے سر پر موت سوار دیکھ کر کہا" کل دوپہر جب تم اپنے کمرہ میں سو رہے تھے تو ہم نے تمہارے ملازم کو پچاس روپے رشوت دیکر پستول خالی کرا لیا تھا ہم نے تمام دروازوں کے باہر پیچ لگا رکھے ہیں جن کے مروڑنے سے تمام دروازوں کی چٹخنیاں خود بخود کھُل جاتی ہیں۔ وہ جو آتشیں گولے تم نے دیکھے تھے۔ اُنہیں رال اور فاسفورس سے بنایا گیا تھا۔ میری آنکھوں میں انٹی منی اور فاسفورس کا مرکب لگا ہُوا ہے ہم نے اس بنگلہ کو ارواحِ سفلی کا مسکن اس لئے قرار دیا ہے کہ میں اور میرے پندرہ بیس ساتھی یہاں رہ کر جعلی نوٹ بناتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے تو تمہیں گولیوں سے ہلاک کر ڈالتے مگر ہمارا ایسا فعل پولیس کو ہمارے پیچھے شکاری کتوں کی طرح ڈالدیتا۔ ہم یہاں آنے والوں کو ایسے

شعبدے دکھا کر خوف و ہراس سے ہی مار ڈالتے ہیں۔ مگر آفرین ہے تمہاری بہادری پر تم ہی ایک ایسے شخص ہو جس نے بہت کم خوف کھایا۔ اگر تم ہمیں امان دو تو میں اور میرے ساتھی آج سے اس ذلیل ترین پیشہ کو ترک کر کے دیانت دار و نیک نیت شہری بن جائینگے"۔
یہ سنتے ہی مصنف کا دماغ غرور و تمکنت کے بہجت خیز خوابوں سے لبریز ہو گیا۔ اُس کے دل میں ایک فتحمند جرنیل جیسی خوشی کا بحر ذخار موجیں مارنے لگا۔ اُس نے اپنی خوبصورت پیشانی پر بل ڈال کر کہا "یہ معاملہ پولیس کے ساتھ تعلق رکھتا ہے یا عدالت سے۔ البتہ میں تمہیں اُن فروگذاشتوں اور تکلیفوں کے لئے معاف کر سکتا ہوں جن کا معاف کرنا میرے بس کی بات ہے"

نوجوان امریکن نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تو شاندار بنگلہ کے برآمدہ میں سپیدۂ سحر چمک رہا تھا۔ سوختنی لکڑیوں کا انبار ایک راکھ کے تودے کی صورت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی تلوار نیام میں کی اور ہوٹل کا راستہ لیا۔ جہاں نہ صرف پولیس کے آدمی بلکہ سینکڑوں مرد و زن۔ بچے۔ بوڑھے اُس خوبصورت و بہادر مصنف کے مشاہداتِ شب کا تذکرہ سُننے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ اُس نے نہایت مختصر الفاظ میں سب کی محبت و حوصلہ افزائی کا شکریہ ادا کر کے اُن خبیث روحوں کے مسکن کی پُر لُطف داستان سُنائی۔ دوپہر کے بعد مختلف رسائل و جرائد کے نامہ نگار اُس سے شب گذشتہ کے حالات سُننے کے لئے آموجود ہوئے اور دو گھنٹے کے عرصہ میں اُس کی تصویر سینکڑوں فوٹو گرافی کے شیشوں میں ثبت ہو گئی۔ جب وہ ساحلِ فرانس چھوڑ کر جہاز پر سوار ہونے والا تھا تو ایک فرانسیسی جریدہ کے مُدیر نے ایک لاکھ فرانک کی رقم خطیر اُسے اس لئے پیش کی کہ وہ اپنے چشمدید حالات کا خود نوشت مسودہ اُس کے حوالے کر دے +

۴۔ **جذبات و محرکات**:۔ اس قسم کے قصص میں وہی فسانہ مقبول انام ہو سکتا ہے جو دلی جذبات میں تحریکات کے مد و جزر کا طوفان برپا کر دے۔ ظاہری فعل سے رُوح کا اندرونی فعل زیادہ پُر تاثیر اور پائدار ہوتا ہے۔ بعض اوقات آدمی یونہی مُسکرا دیتا ہے خواہ دل زہر کے گھونٹ پی رہا ہو۔ بہترین فسانہ نہ صرف ظاہری بلکہ باطنی محرکات کا باعث

ہوسکتا ہے۔ امریکہ میں جو درجۂ امتیاز اس فن میں پو اور ہاتھارن کو حاصل ہے اُسی نے فرانس میں ماپسنٹ۔ انگلستان میں میری کوریلی۔ روس میں کونٹ ٹولسٹائی اور ہندوستان میں مُصوّرِ غم راشد الخیری۔ ڈپٹی نذیر احمد مرحوم اور منشی محمد کامل کو میدانِ صحافت میں ممتاز کر دیا ہے۔ اس قسم کے پلاٹ میں مصنف کے لئے افضل ترین بات یہ ہے کہ سب سے پہلے اُس اثر کو اپنا منتہائے خیال بنائے جو وہ قارئین کے دل پر چھوڑنا چاہتا ہے۔ پھر تمام واقعات کو اُس کے زیرِ نگیں کر دے +

۵۔ موازنۂ اطوار۔ اس موضوع پر نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ممالکِ غیر میں بھی بہت کم کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ انگریزی میں "دی آؤٹ کاسٹ آف پوکر فلیٹ" اور اُردو میں "دو بہنیں" نام دو افسانے اس بات کو خوب وضاحت سے بیان کرتے ہیں۔ جہاں آئندہ نمبر میں یہ بتاؤنگا کہ پلاٹ کے مصادر میں ایک ماخذ "افرادِ قصہ" بھی ہے وہاں یہ بیان کر دینا بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ موازنۂ اطوار پلاٹ بنانے اور کہانی میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے نہایت کار آمد عنوان ثابت ہُوا ہے اس طرز کی داستانیں لکھنے میں وہی مصنف گوئے سبقت لے گئے ہیں جن کا حلقۂ دوستی ہر قسم کی مجلسوں تک وسیع ہو۔ جہاں وہ ہر ایک قسم کے آدمی سے ملتے ہیں اور چشم دُوربین سے اُنکا مطالعہ کر کے اپنے فسانوں کے لئے بہت کار آمد اور دلچسپ مصالحہ جمع کر لیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ممالکِ غیر کے قصہ نویس بہ تبدیلِ لباس ادنےٰ درجہ کے لوگوں میں دیکھے گئے ہیں +

۶۔ محاکات:۔ اس قسم کی کہانیوں کے پلاٹ عموماً نتیجہ خیز ہوتے ہیں۔ جن میں صاف طور پر ایک سبق دینے کا خیال قلمبند ہو اور جنہیں پڑھنے کے قابل بنانے کے لئے نہایت دانائی تجربہ اور عقلمندی درکار ہوتی ہے بہت کم مصنفین ہیں جن میں ایسے افسانے لکھنے کی استعداد یا قابلیت ہو۔ اُردو میں شامِ غم[۱]۔ صبحِ زندگی[۲]۔ توبۃ النصوح[۳]۔ بنات النعش[۴] اور زاہدہ[۵] ایسی کتابیں ہیں جن کے لکھنے سے مصنفین کا مطلب ایک نصیحت آموز بات بتانیکا ہوتا ہے۔ جسے وہ فسانہ کی چاشنی سے اس طرح پڑھنے کے قابل بنا دیتے ہیں جس طرح ایک مغربی طبیب کونین پر چینی کی تہ جما کر کمسن بھولے بچّوں کو مٹھائی کا دھوکا دیکر نگلجانے کی ترغیب دیتا ہے +

۱؎ مصنفہ بریٹ ہارٹ ۲؎ مصنفہ منشی دین محمد ۳؎ علامہ راشد الخیری ۴؎ مولانا نذیر احمد مرحوم ۵؎ علامہ محمد احسان اللہ عباسی

اعلیٰ درجہ کا دلچسپ پلاٹ بنانے کے لئے لازمی امر ہے کہ اُس میں

(۱) سادگی (۳) جدت اور

(۲) فصاحت (۴) تلذذ

ہو۔ سادگی ایک شاداب لفظ ہے جس کے متعلق ڈاکٹر برڈ[1] رقمطراز ہے کہ پلاٹ ایسی خوبی و خوش اسلوبی سے بنانا چاہیئے کہ ہم اُسے فرطِ حیرت و استعجاب اور دلی مسرت سے پڑھیں اور اُس کے اختتام پر اپنی بہجت و شادمانی پر خود ہی چیں بجبیں ہو کر مصنف کی ابلہ فریبی پر غم و غصہ کا اظہار کریں۔ کیونکہ ہم نے خیال کیا تھا کہ اُس کے سرسبز و شاداب مضمون اور ہوا تخیلات میں کوئی گنج نایاب پنہاں ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہیں۔ سادہ پلاٹ کبھی ناکامیاب ثابت نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ایزلوین نے ایسے پلاٹ کو ایک "تاریک گلی" سے منسوب کیا ہے جو پڑھنے والے کو خیالاتِ متخیلہ کے قصرِ رفعت نشان کی راہ دکھائے مگر بجائے ایسے ٹھکانے پر پہنچانے کے اُسے اپنے ہی کم مایہ خیالات کے جھونپڑے میں شرمندہ۔ فریب خوردہ اور غصہ و ندامت سے تلملایا ہوا چھوڑ جائے +

اگر فسانہ نویس اس بات کی نہ بھی قسم کھائے کہ اُس کی داستان واقعاتِ اصلیہ پر مبنی ہے مگر پھر بھی ایسی کہانی کو اُسے خود سچ جان کر لکھنا چاہیئے۔ فصاحت و بلاغت کا دریا بہاتے وقت مصنف کو قدرتی امور کبھی نظر انداز نہ کرنے چاہئیں۔ اگر چھوٹی چھوٹی مچھلیاں گفتگو کر رہی ہوں۔ جس طرح گولڈسمتھ نے ڈاکٹر جونسن کے ادبی طریقوں پر نظرِ تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "پھر اُنہیں ننھی مچھلیوں کی طرح ہی باتیں کرنا چاہیئے نہ کہ ویل مچھلیوں کی طرح" بلاغت۔ فسانہ نگار کو۔ جادو نگار۔ دروغ رقم۔ اور ایک پُرہُنر داستان گو بنا دیتی ہے +

جمہور کا رجحانِ طبیعت اور مذاقِ حاضرہ ہر وقت کوئی نئی بات تلاش کرنے کے درپے رہتا ہے۔ محبت و الفت۔ حُسن و عشق اور محبوبیت کے قصے سب تقویمِ پارینہ سمجھے جانے لگے ہیں۔ نہ صرف انگریزی بلکہ اُردو خوان پبلک بھی قصہ نویسوں سے نہایت اعلیٰ و شُستہ خیالات عمدہ زباں دانی کے نمونے اور تخیلات و جذبات سے لبریز لٹریچر کی طالب ہے۔ نئے قصے

[1] میگزین نکشن مندرجہ لپن کاٹ نومبر ۱۸۹۴ء

لکھے گئے ہیں مگر بہت کم۔ پرانے فسانہ نویس ابھی تک اپنا پہلا سُر الاپ رہے ہیں۔ یا بالکل ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گئے ہیں کیونکہ اُن کے دماغ جذباتِ عشق ہی کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے ہیں۔ وہ نئی راگنیوں سے قطعاً بے بہرہ ہیں۔ جس طرح انگریزی ناول نویسوں میں ہال کین اپنی پرانی روش پر ابھی تک گامزن ہے اسی طرح بعض اردو مصنفین حسن و عشق کے میدان میں خیالاتِ فرسودہ کی تلوار چلا رہے ہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک نئے قصہ نویس پیدا کرے مگر یہ مدیرانِ جرائد کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ مفت یا قلیل اُجرت دیکر مضمون حاصل کرنیکا خیال اعلےٰ مضمون نگار پیدا نہیں کر سکتا۔

عمدہ پلاٹ کا طرۂ امتیاز "تلذذ" ہے۔ جہاں یہ عنقا ہو وہاں فسانہ کی دلچسپی زائل سمجھی جاتی ہے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ مصنف خود نہیں بلکہ ایڈیٹر اور قصہ خواں پبلک اس بات کے بتانیکے لئے بہترین جج ہیں کہ آیا کہانی عمدہ ہے یا نہیں۔ ممکن ہے کہ پڑھنے والے کا خیال تمہارے مطمحِ نظر کے بالکل برعکس ہو اسلئے اُس میں تلذذ بھرنا قصہ کو کامیاب بنانیکا مماثل ہے۔ تمہاری کہانی دوسرے مصنفین کی کہانیوں کے ساتھ مقابلہ میں پیش کیجائیگی۔ جہاں تمہارے فسانہ میں عمدہ نکات ہونگے وہاں اُس میں ایسی خامیاں اور فروگذاشتیں بھی ضرور نظر آئینگی جو تمہاری ہردلعزیزی کو نقصان پہنچانے میں بہت حد تک کامیاب اور موثر ثابت ہو سکیں۔

اگر بہترین فسانہ نویسی کا شوق ہے تو "لوگوں کے دلی جذبات و محسوسات کے محرمِ راز بن جاؤ"۔ انہیں جانو محسوس کرو۔ اُن پر یقین رکھو۔ اُن سے ہمدردی کرو۔ اُنکے لئے کچھ نہ کچھ دلچسپی کا سامان فراہم کرتے رہو اور اگر خدا ہمت و توفیق دے تو انہیں کے لئے جیو اور انہیں کے لئے مرو۔ جب تم میں یہ سب اعلےٰ و ارفع صفات پیدا ہو جائینگی تو یقیناً تمہارا ہر فسانہ لوگوں کے دلوں میں۔ محبت و الفتِ ہمدردی و رفاقت اور عزت و وقعت کے انبار لگا دیگا۔ فسانہ نویسی کے لئے ولکی کالن کا یہ مجرب نسخہ یاد رکھو "لوگوں کو ہنساؤ۔ رلاؤ اور صبر کی تلقین کرو"۔ دنیا کی سب سے بڑی قوت "دلچسپی" ہے اگر قصہ میں یہ موجود ہے تو تمہاری قربانی۔ تہوّر۔ ذہانت۔ ایثار۔ محبت اور باقی تمام چیزیں فسانہ پڑھنے والے دلوں پر قابو پالینگی۔ "لکھو اور اُس وقت تک لکھو کہ تمہاری دوات کی سیاہی خشک ہو جائے حتیٰ کہ تم اُسے اپنے آنسوؤں سے دوبارہ تر کرو"۔ سب سے اول کہانی میں آگ پیدا کرو پھر وہ پڑھنے والے کے دل میں شعلہ زن ہو گی اور اگر تم کہانی میں آگ نہیں ڈال سکتے تو کہانی کو آگ میں ضرور ڈال سکتے ہو۔

(باقی دارد) محمد ضیاء الدین شمسی

۱؎ ہاؤ ٹو رائیٹ اے ناول۔ گمنام ۲؎ شکسپیئر۔ ٹو جنٹلمین آف ویرونا

تاریخ رُوس پر اجمالی نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

حضرتِ مسیح کا قول ہے" درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے" عیسائیت بھی اپنے کارناموں سے پہچانی جاتی ہے! یہ خواہ کہیں ہو، اور کسی صورت میں ہو، اسلام کیلئے بدترین دشمن ثابت ہُوئی ہے مُسلمانوں کو دیکھتے ہی آگ اور خون کی ہولی کھیلنا اس کا قدیمی شیوہ رہا ہے، جس کی ہر زمانے میں اس نے تجدید کی ہے، چنانچہ روس میں جب اس کی حکمرانی قائم ہُوئی تو اس نے اپنے وجود کی یہی خونیں روایات تازہ کیں،

سب سے پہلے قزان اور خبار میں ایک انجمن قائم کی گئی، اس انجمن کا مقصد عیسائیت کی اشاعت تھا، یہ مبلغین حکومت کے زور پر میدان میں اُترے تھے، ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی، دوسرے میں حرص لالچ اور ترغیب و ترہیب، جدید الاسلام مُسلمانوں نے ان چمکتی چیزوں کو دیکھا، اور پھر یہ بھی دیکھا کہ انکار کی صورت میں تلوار کا قبضہ ہاتھ میں بلند ہے، تو فوراً اسلام سے پھر گئے، یہ چمکتی چیزیں محاصل کی معافیاں، جرائم کی سزاؤں سے بریت، مالی اعانت اور سیاسی مراعات تھیں، تو دولتوں کی یہ برگشتگی مسیحی تباہ کاروں کے لئے رحمت و برکت ہوگئی، اور انھوں نے مُسلمانوں کو جلانے، ستانے، پریشان کرنے، اور گھروں سے نکالنے کے لئے حکومت سے ایک قانون جاری کرا دیا، اس قانون کا منشائے نفاذ یہ تھا کہ جس گاؤں میں چند گھر عیسائی ہو جائیں، وہاں کی آبادی کے لئے ضروری ہے کہ عیسائیت قبول کرلے، ورنہ اس گاؤں کو چھوڑ دے، بعض مسلمانوں نے اس حکم کو مان لیا، اور ان مقامات سے ہجرت کرکے دوسری جگہ چلے گئے، لیکن اکثر نے اس کے ماننے سے انکار کیا، خصوصاً شمالی قزان کے مُسلمانوں نے اس کی مقاومت کی، اور آخر دم تک مَیدان میں ڈٹے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ وہ اِن سے زیادہ مبتلائے مُصیبت ہُوئے، اُن کو تو صرف مکانات چھوڑنے پڑے تھے، مگر اِن کو

جانیں چھوڑنی پڑیں، انہیں حکم دیا گیا کہ یا عیسائیت قبول کریں یا موت، اور جب انہوں نے عیسائیت کی زندگی کے مقابلہ میں اسلام پر قائم رہنے کی باعزت موت قبول کی تو ان سفاکوں نے حکم دیا کہ اپنی مسجدوں کے منارے منہدم کر دیں کہ اگر یہ ناگہان گر پڑے تو انسانی جانیں ضائع ہونے کا اندیشہ ہے، اور جب اس حکم کی تعمیل نہیں کی گئی تو خود ہی منارے منہدم کر دئے، جو لوگ اس موقعہ پر خاموش رہے انہیں عیسائی سمجھ لیا گیا، اور جنہوں نے مقاومت کی ان پر ظلم کئے گئے، تازیانوں سے مارا گیا، گرم گرم سلاخوں سے داغ دئے گئے، اندھیری کوٹھڑیوں میں بند کر کے کئی کئی دن بے آب و دانہ رکھا گیا، گھٹنوں کے بل کنکروں پر بٹھایا گیا، خاردار شکنجوں میں دبایا گیا، اور کئی کئی من وزنی زنجیریں دست و پا، دوش و گردن میں ڈال کر میلوں چلایا گیا، غرض کوئی ایسی سزا نہ تھی جو ان غریبوں کو نہ دی گئی ہو، اور اس لئے نہ دی گئی ہو کہ وہ اسلام کے سچے پرستار تھے، اور عیسائیت کو قبول کرنے سے انکار کرتے تھے،

اس حال میں پیٹر اعظم اورنگِ حکومت پر جلوہ افروز ہوا، اس کی مذہبیت اگرچہ عیسائی دعات سے کمزور تھی، اور یہ صرف اصولوں کا پابند تھا، لیکن اسلام کے مقابلہ میں یہ ان سب سے زیادہ شہ زور تھا، اس نے تخت حکومت پر بیٹھتے ہی ان کی سرگرمیوں میں اور اضافہ کر دیا، اور اپنی مملکت میں ظلم و ستم کی آگ کے بڑے بڑے دوزخ دہکوا دئے، عام حکم دیدیا گیا کہ جو مسلمان عیسائیت قبول نہ کرے، وہ اس دوزخ میں ڈالدیا جائے، یا انہیں روسی حکومت سے نکال دیا جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی اعلان کر دیا کہ کوئی عیسائی مسلمانوں سے میل جول نہ رکھے، جو عیسائی اس اعلان کے بعد بھی ایسا کرینگے، انہیں سزا دی جائیگی،

ان اعلانات کے شائع ہوتے ہی اسلامی علاقوں میں ہنگامہ و شورش کا ظہور ہوا، اور پیٹر کو مجبوراً یہ اعلان واپس لینے پڑے،

لیکن یہ ناسور بھرنے والا نہ تھا، اور عیسائیت کی قدیمی وحشتیں پھر نمودار ہونا چاہتی تھیں تاکہ مسلمانوں کی دنیا نے اس کو جس حیثیت سے جانا ہے، اس کا زندہ ثبوت دیکھ لے، اور ظلم و ستم، قتل و غارت، مسماری و تعصب جو اس کا پیدائشی شیوہ ہے مرنے نہ پائے،

اس رسمِ کہن کی تجدید کے لئے ایک اور انجمن قائم کی گئی، اس کا مایۂ ضمیر سیاسی طاقت

تھی، اور اس کا صدر، مشہور دشمنِ اسلام عیسائی مبلغ ماناخ تھا، یہ پہلے بھی اپنی مسیحیت کے مقدس فرائض انجام دیتا تھا، لیکن جب اس کے تمام کاموں کی پشتِ پناہ حکومت ہوگئی تو اس کی سرگرمیاں اَور بڑھ گئیں، اور اب یہ مسلمانوں کی آبادیوں پر بجلی بنکر گرنے اور تلوار بنکر چمکنے لگا

ماناخ نے غیر قوموں کی تضعیف، خصوصاً مسلمانوں کی پامالی اور عیسائیت کے استحکام کے لئے ایک لائحِ عمل بھی بنایا تھا، اور حکومت کی طرف سے اس کی منظوری بھی ہوچکی تھی، لیکن حُسنِ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایلاریون کی مخالفت سے اس کو مستعفی ہونا پڑا، اور یہ انجمن ٹوٹ کر ایک دوسری انجمن قائم ہوئی، اس انجمن کا نام انجمن اہتدائے جدیدہ تھا، اس کی توثیق کے لئے سرکاری فرمان ۲۲ دفعات پر مشتمل تھا، جن کا لبِ لباب حسبِ ذیل ہے:-

۱- تمام رعایا کو عیسائی مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے، اور تمام عیسائیوں کے درمیان رشتۂ محبت و مودت پیدا کیا جائے،

۲- جو لوگ عیسائیت قبول کریں انہیں کپڑا، تمغے، خطابات اور مالی اعانت دی جائے اور فوجی خدمات و محاصل سے مستثنیٰ کر دیا جائے،

۳- جو لوگ عیسائیت قبول کریں انہیں قدیم عیسائیوں کے ساتھ آباد کیا جائے، تاکہ ان میں عیسائیت کے رسوم و عوائد راسخ ہو جائیں، اور وہ دوبارہ اپنے مذہب کی طرف عود نہ کرسکیں، اور

۴- جو لوگ ایسا کریں (یعنی اسلام کی طرف لوٹ جائیں) انہیں تازیانوں کی سزا دی جائے، ان کا مال و متاع ضبط کر لیا جائے،

۵- ایسے تمام لوگوں کو بھی سزائیں دی جائیں جو باوجود عیسائیت کی تبلیغ کے اسکے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں، اِن کا مال و اسباب چھین کر جلاوطن کر دیا جائے،

۶- تمام ملک میں ایسے مذہبی مدرسے قائم کئے جائیں جو عیسائیوں کے لئے مذہبی پیشوا تیار کریں،

۷- صلیب عیسائیوں کا مقدس مذہبی نشان ہے، اسے تمام نمایاں مقامات پر لٹکایا جائے اور ہر شخص کو مجبور کیا جائے کہ وہ اس کی تعظیم کرے،

۸- مسجدوں میں بلند آواز سے اذان دینے کا طریقہ بند کیا جائے، اس سے عیسائیوں کے

مذہبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے' اور اشتعال پیدا ہوکر نقضِ امن کا اندیشہ ہوتا ہے'

۹ - تمام ایسی مساجد جو زاید از ضرورت ہوں، یا عیسائی محلوں میں واقع ہوں، یا محکمۂ اہتدا کے قریب ہوں، یا ایسے مقامات پر ہوں جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۰۰ نفوس سے کم ہو منہدم کردی جائیں،

۱۰ - دوسری قوموں کو ان کی مذہبی کتابیں چھاپنے کی اجازت نہ دی جائے،

اس فرمان کے بعد سے مسلمان اور زیادہ مبتلائے مصیبت ہوگئے، ہر شخص ظلم و ستم پر تل گیا، بچوں سے لے کر عورتوں تک نے جو چاہا بے روک ٹوک کہا اور کیا، مسجدیں منہدم ہونے لگیں، مسلمانوں کے شعائرِ مذہبی اور معتقداتِ دینی کی تذلیل کی جانے لگی، جس نے چاہا ان کو بلا تامل زدوکوب کیا، ان کے لئے دادرسی کا دروازہ بند تھا، تعلیم و تعلم کی ممانعت تھی، مدرسے کھولنا جرم تھا، اور جو کوئی اس کا اقدام کرتا، وہ قید کردیا جاتا، اور پھر مدتوں اس کی خبر نہ لی جاتی،

غرض روس میں مسلمانوں کے لئے اپنے مذہب پر قائم رہنا سخت دشوار ہوگیا تھا، وہ طرح طرح کے ظلم وستم کا شکار رہتے، نہ کوئی خبر گیر تھا نہ دادرس، کیونکہ یہ جو کچھ ہورہا تھا حکومت کی طرف سے ہورہا تھا، اور حکومت بھی وہ جو امن و سلامتی کی مدعی، روشن خیالی کی داعی اور تمدنِ جدید کی حامی تھی، اور جس کی عنانِ نظم و ادارت اس کے ہاتھ میں تھی جو روسی وحشیوں میں پہلا انسان تھا، یعنی پیٹر اعظم!

ناظر دہلوی

قدرت کا طریقۂ گفتگو:- قدرت تین طریقوں سے گفتگو کرتی ہے - وہ ہم سے ہاتھ ملاتی ہے اور کہتی ہے:"ہمت کرو کوشش کرو" پھر اتنی نزدیک آتی ہے کہ ہم اسکے دل کی حرکت سن سکیں - اور کہتی ہے"تعجب کرو - محظوظ ہو - تعظیم کرو" پھر سرگوشی کرتی ہے اور اپنا راز بتلاتی ہے اور کہتی ہے"تلاش کرو - دریافت کرو" اس کی پہلی اپیل ہمارے ہاتھوں سے ہے دوسری دل سے اور تیسری دماغ سے

(جے - آرتھر - ٹامسن)　　(ریاض احمد بی اے انبالوی)

"گم کردہ"

افتخار میرا دوست تھا۔ میں اُسکو دس سال سے جانتا تھا۔ اُس کے نہاں درنہاں راز جنکو وہ اپنے قلب کی عمیق گہرائیوں میں پوشیدہ رکھتا تھا صرف مجھی پر منکشف تھے۔ میرے حیات و جذبات کو سمجھنے والا بھی آہ افتخار ہی تھا۔ میرے بے ربط و مجنونانہ خیالات جو بعض اوقات میرے سینے کی محدود وسعت سے بہت بڑھ جاتے تھے۔ جنکو میری قوتِ تحمل زیادہ دیر تک نہ اُٹھا سکتی تھی اور جو تحت الارض موادِ آتشیں کی طرح خود بخود بلا اختیاری طور پر میری زبان کے راستے خارج ہو جاتے تھے اُنکے مفہوم اصلی پر بھی سوائے افتخار کے اور کون قادر تھا؟ وہ وقت جو میں اور افتخار اکٹھے رہ کر گذارتے ہمارے ایام حیات کا بہترین وقت ہوتا تھا۔ افتخار کی صحبت مجھے تمام اشیاء دنیوی سے زیادہ عزیز تھی۔ مفارقتِ صوری کے عالم میں ہماری انتہائی خواہش یہی ہوتی تھی کہ باہم افسانۂ حیات سُنا کر بارِ زیست کو ذرا ہلکا کریں۔

احباب سے دور۔ اُنکی رُوح پرور مجلس سے دور۔ اُنکی مسرت افزا گفتگو سے (جو میرے اسبابِ حیات کا ایک لابدی جزو ہے) محروم۔ جب کبھی میں کسی ناآشنا کرۂ ہوائی میں زندگی کے چند ایام گذارنے پر مجبور ہوتا تو اُس وقت میرے پُر ملال سکوتِ حیات میں افتخار ہی تھا جو آ کر ہیجان پیدا کرتا۔ اُس کی صُحبت دنیا کا ناپسندیدہ پہلو نہ دکھا سکتی تھی وہ دوستوں کے لئے مایۂ زیست اور ہماری مجلس کی رُوح تھا جس کے نکلجانے سے اب وہ لذتِ حیات بھی مفقود ہے

افتخار نہ صرف دوست نواز بلکہ دوست پرست تھا۔ اُس کا سینہ پاک جذبات اور حقیقی محبت سے منوّر تھا۔ جس کی نورانی لمعات نے اُسکے دوستوں کے قلوب کو بھی صاف کر دیا تھا۔ اُسکی محبت بے لوث اور اُس کی دوستی خود غرضی سے قطعاً مُبرّا تھی۔ اس لئے وہ سمجھتا کہ ہر شخص جو اُس سے متبسم چہرہ کے ساتھ ملتا ہے وہ اپنے تبسم میں صفائی قلب لئے ہُوئے ہوتا ہے۔ یہ اُس کی کمزوری کہیئے یا تجربہ کی خامی یا حُسنِ ظن بہرحال وہ اسی عقیدہ کا آدمی تھا۔ اور ہر ایک کو اپنے ہی رنگ میں رنگا ہُوا دیکھنے کا خواہشمند۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر آرزو جو اُس کے دل میں پیدا ہو بہت جلد اپنے مقصود کو پالے حصولِ مُدعا میں سعی پیہم اور مسلسل کوشش کو بارگراں تصوّر کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ آرزؤں اور خواہشات کی فراوانی فقدانِ اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔

اس لئے چاہیئے کہ جو آرزو پیدا ہو بہت جلد پوری ہو کر اطمینان کی صورت اختیار کرلے یا ناکام رہ کر مایوسی میں تبدیل ہو جائے۔ کانٹے کی طرح کھٹکتے رہنا مجھے پسند نہیں" وہ دوستوں کے لئے موجب راحت تھا ہم چاہتے تھے کہ افتخار اپنے غیر محدود احسانات کے عوض ہم سے اپنی کسی خواہش کا اظہار کرے لیکن وہ ہر ایسی کوشش کو بار سمجھ کر (باوجودیکہ ہماری انتہائی خواہش یہی ہوتی تھی کہ وہ ہماری خدمات کو قبول کرے) اُس سے گریز کرتا کہا کرتا تھا کہ "جبتک اس عوض معاوضہ کا خیال یکسر نہیں اُٹھ جاتا دوستی حقیقی معنوں میں ظاہر نہیں ہو سکتی" اس کے علاوہ افتخار بے حد ذکی الحس تھا۔ وہ ایک غیر معمولی حساس طبیعت لیکر پیدا ہُوا تھا اور شاید اسی لئے اپنے دوستوں سے کسی کام کے کرنے کو نہ کہتا تھا کہ اگر انھوں نے انکار کر دیا تو وہ "نہیں" کی تاب نہ لا سکیگا۔ کسی ناواقف کے لئے اُس کی زندگی سراسر ہموار اور یکرنگ تھی جس میں نہ نوحۂ غم اور نہ نغمۂ شادی کی آواز سُنائی دیتی تھی لیکن میں جانتا ہوں کہ اُس متین چہرے اور خاموش سینے کے اندر جذبات کا ایک تلاطم برپا تھا اور وہ غالباً عوام کو اُن کے سمجھنے کا اہل نہ خیال کر کے زیادہ تر خاموش رہتا تھا۔ لیکن جب کبھی وہ مجھ سے ملتا تو اُس کے خیالات ایک رُکے ہُوئے دریا کی طرح اُمڈے چلے آتے تھے۔ اور اپنی طویل گفتگو کے دَوران میں وہ شاید بھُول جاتا تھا کہ اُسکا مخاطب بھی اپنے مُنہ میں زبان رکھتا ہے۔ وہ مجھے بولنے کا موقع ہی نہ دیتا تھا۔

افتخار شاعر تھا۔ اگرچہ لساناً شاعر ہونے کا تو اسکو دعوےٰ نہ تھا مگر حساً و فکراً تو یقیناً وہ شاعر تھا۔ وہ موسیقی کا دِلدادہ تھا۔ کہا کرتا تھا "جو شخص گانے کی دِلکشا آواز سے متاثر نہیں ہوتا وہ خطرناک ہے اور اُس سے ڈرنا چاہیئے کیونکہ اُسکے پہلو میں دل کی جگہ پتھر ہے" صبح اور شام کی ہوا خوری میں ناغہ نہ ہونے دیتا تھا۔ صبح کی سیر کے وقت میں اور وہ اکثر اکٹھے ہُوا کرتے تھے۔ بعض اوقات چلتے ہُوئے جب ہم آبادی سے بُہت دُور نکل جاتے تو نہر کا آہستہ بہنے والا پانی جس کے دونوں کناروں پر اونچے اونچے درخت زمردی لباس میں آراستہ شبنم کے قطروں سے لدے ہُوئے دیکھ کر میں کہہ اُٹھتا "افتخار دیکھو کیسا خوش نما منظر ہے" تو وہ مختصر مگر اپنے وارداتِ قلبی کی حقیقی مظہر تقریر کو شروع کر دیتا "واقعی خوشنما منظر ہے لیکن قدرت کا بہترین لباس۔ فطرت کا انتہائی حُسن درختوں کے اِس جھنڈ اور نہر کے آہستہ بہنے والے پانی میں ظاہر نہیں ہُوا۔ دُنیا کی اِن بے مثل خوبصورت جگہوں کو دیکھو جہاں دماغ کو سکون حاصل ہوتا ہے اور طبیعت کی پریشانی کو اطمینان بہم پہنچتا ہے۔ جہاں شاعرانہ جذبات کو حرکت ملتی ہے اور دل میں ایک سرور سی کیفیت پیدا

ہوتی ہے۔ مگر جب تمہارا کثرتِ اشغال سے تھکا ہُوا دماغ اپنی اصلی سطح پر آجائیگا۔ جب تمہاری طبیعت کی بے چینی رفع ہوجائیگی اور جب تمہارا دل سرور سے پُر ہوجائیگا تو پھر بھی تم اُس اطمینان کو نامکمل پاؤ گے اور دیکھو گے کہ تمہارے سرور میں ایک رخنہ ابھی باقی ہے جس کو وہ منظر باوجود اپنی انتہائی خوش نمائی کے بھی پُورا نہیں کرسکا۔ تمہارا قلب مکمل راحت حاصل کرنے کے لئے محتاج ہے ابھی اُس چیز کا جو اس قدرتی منظر سے بھی زیادہ دلفریب ہو۔ جسکا خوشگوار نظارہ تمہاری آنکھوں اور دل کو مسحور کردے اور جس کا حُسن تمہاری طبیعت کی بے چینی کو اس رنگ میں ڈھال دے کہ تم ہزار اطمینان کو اُس بے چینی پر قربان کردو اور ہاں یاد رکھو وہ "عورت" ہے "عورت" ہی حقائق کبریائی کی مظہر ہے "عورت" ہی میں قدرت اپنی پوری دلربائی کے ساتھ ظاہر ہُوئی ہے۔ اور عورت یقیناً عورت ہی فطرت کی اختراعِ فائقہ ہے" اب اُسکی آواز زیادہ پُر زور ہوجاتی مگر وہ کوشش کرتا تھا۔ کہ آواز میں زور کے ساتھ سختی نہ عود کر آئے کیونکہ قدرت کی حسین ترین اور نازک چیز کا ذکر کرتے ہُوئے وہ نرم الفاظ اور نرم ہی لہجہ استعمال کرتا تھا۔ بہار کے موسم میں جب ہر جاندار اور بے جان چیز مخمور ہوتی ہے۔ جب اُس کا حُسن ابتدائی منازل طے کرکے آخری مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ تم باغ میں جاؤ اور دیکھو کہ شگوفے کھِل رہے ہیں۔ کلیاں کھِل کر پھُول بن چکی ہیں مگر اُن پھُولوں کے چہروں پر شباب کے ساتھ اُداسی چھائی ہُوئی ہے۔ وہ متبسّم بھی ہیں اور پریشان بھی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اُنکی حقیقی زندگی مَوت میں پنہاں ہے۔ وہ اسی لئے پیدا ہُوئے ہیں کہ اپنے وجود کو اپنے سے اعلےٰ ہستی پر قربان کرکے اصلی لذتِ حیات حاصل کرلیں۔ پھُولوں کے اُس ہار کو دیکھو جو کسی دوشیزہ کے گلے میں رہ کر مُرجھا گیا ہو سطحی نظر رکھنے والا آدمی کہے گا کہ باغ میں کھِلے ہُوئے پھُول زندہ ہیں اور یہ مرگئے مگر فلسفۂ حیات کا مفسّر انسان جھٹ بول اُٹھیگا "مبارک ہیں یہ پھُول جنہوں نے ایک حسینہ کے گلے میں زندگی کا دَور ختم کیا اور یوں مقصودِ زیست حاصل کرلیا۔ اب یہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں" میں تو جب کبھی پھُول دیکھتا ہوں۔ خوشبو سونگھتا ہوں یا موسیقی سُنتا ہوں تو میرا خیال اُس اعلیٰ وارفع ہستی کی طرف معود کرجاتا ہے جس کے لئے یہ تمام اشیاء پیدا کی گئی ہیں اور جو ان کا مجموعہ ہے یعنی "عورت"

مجھے افتخار کی گفتگو سُننے میں بے انتہا لُطف ملتا تھا۔ اب میں اُس کی اُس رگ سے واقف ہوچکا تھا جس کے چھیڑنے سے وہ ایک طویل تقریر کرنے پر مجبور ہوجاتا۔ وہ اس قدر خوش مزاج تھا۔ کہ باوجود جاننے کے کہ ہمارا مقصد اُسکے خطبۂ بلیغ سے

چنداں فایدہ اُٹھانے کا نہیں تجاہلِ عارفانہ کئے اپنے
لکچر کو جاری رکھتا۔ ہر حسین چیز کو دیکھ کر وہ پھڑک اُٹھتا
تھا۔ لیکن اُس کے حاصل کرنے کے لئے وہ بہت کم
کوشش کرتا۔ کہا کرتا تھا حُسن جہاں بھی ہو دلکش ہے
مگر اُس کی تکمیل صرف عورت ہی میں ہُوئی ہے ؎

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

. . . .

افتخار یوں تو ہم سب کا ہی دوست تھا
مگر مجھ سے اس قدر موانست ہو چکی تھی کہ غیریت کا
کبھی خیال تک نہ آیا تھا۔ بعض اوقات جب وہ
میری کسی بات سے یا کسی فعل سے بہت خوش ہو جاتا
تو کہہ اُٹھتا "مراد! اگر تم دنیا میں پیدا نہ ہوتے یا میں
عدم سے ہستی میں نہ آتا یا اگر پیدا ہُوئے تھے اور ایک
دوسرے سے نہ مل سکتے تو نہیں معلوم زندگی کا یہ بار
کس قدر بوجھل اور ناقابلِ برداشت ہو جاتا۔ قدرت
کو ہماری زندگی خوشگوار بنانا منظور تھی۔ اُس نے
ایک کو بٹالے کی خاک پاک سے اور دوسرے کو
اجمیر کی ارضِ مقدس سے اُٹھا کر کس طرح یکجا کر دیا
زندگی میں ایک دوست کی ضرورت ہوتی ہے وہ
دوست جو دوسرے میں جذب ہو جائے یا دوسرے
کو اپنے میں جذب کرلے۔ جو نوحۂ غم سُن کر اپنی آنکھوں
سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہائے۔ وہ آنسو جو
پریشان قلب کے لئے باعثِ نجات ہوں۔ جو
زندگی کی کٹھن منزل میں اپنے تھکے ہُوئے ساتھی کی
طرف تبسم آمیز نگاہوں سے دیکھے وہ نگاہیں جو
اُس کے کرب و اضطراب کے بادلوں کو پاش پاش
کر دیں اور جو ظلمتِ حیات میں اُس کی مشعلِ راہ
ہوں۔ آہ یہی مشکل ہے۔ زندگی اپنے تمام لذائذِ
دنیوی کے ساتھ ہمارے پیشِ نظر ہے۔ لیکن وہ
ایسا رفیق مہیا کرنے سے عاجز نظر آتی ہے جو اپنی
مصیبت سے ہمارے اس شیریں خواب کو جہاں
ہم حیاتِ مصنوعی کا مزا لے رہے ہیں حقیقت سے
تعبیر کر دے اور جو ہمارے خیالات کے سلسلہ کو
اس خواب سے جاگ اُٹھنے سے پہلے منتشر نہ کردے"
مجھے افتخار کی یہ باتیں سُن کر خیال گذرتا تھا کہ شاید

وہ ابھی تک حقیقی اطمینانِ قلب سے بہت دُور ہے
دُنیا کی خیرہ کُن روشنیوں میں وہ کسی اصلی اور پائدار روشنی
کو تلاش کرنے میں مصروف تھا۔ وہ دوست جس کی
تعریف وہ اِن الفاظ میں کرتا تھا "جو نوحۂ غم سن کر اپنی
آنکھوں سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہائے وہ
آنسو جو پریشان قلب کے لئے باعثِ نجات ہوں"
ابھی اک اُمیدِ موہوم اور خیالِ مبہم سے زیادہ حقیقت
نہ رکھتا تھا۔ یہ باتیں کرتے ہُوئے اُس کے چہرے
سے حسرت نمایاں ہُوا کرتی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ افتخار
کے تمام رازوں میں جو مجھ پر افشا ء تھے ابھی کچھ
حصّہ باقی ہے جس کو ظاہر کرتے ہُوئے وہ رُکتا تھا۔
مُلاقات کے بیشتر حصّہ میں وہ اکثر مجھ سے فلسفۂ محبت
پر بحث کیا کرتا۔ ایک روز جب اُس کے خیالات
غیر معمولی طور پر رقیق ہو رہے تھے میں نے اُس سے
ہمدردانہ لہجے میں کہا اور "افتخار تم شادی کیوں نہیں
کر لیتے؟" وہ آہ! مراد! شادی؟ کس سے ہو۔ کون
ہو سکتا ہے میرے خیالات کو سمجھنے والا؟ کون ہے
میرے جذباتِ اُلفت کا حقیقی آشنا؟ ہندوستانی
تمدن میں جہاں بقول "میر افضل علی" بیویاں لاٹری میں
ملتی ہیں میرا انتخاب کیونکر کچھ وزن رکھ سکتا ہے؟"۔
میں نے کئی دفعہ دیکھا کہ افتخار تنہائی کے اوقات
میں نہایت اطمینان سے بیٹھ کر کاغذ پر کچھ لکھتا ہے
اور پھر پھاڑ دیتا ہے۔ اُس کے چہرے سے اشتیاق
اور حسرت کی علامتیں نظر آتی ہیں مگر میں نے اس کے
متعلق پوچھنے کی کبھی جرأت نہیں کی۔

افتخار اُن دوستوں میں سے نہ تھا جو جدا ہو جانے
پر خطوں کا تانتا باندھ دیتے ہیں اور اشتیاقِ ملاقات
اور دردِ فرقت کے رونے روتے ہیں۔ وہ اگر دوستوں
کے ساتھ زیادہ خط و کتابت کا مخالف نہ تھا تو اسکو
چنداں پسند بھی نہ کرتا تھا۔ میں نے جب اُس سے
اس امر کی شکایت کی تو اُس نے مجھ سے کہا "زیادہ
خطوط لکھنا تو میں عامیانہ مذاق سمجھتا ہوں اور نہ اسمیں
دوستی اور محبت کی پائداری کا ثبوت ملتا ہے۔ قلب
اور روح میں اس قدر صفائی ہونی چاہیئے کہ آنے
والے واقعات کا عکس ایک دوسرے کے قلب
پر پڑ جائے"۔

کالج کی تعلیم میں اُسکا آخری سال تھا موسم گرما
کی طویل تعطیلوں کے بعد جب وہ واپس آیا تو میں نے
دیکھا کہ پہلے سے وہ زیادہ خوش نظر آتا ہے مطالعہ
کے اوقات میں بھی زیادہ مصروف رہتا اور فرصت
کا زیادہ حصہ کمرے میں اکیلا رہ کر گذارتا تھا۔ مجھ سے
اُس کا رویّہ ویسا ہی مخلصانہ تھا۔ مگر گفتگو ویسی یاس انگیز
نہ ہوتی تھی جیسی کہ وہ کرنے کا عادی تھا۔ میں اس
تبدیلی کا سبب دریافت کرنے کی کوشش میں تھا
کہ وہ خود ہی ایک روز اپنے مخصوص عنوان پر
گفتگو کرتا ہُوا کہنے لگا "تم جانتے ہو ہمارے

ہاں شادی کا مسئلہ والدین کے ہاتھوں میں اس طرح سونپ دیا گیا ہے کہ اس میں تبدیلی کی کوشش کرنا گستاخی پر محمول کیا جاتا ہے۔ بیوی کا حقِ انتخاب اُس شخص کے ہاتھ میں نہیں جسے بیوی کی ضرورت ہے بلکہ اس امر کا ٹھیکہ ہماری عورتوں نے لے رکھا ہے۔ وہ اپنے بوسیدہ مذاق اور پستیٔ معیار سے ایسا جوڑا تلاش کرتی ہیں جن کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لئے بجائے خاوند بیوی کے دردسری بن جاتے ہیں ہماری معزز بزرگ خواتین لڑکے کے جذبات کا سمجھنا تو کجا اُس غریب کی رائے تک نہیں سُنتیں۔ اور اگر وہ اُس انتخاب سے جن کی ذمہ دار اُس کی صد سالہ بوڑھی دادی اماں ہیں اختلاف ظاہر کرکے انکار کردے تو بس وہ اپنی اس بیباکی اور بے ادبی کی وجہ سے گردن زدنی قرار دیا جاتا ہے۔ کس قدر شرمناک بات ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ ہماری زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی ہو رہی ہے شادی بیاہ کا مسئلہ ویسا ہی تاریک نظر آرہا ہے لیکن تم خوش ہوگے کہ میں اس اصول سے مستثنےٰ ہوگیا ہوں۔ میرا مستقبل مجھے روشن نظر آرہا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستانی تمدن میں رہ کر یہ میری بڑی کامیابی اور خوش قسمتی ہے،،

میں نے خوش ہوکر استفسارانہ نگاہوں سے پوچھا،، تو اپنی اس غیر معمولی کامیابی کی مفصل کیفیت مجھے سناؤ،، اُس نے لبوں پر ایک عجیب تبسم پیدا کرکے بولنا شروع کیا،، گذشتہ رخصتوں میں والد صاحب نے یہ سوچ کر کہ اس سال کے اخیر میں مَیں فارغ التحصیل ہوجاؤں گا مجھ سے ایک روز علیحدگی میں فرمایا،، دیکھو تمہاری تعلیم کا سلسلہ ایک سال تک ختم ہوجائیگا اور اُس کے بعد تم انشا اللہ برسرِ روزگار ہوگے۔ مجھے تمہاری شادی کی فکر ابھی سے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر تمہارے ایم۔ اے کرنے کے بعد تمہاری شادی کردی جائے تو نہایت مناسب ہوگا۔ میں اُن والدین میں سے نہیں ہوں جو صرف اپنی عارضی خوشی دیکھنے کی غرض سے اولاد کو قبل از وقت شادی کے شکنجے میں کس دیتے ہیں۔ حصولِ تعلیم کے دوران میں شادی کو میں ہمیشہ غیر مفید سمجھتا رہا ہوں اور اب جبکہ تم ماشاء اللہ ہونہار نوجوان ہو تمہاری رائے کو باقی رائوں سے ضروری اور مقدم خیال کرتا ہوں۔ تم جہاں چاہتے ہو مجھ سے کہو میں سلسلہ جنبانی کرنیکو تیار ہوں،، میں اگرچہ بہت آزاد خیال اور آزاد گو تصور کیا جاتا ہوں لیکن اُس وقت میری زبان اپنے دیرینہ مُدّعا کے حصول کے لئے کچھ نہ بول سکی۔ آخر انہوں نے خود ہی کہا کہ،، تم اپنی والدہ کے سامنے اپنی خواہش کا اظہار کردو اور یہی مناسب ہے،، اتنی گفتگو کرچکنے کے بعد افتخار ذرا ستایا اور میرے نزدیک ہو کر رُکتی ہُوئی آواز میں بولا،، میں نے اپنی مرضی کا اظہار کردیا ہے۔ میرا انتخاب منظور ہوا اور

کامیاب ہوچکا ہے ــــــــ" حبیبہ" میری آرزؤں کی انتہا ہے۔ میری راتیں اور میرے دن اب اُسی کی یاد میں کٹتے ہیں۔ ہم ایک دوسرے کو خوش قسمت یقین کرتے ہیں۔ اُس دن کے لئے جو ایک سال کے بعد آنے والا ہے ہم دونوں بیقرار منتظر ہیں۔ ہماری یہ محبت ایک سال کے بعد پائدار ہوجائے گی۔ اور ہم ناقابلِ گُسل استحکام کے ساتھ ایک دوسرے سے وابستہ ہو جائینگے"

افتخار نے جس جانفشانی کے ساتھ طالب علمی کا یہ آخری سال گذارا اُسی کا حصّہ تھا۔ وہ کتابوں کا کیڑا بنا رہا لیکن مجھ سے ملنے میں اُس نے کمی نہیں کی۔ اِمتحان میں جیسی کہ امید تھی وہ اچھے نمبروں پر کامیاب ہُوا۔ فراق کا وقت گذر چکا تھا اب افتخار چند ظاہری دنیوی رسموں کے بعد اپنی "حبیبہ" سے ناقابلِ گُسل استحکام کے ساتھ وابستہ کردیا گیا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد اُس نے مجھے ایک خط میں لکھا "میں نے گوہرِ مقصود پالیا اور اب میری زندگی مالامال ہے۔ "حبیبہ" اور میں زندگی کی اس کٹھن منزل میں ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ وہ اپنی تبسم آمیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ میں فضائے علوی میں پرواز کررہا ہوں۔ "حبیبہ" کا پاک قلب محبت اور وفا سے پُر ہے۔ اُس کی آنکھیں کس قدر حسین ہیں۔ دن بھر کی کوفت کے بعد جب میں واپس گھر میں آتا ہوں تو اُس کی تلطف آمیز آواز میرے کانوں کو ایک حقیقی موسیقی سے لبریز کردیتی ہے اور مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا دماغ اب سو رہا ہے۔ گرمیوں کی پُرفضا شام ہم ایک مختصر سے گھاس کے میدان میں گذارتے ہیں "حبیبہ" اپنی نازک اُنگلیوں سے ہارمونیم کے تاروں کو چھیڑتی ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا موسیقی کا ہی مجسّمہ ہے۔ ہر چیز اپنے انتہائی حسن میں نظر آرہی ہے تعطیل کے روز میں اور حبیبہ سارا دن یکجا رہتے ہیں۔ میری آنکھیں اُسکو دیکھتے ہُوئے نہیں تھکتیں میں نے اکثر تمہارا ذکر کیا ہے۔ تم جلد آؤ میرے مکان کو جواب جنتِ ارضی ہے آکر دیکھو۔ ہماری دلچسپیوں میں آکے حصّہ لو۔ تمہاری آمد ہم دونوں کے لئے موجبِ راحت و اطمینان ہوگی"۔ میں خوش تھا کہ آخرکار افتخار کو وہ رفیقہ میسّر آگئی" جو اپنی آنکھوں سے محبت کے دو قیمتی آنسو بہاکر اُس کے پریشان قلب کو نجات دِلاسکتی ہے" افتخار کی شادی کے بعد میں دو سال تک اُس سے نہ مِلسکا۔ اس عرصہ میں مجھے اُس کے صرف دو خط ہی ملے۔ ان دو سال کے بعد میری اور اُس کی آخری ملاقات انبالہ کے اسٹیشن پر ہُوئی۔ پٹنہ کو جاتے ہُوئے مجھے وہاں پر گاڑی تبدیل کرنی تھی۔ رات کے ۹ بجے میں "کلکتہ میل" سے انبالہ اسٹیشن پر اُترا تو میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا

کہ افتخار وہاں پلیٹ فارم پر ٹہل رہا ہے۔ میں اُس سے عرصہ سے نہ ملا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ راولپنڈی اپنی ملازمت پر ہوگا لیکن اب وہ انبالہ ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر متجسسانہ نگاہوں سے "کلکتہ میل" میں کسی کو تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اُسکو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی مگر اس کے چہرے پر مطمئن مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ وہ آگے بڑھا اور خلافِ معمول بغلگیر ہو کر ملا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور وہ پہلے سے بہت زیادہ لاغر معلوم ہو رہا تھا۔ پہلا سوال اُس سے میں نے یہی کیا "افتخار تم یہاں کیسے آئے اور کس کو ڈھونڈھ رہے ہو؟"

افتخار:۔ "میرے بڑے بھائی یہاں ملازم ہیں اور مجھے اُنکے پاس آئے ہوئے آج بیس روز ہو گئے ہیں"

میں:۔ "تو اسٹیشن پر کس کو تلاش کر رہے ہو؟"

افتخار:۔ "مجھے آج صبح ایسا معلوم ہوا تھا کہ تم یہاں آنے والے ہو۔ دوپہر کی گاڑی تو خالی گئی لیکن اب تم آ گئے۔ اچھا ہوا"

میں نے کہا کہ "میں تو پٹنہ جا رہا ہوں تمہارے پاس ایک گھنٹہ سے زیادہ نہیں ٹھیر سکتا" افتخار نے پُر التجا آنکھوں سے جن میں مجھے آنسو جھلکتے نظر آ رہے تھے میری طرف دیکھا اور کہا "نہیں! آج رات یہیں رہو کل شام کو چلے جانا" میں اپنے میں اتنی جرأت نہ پاتا تھا کہ افتخار کی اس درخواست کو رد کر سکوں۔ آخر اُس نے میرا اسباب اُٹھوا کر باہر تانگے میں رکھوا دیا اور میں بھی بیٹھ گیا۔ راستہ بھر وہ زیادہ تر خاموش ہی رہا۔ مَیں حیران تھا کہ افتخار کو کیا ہو گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی زندگی میں کوئی بہت بڑا اور غیر معمولی اہم واقعہ پیش آیا ہے جس نے اُس کی صحت اور ظاہری حالت میں بڑا نمایاں اور گہرا اثر کیا ہے۔ لیکن میں وہ حادثہ معلوم نہ کر سکتا تھا۔ آدھ گھنٹے میں ہم مکان پر پہنچ گئے۔ افتخار کے بڑے بھائی یہاں ڈپٹی کلکٹر تھے اور افتخار اُنہیں کے پاس ٹھیرا ہوا تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد میں نے افتخار سے کہا "تم بہت لاغر معلوم ہو رہے ہو کیا بیمار ہو؟ تم نے خط تک بھی مجھے نہیں لکھا" افتخار نے ایک مصنوعی تبسم پیدا کر کے کہا "میں بیمار تو نہیں میری صحت اچھی ہے" مگر میں نے دیکھا کہ یہ فقرہ کہتے ہوئے اُسکی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ وہ اُٹھکر ٹہلنے لگا۔ مجھ سے برداشت نہ ہو سکا میں نے اُس کے قریب جا کر اپنا دایاں بازو اُسکے کندھے پر رکھ کر کہا "افتخار! مجھ سے اپنا رازِ دل کہو۔ دیکھو تم مجھ سے کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھا کرتے۔ آج یہ تمہاری کیا حالت ہے؟ خدا کے لئے مجھے اس تذبذب سے نکالو" افتخار نے اپنا پژمردہ چہرہ جو کسی زمانہ میں تمام خوشیوں اور راحتوں کا مرکز ہوا کرتا تھا میری طرف اُٹھایا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بے اختیار ہو کر مجھ سے

لپٹ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا میرا بھی جی بھر آیا۔ افتخار جیسا عزیز دوست اور متحمل مزاج شخص ایسی بے چین حالت میں تھا۔ مگر میں نے ضبط کر کے اُسکو آرام کرسی پر لٹا دیا اور خود بھی اُس کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے اُس کی کمر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے تسلّی دینے کی آواز میں کہا "افتخار تم مجھے کس قدر عزیز ہو۔ بتاؤ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ میرا دل تمہیں اس حالت میں دیکھ کر کڑھ رہا ہے" اُسکی ہچکیاں ابھی تک بند نہ ہُوئی تھیں۔ میرے گلے میں اُس نے اپنی دونوں باہیں ڈالدیں "آہ مراد! میری "حبیبہ" ——— میری "حبیبہ" مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہوگئی" .... مجھے ایسا معلوم ہُوا کہ مجھ پر بجلی گر گئی ہے۔ میرے دماغ میں ایک آگ سی لگ گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل آئے۔ اب میں حیران تھا کہ دل کا بخار کس طرح نکالوں۔ آنسو بہانے میں افتخار کے کرب اور تکلیف میں اضافہ ہوتا تھا۔ مَیں نے سو منٹ کی خاموشی کے بعد پھر سوال کیا "یہ حادثہ کب واقع ہُوا؟ مجھے تو اطلاع تک بھی نہیں دی گئی افتخار تم پر واقعی ظلم ہُوا ہے" اُس نے اپنی آنکھیں جن سے بدستور آنسو جاری تھے میری آنکھوں میں ڈال کر بولنا شروع کیا "آہ ظلم سا ظلم۔ میں تو تباہ ہو گیا۔ میری زندگی ایسی افسردہ ہوگئی ہے جس کو

اب دنیا کی کوئی چیز سرسبز نہیں کر سکتی۔ اِس حادثۂ جانکاہ کو برداشت کرنے کی اب طاقت مجھ میں باقی نہیں رہی اس لئے دُنیا میں زندہ رہنا۔ اور آنے والی مصیبتوں کا مقابلہ کرنا میرے لئے بے حد مشکل ہے۔ قدرت نے "حبیبہ" جیسی عزیز ترین شے مجھے دیکر پھر چھین لی۔ آہ مجھ پر ناقابل برداشت ظلم کیا گیا۔ کاش میں حبیبہ کی رُوح پرور صحبت ہی سے محروم رہتا۔ اے کاش مجھے حبیبہ جیسی عظیم نعمت ہی نہ ملتی اور میں اُس کی محبت ہی سے واقف نہ ہوتا تاکہ اُس کے ضائع ہو جانے کے دلخراش غم سے بھی پالا نہ پڑتا۔ رات کے خاموش اور منجمد اندھیرے میں "حبیبہ" کی رُوح آکر مجھے بلاتی ہے۔ آفتاب کی آتشیں شعاعوں کے ساتھ "حبیبہ" کی روح آکر مجھے وہ وقت یاد دلاتی ہے جب ہم نے آپس میں کبھی نہ جدا ہونے کا وعدہ کیا تھا "حبیبہ" میرے بغیر بے چین ہے۔ اُس کی بے چینی کو رفع کرنے کے لئے میرا دل تڑپتا ہے۔ میں "حبیبہ" کے پاس چلا جاؤنگا۔ بہت جلد چلا جاؤنگا" افتخار کے غمگین الفاظ میرے دل میں نشتر کی طرح چبھ رہے تھے۔ افتخار جو مایوسی کے عالم میں بھی مسرور رہا کرتا تھا اب درحقیقت خشک ہو چکا تھا۔ "حبیبہ" کی جوانا موت سے افتخار پر بہت تکلیف دہ صدمہ ہُوا تھا۔ میں نے پھر پوچھا کہ "حبیبہ کا انتقال

کب ہُوا ؟"

"میری پیاری حبیبہ کا انتقال ؟ ...... تین مہینے ہُوئے جب ہیضہ کی وبا زوروں پر تھی میں نے اور حبیبہ نے ایک روز معمول کے مطابق صبح کا کھانا اکٹھے کھایا۔ میں کچہری چلا گیا۔ مجھے گئے دو گھنٹے نہ گذرے ہونگے کہ نوکر بھاگتا ہُوا آیا اور اُس نے مجھے اطلاع دی کہ حبیبہ کو میرے بعد قے ہُوئی ہے میرے ہوش حواس جاتے رہے اور سٹ پٹا کر میں گھر کو بھاگا۔ دیکھا کہ "حبیبہ" واقعی بیمار ہے۔ میں نے اُسی وقت ڈاکٹر کو بُلوایا۔ ڈاکٹر نے تشخیص کے بعد کہا کہ مرض تو واقعی ہیضہ ہے مگر حملہ اتنا سخت نہیں اُمید ہے جلد صحت ہو جائے گی۔ میری پریشانی کی کوئی حد نہ تھی۔ میں نے اُسی وقت ایک تار حبیبہ کے والد کو اور ایک اپنے گھر دیا۔ رات کی گاڑی سے دونوں تشریف لے آئے۔ حبیبہ کی حالت پہلے سے اچھی نہ تھی۔ طبی امداد جس قدر ممکن ہوسکتی تھی ہم پہنچائی گئی مگر حبیبہ اچھی نہ ہوسکی۔ آہ میں جانتا ہوں وہ رات میری پیاری حبیبہ نے کتنی تکلیف میں گذاری۔ بار بار وہ میرا منہ تکتی تھی اُس کی نظریں کس حسرت سے پُر تھیں۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی مگر شدتِ مرض نے اُس کو عاجز کر دیا تھا۔ صبح چار بجے روشنی نمودار ہونے سے قبل حبیبہ نے آخری دم ہمارے ہاتھوں میں لیا۔ اور مجھے قریب المرگ اور زندہ در گور چھوڑ کر اپنے پروردگار کی طرف چلی گئی"

افتخار کا ضبط رخصت ہو چکا تھا۔ اُس کے آنسو تھمتے نظر نہ آتے تھے۔ میں نے کہا "تم جانتے ہو دُنیا میں مرگ و زیست کا سلسلہ قایم ہے ہر شئے کو جس کا تعلق سفلی طبقہ سے ہے اپنی مقررہ معیاد کے ختم ہونے پر فنا ہونا ہے دُنیا میں کتنے آدمی مر گئے اور کتنے مر رہے ہیں لیکن پھر بھی دنیا قائم ہے اور ہم زندہ ہیں۔ زندگی کی گھڑیاں پوری کرنے سے پہلے کوئی اپنی مرضی سے موت کو نہیں بلا سکتا "حبیبہ" کی یاد کو اپنے سینہ کی تمام وسعت میں جگہ دیئے رکھو اور جبتک کہ حبیبہ تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہے اپنے تئیں اس قابل بنانے کی کوشش میں مصروف رہو کہ اس عارضی فراق کے بعد تمہیں اُس سے ایسا دائمی وصال نصیب ہو کہ اُن مسرتوں اور راحتوں میں موت اور جُدائی کا خیال آکر پریشان نہ کر سکے"

افتخار نے ایک سرد آہ بھر کر کہا "یہ عقلی دلائل ہیں ان کو جذبات سے کیا تعلق میری "حبیبہ" اور میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ حبیبہ میرے انتظار میں چشم براہ ہے وہ زیادہ دیر میری منتظر نہ رہیگی۔ میں اب اُسکے پاس پہنچنے کی بہت جلد کوشش کروں گا۔

اس دنیا کی دلچسپیاں میرے لئے اس وقت سے فنا ہو چکی ہیں جب سے "حبیبہ" مجھ سے چھین لی گئی"

افتخار کا بدن لرز رہا تھا۔ الفاظ اُس کے منہ سے اس طرح نکل رہے تھے گویا وہ اُنکے مفہوم سے بے خبر ہے۔ اگر میں گفتگو کو اور طول دیتا تو یقیناً اُس کی حالت میں اور زیادہ رقت پیدا ہو جاتی۔ رات بہت گذر چکی تھی۔ میں نے یہی مناسب سمجھ کر کہ اب افتخار کو آرام کرنا چاہیئے کہا "اب سو رہیں"۔ وہ بغیر جواب دیئے چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند تو مفقود ہو چکی تھی۔ دو تین گھنٹے جو باقی تھے میں نے افتخار کی پریشانی کے متعلق سوچتے سوچتے کاٹ دئے۔ اگلے روز شام کی گاڑی سے مجھے ایک نہایت ضروری کام کی انجام دہی کے لئے پٹنہ جانا تھا۔ اگر وہ کام بہت ضروری نہ ہوتا تو میں افتخار کو ہرگز نہ چھوڑتا۔ شام کو وہ میرے ساتھ اسٹیشن پر آیا۔ جدا ہوتے وقت کہنے لگا "اپنے افتخار سے آخری بار مل لو ممکن ہے اسکے بعد میرا خیال ہی تمہارے دل میں رہے اور میں نہ رہوں"۔ میں نے اُس کو تسلی بخش آواز میں جواب دیا۔ "ایسی اُمید سوز باتیں نہ کرو۔ چونکہ تم کچھ عرصے کے لئے انبالہ ہی میں رہو گے اس لئے میں واپسی پر تمہیں یہیں ملوں گا"۔ اُس نے آہستہ آواز میں کہا "خدا ایسا ہی کرے"۔

مجھے پٹنہ میں ایک مہینے سے زیادہ قیام کرنا تھا۔ ہر وقت افتخار کا خیال میرے دماغ میں رہتا تھا۔ اُس کی طبیعت کا سکون غائب ہو چکا تھا۔ اور مجھے ڈر تھا کہ اس مایوسی اور وارفتگی کے عالم میں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ پٹنہ میں مجھے تین ہفتہ ہو چکے تھے۔ ایک روز جب میں باہر سے آیا تو نوکر نے ایک ملفوف خط میرے حوالے کیا۔ یہ خط افتخار کا تھا۔ بڑا مختصر تھا مگر اُس کے اختصار نے میرے حواس معطل کر دئے۔ میرے دل و دماغ میں ایک آگ سی لگ گئی۔ لکھا تھا۔

"دو بڑی کوشش کرتا ہوں کہ تمہارے درمیان میں رہ کر کھوئے ہوئے اطمینان کو حاصل کرلوں مگر ہر قدم جو آگے اُٹھاتا ہوں مجھے ایک ایسے مہیب اور خطرناک غار کی طرف لئے جاتا ہے جس کا تصور ہی یقین دلا رہا ہے کہ اطمینان کا حاصل کرنا اسی میں ہے کہ اپنی کوششوں کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دوں۔ میں اگر تم میں رہا بھی تو تمہارے ایام حیات کو غمگین بنانے کے لئے میرے حواس زائل ہو چکے ہیں . . . . . .

"حبیبہ" دونوں ہاتھ پھیلائے مجھے لینے کے لئے تیار کھڑی ہے۔ "حبیبہ" کے ملاپ پر میں ہزاروں زندگیاں قربان کرتا ہوں۔ میری رہائی اب کسی سے ممکن نہیں۔ تم سے ملنے کا آرزومند ہوں مگر مل نہیں سکوں گا۔ میرے لئے دعا مت کرو

کہ اب دعا کا وقت گذر چکا ہے۔ تمہاری زندگی خوشگوار ہو۔ میرے خیال کو بھلا دو کیونکہ اب اُسکا رکھنا فضول ہے۔ یہ خط میری محبت اور عقیدت کی آخری قسط ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہو۔ الوداع ......

تمہارا افتخار

اس خط کے ملنے کے پانچویں روز بعد میں اپنے کام کو نامکمل چھوڑ کر واپس انبالہ لوٹا اور سیدھا افتخار کے مکان پر گیا تو معلوم ہُوا کہ آج چار روز ہُوئے وہ شام کے وقت سیر کی غرض سے باہر گیا تھا اور پھر واپس نہیں آیا۔ اُن تمام مقامات پر جہاں اُس کا جانا گمان کیا جا سکتا تھا میں گھنٹوں اُس کی تلاش میں سرگرداں رہا ہوں مگر کچھ پتہ نہیں چلا۔ اُس کے باقی دوستوں نے جنکو وہ میری طرح عزیز تھا اس تلاشِ لاحاصل میں کچھ کمی نہیں کی مگر افتخار اب ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ ہم سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو گیا ہے۔

آہ! افتخار تم کہاں ہو؟۔ اگر ابھی پیکارِ حیات میں وار کرنے اور وار کھانے کے لئے زندہ موجود ہو تو آؤ ہم پروار کرو کیونکہ ہماری زندگی کی لذت بھی تمہارے وار کھانے ہی میں ہے۔ اگر ابھی دنیا کے اِس بے پایاں شور وغل میں تم حیات میں موت کا مزا چکھ رہے ہو تو آؤ ہماری انتہائی کوششیں تمہارے لبوں پر تبسم۔ تمہاری آنکھوں میں نور اور تمہارے دل میں سرور پیدا کرنے پر خرچ ہونگی۔ اور اگر تم حیات کی قید و بند سے آزاد ہو چکے ہو تو خدا کرے تمہاری روح کو ابدی راحت نصیب ہو۔ ہماری دعائیں تم تک پہنچتی رہیں۔ تمہاری روح جو دنیاوی اطمینان سے مایوس ہو کر گئی تھی خدا کرے اپنی "حبیبہ" سے مل کر ایسا اطمینان حاصل کرے کہ دنیا کے لاکھ اطمینان اُس پر قربان ہوں۔ آمین!

عاشق حسین بٹالوی

مجھے یقین ہے کہ اگر میں نہیں تو میرے بعد آنیوالے بچے ضرور اس دن کا مُنہ دیکھینگے جبکہ سائنس کے ابتدائی قاعدوں اور اصولوں کی لاعلمی مذہبی قوانین اور اصولوں کی لاعلمی کے بعد سب سے بڑی کمزوری تصور کیجائیگی۔ (سی کنگزلے)

جستجو اور معنی:۔ سائنس کا کسی خاص قسم کے خیالات کا پابند ہونا اُسکے لئے خودکشی ہے۔ (ہکزلے)

ایک صدی کی فلاسفی آئندہ صدی کی فہم عامہ بن جاتی ہے۔ (ایچ۔ ڈبلیو۔ بیچر)

ریاض احمد بی اے انبالوی

ندرتِ ذوق و نظر

(۴)

مظہر، رشید کا اک ایسا مزاجدان اور ادا شناس دوست ہے کہ قدرت بہت کم، خوش نصیبوں کو ایسے دوست عطا کرتی ہے، متین ہے شائستہ ہے ظریف بھی، اسی کو اس بات کا جملہ احباب میں فخر حاصل ہے کہ رشید اس درجہ وحشت و رمیدگی کے باوصف اکثر اوقات گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھا رہتا ہے، اُس کے مزاج میں اگر کچھ درخور حاصل ہے تو مظہر ہی کو، اگر کسی کو اُس کی طبیعت کے آداب سے واقفیت کا دعوےٰ ہے تو مظہر ہی کو۔

پچھلے دنوں میں ایک مرتبہ رشید کو پھر چپ لگی، احباب پر رشید کی خموشی کی طوالت اور شدت بے حد شاق گذر رہی تھی مگر تدبیر کسی سے کچھ بن نہ پڑتی تھی، آخر مظہر ہی کو مجبوراً مائلِ سعی کیا اور وہ کامیاب ہُوا ــــ۔

اُن ہی دنوں میں سے ایک دن، ابھی رشید، مغموم و دل ریش کہیں سے آیا، اور ابھی آکے بیٹھا ہی تھا کہ مظہر نے کہا "رشید! افسوس کیجئے مجھے میرے بزرگوں سے نویدِ ازدواج ملی ہے، میں جانتا ہوں اس خبر سے تمہیں الم ہی ہوگا مگر شاید تمہارے ملال میں یہ سُن کر کچھ کمی واقع ہو کہ صنفِ لطیف و نازک کے جس فرد کو میری مسرت کی شرکت کے لئے منتخب کیا ہے وہ یکسر حسن اور مجسمۂ نسائیت ہے، مجھے تمہارے اتباعِ تجرّد کے ترکِ عمل سے شرمندگی ہوگی، اگرچہ اختلاف نہیں۔ مگر کیا کروں اعزا کے حکم سے انحراف کی مجھے قطعاً جرأت نہیں ہوتی، رشید بتاؤ کیا کروں ــــ"

ہم سب نے دیکھا رشید بیتاب ہوگیا، اُس نے پہلے حیرت سے مظہر کو دیکھا اور پھر نہایت مایوسی کے ساتھ بولا ــــ "ہائے کیسا عبرت خیز زمانہ آگیا کہ نسائیت اور عصمت دنیا پر وبال ہوگئی، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حسنِ نسائیت، اور جمالِ دوشیزگی، اپنی مثال فردوس کے گوشوں میں تلاش کرے، دنیا اب شاید اس نوع کی تہذیب و تحسین کے جواب سے عاجز ہو جائیگی!

مظہر، تمہاری شادی کیجاتی ہے اور کہتے ہو اک عفیفہ تمہارے لطفِ ازدواجی کے لئے منتخب کیجا چکی ــــ میں نے تم کو پیکرِ وقارِ تعقل سمجھا تھا، سُنایا جاتا ہے لڑکی بھی مجسمۂ جمالِ نسائیت ہے، مگر حیف کہ نہ تم سے نسائیت کا احیاء ممکن ہُوا، اور نہ لڑکی سے ایثارِ شباب و دوشیزگی بن پڑا، تم خیال کی لذت سے مغلوب اور وہ ذکی الحس ہونے پر بھی خاموش، ہائے کیا غضب ہے ــــ"

ایک حور آسمان سے بہ کمالِ رعنائی، زمین پر اتری

اور اس مادیت آبادِ ارضی سے ذرا اونچے ہی اونچے معلق ہو کر رہ گئی، اُس کا نام اِس عالم میں نسائیت ہُوا تھا، اور یہ شے عام سطحِ عورت سے اک بلند تر چیز تھی، لیکن اب دیکھا جا رہا ہے کہ شاید حُسنِ نسائیت اس دُنیا سے رخصت ہو جائیگا اس لئے کہ اُس کے پرستار اُس سے نہایت بے اعتنائی کے ساتھ افسوس کہ مُنہ موڑنے لگے!"

جمالِ عصمت و دوشیزگی جو استعمالِ غیر سے بیگانہ و اجنبی ہے اپنی طہارت عزیز دلفریبیوں کے ساتھ اس عالمِ ویران کی زینت ہُوا تھا مگر حیف کہ اب عنان گیرِ لذت ہو رہا ہے اس لئے کہ دُنیا میں درندگی و بہیمیت کا دور دَورہ ہے ——"

مظہر! اس نوع کی پاسائی نکہت سے تمہارے ذوق کی جراحت کا سامان فراہم ہوگا، اور یاد رکھو عمل کی اس لغزش سے تم اپنی رُوح کی شگفتگی کو گنوا بیٹھو گے اور پھر ساری عمر تلاش کرو گے مگر یہ شے میسر نہ آئیگی!

آج وہ غریب لڑکی، اپنے حُسنِ لطافت اور وقارِ صنمیت کو ضائع کر رہی ہے مگر زندگی کے آنے والے دَور میں جب وہ امن و شاہزادگی کو اپنے ساتھ نہ دیکھیگی تو محسوس کریگی کہ اُس نے کیا چیز کھو دی ——!"

مظہر نے دیکھا کہ رشید اب محوِ جذبات و تقریر ہو گیا اور ذوقِ گویائی اُس کی ہر ادا سے ظاہر ہونے لگا تو اُس نے عمداً ایسے عنوان کی جانب رشید کو دعوتِ تکلم دی، جو اُس کے جاذبیتِ ذوق کا اور لطفِ سخن سرائی کا واحد ذریعہ ہے۔

مظہر نے کہا، رشید! ہماری نادانیوں پر دل نہ دُکھائیے، اگر ہم آپ سے کچھ دریافت کریں تو ہمارے استفسارات کے جواب میں آپ اک خندۂ مضحک نہ ہو جائیں، ہم بے وقوف سہی اور سب کچھ، مگر اصُولاً آپ اپنی تقریر کے وضوح پر مجبور ہیں، معاف فرمائیں اگر ہم آپ سے یہ کہیں کہ ابھی ہم نسائیت اور عورت کے اُس خاص فرق و امتیاز کو نہیں سمجھے جو جناب کے وظائفِ ادبی کا اک جزوِ غیر منفک ہے، صورت یہ ہے کہ کسی سنگین ستون، کسی قامتِ چوبین کو اک رنگین، ریشمی ساڑھی باندھ دیجئے آپ بیتابِ جذبات ہو جائینگے اور فوراً آپکی ادبیت کی سرکار سے پیکرِ نسائیت کا پاکیزہ خطاب عطا ہو جائیگا ——"

موسمِ برشگال ہے، گھنگھور گھٹائیں ہیں، میں نے بارہا دیکھا ہے، سُنا ہے کہ آپ کسی سبزہ زار سے گذرے ہیں، آپ نے قدرت کی عجوبہ ترین مخلوق تیتریاں اُڑتی ہُوئی دیکھیں، اور آپ پر قیامت چھا گئی، مست ہیں پُرکیف ہیں اور بقولِ خود۔ رقصِ نسائیت دیکھ رہے ہیں!"

آپ شملے جا رہے ہیں اور میں معیتِ سفر سے مشرف ہوں، اب جناب کالکا سے جو کھڑکی سے منہ باہر نکال کر بیٹھے تو چھ ساڑھے چھ گھنٹے کامل بیت گئے

نہ کچھ منہ سے بولتے ہیں اور نہ مجھے دیکھتے ہیں، بات کیا نکلی
کہ گاڑی جب گھوم پر مڑتی ہے، جب قینچی پر آ کر کٹتی
ہے تو حضور کو رفتار کا یہ انداز بہت لطف دے رہا
تھا، قہرمانِ دخانی کی یہ موجِ خرام، جناب کے خیال
میں آتشیں پھول کتر رہی تھی، پوچھا کیوں صاحب!
کیا اس میں بھی نسائیت کا دخل ہے تو ارشاد ہوا
ہاں اس میں تو نسائیت کا بہت ہی دخل ہے!"

سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ کے دروازے میں
کوئی یورپین لڑکی اپنے دونوں ہاتھوں سے دروازے
کے بالائی حصے کو اک لااوبالیانہ انداز سے تھامے
کھڑی ہے، حضور ہیں کہ اِدھر اُدھر اُس کے یوں ہی
سگرٹ جلاتے اور دھواں اُڑاتے پھر رہے ہیں،
پوچھا جاتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے دیکھو یہ ہے استغنائے
نسائیت ــــ!"

مصوری میں شملے میں کوئی لیڈی رائڈنگ ڈریس
میں گھوڑے پر سوار ہے اور گھوڑا تیز رفتار سے پہاڑ
کے نشیب و فراز کو طے کر رہا ہو اور اُس سے نسوانی ساخت
کے اقتضا سے سوار کے جسمِ نازک میں کچھ لوچ اور
لہر پیدا ہو رہی ہو، جناب ہیں کہ مٹ رہے ہیں۔
کبھی وقارِ رواں کہتے ہیں کبھی ارتعاشِ شعاع کہتے
ہیں، کبھی جنبشِ شاخسار فرماتے ہیں اور کبھی ترنمِ موج
ــــ آخر یہ نسائیت ہے کیا بلائے بے درماں؟

میرے خیال میں تو رشید تمہارے التفاتِ نظر
اور انجذابِ ذوق کا کوئی خاص معیار نہیں ہے کبھی تو
نسائیت اور عورت بالکل مترادف المعنیٰ بتاتے ہو
اور کبھی اُس کا علو ہمسرِ ملکوتیت ہے، کبھی اُسکو سراپا
اک لذت قرار دیدیتے ہو اور کبھی یکسر نکہتِ گل،
کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مرد کی آغوش میں
اُس کے لئے ایک گدگدی پیدا کرنا چاہتے ہیں اور
کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ نہیں جنسِ کرخت کی پیشانیوں
کو اُس کے حضور صرفِ سجدہ ہو جانے کی تعلیم ہے ــــ"

میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا کبھی اس عالم میں
نسائیت اور عورت کا امتزاجِ خمیر ہوا ہے ــــ؟
اور اگر ہوا ہے تو کیا وہ برکت ازدواجی سے محروم
رہی ہے؟"

ایسی نسائیت جس کو درجۂ ملکوتیت تک آپ
سراہتے ہیں اور جس کی پرستش، پرستش کی تحریک و
تبلیغ آپ نے اپنی زندگی کا نصب العین قرار دے
رکھا ہے، کیا بتا سکتے ہیں کہ آپکی یہ سعی، فطرتِ صالحہ کے
خلاف نہیں ہے، اور اس سے منشائے تخلیقِ نسوانی
کی توہین تو نہیں ہوتی ــــ"

ایسی عورت جس میں نسائیت کا عنصر غالب
ہو آپ کیوں اُس کے واسطے مسرتِ ازدواج جائز
نہیں رکھتے۔ حالانکہ اک نسائیت سے معمور مظہرِ لطافت،
عورت آپ کے نزدیک محبت کے قابل ضرور ہے،
پھر محبت کے پاکبازانہ مقاصد بغیر عقد کئے، کسی

شریف عورت سے کوئی مرد کیونکر حاصل کرسکتا ہے"؟!

رشید حقیقت یہ ہے تمہارا عروج نظر امکان وسعی کی حد سے بالاتر ہے آپ دیکھتے اُس کو ہیں۔ جہاں سے ہمیشہ نظریں تھک تھک کر مایوس ہو ہوکر لوٹ آئیں۔ کہتے آپ اُس سے ہیں کچھ، جو یا تو سنتا ہی نہیں، یا اگر سنتا ہے تو کم سے کم آپکی آوازوں کو قابلِ التفات نہیں سمجھتا، اگر ایسی ہی اچھوتی دلکشی کا نام نسائیت ہے کہ جو کبھی میسر ہی نہ آسکے تو یقیناً آپ جیتے اور ہم ہارے نہ کبھی یہ کسی کو نصیب ہوگی اور نہ آپ کے مقرر کردہ معیارِ نسائیت کا کبھی تجزیہ ہوگا ——"

مظہر تم نے خوب کیا جو میرے سکونِ فراغت کے درپے غارت ہوئے، تم نے اچھا کیا جو میرے جذبات کی بیکسی و مایوسی سے تمسخر و استہزا برتا، مجھے تو اس دنیا کے ہر گوشے سے بوئے بیگانگی آتی ہے۔ دوستوں کی اجنبیت سے اگر لطف اندوز نہ ہوتا تو اک نوع کی لذت سے محروم جاتا، خدا کا شکر ہے مجھے تمہارے ہی خوانِ کرم پر دعوۃِ رسوائی عطا ہوئی، شبانہ روز کی یکجائی، ایسا قرب و اتحاد۔ اُس پر کچھ آپکی جانب سے ایسی جراحت ریز نمک افشانیاں واللہ میرے زخموں کا منہ نہیں جو اظہارِ شکریہ کرسکیں" حقیقت میں، میرے ہم خیال، میرے ہم نوا اگر اس دنیا میں مجھے ڈھونڈے نہ ملیں تو مجھے قطعاً متاسف نہیں ہونا چاہیئے۔ میرے ہذیانِ محبت کو اگر جماعتِ انسانی کے بعض خوش مذاق افراد مہمل کہیں تو مجھے ہرگز متالم نہ ہونا چاہیئے اس لئے کہ قدرت نے نعمتِ بصیرت و بصارت کے خزائن کو وقفِ عام نہیں کیا ہے، مجھے کب آرزو ہوئی کہ جو کچھ میں کہوں اسکو آپ لوگ باوجود سعی وکوشش کے، سمجھتے چلے جائیں۔ مجھے ہی اسکی کب تمنا ہے کہ میری لطافتِ حس آپکی بے بہرہ شانِ تعقل کا طواف کرتی پھرے، ہر چند کہ تم سے اب نزاکتِ ذوق وفہم کی توقع تو قطع ہو چکی ہے مگر میں احیائے حقیقت کے لئے عجز کا الزام برداشت نہیں کرونگا آپ کے اعتراضات اور تلمیحات کے لایعنی انبار میں سے کچھ بھی نظر انداز نہ کرونگا اور اک اک بات کا جواب دونگا"

آپکا عنوانِ مزخرافات، نسائیت اور عورت کے فرق وامتیاز کی دریافت ہے، ایسے لوگ جو شاخوں پر سے شاداب پھولوں کو بلا تکلف توڑ لیں اور مٹھیوں میں بھینچ کر سونگھنے کھڑے ہو جائیں، اُس کے مقابلے میں، جو شاخ ہی پر پھول کی شادابی و شگفتگی کو دیکھتا ہے اور گھنٹوں اُس کے طلسمِ رنگ و بو پر غور کیا کرتا ہے، کیا حق حاصل ہے جو دعوائے خوش مذاقی کریں۔ نازک ترین سوالات کرنے سے آدمی خوش ذوق نہیں بن جاتا۔ اُس میں لطافتِ حس ہونی چاہیئے۔

تم خود غور کرلو دنیا میں واثرِ ذی عمل کے کس قدر نقوش ہیں اور کس کس سے متعلق ہیں، تم نسائیت اور عورت کا فرق دریافت کرنے ہو۔"

مظہر: نسائیت اک آئینہ ہے کہ جسکو ہم دیکھتے اور لطفِ نظارہ اُٹھاتے ہیں مگر اُس میں ہمارا عکس مرتسم ہوکر رہ نہیں جاتا۔ بخلاف اس کے عورت بالکل بلاٹنگ پیپر کے اسلوب پر واقع ہوئی ہے کہ ذرا سے اتصال پر تمام نقوش مادی اُس میں منتقل ہوجاتے ہیں ـــــ نسائیت، اک ساکن سطح آب ہے مُصفا، ہم جس میں عکس پذیر ہوسکتے ہیں مگر دامن تر نہیں ہوسکتے، برعکس اس کے عورت سراسر بارانِ لذت و اتصال ہے کہ آدمی کو تردامن بنا دیتی ہے ـــــ !!"

اگر تم اپنے ذہن میں اس نازک سے فرق کو محفوظ کرلوگے تو کبھی پھر تمہارے ذوق کو شُبہ سے واسطہ نہ پڑیگا ـــــ دیکھو،

تم نے اپنی دانست میں میرے ذوق کا یہ کہکر مضحکہ اُڑایا ہے کہ کسی سنگین ستون، کسی مجسمۂ چوبین کو ایک رنگین ساڑھی باندھ دی جائے تو میں اس کو پیکر نسائیت کہدیتا ہوں، مجھے بھی اس سے انکار نہیں بیشک یہ صورت پیکر نسائیت ہی کہنے کی سزاوار ہے شک ہے میں نے کبھی مجسمۂ عورت تو نہیں کہدیا ہے پیکرِ سنگین، مجسمۂ چوبین اپنے اندر مفاسدِ مادیت نہیں رکھتے پس لباس کی قطع، کپڑے کی وضع اور رنگ کی نزاکت باقی رہی، اگر ریشم اور رنگ کی ترکیب کو میں نے اسٹیچو، پر دیکھ کر پیکرِ نسائیت کہدیا تو کیا ظلم کیا۔ بسا اوقات یہی ملبوس، یہی رنگ، یہی ریشم جب کسی خاص جسم پر دیکھے جاتے ہیں، تو عنوان بدل جاتا ہے، اسکو تزئین اور عورت، عورت اور امارت کہا جائیگا۔ پیکرِ نسائیت نہیں، افسوس پیکرِ نسائیت کہنے میں جو میرے طہارتِ ذوق کی رعایت تھی اُس کی تم نے ذرا پروا نہ کی!"

برسات کے موسم میں گھنگھور گھٹائیں ہیں اور رنگین تیتریاں باغوں میں، سبزہ زاروں میں اُڑتی پھرتی ہیں، میں قوس قزح کے اس نیرنگ کو اور کرن کی اس جھمک کو اگر رقصِ نسائیت سے تعبیر کرتا ہوں تو تم میرا منہ کیا تکتے ہو، اپنا سر پیٹو۔ اپنے ذوقِ محاکات کا ماتم کرو۔ تم نے آجتک نسائیت کو عورت سے علیحدہ کرکے دیکھنے کی، سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، رنگ اور ارتعاش کے اس مجموعے کو رقصِ نسائیت کہنا جس بلاغتِ ذوق کا شیوہ ہے افسوس اُس کی تم کو ہوا ہی نہیں لگی ـــــ"

اگر گاڑی کا پیچ و خمِ رفتار، مجھے بھاتا ہے اور میں خرامِ ناز کے لوچ سے اس کو عبارت کرتا ہوں تو آپکو اچنبھا کیوں ہے، کاش تمہاری نظر سے رفتار کی کچھ نزاکتیں گذر لیتیں۔

سیکنڈ کلاس گاڑی کے دروازے میں اک

تمثالِ حسن یورپ کو دیکھا کہ دروازے میں دونوں ہاتھ اُٹھائے کھڑی ہے اور اِدھر اُدھر دیکھ رہی ہے میں نے لاریب کہ اُسکے حسنِ تماشا زا کو دیکھا، تم سگرٹ کو سُلگاتے دُھواں اُڑاتے پھرتے رہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ تم حسن کے حضور نمائشِ ملبوس و امارت اور نشرِ ہوس و انگریزیت کر رہے ہو۔ میں نے اگر اس عدمِ التفات و توجہ کی علت غائی کو پوچھا اور اُس کو وقارِ نسوانی اور استغنائے نسائیت کہا تو کیا غلط کہا؟"

میں نے اُسکی آنکھوں کی کیفیتِ احتراز و استکراہ کو دیکھا یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ تو سخن سرا ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ ہم پیمانۂ حور ہیں ہم ساغرِ ملک ہیں اے مادیت پرست تیرے لب و حلقوم کی تشنگی کہیں اور جا کر رفع ہو، میری عرضِ استغنائے نسائیت کا تو یہ خلاصہ تھا تم کیا سمجھا ——"

عورت جب گھوڑے پر سوار ہوتی ہے۔ تو پھر وہ عورت نہیں رہتی۔ اُسکی تبدیلیٔ ہیئت و لباس اس حُس کا بھید ہے کہ وہ اس وقت مادیت نسوانی سے بیزار و گریزاں ہے، مظہر غور فرماؤ خدا کے لئے سمجھو، عورت جب اپنی خلقت کے مقصدِ مادی سے علیحدہ ہوگئی تو پھر وہ یکسر نسائیت نہ ہوگئی تو کیا ہوئی۔ آہ وہ دقار رواں ہے ضیا، اور برق کی ترکیبِ اجمل ہے، کوئی شک نہیں وہ ارتعاشِ شعاع ہے۔ نسیم اور نکہتِ گل کے اتحاد کو شاخسار کی اک جنبشِ بے اختیار ہی کہا جا سکتا ہے نسوانی تخلیق کے سیلاب لطافت میں یہ عقدہ ہائے یاسمینی ترنم موج و حباب ہی کے سے پاکیزہ عنوانات کے حقدار ہیں ——"

مظہر! تم تو شاید یہ چاہتے تھے کہ سنگین ستونوں اور چوبیں مجسموں میں سے کسی عنوان سہی عورت پیدا کی جاتی —— تیتری کے عُریانی رقص کو لذتِ مادی قرار دیا جا سکتا —— "ریل کے دروازہ میں عورت کو دیکھا، اُس کے عدمِ التفات کو کیوں نہ غمزۂ دل طلب ثابت کیا، شملہ ریلوے لائن کے پیچ و خم میں نسائیت کا ذکر عبث ٹھیرا، آرزو تو یہ تھی کہ محض انجینرنگ ترقی اور میکانیکل فروغ کو سراہا جاتا ——"

صنفِ نازک کے کسی فرد کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر مجھے نسائیت کے بیان کا کیوں موقع ملا ——"

حالانکہ مظہر میں نے بارہا کہا ہے کہ نسائیت۔ اور عورت کے فرق کو ہر لحہ ملحوظ رکھو مگر تم نے ہمیشہ تنزلِ مادی اور علو، روحانی کی طنابیں ملانی چاہئیں —— چوبین مجسموں پر ساڑھی کی زیبائش کو میں نے پیکرِ نسائیت کہا، اچھا تم ہی کہو کیا ستون سنگین سے تم شادی کر سکتے ہو؟

تیتریوں کے اُڑنے، ناچنے کو رقصِ نسائیت کہا پاکیزگیٔ ذوق کا یہی اقتضاء تھا، مجھے بتاؤ نیرنگِ لون سے مناکحت کر لو گے؟ ریل کے پیچ و خم میں میں نے

نسائیت محسوس کی حقِ محاکات ادا کیا، تم اسکی تردید کرسکتے ہو مجھے اسی خم و پیچ محض سے تعلقِ ازدواج کرکے دکھاؤ؟ تب یہ چیزیں مجبور ازدواج نہیں ہیں تو پیارے دوست! میں حقِ اظہارِ نسائیت سے عہدہ برا ہوگیا! سیکنڈ کلاس گاڑی کے دروازے میں کسی لڑکی کے تہذیب نظارہ اور اندازِ تماشا کے لئے اگر میں نے استغنائے نسائیت کا عنوان تراشا تو آپ کو غور کرنا چاہیئے تھا کہ میں نے اُس لڑکی کی کونسی جمیل جس کو اپنے عنوان کا ماخذ ٹھیرایا میں نے لڑکی کے دیکھنے کی ادا کو مستقل اک شئے فرض کیا اُس کی حس کی بلندی کو علیحدہ اک جسم دیا۔ اور اُسکے تمام مادیت معمور اثاثۂ شباب میں سے میں نے صرف اُس وقت اُسکی اُس ادائے سادہ و پاک کو لیا، جس میں حقیقتہً تمہارے اضطرابِ شباب کے مقابلہ میں سچی نسائیت و ملکوتیت پیدا تھی۔ اس لئے میں نے بالکل صحیح طور پر اُس کے دیکھنے کو، اس طرح دیکھنے کو کہ وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی، دیکھا۔ دیکھنے والے اُس کے سارے متاعِ حسن و شباب کو دیکھ رہے تھے مگر اس سے غافل تھے کہ یہ لڑکی، حسن کا یہ سب کچھ ہوتے ہوئے ابھی وہ اور کچھ اگر ہے، تو کیا ہے ——،

عین اُس وقت جبکہ موجودہ سب کچھ سے الگ، وہ کچھ اور تھی، میں نے دیکھا اور وہ اُس کا صرف یہ سادہ و بے لوث دیکھنا تھا —— کہ جسکو یکسر استغنائے نسائیت ہی کہا جا سکتا ہے اور کچھ نہیں"

میں نے شملہ میں مصوری میں اگر کسی لیڈی کو گھوڑے پر سوار دیکھ کر چند مقدمات ادبیہ کے تحت میں اُسکو وقار رواں، ارتعاشِ شعاع، جنبش شاخسار ترنمِ موج کہا۔ تو بالکل صحیح کہا۔ ان میں سے کسی میں بھی اگر مادیت کی گنجائش ہے تو مجھے جھٹلا دو ——"

کیا کہا! نسائیت ہے کیا بلائے بے درمان ؟"

ہاں ایسے مرمریں بت جو گدازِ حس سے محروم ہیں۔ ایسے پہلو انسانیت کے جو دھڑکن کے مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ ایسی آنکھیں جو نمِ محبت سے ناواقف ہیں وہ وارفتگانِ زلیست کے وظائف کو ہرگز نہیں جان سکتیں۔ دل کے دُکھ جانے کا معاملہ وہ دل نہیں جانتے جو کبھی ٹوٹے نہ ہوں، حیاتِ یاس و الم کی کیفیات وہ زندگیاں نہیں سمجھ سکتیں جو تنعم و تعیش سے علاقہ رکھتی ہیں، نسائیت وہ داروئے غم ہے جس کی تلاش میں کائنات کا ذرہ ذرہ بیتابِ جستجو ہے۔

یہانتک جواب تھا آپکی تقریر کے اُس حصہ کا جسکو محض لطافتِ تخیل کہا جا سکتا ہے اس سے آگے آپ نے معتقداتِ مذہبی سے کام لیا ہے۔ اور افسوس اس نوع کی سنجیدگی کا احترام میں اپنی خاموشی سے بجالاؤنگا —— تاہم اعتقادی جذبہ کو ٹھیس پہنچائے بغیر جس قدر مجھ سے ممکن ہے عرض کرونگا۔

آپ میرے التفاتِ نظر و انجذاب ذوق کا
کوئی خاص معیار تسلیم نہیں فرماتے مگر آپکی تقریر کا ہر جزو
میرے افکار و اجتہاد کی اہمیت کو تسلیم کر رہا ہے۔ آپ
کہتے ہیں تم نسائیت اور عورت کو مترادف المفہوم قرار
دیتے ہو اور کبھی اُسکو ملکوتیت کا ہمسر۔ آپنے مجھے
دھوکا دینا چاہا ہے یا خود آپکو فریبِ التباس نصیب
ہُوا، میں یہ کہتا ہوں کہ بیشک نسائیت کا بہترین مامن
مسکن عورت کی ذات ہے، اور نسائیت کی نمایش
کا اعلیٰ ذریعہ قدرت نے عورت کی تخلیق میں پیدا کیا
ہے، لیکن پھر عورت ہی کو نسائیت کا مظہرِ اتم قرار
دیدینا جائز نہیں، کبھی میری توصیف، نسائیت کے
لئے درجہ ملکوتیت منجر ہے تو یہ کچھ مبالغہ نہیں ہے۔
اکثر نسائیت اس درجہ سے اوپر گذر گئی ہے، جب انسانی
ملکاتِ روحی قوی ہو جائینگے، ابن بشر کے لئے یہ مرتبہ
دُور نہیں کیسا لغو و بے سر و پا اعتراض ہے ـــ"

پھر یہ کہنا کہ میں کبھی اسکو سراپا لذت کہتا
ہوں اور کبھی یکسر نکہت گل۔ یقیناً صحیح ہے۔ وہ
لذت ہے بہر نوع چاہے خیال کی ہو چاہے عمل کی
وہ نکہتِ گل ہے۔ بلا شک۔ اُس کی ساخت نزہت
طلب بھی ہے اور اُسکی حیات عطر بیت پاش بھی

آپ مجھے الزام دیتے ہیں کہ میں اُسکے لئے
مرد کی آغوش میں گدگدی پیدا کرنا چاہتا ہوں اور کبھی
انسانی پیشانیوں سے سجدے کرانا ـــ"

مظہر مسلمات پر گفتگو کرنے کے لئے مبادیات
مسائل کا بیان کرنا ناگزیر ہے، مسئلہ کو ممکن الفہم بنا کے
جب نسائیت کی تشریح کیجائیگی تو عورت مبادی بحث
ٹھیرے گی، چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ اب بعض کوتاہ اندیش
نسائیت کی ایسی حیثیات کو جو عورت میں پیدا ہیں،
مجھ سے سن کر اپنی آغوش میں گدگدی محسوس کریں
تو میرا اس میں کیا قصور؟ مگر میری تقریر جب اس
درجہ سے گذر جاتی ہے تو صرف بندگی اور پرستش
کا مفہوم باقی رہ جاتا ہے، اور مجھے اس گذارش
سے چنداں شرمندگی نہیں ـــ"

آپ پوچھتے ہیں دُنیا میں کبھی نسائیت اور
عورت کا امتزاجِ خمیر ہُوا ہے، اور اگر ہُوا ہے تو
وہ مسرت ازدواجی سے کیا محروم رہا ہے ـــ"

بیشک قدرت نے ایسی مخلوق بھی پیدا کی
تھی اور پیدا ہے مگر اُس کا دائرۂ عمل واثر ہمیشہ ممتاز
و ممیز رہا ہے۔ تم تاریخ کے صفحے پڑھو۔ تم کو
ضرور معلوم ہو جائیگا کہ اتنی عورتیں گذری ہیں اور
اتنی نسائیت تمثال ہستیاں جلوہ دے گئی ہیں،
کبھی افکارِ مادی نسائیت پر غالب نظر نہ آئینگے عورتیں
جذبۂ مادی سے متاثر گذر گئیں وہ قابلِ ذکر نہیں نسائیت
تمثال ہستیاں پرستیدۂ عالم ہو کر رہی ہیں۔ اور دُنیا
اُنکو ابھی تک یاد کرتی ہے، پوجتی ہے، اُنکے مجسمے،
مورتیاں موجود ہیں ـــ اُنکی شادیاں ہُوئیں یا نہ ہُوئیں

یہ افسانہ طلب داستان ہے۔ شادی فقدان نسائیت
کے لئے لازم نہیں۔ امکان ہے ایسا بھی ہُوا
ہو۔ مگر نسائیت کی تکمیل عروجِ روحانی کی مقتضی
ہے ضرور۔ اس کا فیصلہ سہل نہیں پھر اعتقادی
گفتگو شروع ہو جائیگی۔ جو نامناسب ہے ــــ"

مجھسے ارشاد ہے، نسائیت کی پرستش
پرستش کی تبلیغ کئے جارہے ہو کیا فطرتِ صالحہ
کے اور منشائے تخلیقِ نسوانی کے یہ خلاف تو نہیں ہے"

مظہر! فطرتِ صالحہ نہیں چاہتی کہ دنیا کو
مجموعۂ لذات بنایا جائے علم الٰہی کی تحصیل اپنی ذات
کے عرفان سے شروع ہوتی ہے انسان کی اپنی کائنات
اک مشتِ خاک۔ اُس خمیر میں یہ مفاسد جنم لیں
اللہ۔ اللہ کن آلائشوں میں مبتلاء ہونیکی تحریک
کو اقتضائے فطرتِ صالحہ قرار دیتے ہو۔ یہ
بوقلموں التباس ہے یہی جگہ تو تدبر اور تفکر کی ہے
منشاء تخلیقِ نسوانی کی اک کہانی تو وہ ہے جس سے
جدامجد آجتک متہم ہیں۔ دوسری کہانی تفریقِ قبائل
کی ہے جو دوسرے ہی دورِ انسانی میں مرتب ہوگئی
تھی کوئی اور قصہ باقی ہو تو حضور سُنادیں ــــ "

تاہم مظہر! انفاسِ قدسی زمین پر موجود ہیں
اب بھی حوریں زمین پر جمالِ ظاہری و باطنی سے
جلوہ گر ہیں۔ فرشتے انسانوں میں ابھی جنم لیتے ہیں
تم خدا کی عظمت کو اپنے عقل کے پیمانے سے
کیوں ناپتے ہو۔ سب طرح کے لوگ دنیا میں ہیں
تعجب نہ فرمائیے۔

آپ کا خیال ہے شاید اشتراکِ جنس کے
اختلافِ عمل سے انسان مشرک ہو جاتا ہے۔
حالانکہ بات یہ نہیں ہے اور اگر آپ خاص اِسی
مسئلہ پر گفتگو چاہتے ہیں تو مجھے عذر نہیں پہلے
آپ احیاء العلوم کا باب النکاح پڑھ لیجئے ــــ۔

اب آپ کا یہ اعتراض البتہ دلچسپ ہے"
کہ اک نسائیت سے معمور عورت اگر محبت کے
قابل ہے، تو پھر محبت کے پاکبازانہ مقاصد بغیر
عقد کئے کسی شریف عورت سے کوئی مرد کیسے حاصل
کرسکتا ہے ــــ"

مظہر! نسائیت سے محبت، الفتِ بے مدعا
ہے۔ اُس کا مقصد کیا۔ وہ الفت کرتا ہے۔
اپنے آپ کو مٹاتا ہے اور نہیں جانتا کہ میرا مقصود
کیا ہے۔

کوئی عورت اگر نسائیت سے معمور ہے تو
پھر وہ عورت کب ہے وہ تو دیوبیت کا مجسمہ ہے
اُس سے محبت کا مقصد کیا، پرستش اور پوجا ہے
انسان اپنی بیچارگی پیش کرتا ہے۔ نہ کہ مقصدِ محبت
قائم کرتا ہے ــــ پھر پاکبازانہ مقصد عورت؟
اک چیستان ہے، میں نسائیت کا پرستار ہوں اور
دیویت کا پجاری۔ یا عورت سے محبت کرنیوالا

اور پاکبازانہ مقاصد محبت کی تاویلیں بگھارنے والا۔ ذرا مجھے دیکھ کر کچھ کہا ہوتا۔ تاہم عورت کے احساس اور مرد کی کیفیات کو محو کر دو تو دنیا میں اپنی جنس سے اور دوسری جنس سے بھی پائیدار محبت کر سکتا ہے اور وہ محبت نہایت پُرلطف شاندار اور مستحکم ہوگی ——"

عورت سے جو محبت خون کے رشتے کو ملحوظ رکھ کر کیجاتی یا نفسانی اغراض کی تکمیل کو مدنظر رکھ کر کیجاتی ہے وہ ہمیشہ ناا ستوار وغیر مستحکم ہوتی ہے، عورت سے محبت وہی شاندار ہے جو ان علائق سے آزاد ہو کر کیجائے، رُوحانی دنیا میں ایسی محبتوں کی بہت قیمت ہے، اسی خیال کو ٹیگور کی محترم ہمشیرہ نے لکھا ہے +

پیارے منظہر! نسائیت کمیاب ہے۔ نایاب نہیں، میرا عروج نظر کیوں قابلِ نکوہش ہے۔ یہ نظروں کا تھک تھک کے واپس ہو جانا تو تپشِ ذوق کا سامان ہے۔ یہ آواز کا یاسِ ناشنوائی سے مضمحل ہو ہو کر لوٹ آنا تو کاوشِ عمل کا وسیلہ ہے۔ نسائیت اچھوتی دلکشی کا نام ہے۔ جو میسر نہیں آسکتی"، ہاں سچ کہتے ہو میں اس کی تعریف کر سکتا ہوں مگر تمہارا انقلابِ ذوق میرے قابو سے باہر ہے اور نہ میرے خیال میں دنیا میں کوئی ایسی قوت ہے، جو لذت کو دکھادے۔ ترنم کو چکھائے، لطفِ مشاہدہ کو سُنادے۔ اور سونگھنے کی شے کو مس کرا سکے ——"

خلیقی دہلوی

رات کے وقت جب شور درماندہ ہو جاتا ہے، سمندر کا دھیما زمزمہ ہوا کو معمور کرتا ہے۔

دن بھر کی آوارہ خواہشات آرام کے لئے روشن چراغ کے ارد گرد واپس آجاتی ہیں،

محبت کا کھیل کُود خاموش ہو کر پرستش میں تبدیل ہو جاتا ہے، زندگی کا آبجو سے بحرِ محیط کو جا چھوتا ہے، اور دنیائے صَوَر اپنے نشیمن میں آجاتی ہے، اُس حُسن و خوبی میں جو تمام صورتوں سے بالاتر ہے

وہ کون ہے جو اس خوابیدہ زمین میں، بے حرکت پتّوں کے درمیان سوئی ہوئی ہوا میں، تنہا جاگ رہا ہے؟ —— خاموش پرندوں کے آشیانوں میں، غنچوں کے نہاں خانوں میں، جاگ رہا ہے؟ —— رات کے مرتعش ستاروں میں، میرے دردِ ہستی کے عمق میں، جاگ رہا ہے؟

(ٹیگور)

ہادی حسین۔ مشن کالج لاہور

موت

نہیں۔ تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ اے زمینوں کو گردش میں مبتلا کرنے والی طاقت تجھے مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔ تو نے مجھے کیا سکھایا؟

مانگنا!

میں نے مانگا۔ بار بار مانگا۔ التجا سے، محبت سے، آنسوؤں سے، رو رو کر، بلبلا کر! کیا؟

بچپن میں چاند۔ جوانی میں چاندنی راتوں کی رفیق اور اب .... اب .... صرف ہری ہری گھاس کا تحمل۔ مگر ترا دہی سہ حرفی جواب +

مانگنا چھٹ گیا؟ نہیں میں اپنے آپ سے چھٹ گیا ورنہ مانگتا اور سدا مانگتا رہتا۔

"سبحان ربی الاعلیٰ" کی خوگر جبینِ نیاز گدانہ کرتی تو اور کیا کرتی مگر .... مگر اے آسمانوں کی وسعت کو ملیامیٹ کرنے والی طاقت تو نے میری خودی پر ڈاکہ مارا۔ میرا مال تو نے چھینا۔

اب میری صدا ختم ہو چکی۔ یہ اس کی بازگشت بھی چند ساعت میں سنائی نہ دیگی۔ تیرے سہ حرفی جواب (موت) نے آخر کار جیتے جی مجھے آلیا۔

اے زندگی کے مصرعے میں سکتہ کو دور کرنے والے کہنہ مشق استاد تیرا شکریہ۔

عبد العزیز

خیالات

اے حسینوں سے حسین تر! اے چاند سے مکھڑے والے! اے تاروں کے محبوب! تُو کہاں ہے؟
میری تلاش کو کاوش ہی رہتی ہے کہ تُو کہاں ہے؟

چاندنی راتوں میں

جب قمرِ تابندہ فلک پر جلوہ افروز ہوتا ہے تو زمین و آسمان اُس کی سفید و شیریں کرنوں سے پُرنور ہو جاتے ہیں! اسرارِ ظلمت پر یہ نرم و نازک روشنی پڑتی ہے اور تخیل ہوائیں بے پر ہلائے اُڑتا ہے اُڑتا ہے اور گاتا ہے! گاتا ہے اور اُڑتا ہے!!

پھر ـــــــ شبِ تاریک میں

جب دُنیا و مافیہا پر سناٹا چھایا ہوتا ہے تو ٹمٹماتے ہُوئے تاروں کی ننھی روشنی سے کائنات مخمور نظر آتی ہے! شمعِ زندگی جھلملانے لگتی ہے اور دل کسی دوسری دُنیا کے خواب دیکھنے کی تمنا میں مدہوش ہو جاتا ہے!!

یا ـــــــ پہاڑوں کی گھاٹیوں میں

جہاں آبشار بلندی سے گر کر سبزۂ خودرو پر اپنے اَچھوتے موتی بکھیر دیتا ہے اِک شاداب و مخملیں تبسم خلوت آرا ہوتا ہے! لطیف روشنی چمن کی تر و تازہ رنگینیوں میں کھیلتی ہے اور نسیم جنگلی پھولوں کی بُو باس سے مستِ ناز ہو کر اٹھکھیلیاں کرتی ہُوئی چلتی ہے!!

اور ـــــــ سمندر کی بے پایاں وسعت میں

جب صبا کے ہلکے ہلکے جھونکے ننھی نیلگوں لہروں سے سرگوشیاں کرتے ہیں تو سازِ قدرتِ وحدت کے میٹھے راگ سے بیقرار ہو جاتا ہے! اِدھر رُوح بیخودی کی شکستہ کشتی پر سوار ہو کر اپنے تئیں بحرِ امواج کی دائمی کشمکش کے سپرد کر دیتی ہے!!

آہ ـــــ اے ماہِ درخشاں! اے ستارۂ تاباں! اے آبشارِ حُسن! اے قلزمِ محبت! کیا تُو وہاں ہے؟
میری تلاش کو روز و شب کاوش ہی رہتی ہے کہ تُو کہاں ہے؟؟

میں گمان کرتا ہوں کہ اگر میں یہ چاندنی کا گداز! یہ تاروں کی مستی! پہاڑوں کی یہ سطوت! اور

سمندر کی یہ شان و شوکت! کسی اک نقطے پر جمع کر کے اُسے منتشر کر دُوں تو فضا تیرے نُور سے معمور ہو جائے!!!

طلوعِ سحر کے گلابی دُھندلکے میں

جب بیباک چڑیا مسرت کی راگنی چھیڑتی ہے تو چمن کے سبز پوش اپنی میٹھی نیند سے بیدار ہو کر اُس آزاد گیت کو گاتے ہیں اور حالتِ وجد میں جھومنے لگتے ہیں! جھاڑیوں کی نازک پتیاں اور پھولوں کی پنکھڑیاں اپنی خوشی میں آ کر تالیاں بجاتی ہیں اور کسی کی آمد آمد کا راگ گنگناتی ہیں!

پھر ـــــ بہار کی مست گھڑیوں میں

جب بادل نوزائیدہ آسمان کی محفل میں "رقص و سرود" کرتے ہیں اور پھر اِدھر اُدھر اپنی رنگ رلیوں میں بکھر جاتے ہیں تو کسی محبوب کے لئے رنگ برنگ کے موتیوں کا ایک جھولا ڈالا جاتا ہے! کرنیں اُسکا ریشمیں تار ہوتی ہیں اور بارش کے قطرے اُس کے گوہرِ سفتہ!

یا ـــــ طفلی کے مسرور دنوں میں

جب معصومیت بھولے بھالے بچے کے مُنہ پر آبِ رواں کے چھینٹے دیتی ہے تو چہرہ عصمت و پاکیزگی کی تابش سے چمک اُٹھتا ہے! آنکھوں میں اُلفت کا چراغ درخشاں ہوتا ہے اور پیشانی پر ستارہ بلندی روشن!! کیا وہ تُو ہی ہے جو بےخبری کے ساتھ اُن ننھے ننھے کھلونوں سے کھیلتا ہے اور دُنیا کے ساز و سامان کو اک نظر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا؟؟

اور ـــــ عنفوانِ شباب میں

جب حُسن خوبرویوں پر اپنی شرمیلی اداؤں کی بارش کرتا ہے اور درو غگو طالب ہنوز ناآگاہ ہوتے ہیں تو راستی رہ رہ کر رُخِ دلکش پر اپنا ایثار نچھاور کرتی ہے! کھلے ہُوئے بال آزادی کے ساتھ شانوں پر پڑتے ہیں اور لبریزِ حُسن آنکھیں محبت کے بار سے جُھکی رہتی ہیں! تو کیا وہ تو ہی ہے جو اک مسکراہٹ کے ساتھ یُوں اپنی دلکشی کا نت نیا منظر دکھاتا رہتا ہے؟؟

آہ ـــــ اے نغمۂ شیریں! اے قوسِ رنگیں! اے معصومئ دلکش! اے خوبئ دلفریب! کیا تو وہاں ہے؟ آہ آہ! میری تلاش کو ہمیشہ یہی کاوش رہتی ہے کہ تُو کہاں ہے؟

ہاں! میں خیال کرتا ہوں کہ اگر میں یہ راگ کا سوز! یہ بہار کی رنگینی! بچپن کی یہ معصومی! اور شباب کی یہ دل آویزی! زندگی کے ساغر میں بھر کر اپنی پژمردہ صورت پر چھڑک دُوں تو ضرور ہے کہ میری خوابیدہ آنکھیں بیدار ہو جائیں اور میں تیرا پرتو اپنے ہی آئینۂ دل میں عیاں طور پر دیکھ لُوں!!!

د ل

حصّۂ نظم

ماضیات

کلام حضرتِ فردوس منزل ابوالمظفر شاہِ عالم ثانی بادشاہ غازی متخلص بآفتاب نوراللہ مرقدہٗ

ایک قلمی نسخہ ہے

مژدہ اے یار کہ ہیں وصل کے ایام قریب — دُور ہوتے ہیں سبھی ہجر کے آلام قریب

بے قراری، طپش، اور بیکلی، اور بیتابی — دل نے کاٹی بہت اب ہوتا ہے آرام قریب

دے گئے مجھکو ہزاران چمن خوش خبری — "غنچہ دل مت ہو" کہ ہے وصلِ گل اندام قریب

آفتاب اپنے خدا کا نہ ہوں کیونکر شاکر — میرے ہر کام کو وہ دیتا ہے انجام قریب

سیر کرتا ہُوا اُس رُخ کی پھنسا زلف میں دِل
آفتاب آیا جو مغرب میں ہُوئی شام قریب

رباعیات

جناب مرزا حکیم جمشید علیخاں اختر دہلوی طبیب خاص مہاراجہ جے پور

کچھ تو ہی نہیں بلبل نالاں غمناک — اس باغ میں ہے دامنِ گل بھی صد چاک
مُرجھا کے یہاں سینکڑوں گل خاک ہُوئے — ہیں غنچۂ ناشگفتہ لاکھوں تہِ خاک

اے چرخ ہر ایک سے ہے کینہ تیرا — نام اس لئے رکھا ہے کمینہ تیرا
اے خاک ہزاروں گنج نکلیں مدفون — دیکھے کوئی چیر کر جو سینہ تیرا

کل صبح یہ میخانہ میں آئی آواز — اے رندِ خرابات تری عُمر دراز
تسبیحِ ملایک سے بہتر ہے ہمیں — وہ آہ کہ ہو جس میں بھرا سوز و گداز

نوائے درد

ایک نوعمر علم دوست عزیزہ کی وفات پر

پھولا پھلا نہ وہ گلِ رعنا ہزار حیف! — بدتر ہوئی خزاں سے ہماری بہار حیف!

جاری ہے ملکِ زیست میں پروانۂ اجل — زندوں کو زندگی پہ نہیں اعتبار حیف!

رونق تھی جن کے دم سے جہاں کی وہ چل بسے — چلتے رہے جہاں کے مگر کاروبار حیف!

وہ باغ جس کا نام تھا گلزارِ زندگی — کہتے ہیں اُس کو موت کا اب لالہ زار حیف!

آنکھیں تھیں فرشِ راہ مری جن کے واسطے — آنکھوں کے سامنے ہیں وہی خاکسار حیف!

جن کے لئے تھی تیرے تبسّم میں زندگی — روتے ہیں تیرے سرپہ کھڑے زارزار حیف!

پتھر کا ہو جگر تو کوئی تیرا غم سہے — ہے تارتار جامۂ صبر و قرار حیف!

جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائے تھے تجھ کو ہم — تُو نے بھی زندگی کی نہ دیکھی بہار حیف!

بچنا ہو گر غموں سے تو مرجایئے کہیں — رنج و محن ہیں زیست کے لیل و نہار حیف!

وہ بھی تھے دن کہ گرم تھی جب بزمِ انبساط — یہ بھی ہے وقت شب کو نہیں ہے قرار حیف!

وہ بھی تھی زندگی کہ محبت کا دور تھا — یہ بھی ہے عمر بزم کا ہے انتشار حیف!

وہ بھی تھے دن کہ موت سے بدتر تھا انتظار — یہ بھی ہے وقت موت کا ہے انتظار حیف!

رو رو کے آنسوؤں کی لڑی کیا پروئیے — کھویا گیا ہے اپنا دُرِ شاہوار حیف!

ذکرِ خوشی گنہ ہے دلِ زار کے لئے
یعنی غمِ عزیز میں ہے داغ دار حیف!

زار

شاعر اور قدرت

شاعر

رونقِ باغِ جہاں پھر وہی رعنائی ہو
پھر وہی میں ہوں وہی چشمِ تماشائی ہو

پھر مرے ساز سے ہو نغمۂ اُلفت پیدا
پھر مری بزم میں وہ زمزمہ پیرائی ہو

محشرستانِ تجلی ہو مرا کاشانہ
شعر ویوں کی یہاں انجمن آرائی ہو

پھر سے چرچا ہو مرا عشق کی آبادی میں
پھر پریشانئِ دل باعثِ رسوائی ہو

لے چلے خواہشِ دیدار کسی کے در پر
پھر وہی ذوقِ تقاضائے جبیں سائی ہو

پھر سرو کار ہو آوارگی سے شام و سحر
پھر وہی میں ہوں وہی بادیہ پیمائی ہو

قدرت

دیکھ! آئینۂ ایام میں صورت اپنی
بگڑی صورت کو بنا محوِ خود آرائی ہو

پرتوِ حسنِ رُخِ شاہدِ عالم پہ نہ جا
جلوۂ شانِ کریمی کا تماشائی ہو

نورِ کامل کی جھلک ہے تری خاکستر میں
بے خبر جلوۂ باطل کا نہ سودائی ہو

تیری فطرت میں ہے وہ نُور اگر تو چمکے
مضطرب تیرے لئے شعلۂ سینائی ہو

شایق

جذباتِ عالیہ

یاس

موجِ ہوا سے خاک اگر آشنا نہ ہو
دل کو جلا کے سُرمۂ بینش بنائیے
شکل اس کی دیدنی بھی ہے نادیدنی بھی ہے
سجدہ وہ کیا کہ سر کو جھکا کر اُٹھا لیا

دنیائے گردباد کی نشو و نما نہ ہو
آنکھوں سے معرفت کا اگر حق ادا نہ ہو
جو تجھ کو جانتا ہو مگر مانتا نہ ہو
بندہ وہ ہے جو بندۂ بندہ نما نہ ہو

پار اُترے کیا دوا بہ امید و بیم سے
آمین تک زبان سے نکلتی نہیں کیا
ایسا نہ ہو کہ تھک کے کہیں بیٹھ جائے دل
دل نشۂ خودی میں پڑا جھومتا ہے کیا

جب ناخدائے دل کو یقینِ خدا نہ ہو
مغرور اتنا اے دلِ بے مدعا نہ ہو
دیر و حرم میں گم نگۂ نارسا نہ ہو
زور آزمائی کو کوئی درد اُٹھ کھڑا نہ ہو

اُمیدِ صُلح کیا ہو کسی حق پسند سے ۔ پیچھے وہ کیا ہٹیگا جو حد سے بڑھا نہ ہو

دل کھول کر تڑپنے دے اے صبر الوداع ۔ پرہیز کیوں کرے دن جب اُمیدِ شفا نہ ہو

پچھلا پہر ہے کاتبِ اعمال ہوشیار ۔ آمادۂ گناہ کوئی جاگتا نہ ہو

صورت نہ پکڑے جلوۂ بے معنیٔ حباب ۔ قطرہ اگر اسیرِ طلسمِ ہوا نہ ہو

یاؔس آپ کو خدا کی خدائی سے کیا غرض

وحدت سرائے دل میں کوئی دوسرا نہ ہو

وقار الاعظم شرف (جاورہ)

اشکِ خوں رنگتیں بدلتا ہے ۔ دل کا کانٹا نہیں نکلتا ہے

جانے کیا کل بگاڑ دی تم نے ۔ دل سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

ڈھونڈھتا ہے تجھے ترا بیمار؟ ۔ ہجر میں کروٹیں بدلتا ہے

تم سے روشن ہے آئینہ کا گھر ۔ پانی میں بھی چراغ جلتا ہے

ہجر میں بندھ رہے ہیں خام خیال ۔ ان کھلونوں سے دل بہلتا ہے

دردِ الفت کو اور دھندا کیا ۔ میری چھاتی پہ مونگ دلتا ہے

اے شرفؔ غیر کو ملا رکھو

یونہی دُنیا کا کام چلتا ہے

احسن مارہروی

میری طرح جہان ہے شیفتہ اہلِ ناز کا

کس سے نہیں ہے واسطہ حُسنِ زمانہ ساز کا

عقل نے سو جتن کئے ذہن نے لاکھ فکر کی

قفل مگر نہ کُھل سکا تیرے طلسمِ راز کا

چھوڑ کے سنگِ آستاں ناز کا ہمکنار ہے

عجز نے کیا بڑھا دیا رُتبہ سرِ نیاز کا

جھیل کے سختیٔ جفا نرم مزاج بن گیا

عشقِ بتاں سے مل گیا دل کو مزا گداز کا

اس دلِ ہیچکارہ کو کام کا اپنے کر لیا

کیوں نہ رہینِ لطف ہوں عشوۂ دلنواز کا

دیکھ رہا ہے سب کو وہ دل ہے مگر تری طرف

پاؤں نہ ڈگمگائیگا عاشقِ پاکباز کا

بیعتِ بوریا نشیں احسنِ بے ریا نہ کر

دل سے نیاز مند بن درگۂ بے نیاز کا

ثاقب

وہ نگاہِ ناز جو دزدِ متاعِ ہوش ہے ۔ حاصلِ صد آرزو ہے باعثِ صد جوش ہے

آرزوئے وصل ہے تمہیدِ یادِ ہجرِ دوست ۔ انتظارِ صبحِ محشر یادگارِ دوش ہے

اف شبِ غم کی اداسی مجھ سے اے ہمدم نہ پوچھ ۔ اک چراغِ آرزو تھا وہ بھی اب خاموش ہے

میرا غم برہم زنِ ہنگامۂ محفل ہوا ۔ کیوں اداسی چھا گئی کیوں انجمن خاموش ہے

کون بیخود ہو گیا کس پر گری برقِ جمال ۔ کیا تجھے بھی او تغافل آشنا کچھ ہوش ہے

اب وہ نالے ہیں نہ وہ ارماں نہ وہ سوز و گداز ۔ دل ہے پہلو میں مگر افسردہ ہے خاموش ہے

اپنی آنکھوں کی قسم تجھ کو ابھی آنکھیں نہ پھیر ۔ ہاں ابھی اے ساقیٔ ذی ہوش مجھ کو ہوش ہے

دیکھنے والو! ذرا ثاقبؔ کی صورت دیکھنا

آہ وہ بیکس ہجومِ یاس میں خاموش ہے

برقعہ نوایجاد

آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صیغۂ نسوان کے سکرٹری کے انعامی اعلان پر اسکی اختراع ہوئی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ نے بہترین برقعہ قرار دیکر اول انعام طلائی تمغہ دیا ہندوستان کے دیگر صوبوں کی کانفرنس نمائش ہائے صیغۂ نسوان سے بھی بارہ طلائی و نقرئی تمغہ۔ سند و انعامات حاصل کر چکا ہے۔

سولہ سال سے ہندوستان کے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کے لوگوں میں مقبول ہے

بنگال برقعہ بہت پسند ہوا۔ واپس نہیں کیا جاویگا بچہ کی ٹوپی جلد روانہ کریں۔
ازجناب شمس الرحمن صاحب پلیڈر۔ کلکتہ بنگال۔

دکن برقعہ ہے نہایت آرام دہ اور پردہ دار ہیں دو برقعہ رنگین میرے بھائی کے گھر کے لئے روانہ کریں۔
جناب محمد عبداللہ حسن صاحب اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

بہار۔ ایک برقعہ چینی ریشم جس قدر جلد ممکن ہو اور روانہ کریں جو برقعہ رنگین بھیجا ہے۔ اسکی وضع بہت پسند ہوئی۔
ازجناب راجہ محمد یعقوب صاحب۔ راجہ ریاست۔ پرسونی۔

مدراس آپکا اشتہار اکثر نظر سے گذرتا تھا۔ برقعہ منگوانے میں اشتہار کے مطابق ثابت ہوا۔ ایک برقعہ اپنا کپڑا روانہ کرکر تیار کراؤنگا
ازجناب حسن صاحب۔ رئیس حسن۔ میسور۔

یوپی برقعہ ملا واقعی بہت آرام دہ ہے ہر ایک بہن کو خریدنے کی ترغیب دونگی۔ ایک برقعہ میری بہن کے نام روانہ کریں۔
ازجناب بنت سید عبدالحمید صاحب۔ ایم۔ اے۔ لکھنؤ۔

سی پی میں نے بھائی احمد حسن صاحب کے پاس آپکا برقعہ دیکھا اسکی وضع پسند ہے ایک برقعہ رنگین روانہ کریں۔
ازجناب ایس حامد حسین صاحب۔ جی۔ آئی۔ پی ریلوے۔ بنیہ۔

پنجاب جو برقعہ واپسی کی شرط پر منگوایا تھا۔ بہت پسند ہوا گھر پر پہنچنے پر دو برقعہ طلب کروں گا۔
ازجناب ایم فیضل خاں صاحب نمبر ۳۲۳۔ لائل پور۔

احاطہ بمبئی آپکی دوکان سے دو برقعہ چینی ریشم خرید کئے تھے یہاں پر سب نے پسند کئے ایک برقعہ اور روانہ کریں۔
ازجناب ایم۔ اسمعیل۔ پوسٹ نمبر ۵۔ کولابا۔ بمبئی

آپ بھی بشرط واپسی منگوا کر خود ملاحظہ کریں و پردہ نشین خواتین کو معائنہ کا موقع دیں

برقعہ نوایجاد کی وضع عام طرز کے بدنما تکلیف دہ اور ناکافی پردہ برقعہ سے بالکل مختلف ہے اس کی اختراع میں پردہ نشین کی ہر ایک ضرورت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

اتفاقیہ بے پردگی کا بچاؤ۔ تازہ ہوا کی آمد کا کافی انتظام بچہ کو دودھ پلانے میں سہولیت

دیر تک پہنے رہنے کی تکلیف سے محفوظ بکمل پردہ دار۔ خوبصورت آرام دہ زمانہ کے حسب حال

وضع دو حصوں پر منقسم ہے بالائی حصہ سر سے شروع ہو کر ہاتھ کی انگلیوں سے تین انچہ نیچا رہتا ہے۔ اس میں ہماری ایجاد کردہ ٹوپی نما کمانی لگی ہوئی ہے جو نقاب کو چہرہ سے بالکل الگ رکھتی ہے تاکہ چہرے پر پڑے رہنے سے دم نہ بولائے اور باہر سے چہرہ کا خاکہ نہ معلوم ہوسکے زیرین حصہ مثل ڈھیلے ڈھالے کوٹ کے کندھے سے شروع ہو کر پیر کے ٹخنہ تک رہتا ہے کوٹ ہی کی مانند سامنے کے رخ بٹن لگے ہوئے ہیں۔ پہلو میں ہر دو جانب ہاتھ باہر نکالنے کے لئے جگہ ہے۔ سامنے کے رخ دو جیبیں ہیں۔

آج ہی منگائیں۔ کندھے سے لیکر پیر کے ٹخنہ تک کی لمبان اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں۔

ہر جگہ پردہ نشین خاتون کو اس کی ضرورت ہے

قیمت سفید لٹھا ۵ رنگین اٹالین ۲۵ الپکہ ۳۵ چینی ریشم ۴۵ سفید کھدر ۱۲ رنگین کھدر ۱۶

خاتون اسٹورز۔ نمبر ۱۲۔ فیض بازار۔ دہلی

قواعد

۱ - ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اوّل میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ - علمی و ادبی۔ تمدنی و تاریخی۔ اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے۔

۴ - جواب طلب خطوط کے لئے ۱ر کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵ - کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائے گا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے۔ نمونہ کا پرچہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک۔

۷ - ہُمایُوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحات سالانہ ہوگی۔

۸ - خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں

۹ - ناپسندیدہ مضمون ۱ر کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۰ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۱۱ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

مینیجر رسالہ ہُمایُوں

۳۰ - مزنگ روڈ - لاہور

(باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور چھپوا کر شائع کیا)

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نوید دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

یادگارِ علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبۂ
میاں بشیر احمد بی۔اے۔ (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل)

منشی محمد صادق
مرکنٹائل پریس

ہمایوں

جلد ۲ اکتوبر ۱۹۲۲ء نمبر ۴

اُمیّد

جگر میں یاس قیامت اُٹھائے پھرتی ہے
اُمید سوچ میں بیٹھی ہے سر جھکائے ہُوئے!

کُرۂ ارض پر یاس و حرماں کی کالی کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں، اِدبار کی تیز و تند ہوا مطمئن پانیوں کو جنبش میں لاتی ہے اور بحرِ ناپیدا کنار کی لہریں اس طرح اُٹھتی گرتی ہیں گویا اُنکا مد و جزر دُنیا کے دل کی دھڑکن ہے! ہلاکت کا دیوتا اپنی چیخ پکار سے نوعِ انسان کی بستیوں میں شدت کا اضطراب پیدا کر دیتا ہے اور عالمِ موجودات کا ہر وجود اُس طوفانِ عظیم کے خوف سے کانپ اُٹھتا ہے جسکا آغاز اسقدر ہیبتناک اور جسکا شباب اس سے بڑھ کر جانفرسا ہوگا! ـــــ ایسے دلگداز دور میں اسی کُرۂ ارض پر ایک صورت تنِ تنہا بیٹھی ہے، اُسکے غرور کو رنج و اندوہ نے سرنگوں کر دیا ہے، اُسکی آنکھوں پر ستم نے جفا کی پٹی باندھ دی ہے، وہ سر جھکائے اُس ساز کو جسکے ہر تار سے زندگی کے نغمے نکلتے ہیں تھامے ہُوئے ہے۔ قسمت کے ہاتھوں ایک کے بعد دوسرا تار ٹوٹتا ہے × × یہانتک کہ اب صرف ایک ہی تار باقی ہے! ،،، تاریکی چاروں طرف کاجل کی طرح برس رہی ہے × × ہاں ایک ستارہ ہنوز نمودار ہے اور اُسکی ننھی کرن اس ظلمت آباد میں آوارہ و تنہا پھر رہی ہے! ،،، ـــــ یہ صورت کون ہے؟ اُمید! اور یہ جھلملاتی ہُوئی روشنی اُمید کی آخری کرن!! ـــــ نغمۂ اُمید بدستور جاری ہے اور شعاعِ اُمید بدستور تاباں!

کیا اِس نغمہ کو جوابِ نغمہ نہ ملیگا؟ گذرے دنوں میں جب یہ ساز ہمنوائی سے معمور تھا تو موسیقی یُوں تشنۂ وصال نہ تھی، نغمہ

راگنی کے سپرد تھا راگنی نغمہ میں غرق تھی! لیکن اس قُربِ ظاہری میں کمالِ محبت کیلئے جگہ نہ تھی اور مُطربِ حقیقی کو منظور یہ تھا کہ وہ سازِ حیات میں خود اپنی شانِ کمال کا آوازہ سُنے جو اس وقت تک آوازوں ہی کے ہجوم میں گُم تھا!! ــــ تار سے عجزِ محبت کا نغمہ نکلتا تھا کہ حُسنِ ازل کی ہم آہنگی کائنات کے کونے کونے سے اُسکی پذیرائی کو بڑھی اور یہ لاتعداد صداؤں کی آواز ہمیشگی کے گنبد سے ٹکرا کر مخلوقات کے ذرے ذرے میں نفوذ کر گئی! ــــ بادل جو تو بہ تو چھائے ہُوئے تھے پھٹے، ستارے کا نور پھیلا اور ہزاروں لاکھوں ستاروں نے اپنی اپنی کرن سے زمین و آسمان کی تاریکیوں کو روشن و پُر نور بنا دیا!!

سچائی کی آواز دُنیا میں ہمیشہ ایسے اوقات میں بلند ہُوئی ہے جب ظلم و کذب کا اندھیرا انسانی آبادیوں پر چھا گیا ہے، جب اخلاق و مذہب کے مُنہ خاک سے بھر دیئے گئے ہیں، جب چند نفوس نے دیگر ہمجنسوں کو یا ایک قوم نے کسی دوسری قوم کو بے اعتنائی کے ساتھ اپنے پاؤں تلے روند دیا ہے!

مغرب جہالت و ناشائستگی میں مگن تھا، روما کی سطوت محض طاقت کے گورکھ دھندوں میں آشکار تھی، شمالی ملکوں میں ابھی رُوحانیت کا نام تک نہ سُنا گیا تھا کہ ــــ مسیح نمودار ہُوا اور اپنے ایثار سے کروڑوں مُردہ دلوں میں جان ڈال دی!

ہند میں مذہبی جبر و تفوق کا بازار گرم تھا اور انسانی زندگی بے معنی قربانیوں میں صرف ہو رہی تھی کہ بدھ نے آکر انسانی مساوات اور نفس کُشی کا عملی درس دیا!

عرب کا خمارِ جاہلیت کسی طرح اُتارے نہ اُترتا تھا، دُنیا بُت پرستی کے نئے نئے طریق اختراع کرتی تھی، بندے اپنے پروردگار سے کوسوں دُور پڑے تھے کہ پیغمبرِ اسلام نے ہادیِ عالم بنکر راستی اور وحدانیت کا سیدھا رستہ دکھا دیا! ایسے نازک وقتوں میں افراد سینکڑوں بار نااُمید ہو ہو گئے ہیں لیکن خود فطرت کبھی نا اُمید نہیں ہُوئی! ایسی مشکل ساعت میں انسانیت شہ رفعت کی چوٹیوں پر اُمید کی شکل میں جلوہ افروز ہُوئی ہے!! ــــ یُورپ کے خود پرست مطلق العنان اور حکام جاگیردار اپنے موروثی حقوق پر جمے بیٹھے تھے اور کسانوں مزدوروں کو پیٹ بھر کے کھانا نصیب نہ ہوتا تھا کہ فرانس میں اک انقلابِ عظیم نے کروٹ بدلی اور دُنیائے مغرب یکسر آزادی کے نعروں سے گونج اُٹھی!

ایشیا کے رہنے والو! اپنے خدا پر بھروسہ کئے رہو اور ہمت و استقلال کا دامن نہ چھوڑو کہ حُریت کی رُوح کُرۂ ارض پر تمہارے لئے سرنگوں ہے اور اُمید کی آخری کرن، ہنوز بے تابی کے ساتھ چمک چمک کر، سیاہ بادلوں کو اپنی آسمانی روشنی سے زرّیں و تاباں بنا رہی ہے!!

بشیر احمد

دوشیزۂ فرانس

۲

پہلی فتح

کہتے ہیں کہ وہ دُعا جو خلوص دل سے کی جائے قبول ہو جاتی ہے!

کیا ہر ایسی دُعا قبول ہوتی ہے؟ یہ دُعاؤں کا قبول کرنے والا ہی جانتا ہے! گنہگار بندوں کو اس لاحاصل بحث سے کیا واسطہ؟ اُنہیں تو یہی بس ہے کہ دل میں خلوص پیدا کریں، اس خلوص کے ساتھ دُعا کریں اور پھر یقین رکھیں کہ یہ دُعا قبول ہو چکی!

گنہگار سے گنہگار کے لئے بعض اوقات اک ایسی قبولیت برسوں تک پوشیدہ حقیقت رہتی ہے کہ اُس کی صدائے بازگشت صدیوں کے گنبد سے ٹکرا کر عرصۂ کائنات کے کونے کونے میں پھیل جاتی ہے!

ایسی ہی تھی شہزادۂ فرانس کی دُعا جو اک دردمندی کے لمحے میں عشرت گاہِ شاہی سے بلند ہوئی اور جس کے لئے فلک پر پہنچتے ہی بابِ اجابت وا ہو گیا!

وہ گنہگار تھا! برسوں سے اجنبی غنیم، فرانس کا بن بلایا مہمان، ملک کو تباہ و برباد کر رہا تھا، ہر سُو ہلاکت اپنے کارنامے سُنا رہی تھی، لوگ امن و امان کی زندگی بھول کر سمجھے بیٹھے تھے کہ اُن کی قسمت مصیبت سے تبدیل ہو چکی ہے، شہزادہ اُن کی تنہا اُمید تھی، اُسے مُلک کو آزاد کرنا اُسے ہی فرانس کو از سرِ نو قومیت کی عام خوشیوں سے معمور کرنا تھا۔ لیکن وہ گنہگار تھا، باوصف اُن مایوسیوں اور ناکامیوں کے جو ہر میدانِ جنگ میں اُس کے نبرد آزماؤں کا حصّہ تھیں، اُس غارتگری کے ہوتے ہُوئے جو غنیم وہاں سے چند ہی کوس پر نہایت سنگدلی کے ساتھ کر رہا تھا وہ اپنے اُمرا و خوانین میں گھرا ہُوا، خوشامدیوں اور نکھٹوؤں کے جمگھٹے میں پابندِ عشرت ہو کر عمر کے رہے سہے دن کاٹ رہا تھا!

ہاں! قدرت کبھی کبھی گنا ہوں کی کدورت سے اپنی سحر کاری کے جلوے دکھاتی ہے شہزادہ گاہے گاہے اس عیش و تنعم سے الگ ہو کر ملک کے درد و رنج کو اپنے عمقِ دل میں محسوس کرتا اور سوچتا کہ میرا کام یہ نہیں جو میں کر رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ جاں فرسا خیال کہ میں حقیقی ولیعہدِ سلطنت ہوں یا نہیں ہوں بنیادِ ہستی کو متزلزل کر دیتا اور مایوس و برافروختہ ہو کر شہزادہ پھر نشاط و مسرت میں غرق ہو جاتا!

× ×

ایک صبح، نور کے تڑکے، جب کہ دربار کی جملہ عشرتیں تھک کر گہری نیند سو رہی تھیں اور صرف عنایتِ ایزدی بیدار تھی، اک ایسے لمحے میں جب دنیا شک و شبہ سے تعبیر ہوتی تھی اور صرف مشیتِ پروردگار کی ہر بات پر یقین کرنے کو جی چاہتا تھا شہزادہ اپنی خلوت گاہ میں آیا اور اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اٹھا کر دل ہی دل میں کہنے لگا "بارِ خدایا! اگر میں در اصل وارثِ حقیقی ہوں، فی التحقیقت فرانس کے شاہی خاندان سے ہوں اور اس مملکت کا میں ہی حقدار ہوں تو اپنی رحمت سے میری حفاظت کر اور مجھے اپنی پناہ میں لے لے یا اگر تجھے یہ منظور نہیں تو اتنی توفیق دے کہ میں بچ کر ہسپانیہ یا اسکاٹلینڈ کو بھاگ نکلوں جہاں کے باشندے پشتوں سے شاہانِ فرانس کے حلیف و ہم درد چلے آتے ہیں اور وہاں میرے لئے کوئی ٹھکانہ بنا دے!"

اس کے چند ہی روز بعد خبر آئی کہ دومرمی کی کم سن لڑکی شہزادے کے سامنے حاضر ہونے کی اجازت چاہتی ہے!!

شینوں جو شہزادے کا مقام تھا کارزارِ طور سے، جہاں سات سو برس پیشتر عربوں اور فرنگیوں کے درمیان یورپ کی قسمت کا فیصلہ عیسائیت کے حق میں ہوا، تھوڑے ہی فاصلے پر واقع ہے اور یہی ان دِنوں حکومتِ فرانس کا عارضی دارالسلطنت تھا!

ژان کے آنے کی خبر سن کر قلعہ میں غیر معمولی جنبش نظر آئی۔ چارلس کا وزیرِ اعظم طریموِل ژان کی حوصلہ افزائی کرنے کے قطعی مخالف تھا۔ لیکن خود چارلس تذبذب کی حالت میں تھا اور بعض اُمرا یہ سمجھ کر کہ اور کچھ نہیں تو تفریحِ طبع کا سامان ہو جائیگا خیر مقدم کرنے کو تیار تھے۔

مارچ کی اک شام تھی جب ژان قلعہ میں داخل ہوئی۔ دیوانِ عام میں اُمرا و وزرا کا دربار

منعقد تھا، پچاس بڑی بڑی مشعلیں جل رہی تھیں، بیسیوں صوبہ دار اپنی زرق برق پوشاکیں پہنے جلوہ آرا تھے اور فرانس کے تین سو چوٹی کے شہسوار اپنی تنگ و چست وردیاں زیب تن کئے شانِ سپہ گری کے ساتھ استادہ تھے۔ ایوان سے شاہانہ شوکت و جلال ٹپکتا تھا اور دلوں پر زیب و زینت کا رعب چھایا جاتا تھا! ایک امیرزادہ نے ژان کے آنے کی اطلاع دی۔ وہ اپنے موٹے جھوٹے دیہاتی کپڑے پہنے اندر داخل ہوئی، چارلس کچھ شاید تفریح کے طور پر اور کچھ دل ہی دل میں محسوس کر لینے کے باعث اپنی جگہ سے اُٹھا اور عام لوگوں میں جا کھڑا ہوا" بھولی بھالی کسان لڑکی درباریوں کی مسکراہٹ اور ظاہر اشک و شبہ سے ذرا نہ جھجکی بے دھڑک سیدھی شہزادے کی طرف چلی گئی اور اُس کے سامنے دو زانو ہو کر بولی" شریف دوفین! خدا تمہاری عمر میں برکت دے"۔ چارلس نے کہا" مگر میں تو بادشاہ نہیں ہوں، بادشاہ وہ دیکھو وہاں ہے! شریف شہزادے!" ژان نے کہا" تمہیں ہو، اور کوئی نہیں!" پھر اُٹھ کھڑی ہوئی اور بولی" اچھے دوفین! میں ہوں ژان دوشیزہ! مجھے آسمانوں کے بادشاہ نے تمہارے پاس پیغام دیکر بھیجا ہے کہ ریمز پر تمہارا "تقدس" اور تاجپوشی ہو گی اور شاہِ فلک کی طرف سے جو حقیقی شاہِ فرانس ہے تم فرانس کے حکمران مقرر کئے جاؤ گے"!

ہنسی اُڑانے والے خاموش ہو گئے، تفریح و استہزا کی گنجایش نہ رہی، درباریوں نے جب شہزادے کی متین صورت دیکھی تو اُن کی مسکراہٹ سنجیدگی سے بدل گئی۔ شہزادہ ژان کو الگ دریچے کی طرف لے گیا، رات کی تاریکی میں اوپر تاروں کی خوشنما ٹمٹماہٹ اور نیچے دریا کا دلفریب بہاؤ تھا، ژان نے اُسے کہا" مجھے تم کو اپنے آقا کی طرف سے یہ پیام دینا ہے کہ تم فرانس کے حقیقی ولی عہد اور بادشاہ کے اصلی بیٹے ہو۔ اُس نے مجھے بھیجا ہے کہ میں تمہیں شہر ریمز کو لے چلوں جہاں تمہاری رسمِ تقدس اور تاجپوشی ہو گی ــــ یہ کہہ کر ژان نے نہ معلوم شہزادے کی نگاہ میں کیا دیکھا کہ ذرا سختی کے لہجے میں بولی" اگر تمہاری مرضی ہو!"

کیا یہ جوابِ ایزدی تھا شہزادے کی اُس دعا کا جو دل ہی دل میں کی گئی تھی اور جسکا بجز اُس کے کسی کو علم نہ تھا؟ چارلس لڑکی کی صداقت اور نیک نیتی سے غایت درجہ متاثر ہوا۔ لیکن درباریوں کی یہ کیفیت نہ تھی۔ عورتیں تو ہمیشہ اُس پر یقین رکھتی ہی تھیں اور ہر بات میں

اُس کی سچائی کی قائل تھیں مگر کلیسا کا مسلک کبھی غیر جانب داری کا تھا کبھی مخالفت کا اور فوجی آدمی اُسے علانیہ نفرت و استہزا کی نظروں سے دیکھتے تھے اور اِس خیال کو صریح حماقت سمجھتے تھے۔ کہ اک ایسی نوعمر لڑکی کے ہاتھ میں سپاہیوں کی جان اور مُلک کا تحفظ و انتظام دے دیا جائے اور بظاہر کون کہہ سکتا تھا کہ شک کرنے والے یا ہنسی اُڑانے والے حق بجانب نہیں ہیں؟ کون بے سوچے سمجھے ملک و اہل ملک کی قسمت کو اک ناتجربہ کار کے کہنے پر اُس کے سپرد کر دیتا؟ تجویز کی گئی کہ حکما و علما کی ایک جماعت ژان کا امتحان لیکر اپنی رائے سے شہزادے کو مطلع کرے چند اسقفوں کے مختصر سوالات کے بعد ژان کو پواتیئر بھیجدیا گیا جہاں کے دارالعلوم مقامی مجلس شوریٰ اور کلیسا کے اربابِ حل و عقد اُس کا امتحان کرنے کو جمع ہوئے۔ ژان اک مجرم کی طرح اِن مُنصفوں کے سامنے لائی گئی اور اُس پر یوں جرح کی بوچھاڑ ہونی شروع ہوئی

ایک راہب نے کہا "تم کہتی ہو کہ خدا فرانس کو بچا لیگا، اگر اُس کی مرضی ایسی ہی ہے تو اُسے جنگجوؤں کی کیا حاجت ہے!"

لڑکی نے ذرا تندی سے جواب دیا "آدمیوں کا لڑنا ضروری ہے، فتح خدا دیتا ہے!"

ژان کسان لڑکی تھی بعض باتوں میں کسانوں کی طرح اکھڑ مزاج۔ ایسی لایعنی باتیں سُنتی تو غصے میں آجاتی۔

ایک پادری نے جو تحقیقات کو اپنے فضول سوالات سے کمزور کرنا چاہتا تھا پوچھا "تمہارے آسمانی مہمان کونسی زبان بولتے ہیں؟" ژان نے جھنجھلا کے جواب دیا "تمہاری زبان سے بہتر!" اُس نے بھی تند خوئی سے کہا "کیا تم خدا کو مانتی ہو؟" لڑکی نے اُسی طرح کہا "ہاں! تم سے بہتر۔" ایسی ہوشیار ترکی بہ ترکی جواب دینے والی کو بحث مباحثے سے عاجز کرنا دشوار تھا۔ راہب نے کہا "نِرے لفظوں سے کچھ نہیں بنتا خدا ہمیں تم پر یقین نہ لانے دیگا جب تک تم اُس کی کوئی نشانی ہمکو نہ دکھاؤ گی۔" اس کا جواب ژان نے نہایت متین لفظوں میں، اگرچہ ذرا غصے سے، یوں دیا "میں پواتیئر کو اس لئے نہیں آئی کہ اپنی نشانیاں دکھاتی پھروں۔ البتہ مجھے اورلیاں لے چلو پھر میں دو نشانیاں دکھا دوں گی جن کے دکھانے کو میں بھیجی گئی ہوں۔ مجھے چاہے کتنا ہی چھوٹا دستہ لڑنے والوں کا دو لیکن مجھے جانے دو" +

اورلیاں کی حالت اس وقت نازک تھی۔ وہاں انگریزوں نے فرانسیسیوں کو محصور کر رکھا تھا
یہ شہر پیرس سے چالیس پچاس میل جنوب مغرب اور شینوں سے اسی نوے میل شمال مشرق میں
دریائے لوآر کے کنارے واقع ہے۔ اس کے اردگرد کوئی پہاڑی یا بلند سطح زمین نہیں بلکہ کوسوں
تک میدان ہی میدان چلا گیا ہے جیسا کہ وسط فرانس کی عام سطحی حالت ہے۔ محاصرین نے
اُس کے چاروں طرف اونچے اونچے بُرج بنا رکھے تھے اور ان سے وہ شہر پر گولہ باری کرتے
تھے، صرف جنوبی طرف جدھر دریا بہتا تھا کچھ کھلی تھی اور ادھر ہی سے محصورین کو سامانِ خورونوش
بہم پہنچتا تھا۔ محاصرے کا کام انگلستان کے بہترین سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھا۔ باشندوں کو کمک
پہنچنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔ شہر کا فتح ہو جانا یقینی تھا۔ ہاں کہیں سے کوئی بڑی فوج حملہ آوروں کو
پس پا کرتی ہوئی آ جاتی تو اور بات تھی لیکن سب جانتے تھے کہ غریب الوطن شہزادہ کے ہاتھ
خالی ہیں وہ اتنی بڑی فوج کیونکر بہم پہنچا سکتا ہے۔ ژان نے ہمیشہ انگریزوں کی شکست اور
اورلیاں کا محاصرہ اُٹھانا اپنے مقررہ کام کا پہلا مرحلہ قرار دیا تھا۔

اس باضابطہ سرکاری تحقیقات کے علاوہ ژان پر عوام الناس کے سوالوں کی بوچھار ہونے
لگی۔ لوگ جوق جوق اُس کے گھر آتے اور سوالوں کی بھرمار کرتے یہاں تک کہ وہ اور اُس کی
آوازیں شہر بھر میں مشہور ہو گئیں اور گردونواح کی آبادیاں بھی اُس کے ذکر سے گونجنے لگیں۔ عورتیں
اُسے سچا گردانتیں مگر اُس کا لباس دیکھ کر ذرا سر ہلاتیں کہ یہ مردوں کا لباس کیوں پہنتی ہے؟
ژان کا جواب تسلی بخش تھا۔ اول تو یہ کہ یہی جنگی لباس تھا، جنگ کرنا عورتوں کا کام نہیں لیکن
جب یہ کام کرنا پڑے تو بجز اس کے چارہ نہیں کہ وہ لڑنے والوں کی وردی زیب تن کریں۔
دوسرے اس لئے کہ اُسے مردوں کے درمیان رات دن رہنا تھا اور یہ لباس ہی اُس کا بہترین
محافظ ہو سکتا تھا۔ ان باتوں کا چرچا لازم تھا۔ اگر اُسے اپنا کام سرانجام دینا تھا تو بہتر یہی تھا کہ خاص
عام اُس کی بات بات کو جان جائیں۔ آخر علما و حکما نے فیصلہ کیا کہ وہ ژان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتے
اور اُنہوں نے مجبوراً بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ آپ اِس سے جو کام چاہیں لے سکتے ہیں۔ اس کے
بعد ژان کو شینوں لایا گیا جہاں ملکۂ فرانس اور دوسری خواتین نے ایک نسوانی تفتیش پہلی تحقیقات
سے زیادہ سخت اور نتیجہ خیز، شروع کر کے اُس کے بھولے پن اور عصمت کی اچھی طرح پڑتال کی۔

نتیجہ وہی ہوا کہ وہ بھی ژان کے خلاف کوئی سخن زبان پر نہ لاسکیں اور اُسے قطعی نیک و پاک کہہ کر انہوں نے اُس کے حق میں فیصلہ کر دیا +

اب وقت آگیا کہ دوشیزہ کو اُس کے عظیم الشان کام کے لئے تیار کیا جائے۔ اُس کی رہائش کا باقاعدہ انتظام کیا گیا اور ایک فوجی عملہ اُس کی خدمت و مشورت کے لئے مامور کیا گیا جسکا سرکردہ ژان دولوں تھا + چارلس اُسے اپنے پاس سے ایک تلوار دینا چاہتا تھا لیکن ژان نے خود ہی حکم دیا کہ فیئر بوآ کے گاؤں میں (جو شینوں کو آتے راہ میں پڑتا تھا) سینٹ کاترین کے گرجا کی اونچی قربانگاہ کے عقب میں ایک تلوار مدفون ہے وہ اُس کے لئے لائی جائے۔ تلوار وہیں ملی جہاں ژان نے بتایا تھا۔ صاف وصیقل کرکے گرجا والوں نے اُسے اک قرمزی مخمل کے میان میں رکھا۔ اور ژان کو تحفۃً بھیجدی + دوسری چیز جس کی اُسے ضرورت تھی اُس کا عَلَم تھا جس کی اُس کے دل میں بڑی اہمیت تھی + یہ عَلَم جو طور میں تیار کیا گیا سفید کتان کے کپڑے کا تھا۔ جس پر ریشمیں جھالر ٹکی تھی اور حضرتِ مسیح کی اک شکل بنی تھی کہ اپنے ہاتھوں میں کرۂ ارض کو تھامے ہوئے ہیں اور دائیں بائیں دو فرشتے حسنِ عقیدت سے دوزانو ہیں + نیچے لکھا تھا "مریمؑ مسیحؑ" + عَلَم ژان کی ہدایات کے مطابق بنایا گیا تھا۔ جو دراصل اُس کی مرشد مارگریت اور کاترین کے اشارات تھے + طور میں اب تک اس کی نقل موجود ہے نسلاً بعد نسلٍ لوگ اِس کا نقشہ اُتار کر ایسے بیسیوں جھنڈے تبرکاً تیار کرتے رہے + ژان نے ارادہ ظاہر کیا کہ وہ خود ہی عَلَم بردار بنے گی۔ سپہ سالار کے لئے عَلَم برداری اک عجیب سا کام تھا لیکن ژان کے آسمانی رہبروں کا ارشاد یہی تھا جس سے سرِ مو تجاوز ناممکن تھا۔ اُنکی ہدایت تھی کہ "خدا کی راہ میں عَلَم کو تھام لے اور اُسے دلیرانہ لئے جا" علاوہ بریں اس میں اُس کا اک سادہ طفلانہ مطلب بھی تھا جو اُس نے شرماتے ہوئے ظاہر کیا کہ "میرا مطلق ارادہ نہیں کہ میں اپنی تلوار چلاؤں اگرچہ مجھے اُس سے بڑی محبت ہے، میں کسی شخص کی جان نہیں لینا چاہتی" عَلَم برداری کا کام کسی کو دُکھ نہ دیگا، اس سے کسی کا خون نہ بہے گا! ملاحظہ ہو کہ عَلَم بھاری اتنا تھا کہ اک نازک اندام شہری خاتون اُسے نہ اُٹھا سکتی، یہ اک مضبوط کسان لڑکی ہی کا کام تھا کہ اُسے گھنٹوں اُٹھائے اُٹھائے پھرے!

تحقیقات و تفتیش میں بہت وقت گذر گیا یعنی قریب قریب دو ماہ صرف ہو گئے تھے + ژان کی نظروں میں یہ وقت محض ضائع ہوا کیونکہ اس دَوران میں اورلیاں کے مصیبت زدہ لوگ

انگریزوں کے حملے سہتے سہتے تھک گئے، یوں تو دُونوآ سا سالار شہر کی محافظت پر کمر بستہ تھا لیکن اس کھیل میں ہار ہی ہار تھی ہار فرانساوی قوم کی سیرت سے مطابقت نہ رکھتی تھی۔ انگریزوں سے پے در پے زک اُٹھانے کے باعث اُن کی اٹل فتحمندی کا خیال لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہُوا تھا، یہ قسمت کی اک بدنصیبی تھی جس سے وہ اپنے تئیں بچا نہ سکتے تھے اور دونوآ کو بھی یقین تھا کہ ہتھیار ڈال دینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں + ایسی حالت تھی کہ ژان طُور سے ہوتی ہُوئی بلوآ پہنچی + جنگجوؤں کی ایک چھوٹی سی جمعیت اور بہت سے قائد اور کپتان ساتھ تھے + ملکۂ صقلیہ نے غازیۂ فرانس کو اپنے ہاتھوں سے آراستہ کیا تھا۔ اپنی سفید و تاباں زرہ پہن کر وہ فرشتۂ میکائیل کی سی اک نورانی صورت بن گئی۔ اُس کا سر برہنہ تھا اور چمکتے ہُوئے سورج میں وہ ایک آسمانی خاتون معلوم ہوتی تھی جو سرسبز شاداب میدانوں کو اپنی مختصر جمعیت کے ساتھ عبور کر رہی ہے تاکہ اُنہیں کسی پاکیزہ عبادت گاہ کی طرف لے چلے + ژان پہلے سے یہ بات واضح کر چکی تھی کہ حملہ کرنے سے پہلے وہ ربانی پیغام کے بموجب انگریزوں کو خدا کا واسطہ دے کر یہ آخری تجویز پیش کرے گی کہ وہ اپنی فتوحات ترک کر دیں اور فرانس کو فرانساوی قوم کے حوالے کر کے انگلستان کو چل دیں + پس طُور سے اُس نے یہ خط انگریزوں کے نام بھیجا:۔

یسُوع مریم!

شاہِ انگلستان اور تُو ڈیوک بیڈفورڈ جو اپنے آپ کو ناظمِ فرانس کہتا ہے اور تُو طامس میر میزان جو اپنے آپ کو اس بیڈفورڈ کا قائد پکارتا ہے! آسمانوں کے بادشاہ کا پیام سنو! دوشیزہ کو جسے مالکِ زمین و آسماں نے یہاں بھیجا ہے تمام اُن اچھے شہروں کی چابیاں دے دو جو تم نے اُس کے فرانس میں بجبر و تشدد فتح کئے ہیں۔ اُسے خدا نے بھیجا ہے تاکہ وہ چھنے ہُوئے حقوق شاہی کی بحالی کرے۔ وہ تمہارے ساتھ مصالحت کرنے کو تیار ہے اگر تم مناسب بات کو مان لو اور فرانس کے ساتھ انصاف کرو اور جو کچھ تم نے غصب کیا ہے ادا کر دو + اور تم تیر انداز و جنگجو خدا کے بندو جو اورلیاں کے گرد پڑے ہو! خدا کی راہ میں سلامتی کے ساتھ چل دو۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو جلد ہی دوشیزہ کی آمد آمد کی خبر سُن لو گے جس سے تمہیں عنقریب

بہت دکھ پہنچے گا۔ شاہِ انگلستان! اگر تم اس کی تعمیل نہ کرو گے تو سمجھ لو کہ اس جنگ کی سرکردہ میں ہوں اور جہاں کہیں فرانس میں میں تمہارے آدمیوں کو پاؤں گی انہیں ملک چھوڑ دینے پر مجبور کر دوں گی۔ میں خدا کی طرف سے جو آسمانوں کا بادشاہ ہے یہاں بھیجی گئی ہوں کہ تم سب کو فرانس سے باہر نکال دوں۔ اگر تم میرا حکم مانو گے تو میں نرمی کے ساتھ پیش آؤنگی۔ اور اپنی ہٹ پر قائم نہ رہو اس لئے کہ تم مریم مقدس کے بیٹے کی طرف سے ملک کے سپردار نہیں ہو بلکہ خدا کی طرف سے چارلس، حقیقی ولی عہد ہی سچا حکمران ہے کیونکہ مشیتِ ایزدی یوں ہی ہے۔ اور یہ الہام ہے دوشیزہ کا جو پیرس میں اچھے لوگوں کے ہمراہ داخل ہوگی۔ اگر تم اپنے پروردگار اور دوشیزہ کی یہ باتیں نہ مانو گے تو یاد رکھو کہ جہاں کہیں بھی تم پناہ گزیں ہوگے ہم تمکو ڈھونڈھ نکالیں گے اور ایسا ہنگامہ برپا کردیں گے کہ فرانس نے ہزار برس سے نہ دیکھا ہوگا۔ اور یقین کئے رہو کہ آسمانوں کا بادشاہ دوشیزہ کو اور اس کے لڑنے والوں کو اتنی قوت بخشیگا کہ تمہاری طاقتیں سب کی سب دھری رہ جائیں گی۔ اے ڈیوک بیڈفورڈ۔ دوشیزہ تجھ سے منت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ تو لوٹ مار کو ختم کردے۔ اگر تو عقل سے کام لے تو اب بھی تو اس کے دائرۂ مصاحبت میں آجائے جہاں فرانس مسیحیت کیلئے وہ کام کر دکھائے جو کبھی نہیں کیا گیا۔ تو جواب دے کہ کیا اب بھی تو شہر اورلیاں کی تباہی پر کمربستہ رہیگا؟ اگر تو ایسا کریگا تو تھوڑی ہی مدت کے بعد اُن مصیبتوں کو روئے گا جو تیرے سر پر ٹوٹ پڑینگی!

المرقوم بروز ہفتہ (۲۲ مارچ ۱۴۲۹ء)۔

ژان نے اس اثناء میں اپنی مختصر فوج میں اک انقلابِ عظیم پیدا کردیا تھا۔ اب تک اُسے مطلق خبر نہ تھی فوج کسے کہتے ہیں اور فوجی انتظام کس طرح کیا جاتا ہے؟ لیکن اب جب کہ وہ اُن کی سپہ سالار بن چکی تھی وہ اپنی طبیعت کے مطابق بالکل نڈر اور صاف گو ہوکر فوج کے کونے کونے میں گشت کرنے لگی۔ عام برائیاں جو ایک معمولی کپتان نظرانداز کردیتا ہے اُس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکیں، اُس نے حکم دے دیا کہ سپاہی بڑی بڑی لایعنی قسمیں کھانا اور مغلظات بکنا قطعی طور پر چھوڑ دیں چنانچہ بڑے کپتان لائیر کو بھی جو ایک نامہذب کھردرا سا آدمی تھا صرف یہ اجازت تھی کہ وہ اپنے ڈنڈے کی قسم کھائے۔ ژان بے دھڑک فوج

کی صفوں میں اِدھر سے اُدھر پھرتی، شریر و خبیث لشکری اُس کے آنے پر تتر بتر ہو جاتے وہ جہاں جاتی اپنے غوغائی اکھڑ بھائیوں کو نصیحت کرتی کہ جتنے دنوں اس دنیا میں جیتے ہو اپنا اپنا فرض ادا کرو اور اگلی دُنیا کو دل سے محو نہ کرو۔ اگر وہ جان لیتی کہ کسی سپاہی کو "اعتراف گناہ" کرنا ہے تو کوچ کرتی ہُوئی فوج کو ٹھیرنے کا حکم دیتی، اُس کا دل نہایت نرم و حساس تھا۔ وہ کسی کو مرتے دیکھنا گوارا نہ کرسکتی تھی حالانکہ اُس کا منصبی کام ہی یہ تھا کہ اپنے مقصد کے حصول میں دائیں بائیں خون کی ندیاں بہتی دیکھے۔ جہاں کہیں کسی فرانسیسی یا انگریز کو بھی دم توڑتا دیکھ پاتی اُسے یہی فکر ہوتی کہ کہیں یہ بدنصیب "اعترافِ گناہ" کئے بغیر آنکھیں نہ بند کرے۔

اورلیاں کے قریب ڈُونوا جو محصورین کا سرِ عسکر تھا اور ژاں کا استقبال کرنے کو نکلا تھا ملا۔ دراصل ژاں کو دھوکا دیا گیا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ بلاتوقف انگریزی قلعہ بندیوں پر حملہ کردے لیکن وہ یہاں کی جغرافی حالت سے آگاہ نہ تھی اور اُس کے رہبر اُسے جان بوجھ کر سامنے کے کنارے پر لے آئے۔ یہ اُن فریب کاریوں کا آغاز تھا جن سے دوشیزۂ فرانس کو مسلسل واسطہ پڑا۔ قائد کپتان لفٹنٹ سب اُس کی شہرت و سبقت سے جلتے تھے۔ جہانتک ہوسکتا تھا۔ وہ اُس کی تجویزوں کو رد کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن عموماً ناکام رہتے اور نتیجتہً شرمسار۔ ژاں دریا کو عبور کرکے ڈُونوا سے ملی اور بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اُس کے ساتھ صاف صاف باتیں کرنے لگی۔ "کیا تم اورلیاں کے قائد ہو؟" اُس نے جواب دیا "ہاں میں ہی ہوں" اور "مجھے تمہارے آنے کی خوشی ہے"! ژاں نے کہا "کیا تمہیں ہو جو مجھے دریا کے اس کنارے پر لائے ہو۔ اور اُس کنارے پر نہیں لے گئے جہاں ٹالبٹ اور اُس کے انگریز ہیں؟" اُس نے عذر کیا کہ اُسکی اور دوسرے معاملہ فہموں کی یہی رائے تھی۔ ژاں نے ذرا زور سے کہا "خدا کی رائے جو ہمارا آقا ہے زیادہ صائب اور زیادہ سودمند ہے" مسافری کشتیوں کی کمی کے باعث فوج کو تو بلوآ لوٹنا پڑا اور ژاں اپنی مرضی کے خلاف اُس وافر سامان رسد کے ساتھ جو وہ اپنے ہمراہ لائی تھی دریا کو عبور کرنے لگی۔ ہوا مخالف تھی، لدی ہُوئی کشتیوں کے لئے پار ہونا دشوار نظر آتا تھا۔ ژاں بولی "ذرا صبر کرو۔ خدا کی مدد سے سب کچھ ٹھیک ہو جائیگا"۔ کہتے ہیں کہ ہوا کا رُخ فوراً تبدیل ہو گیا اور سب کشتیاں کنارے لگ گئیں۔ غنیم نے بھی کچھ دخل نہ دیا جیسا

کہ ژان نے پہلے ہی سے پیشین گوئی کر دی تھی۔ کنارے کنارے ہوتے یہ جماعت شام کے آٹھ بجے شہر میں داخل ہوئی۔ دوشیزہ کے استقبال میں شہر کے سب جوان اور بوڑھے عورتیں اور بچے گھروں سے نکل نکل کر بازاروں میں دورویہ کھڑے تھے۔ ژان سیاہ زرہ والے جنگجوؤں کے عین بیچوں بیچ ایک سفید گھوڑے پر سفید زرہ پہنے اور سفید جھنڈا لئے آرہی تھی ایسے جیسے اندھیری رات میں تاریک بادلوں کے درمیان چودھویں کا چاند اپنے نقرئی حسن کے ساتھ تیرتا ہے۔ اُس کا سفید جھنڈا ہوا میں لہرا رہا تھا، اُس کی سفید زرہ چراغ و مشعل کی تیز روشنی میں جگمگا رہی تھی وہ ہو بہو اپنے فرشتۂ رحمت میکائیل کی تصویر معلوم ہوتی تھی!۔ شہر والے لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، امید کی بعید سے بعید جھلکی بھی کہیں نظر نہ آتی تھی، اُن کی شکست یقینی تھی اور پھر اس ذلت کا خیال کہ اورلیاں کی فتح فرانس کی تسخیر کا پیش خیمہ ہوگی غایت درجہ جاں فرسا اور یاس انگیز تھا۔ پھر کیا تعجب ہے کہ لوگوں نے اُس کا یُوں خیر مقدم کیا گویا انہوں نے خدا کو اپنے درمیان اُترتے دیکھا۔ وہ اپنے دائیں بائیں لوگوں کو تقریر کئے جاتی تھی، انہیں تسلی دیتی تھی کہ گھبراؤ نہیں اور کہتی تھی کہ اگر تم میں ایمان باقی ہے تو تم یقینی طور پر اس دُکھ سے نجات پالو گے۔ ان مجمعوں سے گذر کر اُس نے گرجا میں جا کر اپنی نماز پڑھی اور خدا کا شکر ادا کیا اور پھر اُس مکان کو لوٹی جو اُسکی رہایش کیلئے منتخب ہُوا تھا۔ یہ دیوک اورلیاں کے خزانچی کا مکان تھا۔ وہاں اِس سر برآوردہ مہمان کی آمد کی تقریب میں ایک پُرتکلف ضیافت دی گئی۔ دُونوآ اور لائیر دونوں نے خوب پیٹ بھر کے کھانا کھایا لیکن ژان نے صرف روٹی کے چند ٹکڑوں پر اکتفا کیا۔ اس کے بعد وہ ایک خاموش کمرے میں اپنے بستر پر جا لیٹی جہاں دستورِ قدیم کے مطابق گھر کی چھوٹی بچی شارلوت اُس کی شریکِ بستر ہُوئی۔ دونوں ژان دَمتیز، دُپولینی اور دوشیزہ کا بھائی پیئر سب اسی مکان کے دوسرے کمروں میں مقیم تھے یہ ۲۹، اپریل ۱۴۲۹ء کی رات تھی!

× × × × × × × × × × × × × × × × × ×

دُوسرے دن ایک مجلس حربی منعقد ہُوئی جس میں سب فوجی افسر جمع تھے۔ ژان کی دلی خواہش تھی کہ انگریزوں پر فوراً حملہ کیا جائے۔ حالانکہ ابھی تک اُس کے ہمراہی جنگجو

شہر میں نہ پہنچے تھے۔ اُس کی قطعی رائے تھی کہ حملے میں ایک لمحہ بھی توقف نہ کرنا چاہئیے لیکن کپتانوں نے جو مدت سے محض مدافعانہ کارروائی میں مصروف رہے تھے اس کی سخت مخالفت کی۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے ژان کے اس قومی کام کے دَوران میں سوائے چند در چند افسروں کے (جن میں دُونوآ لائیر آلاسون زین ترائی وغیرہ شامل تھے) باقی سب فوجیوں نے قدم قدم پر اُس کی مخالفت کی دشمنی میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور ہمیشہ ہر بات میں رخنہ اندازی کی پُوری کوشش کی۔ وہ دوشیزہ کی شہرت پر خار کھاتے تھے۔ اُن کا دل جلتا تھا کہ ہم مہینوں برسوں سے لڑتے آئے ہیں ہر ہر میدان میں ہمیں زک اُٹھانی پڑی ہے اور اب یہ کسان لڑکی یہ گنواری آکر ہماری سردار بنتی ہے اور میدانِ جنگ میں سپاہیوں کی سرکردہ بنکر فتح کی آرزومند ہے اور فتح حاصل بھی کر لیتی ہے!! یہ حاسد ہمیشہ اُسے گنواری کہہ کر پُکارتے تھے۔ شریف النسل، اپنے اور اپنے باپ دادا کے کارناموں پر فخر کرنے والے اک گمنام عورت کی قیادت میں لڑنا ننگ و عار سمجھتے تھے۔ یہ تھی ژان کے ہم مُلکوں کی شرمناک حالت۔ اُدھر انگریز اُسے اپنی دشمن اور ایک جادوگرنی جانتے تھے جس کی سحرکاریاں سورماؤں کے بازو شل کر دیتی ہیں جس کی فسونگری بڑے بڑے جوانمردوں پر ایسا اثر کرتی ہے کہ اُنہیں بھاگتے ہی بنتی ہے ژان اِس فیصلے پر بہت ناراض تھی۔ اُسے اپنی ساری مُصیبتوں میں کبھی ایسی مایوسی نہ ہُوئی تھی جیسی کہ اِن باتوں سے ہُوئی۔ لیکن وہ حرفِ شکایت لب پر نہ لائی اور بلا چون وچرا اپنا کام کئے گئی۔ اُس نے دو قاصد انگریزوں کے پاس یہ پیام دے کر بھیجے کہ حکمِ خدا کے مطابق تم اپنے قلعے چھوڑ دو اور گھر چلے جاؤ۔ اُنہوں نے جواب میں دوشیزہ کو تندی کے ساتھ بُرا بھلا کہا کہ "تو گوالن ہے گھر جاکر اپنی گایوں کو سنبھال" اور یہ بھی کہلا بھیجا کہ "اگر تو اپنی ہٹ سے باز نہ آئیگی تو تجھے پکڑ کر جلادیں گے"۔

اِسی روز شام کے وقت وہ اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ پُل کی طرف گئی۔ پُل بیچ میں سے توڑ ڈالا گیا تھا۔ دریا کے پار غنیم اپنی قلعہ بندیوں میں متمکن تھا۔ ژان ٹوٹے ہُوئے پُل پر غنیم کے قلعہ ٹُوریل کے جتنا قریب ہو سکا گئی اور بلند آواز سے اُنہیں کہا کہ ابھی وقت ہے چلے جاؤ۔ اُدھر سے گالیوں کی ایک بوچھاڑ ہُوئی۔ "گوالن" اور "گنواری" پر بس ہوتی تو خیر برداشت ممکن

تھی، غنیم نے ایسے فحش اور دل آزار کلمات کہے کہ (ایک بیان کے مطابق) بے اختیار ژان کے آنسو نکل پڑے لیکن اُس نے صرف اتنا ہی کہا کہ "تم جھوٹ بولتے ہو۔ یہ کہہ کر شہر کو واپس آگئی!
اس کے بعد دو دفعہ وہ دُولوآ کے ہمراہ اپنی فوج کو آتا دیکھنے کے لئے شہر سے نکلی اور غنیم کے پاس سے ہو کے گذری لیکن نہ کوئی آدمی اپنی جگہ سے ہلا نہ کوئی بندوق چلی جیسا کہ ژان نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ ہوگا۔ جب کبھی وہ قلعہ بندیوں کے پاس سے گذرتی تو بدستور گالیوں کی بوچھار ہوتی جس کے جواب میں وہ خدا کا واسطہ دے کر پھر کہتی کہ انگلستان کو لوٹ جاؤ۔
۴ مئی کو ایک عجیب وغریب واقعہ ظہور میں آیا۔ ژان کی فوج صبح اورلیاں میں داخل ہو چکی تھی۔ اُس کا مصاحب اعلیٰ دولوں تھک کے سو رہا تھا، شہر کے کپتانوں نے کمک کا فائدہ اُٹھا کر بغیر نئے قائدوں کے مشورے کے فصیل سے باہر نکل کر غنیم پر حملہ کردیا۔ یہ اک حاسدانہ کارروائی تھی جس کا مقصد تھا کہ ژان کی غیر حاضری میں فتح کا سہرا ہمارے سر رہے۔ اچانک ژان نہایت گھبراہٹ اور خوف کی حالت میں اپنے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی "آوازوں" نے اُسے سوتے سے جگا دیا تھا۔ اُس نے چلا کر کہا "میری مجلس شوریٰ مجھے انگریزوں پر حملہ کرنے کو کہتی ہے۔ یہ میں نہیں جانتی کہ اُن کے قلعوں پر حملہ کرنا ہے یا میدان میں لڑنا ہے؟" جوں جوں اُسے ہوش آنے لگا۔ اُس کا ہیجان بڑھنے لگا۔ "ہمارے جنگجوؤں کا خون بہ رہا ہے" اُس نے کہا "اُنہوں نے مجھے کیوں نہ بتایا؟ لاؤ میرے ہتھیار! میرے ہتھیار!" خادم سمجھے کہ اُس کے دماغ میں خبط پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن دولوں ژان کو خوب جانتا تھا۔ اُس نے اپنی خاتون کو جلد جلد مُسلح کیا۔ ژان گھر سے باہر نکلی، گھوڑا تیار تھا، نوکر نے دریچے سے جھنڈا دیا، اُسے لیا اور اسپ تازی کو ایڑ لگا کے شہر کے کوچوں بازاروں میں وہ بجلی کی طرح کوندتی ہوئی چلی۔ مصاحب ایک ایک کر کے پیچھے دوڑے اور دُور سے شور وغل سُن سُن کر حیران وپریشان ہونے لگے کہ کیا ماجرا ہے۔ ژان کا ادراک درست تھا۔ حاسدوں کی ایک جمعیت نے شہر سے چُپکے چُپکے نکل کر انگریزی قلعہ سینٹ لوپ پر حملہ کیا تھا، لیکن نتیجہ وہی ہوا جو اس سے پہلے سبھی حملوں کا ہوا تھا
ژان شہر کے دروازے سے سرپٹ گھوڑا دوڑائے باہر نکلی ہی تھی اُس کا جھنڈا ہوا میں اُڑ رہا تھا، اُس کی سفید زرہ سورج میں چمک رہی تھی، کہ سامنے سے فراری اُسے ملے کہ جانیں

بچانے کے لئے اپنے اپنے گھروں کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اُس نے اُنہیں کچھ نہیں کہا کہ تم کیوں بھاگے جاتے ہو؟ البتہ اُس کے ہمراہی سپاہیوں اور شہریوں نے اِن بزدلوں کو موڑا۔ ژان سیدھی انگریزی قلعے کے برُج کی طرف جا رہی تھی۔ دُ دلُوا ستّی بھول گیا جب اُس نے دُور سے دیکھا کہ وہ عین برُج کے نیچے جا پہنچی ہے۔ اُس کی سیرت نگار خوب لکھتی ہے کہ "جو کچھ اُس نے کیا وہ نہ عورت کے کرنے کا کام تھا نہ عورت کے بیان کرنے کی بات"۔ ژان شہریوں کی سرکردہ بنی، دُ دلُوا سپاہیوں کا۔ ژان نے پہلی بار فرنساوی خون بہتا دیکھا اور اس خیال سے کانپ گئی کہ مرنے والوں میں بعض "اعترافِ گناہ" کئے بغیر زندگی کو خیرباد کہہ رہے ہیں لیکن یہ ایسے پاکیزہ خیالوں کا وقت نہ تھا، سب سے بڑی ضرورت اس بات کی تھی کہ قلعہ کے ذرائع آمد و رفت منقطع کر دیئے جائیں اور اُسے الگ تھلگ کر دیا جائے۔ لڑائی گھمسان کی ہونے لگی انگریز دم توڑ کے لڑے۔ وہ اس خیال سے پاگل ہو گئے تھے کہ یہ بلائے ناگہانی کیسے ٹوٹ پڑی؟ اُدھر فرنساوی اسی خیال سے شیر بن گئے تھے کہ یہ فرشتۂ آسمانی ہماری مدد کو کیونکر نازل ہُوا!

لارڈ ٹالبٹ نے دوسرے قلعوں سے کمک بھیجی مگر وہ شہر سے آنیوالے فرانسیسیوں نے راہ ہی میں روک دی۔ شام کا وقت تھا جب کہ آخر کار قلعہ فتح ہو گیا۔ اورلینئیوں نے قیدی ایک نہ پکڑا، سب کو تہ تیغ کر دیا۔ اِن تاریک ساعتوں میں دوشیزہ اپنا عَلَم تھامے ہُوئے ہر جگہ سے صاف نظر آتی تھی۔ نگاہ سب سے پہلے اُسی پر پڑتی تھی، کبھی اپنے جنگجوؤں کو نعرہ مارتی کبھی آنکھوں سے دو آنسو گراتی، سارا وقت وہ صفِ اول میں قائم رہی لیکن کسی کے قتل کو تلوار نہ اُٹھائی۔ جب فتحمندی کے ساتھ شہر کو لوٹی تو اپنے ہمراہ قیدیوں کا اک خاصہ گروہ لائی جس کی وہ خود محافظت کرتی تھی تاکہ کسی دشمن کو ذرا بھی گزند نہ پہنچے۔ یہ تھا ژان کا پہلا حملہ کس قدر تعجب انگیز! یہ تھی اُس کی پہلی فتح، کتنی شان دار!!

دُوسرے دن مجلسِ حربی منعقد ہوئی۔ دوشیزہ کو فوجیوں کا یہ فیصلہ کہ صرف چھوٹے قلعوں پر حملہ کیا جائے ناگوار معلوم ہُوا۔ حسنِ اتفاق سے غنیم نے خود ہی چھوٹے قلعے چھوڑ دیئے اور بڑے قلعوں میں اجتماعِ قوت کے اصول کے مطابق متمکن ہو گئے۔ شہر دریا کے دائیں طرف آباد تھا اور انگریزوں کے بڑے قلعے بائیں کنارے پر تھے۔ قلعہ آگستن پر حملہ کیا گیا۔ لیکن

ناکام رہا۔ فرانسیسوں کا انبوہ دوشیزہ کے اسپ کو دریا میں دھکیلے دیتا تھا کہ اُس کی آنکھ میں عزم کی بجلی چمک اُٹھی۔ گھوڑے کو ایڑ لگا کے اک ایسا نعرہ مارا کہ من چلے فرانسیسی سب اُسکے پیچھے ہو لئے۔ آن کی آن میں وہ قلعے کی نواحی خندق کے قریب تھی، یہاں اُس نے استقلال کے ساتھ اپنا علَم گاڑ دیا۔ میشلے لکھتا ہے کہ یہ فتح زیادہ تر کپتانوں کے زورِ بازو سے ہُوئی۔ یہ درست ہوگا، کیونکہ ژان خود اپنے زورِ بازو سے نہ جیت سکتی تھی۔ اُس نے تو عمر میں ایک بار بھی دشمن کے مارنے کو ہاتھ نہ اُٹھایا۔ لڑنے اَور تھے وہ صرف رستہ دکھانے والی تھی، وہ کام کرنے والے تھے یہ فتح دلانے والی؛ وہ جسم تھے یہ اُن کی رُوح۔ جب اُنہیں ژان کی بدولت جوش آجاتا تو وہ وہی پُرانے شجاع تھے۔ جنہوں نے فرانس کو ایک زبردست طاقت بنا دیا تھا۔ جب ہمت ہار دیتے تو وہ تھے اور انگریزوں کا تعاقب! ایسا ہی اثر دوشیزہ کا انگریزوں پر تھا۔ جب بقول اُن کے وہ اُس کا پُرجوش چہرہ اور سفید چمکتی زرہ دیکھ پاتے تو اُن پر جادو سا چل جاتا اور وہ بھول جاتے کہ اِنہیں فرانسیسوں کو اُنہوں نے بیسیوں لڑائیوں میں پچھاڑا ہے۔

۶ رمئی کو قلعہ آگستن فتح ہوگیا۔ رات کا اندھیرا زیادہ ہو رہا تھا۔ اس لئے دُوسرے بڑے قلعہ "لے ٹوریل" پر حملہ نہ ہو سکتا تھا۔ ژان کو خفیف سی چوٹ بھی آئی تھی۔ فوجیوں نے اُسے ترغیب دے کر شہر بھیج دیا اور خود یہ صلاح کی کہ اب شہر بالکل محفوظ ہے اور شہریوں کے پاس کافی خورد نوش کا سامان ہے، چنداں ضرورت نہیں کہ لڑائی کو جاری رکھا جائے۔ ژان نے یہ خبر رنج و مایوسی کے ساتھ سُنی اور خبر رسانوں سے بولی، "تم نے اپنی مجلس جمالی ہے اور میں نے اپنی۔ پھر اپنے پادری سے کہا کل پَو پھٹتے ہی میرے پاس آنا اور برابر میرے ساتھ رہنا، کل مجھے بہت کام کرنا ہے امیرا خون بہے گا اور اپنے دائیں شانے کی طرف اشارہ کرکے کہا" کل میں زخمی ہونگی" اس سے ایکماہ پہلے بھی وہ یہی پیشین گوئی کر چکی تھی اور واقعہ سے تین ہفتے پہلے براباں کی کتاب البلد میں یہ بات مرقوم بھی ہوگئی تھی۔ صبح ہوتے ہی وہ شہر چھوڑ کے نکلی اگرچہ فوجیوں اور دوسرے سازشیوں نے اُسے بہت روکا۔ اُس کے بلند مرتبہ میزبانوں نے کہا "ٹھیرو اور ہمارے ساتھ اس تازہ دریائی مچھلی کے کھانے میں شریک ہو جاؤ" وہ بولی "اسے شام کے لئے رکھ چھوڑو۔ میں پُل پر سے واپس آؤں گی اور چند گوڈنوں (انگریزوں) کو بھی لئے آؤں گی کہ اپنا اپنا حصہ لیں" یہ کہہ کر وہ

روانہ ہوئی۔ اُسکے پُرجوش پیرو اُسکے پیچھے تھے۔ ایک بڑے افسر نے اُنہیں شہر کے آخری دروازے پر روکنا چاہا مگر یہ طوفان ایسا نہ تھا کہ تھامے تھم سکتا۔ لوگ دیوانہ وار کشتی میں اُسکے ساتھ کُود پڑے سامنے ٹُورِیل کا قلعہ تھا اور یہی غنیم کی تنہا جائے پناہ تھی۔ فرنساوی فوج پڑی سستا رہی تھی نہ اُس میں آگے بڑھنے کا خیال تھا نہ پیچھے ہٹنے کے آثار۔ ژان کے پیرو قدم قدم پر اُسکے ساتھ تھے۔ وہ فرانسیسیوں کی اُس خشمگیں بلند ہمتی اور بے پرواجرأت کے بل پر کارزار میں گھُس گئے جو ایسے جوش و انہماک کے وقتوں میں اپنے کرتب دکھاتی ہیں۔ جنگ و قتال کے عین بیچوں بیچ دوشیزہ کی صاف و بلند آواز سُنائی دیتی تھی "خُدا کی راہ میں"! خدا کی راہ میں"! اور اپنے آپ سے کہتی تھی۔ اچھا دل، اچھی اُمید! بس اب وہ ساعت قریب ہے"! لیکن کئی گھنٹوں کے پے در پے حملوں کے بعد حملہ آوروں کی ہمت میں کمی نظر آنے لگی۔ ژان نے یہ دیکھا تو ایک سیڑھی پکڑ لی اسے قلعے کی دیوار کے ساتھ رکھکر چڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ ایک تیر عین اُسکی چھاتی میں لگا۔ دوشیزہ دھم سے زمین پر گر پڑی، لوگ اُسکے چاروں طرف آ جمع ہوئے، آن کی آن تو ایسا معلوم ہُوا کہ سب اُمیدیں ملیا میٹ ہوگئیں! کہتے ہیں کہ اس رقت آمیز ساعت میں اُسکا سب سے بڑا دشمن، جس نے ہر بات میں ژان کی تجاویز کو رد کرنیکی کوشش کی تھی، اُسکے پہلو میں کھڑا تھا، وہ بے اختیار بول اُٹھا "اے دلاور خاتون! اے میرا گھوڑا، اور دل سے کدورت مٹا دے، میں مانتا ہوں کہ میں ہی غلطی پر تھا"! دوشیزہ بولی "اگر میرے دل میں کدورت تھی تو غلطی میری تھی کہ کوئی جنگجو ایسا شریف نہیں گذرا جیسا کہ تُو"۔ وہ اُسے اُٹھا کے کسی آرامگاہ میں لیجاتے لیکن ژان کو یہ منظور نہ تھا۔ اُس نے خود اپنے ہاتھ سے تیر کو جو ایک بالشت باہر کو نکلا ہُوا تھا کھینچا۔ درد شدت کا تھا وہ ضبط نہ کرسکی اور درد سے بے اختیار چلا اُٹھی۔ کسی نے قریب سے کہا "اس پر منتر پھونکدیں" مگر فوراً جواب ملا "اس سے مجھے موت منظور ہے"! پھر ژان نے اعترافِ گناہ کیا گویا وہ سمجھتی تھی کہ شاید دُنیا کو خیرباد کہنے کا وقت آگیا ہے!

لیکن بہت جلد اُسکے مزاج میں اک انقلابِ عظیم پیدا ہوگیا۔ اُس نے دیکھا کہ حملہ آوروں کے پاؤں لڑکھڑا رہے ہیں اور قریب ہے کہ اُکھڑ جائیں۔ دُونوا نے کہا پیچھے کو ہٹ جانا مناسب ہے۔ یہ سُنا تو وہ جھنجھلا کے اُٹھی اور بصد دُشواری اپنے اسپ پر سوار ہو کے قائدوں سے بولی "تھوڑا آرام کرو کچھ کھاؤ پیو اور تازہ دم ہو جاؤ۔ پھر جب تم میرا علَم دیوار کے ساتھ اُڑتا ہُوا دیکھو تو قدم بڑھاؤ اور بڑھے چلو کہ قلعہ ہمارا ہی ہے"!

یہ کہہ کر ژان انگور کی ایک بیل کی آڑ میں جا ٹھیری اور خدا سے دُعا کی۔ پھر اپنا عَلَم تھام کر اپنے خادم سے بولی "مجھے بتا دیجو جب میرا عَلَم دیوار کو چھوئے! وہ بڑھے گئی حتیٰ کہ خادم نے کہا کہ عَلَم اب دیوار کو چھو رہا ہے۔ دوشیزہ نے چلّا کے کہا "بہادرو! چلو! چلو! قلعہ تمہارا ہی ہے!" فوج یک دلی کے ساتھ اُٹھی اور قلعے کی دیوار پر جا پڑی۔ ژان کا عَلَم اُس کے ہاتھ میں ہے بدستور اُس کا نعرہ تھا "سب کچھ تمہارا ہی ہے"۔ برسوں سے ایسا جوش و خروش ایسی جانفروشی و دلاوری فرانسیسوں میں نہ دیکھی گئی تھی۔ وہ دیوار پر یوں چڑھ گئے گویا وہ ایک زینہ ہے"۔ انگریز قلعے کے اندر بدحواس ہو کر چیخنے لگے کہ "کیا یہ سمجھتے ہیں انہیں موت نہیں آ سکتی؟" حیران تھے کہ یہ کوئی جادوگرنی ہے یا فرشتۂ غیب؟ ابھی زخم کاری کھا کر گرتی ہے ابھی اُٹھ کے فوج کی سرکردہ بن جاتی ہے! تیروں کی بارش ہو رہی ہے لیکن وہ ہے کہ بے دھڑک قدم بڑھائے جاتی ہے! "چلے چلو!! اندر چلو! خدا کی راہ میں! کہ سب کچھ تمہارا ہی ہے"!! انگریزوں کا جنرل وہ جو ژان کو گالیاں دیا کرتا تھا چوہے کی طرح پنجرے میں قید تھا، ٹامک ٹوئیے مارتا لیکن کچھ بن نہ پڑتا۔ اک آخری کوشش اُس نے کی کہ کسی طرح قلعے سے نکل کر پُل پر سے بھاگ جائے۔ اُدھر پُل پر گولہ باری ہو چکی تھی جب یہ لوگ اُس پر دَوڑے تو وہ ٹوٹ کر ان کو لئے ہوئے دریا میں جا پڑا۔

× × × × × × × × × × × × × × × ×

لڑائی ختم ہو چکی تھی فرینساوی عَلَم فصیل پر لہرا رہا تھا! لیکن ژان کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، وہ ڈوبتے ہوئے انگریزی قائد کو دیکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی "مجھے تیری رُوح پر ترس آتا ہے"!!

(باقی)

بشیر احمدؐ

(۱) اشخاص قصہ:۔ یہاں ایک نہایت دیرینہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا لوگ واقعات پر حکومت کرتے ہیں یا واقعات لوگوں پر قابو رکھتے ہیں۔ چنانچہ بلحاظ ایک قصہ نویس مسٹر ہاول اول الذکر کے حق میں رائے رکھتے ہوئے رقمطراز ہے "اصلی پلاٹ افرادِ قصہ سے ہی جنم لیتا ہے۔ یعنی واقعات اُن باتوں کا نتیجہ ہیں جو کچھ انسان کرتا ہے نہ کہ انسان اُن واقعات کا نتیجہ ہے جو اُس کے افعال سے پیدا ہوں۔ اس لئے پلاٹ افرادِ قصہ سے پیدا ہوتا ہے۔ پلاٹ افرادِ قصہ مشخص نہیں کرسکتا۔" تھیکرے نے جب وینٹی فیر لکھنے کا ارادہ کیا تو اشخاصِ قصہ ہی سے پلاٹ تیار ہوا تھا۔ چنانچہ اپنی والدہ کے نام خط تحریر کرتے ہوئے لکھتا ہے" جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک ایسا انسانوں کا جوڑا بناؤں جو اس دُنیا میں خدا کے بغیر رہ سکے۔ حریص۔ نمایش کا دلدادہ۔ ہر حال میں مطمئن۔ اور اپنی اعلیٰ وارفع صفات سے بے نیاز۔"

مولانا نذیر احمد صاحب نے جب مرأۃ العروس لکھنے کا تہیہ کیا تو اُنکے فسانہ کا پلاٹ بھی افرادِ قصہ ہی سے پیدا ہوا۔ سب سے اول اکبری کا حال قلمبند ہوا۔ پھر صاحبزادیوں کے تقاضے پر اُس کی ہمشیرہ اصغری کا چنانچہ وہ اسی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:۔

"تب مجھ کو ایسی کتاب کی جستجو ہوئی جو اخلاق و نصائح سے بھری ہوئی ہو اور اُن معاملات میں جو عورتوں کو اپنی زندگی میں پیش آتے ہیں اور عورتیں اپنے توہمات اور جہالت اور کجرائی کی وجہ سے ہمیشہ اُن میں مبتلائے رنج و مصیبت رہتی ہیں اُنکے خیالات کی اصلاح اور اُن کے عادات کی تہذیب کرے اور کسی دلچسپ پیرایہ میں ہو جس سے انکا دل نہ اُکتائے طبیعت نہ گھبرائے مگر تمام کتاب خانہ چھان مارا ایسی کتاب کا پتہ نہ ملا پر نہ ملا۔ تب میں نے اس قصہ کا منصوبہ باندھا تین برس ہوئے میں جھانسی میں تھا کہ اکبری کا حال قلمبند کیا۔ لڑکیوں کو تو اُس کا وظیفہ ہو گیا اور ہر روز ختم کتاب کا تقاضا شروع کیا یہانتک کہ ڈیڑھ برس کے بعد اصغری کا حال بھی لکھا گیا۔"

(۲) واقعات:۔ میرین کرافورڈ نے ناول کو ایک "جیبی تماشہ گاہ" کے نام سے موسوم کیا ہے ڈرامہ نویس اور فسانہ نگار تقریباً ایک ہی خیال اور یکساں حالات کے اندر محنت کرتے ہیں اور ایک

۱؎ انٹروڈکشن ٹو وینٹی فیر۔ بایوگریفیکل ایڈیشن۔

۲؎ دی ناول وَاٹ اِٹ از۔

ہی قسم کا اثر اپنے ناظر و قاری کے لئے تلاش کرتے ہیں۔ شکسپیر کہتا ہے تمام عالم ایک تماشہ گاہ ہے اور واقعات کا کھیل کھیلنے والے ایکٹر وہ لوگ جو کرۂ زمین پر بستے ہیں۔ جس طرح کسی خاص واقعہ کو سٹیج پر ایکٹ کرنے کے لئے ڈرامہ نویس اُس واقعہ کے مطابق اشخاص ڈرامہ پیدا کرتا ہے۔ اُسی طرح فسانہ نگار واقعات کے قلمبند کرنے کے لئے افرادِ قصہ تلاش کرتا ہے۔ جب واقعات اور افرادِ قصہ حاصل ہو گئے تو پلاٹ تیار ہے۔ اس بات کو بالتصریح بیان کرنے کے لئے کہ جب اشخاصِ فسانہ پیشِ نظر ہوں تو واقعات کس طرح بنائے جاتے ہیں یا اگر واقعات مدنظر ہوں تو افرادِ قصہ کیسے تلاش ہو سکتے ہیں وہ میں مندرجہ ذیل دو مثالوں سے واضح کرتا ہوں جس سے ثابت ہو جائیگا کہ اساتذۂ فن کن اصولوں کے پابند تھے اور اپنی کہانیاں لکھنے کے لئے کیا تجاویز عمل میں لایا کرتے تھے۔ ہمارا پہلا راہنما سر والٹر بیسنٹ[1] ہوگا:۔

"فرض کیجئے ہم جواہرات کے سرقہ پر فسانہ لکھنا چاہتے ہیں۔ سب سے اول یہ چوری کسی رازِ سربستہ کے ساتھ ہونی چاہیئے ورنہ اس میں ذرہ بھر دلچسپی نہ رہیگی۔ علاوہ ازیں سرقۂ جواہر نہایت زبردست اور ہمدردیٔ عامہ حاصل کرنے کے لائق ہو۔ معمولی نقب زنی پر کسی قصہ کی بنیاد قائم کرنا محض تضیعِ اوقات سمجھنی چاہیئے۔ جواہرات کا مالک کوئی جوہری نہ ہو بلکہ کوئی ایسا شخص جس کا نقصان قارئین کے لئے موجب دلچسپی ہو سکے اور جس کے نقصان پر دل ایک خاص اثر محسوس کرے۔ فرض کر لو کہ ان جواہر کی مالکہ ایک ایسی اوباش مزاج عورت ہے جو اپنے زیورات کی بدولت ہر وقت ایک امتیازی غرور و تمکنت کے بے پایاں سمندر میں غوطہ زن رہتی ہے۔ مگر ساتھ اتنی مقدرت بھی نہیں رکھتی کہ اُن زیورات کے چوری چلے جانے پر ویسے جواہر پھر خرید سکے۔ جواہرات بھی ایسے ہی نایاب اور گراں قیمت ہونے چاہئیں جو کسی خاص مواقعات یا تقریبات پر ہی پہنے جاتے ہوں اور جن کا گھر[3] میں رکھنا بھی خالی از خطرہ نہ ہو انہیں

[1] اون دی رائیٹنگ آف ناولز۔ اٹلانٹا۔ جلد اول صفحہ ۲۷۲ [2] تعدد ریا مصنفہ منشی عبد الغفور اس بات کو وضاحت کے ساتھ بیان کرنیکے لئے عمدہ ناول ہے [3] یورپ اور امریکہ میں یہ عام دستور ہے کہ قیمتی زیورات اور جواہر گھروں میں نہیں رکھے جاتے بلکہ وہ ٹرسٹ کمپنیوں کے دفاتر میں محفوظ رہتے ہیں کمپنیوں والے ایسی بیش بہا چیزوں کی حفاظت کے ذمہ وار ہوتے ہیں اور ایک مقررہ رقم مالکان جواہر سے اُنکے مال کی حفاظت کے صلہ میں ہر ماہ وصول کر لیتے ہیں۔

ایک ایسے جوہری کی حفاظت میں رکھنا چاہیئے جو نہایت مضبوط کمرے رکھتا ہو۔ اب آپ یہ محسوس کرینگے کہ کہانی کی بنیاد قایم ہوگئی اور موادِ قصہ کچھ حد تک پیدا ہوگیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اُن مضبوط و محفوظ کمروں میں کس طرح داخل ہو کر جواہرات چُرائے جائیں۔ یہ ناممکن بات معلوم ہوتی ہے اور اکثر اوقات ایسی تجاویز سودمند نہیں ہوسکتیں۔ تو کیا پھر جواہرات اُس وقت حاصل کئے جاسکتے ہیں جبکہ وہ اس کی مالکہ کے گلے کا ہار ہو رہے ہوں۔ شاید ہلاکو اور چنگیز خاں کے زمانہ میں ایسے واقعات معرضِ ظہور میں آسکتے ہوں لیکن اب ایسی جرات کرنیکا شاید ہی کوئی حوصلہ کرسکے۔ کیا اُس گھر میں نقب زنی کی جائے جہاں اُس کی مالکہ کسی خاص تقریب پر اُنہیں پہن کر آئی ہو مگر اس قسم کی عورت کبھی بھی اپنے مایۂ ناز جواہر سے اتنی غفلت شعاری نہیں کرسکتی لازمی امر ہے کہ جواہر دوسری صبح بحفاظت ٹرسٹ کمپنی بھیجدیئے جائیں۔ تو پھر چوری کرنے کا موقعہ ہی کونسا نکلا۔ ایسے مواقعات پر خیالاتِ متخیلہ کو گرہ لگ جاتی ہے اور قصہ نویس اپنے دماغ پر زور دیتا ہے کہ یکلخت سیاہ بادلوں میں شعاعِ امید دکھائی دیتی ہے کہ چوری کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور صرف اُس وقت جبکہ جواہرات[1] جوہری کی دکان سے اُن کی مالکہ کے پاس یا مالکہ کے گھر سے جوہری کی دکان پر لیجائے جا رہے ہوں۔ ایسے مواقعات پر یہ لازمی امر ہے کہ جواہرات[2] کی چوری کا شُبہ داستانِ محبت کے ہیرو پر کیا جائے جس پر اُن کی مالکہ دل و جان سے فدا ہو۔ ممکن ہے کہ جواہرات کی مالکہ کا منظورِ نظر ایسے جرم سے بے لوث ہو۔ لیکن ساتھ ہی قارئین کے دل میں اُس کی وہی وقعت رہنی چاہیئے جو ایک فسانہ کے ہیرو کی ہوتی ہے۔ شاید کُسے اس جُرم کی پاداش میں دھر لیا جائے۔ مگر کن شبہات پر!!! اب کہانی عروج پر ہے۔

سب سے بہتر اور واحد طریق یہ ہے کہ اُن بیش بہا جواہر کا مقفل صندوقچہ اُس ہیرو ہی کے سپرد کیا جائے جو اُسے جوہری کی دکان یا اپنی محبوبہ کے مکان سے لیجانیکا ذمہ دار ہو۔ صندوقچہ کی صرف دو چابیاں ہونی چاہئیں ایک جوہری اور دوسری مالکہ کے پاس اور بلاشک یہ امر اس بات کو اور پُرلطف بنادیگا کیونکہ مقفل صندوقچہ سے جواہرات کا سرقہ بجائے خود

---

[1] بعض غیر ملکی مصنفین نے ایسی چوریاں نہایت کامیابی سے دکھلائی ہیں [2] دیکھو فرانس کے مشہور فسانہ نگار مایسنٹ کا مشہور قصہ "دی نیک لیس" [3] دیکھو بلیو سرکل از الزبتھ جارڈن۔

ایک عجیب بات ہے۔ ہیرو کسی دفتر کا منشی۔ ایک معمولی دکاندار منیم یا کارندہ ہی نہ ہو۔ بلکہ ایسے مشہور تجارت پیشہ یا کسی متمول خاندان سے تعلق رکھتا ہو جس کا تموّل اُسے پولیس کی نظروں میں ایک معمولی مجرم کی حیثیت سے پیش نہ کر سکے۔ بعض اوقات جواہر ہیرو سمیت غائب ہو سکتے ہیں اور قارئین کو بہت عرصہ تک اضطراب و تشویش میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد مصنف اپنے تخیل سے کہانی کی تربیت و پرورش کر کے اُسے اختتام تک پہنچا دیگا"۔

مندرجۂ بالا تجربہ سے معلوم ہو گیا کہ افرادِ قصہ کے لئے واقعات کس طرح تلاش ہو سکتے ہیں۔ آیئے اب دیکھیں کہ واقعات کے لئے افرادِ قصہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس شاہراہ پر لیجانے کے لئے ہمارا راہبر مشہور فسانہ نگار ولکی کالن ہو گا جو ہمیں بتائیگا کہ اُس نے اپنا مشہور و معروف قصہ دی وومن اِن وائیٹ کس طرح لکھا تھا:۔

"میری سب سے پہلی کارروائی ایک خیالِ متوسط حاصل کرنیکی تھی یعنی مجھے ایک محور کی تلاش تھی جس پر فسانہ کی آسیا گردش کرے۔ "وومن اِن وائیٹ" کا خیال متوسط ایک خانگی زندگی میں ایسی سازش کا خیال تھا جس میں واقعات کچھ ایسے ترتیب دیئے گئے ہوں کہ ایک عورت کو اُس کی مشابہت سے لوٹ لیا جائے یعنی اُسے ایک ایسی عورت کے ذریعہ سرگردان کیا جائے جو شکل و شباہت میں اُس سے ملتی جلتی ہو۔ اُس عورت کا انہدامِ مشابہت اُس کی کہانی کا حصۂ اول ہو گا اور بازیافت شناخت اُس کا حصۂ دوئم۔ اب میرا خیالِ متوسط چند ایک ارکینِ قصہ تلاش کرنے کے درپے ہے۔

"ایک چالاک بدمعاش اس سازش کا بانی ہونا چاہیئے۔ بدمعاش عورت یا بدمعاش مرد؟ مگر جس قسم کی شرارت میں چاہتا ہوں وہ صنفِ قوی کا ہی حصہ ہے۔ شاید ایک غیر ملکی آدمی کا کونٹ فاسکو ایک دھندلی شکل و شباہت کے ساتھ میرے پیش نظر ہوتا ہے۔ اور غالباً اُسوقت

۱؎ "دولت عثمانیہ کے موروثی ہیرے" مترجمہ فسانہ ایجنسی ایک مبتدی فسانہ نویس کے لئے کارآمد ناول ہے:۔

۲؎ دیکھو اُس کے خود نوشت حالاتِ زندگی۔

۳؎ جہاں تک میرا خیال ہے اس کتاب کا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔ اگرچہ "دردِ جگر" کے نام سے مختلف تھئیٹریکل کمپنیاں بہت مدت سے اسٹیج پر کھیل رہی ہیں۔

میں اُس کا نام بھی نہیں جانتا۔ میں اُسے انتظار کرنیکا حکم دیتا ہوں اور اُن دو متشکل عورتوں کی نسبت اشہبِ فکر کو میدانِ خیال میں دَوڑاتا ہوں۔ دونوں عورتیں بالکل بیگناہ ہونی چاہئیں اس عرصہ میں میرا پیکِ خیال لیڈی گلائیڈ کو ایک بیگناہ مجرم کی حیثیت سے تلاش کرلاتا ہے۔ اب میں دوسری عورت کی تلاش میں محو ہوجاتا ہوں لیکن ناکامیابی اپنا چہرہ دکھاتی ہے۔ میں سیر کے لئے چلاجاتا ہوں کہ شاید اُس دَوران میں میرا تخیل اُسے تلاش کرسکے مگر نااُمید رہتا ہوں مَیں اُس شب کو اس کام کے لئے وقف کردیتا ہوں مگر پھر بھی ناکامیابی ہوتی ہے لیکن تجربہ مجھے بتلاتا ہے کہ اب اس کے لئے کسی قسم کی تلاش قطعاً بے سود ہوگی۔ اُس کی آمد کو اُس کی مرضی پر موقوف رکھو۔ دوسری صبح جبکہ میں اپنے بستر پر کروٹیں ہی بدل رہا تھا کہ میرا ضدی دماغ مجھ سے مشورہ کئے بغیر اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ عزیب اینی کیتھرک میرے کمرہ میں داخل ہوکر کہتی ہے "میں آزمایش کے لئے حاضر ہوں"۔

"اب میں نے ایک خیال اور تین افراد حاصل کرلئے۔ اب مجھے کیا کرنا چاہیئے؟ میری کارروائی اب کہانی کو اُس کی بنیاد پر استوار کرنیکی ہے۔ اس جگہ میری تین مندرجۂ ذیل کوششیں ہونگی:۔

(۱)۔ کہانی کو ابتدا سے شروع کرو۔

(۲)۔ کہانی کو کبھی اس خیال سے مت لکھو کہ وہ کتنی جلدوں یا کتنے حصّوں میں تقسیم ہوجائیگی لکھتے جاؤ حتّٰی کہ تمہارے تمام خیالات جو تم نے اُس کہانی کے لئے پیدا کئے تھے اُس میں جذب ہوجائیں۔

(۳)۔ کہانی کے اختتام کا فیصلہ کرلو۔

اس وقت تک میں تشریحات سے بالکل الگ ہوں۔ تمام خیالات میرے سامنے ہیں اور میں کہانی کے صحیح خاتمہ کے قریب قریب پہنچ رہا ہوں۔ درست خاتمہ کا فیصلہ کرکے اب میں اس کی ابتدا کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ اور ایک نئی نظر سے اُسے دیکھتا ہوں۔ لیکن آغاز مجھے غیر تسلی بخش نظر آتا ہے۔ ایک پورا ہفتہ دن اور رات میں اس امر پر غور کرتا ہوں مگر غیر مطمئن طور پر۔ دوسرے ہفتہ کے اختتام پر میں نہایت دل گرفتہ ہوجاتا ہوں کیونکہ کہانی کا صحیح آغاز مجھے نہیں ملتا۔ کہانی

کے افتتاحیہ ابواب کا منظر کمبر لینڈ میں ہے جہاں مس فیرلی (بعدہٗ لیڈی گلائیڈ) مسٹر فیرلی اور مس ہال کومب (جو اتفاقیہ طور پر اپنی کیتھرک کی طرح دریافت ہو گئی تھی) تمام نوجوان ڈرائنگ ماسٹر والڈ ہارٹ رائیٹ کا انتظار کر رہے ہیں۔ مگر یہ منظرِ افتتاح میری نگاہ میں کوئی خاص وقعت نہ پیدا کر سکا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ سب سے پہلے جس شخصیت کا قارئین سے تعارف کرایا جائے وہ اپنی کیتھرک ہونی چاہیئے۔ اور اُسے اُس وقت سے پہلے ہی قارئین سے شناسا ہونا چاہیئے۔ جبکہ وہ کمبر لینڈ میں میرے ہمسفر ہوں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ ایسا ہو گا مگر سوال یہ ہے کہ کس طرح ہو گا؟ میرے دماغ میں کوئی خیال نہیں سماتا۔ اب میں اور میرے فسانہ کا مسودہ ایک دوسرے سے لڑ جھگڑ رہے ہیں اور آپس میں گفتگو نہیں کرتے۔ ایک شب میں نے کسی اخبار میں ایک پاگل کے کسی پاگل خانہ سے فرار ہونیکا واقعہ پڑھا۔ دفعتہً مجھے والڈ ہارٹ رائیٹ کی اپنی کیتھرک کے ساتھ ملاقاتِ نیم شبی کا خیال پیدا ہوا جو ایک مرجع سے فرار ہو کر آئی تھی۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی میرے تمام مصائب کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد کہانی لکھنے کے لئے میں نے لگاتار چھ ماہ سخت محنت کی، کیونکہ میں جانتا تھا کہ فسانہ کا مقبول ہونا ہی مصنف کی محنت کا معاوضہ ہے[1]"

(۳) تاثر:۔ انسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ کسی چیز کے دیکھنے۔ سننے یا پڑھنے سے حالات کے مطابق دل ایک خاص اثر محسوس کرتا ہے۔ خواہ وہ اثر کسی تصویر کے دیکھنے سے ہو۔ کسی سنسنی خیز واقعہ کے پڑھنے سے یا ناموافقتِ زمانہ سے پیدا ہوا ہو۔ میں ایک شب اپنے مکان سے باہر نکلا تو ایک ایسے مخمور فقیر سے ملا جو گرتا پڑتا میری طرف آ رہا تھا۔ جب میں نے اُس کا راستہ چھوڑ دوسری طرف کھسک جانیکا ارادہ کیا تو اُس نے نہایت شیریں زبانی اور اثر میں ڈوبے ہوئے لہجہ کے ساتھ عمر خیام اور حافظ کے بیسیوں شعر پڑھ دیئے۔ پھر اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ فرض کیجئے میں اُس واقعہ پر ایک کہانی لکھنا چاہتا ہوں۔ اس کہانی کا پلاٹ خواہ کچھ بھی ہو مگر قارئین کے دل پر جو اثر ڈالنے کی میں کوشش کرونگا وہ ناموافقتِ زمانہ اور نیرنگیٔ دہر کے متعلق ہو گا جب مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ شرابی ایک فاضلِ اجل اور عالمِ بے بدل تھا۔ ابراہام لنکن مع اپنے ایک ہمخیال دوست کے ایک دفعہ بردہ فروشوں

[1] اس مثال کو سمجھنے کے لئے لازمی ہے کہ "دی وومن ان وائیٹ" کا بغور مطالعہ کیا جائے +

کی منڈی کا تماشہ دیکھنے گیا۔ اُس تجارت گاہ کے وسیع میدان میں داخل ہوتے ہی اُس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی کو تازیانہ سے پیٹا جا رہا ہے۔ اُس نے حیران ہو کر ایک آدمی سے دریافت کیا "حضرت یہ کیا معاملہ ہے"؟ اُس نے جواب دیا کہ یہ عورت ایک امیرزادہ نے ابھی خریدی ہے مگر وہ اپنے رشتہ داروں سے علیحدہ ہو کر جانا نہیں چاہتی اس لئے منڈی کا چوہدری اُسے پیٹ رہا ہے۔ ابراہام کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے وہ اس وحشتناک نظارہ کی تاب نہ لا کر گھر کو لوٹ گیا مگر اُس کے فسانہ نویس دوست نے اس نظارہ سے متاثر ہو کر وہ زبردست قصے لکھے کہ امریکہ میں اس خلافِ انسانیت تجارت کے خلاف ایک زبردست شورش پیدا کر دی۔ بلکہ خود ابراہام لنکن نے اپنی جادو بیانی سے وہ اثر ڈالا کہ اس بدرسم کا قلع قمع کر کے چھوڑا۔ مگر ان تمام فسانوں اور تقریروں کی پشت پناہ کیا تھا؟ تاثر!!

امریکی[1] خداوندانِ صحافت کا قول ہے کہ دنیا کا کوئی پیشہ سوائے فسانہ نویسی کے کسی آدمی کو اتنی جلدی شاہدِ عزت و ثروت سے ہمکنار نہیں کر سکتا۔ موجودہ آسمان صحافت کے ایک تابناک ستارے کی نسبت آرم سٹرانگ ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے[2] "وہ سینٹ ویلنٹائین ڈے کی تقریب سے اپنے کان کنی کے کپڑے پہنے شہر میں وارد ہوا اور رات کو ایک تھئیٹر میں تماشہ دیکھنے چلا گیا۔ اگرچہ اُس کا ارادہ وہ رات خوشی و مسرت کے ساتھ بسر کرنے کا تھا۔ مگر تماشہ کے اختتام پر وہ حیرت و استعجاب میں غرق باہر نکلا۔ کیونکہ وہ ایک خوبصورت رقاصہ پر دل و جان سے فریفتہ ہو گیا تھا۔ دُنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر وہ ایک مبہوت انسان کی طرح سڑک پر کھڑا ہو گیا جہاں تماشائیوں کی ریل پیل اور چیخ پکار گاڑیوں اور موٹروں کی آوازیں اُس کے حواسِ خمسہ میں اختلال پیدا کر رہی تھیں۔ یکلخت اُس کے دل میں اُس غارتگرِ دین و ایمان کا نام معلوم کرنے کی خواہش پیدا ہوئی وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد جھپٹا ہوا تھئیٹر کی اُس عالیشان گذرگاہ پر پہنچا جہاں ایک تختہ پر چند ایک تصاویر کے ساتھ اُس شب کے تماشہ کا اعلان تھا۔ بیفکر تماشائیوں کی ٹھوکروں اور دھکوں کی

---

[1] ہاؤ ٹو رائیٹ۔ شائع کردہ ہوزیر انسٹیٹیوٹ آف امریکہ۔

[2] دی گریٹسٹ شارٹ سٹوریز آف دی ورلڈ۔ ریوائزڈ ایڈیشن۔

پروا نہ کرتا ہُوا وہ اُس انسانی سمندر کے تھپیڑوں کے سامنے ایک مضبوط چٹان کی طرح کھڑا ہو گیا جہاں اُس نے ایک تصویر کے نیچے "مس گارڈن" کا نام سُرخ حروف میں لکھا دیکھ لیا جس سے اُس کے قلبِ ناصبور میں قدرے اطمینان پیدا ہو گیا۔ اگرچہ اُس کا دل چاہتا تھا کہ وہ تصویروں والا تختہ اُٹھا کر بھاگ نکلے مگر ایک کمسن چھوکرے نے بے اعتبار نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھ کر کہا "مہربانی کر کے تختہ چھوڑ دو"۔

رات کا بقیہ حصّہ اُس نے نہایت کرب و بے چینی کی حالت میں بسر کیا۔ لیکن دوسری صبح وہ اپنے اُنہیں تعشق خیز خیالات میں محو تھیٹر کی سر بفلک عالیشان عمارت کے شاندار دروازہ پر کھڑا تھا۔ جہاں گذشتہ رات کی چہل پہل اور رونق کی بجائے اس وقت سکوت اور خاموشی حکمران تھی۔ وہ دھڑکتے ہُوئے دل کو سنبھال کر اندر داخل ہُوا جہاں ایک کمرہ میں ملازمینِ تھیٹر کا ملازم بنچ سے کھڑے ہو کر سرگوشی کی آواز میں پوچھنے لگا "کس سے ملنا ہے؟"

نوجوان ملاقاتی کا دل رعبِ حسن سے بیٹھنے لگا۔ وہ اپنے دلی اضطراب کو چھپا کر بولا "میں مس گارڈن سے ملنا چاہتا ہوں کیا یہی اُن کا کمرہ ہے؟"

کمسن خادم نے "ہاں جناب" کہکر نووارد کی طرف ملاقات کا کارڈ لینے کی غرض سے ہاتھ بڑھایا۔ مگر نوجوان کان کن نے اُس کا مطلب سمجھ کر منفعل آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا پھر خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہنے لگا "میرے پاس کارڈ تو کوئی نہیں۔ کیا تمہارے پاس کوئی پنسل اور کاغذ کا ٹکڑا موجود ہے"

نوجوان ملاقاتی کی کم مائیگی اور اُس کے بوسیدہ لباس نے کم عمر چھوکرے کے دل میں ایک قسم کی بے وقعتی پیدا کر دی۔ اُس کے دورانِ ملازمت میں یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ ایک ایسا کم حیثیت آدمی مس گارڈن جیسی رقاصہ سے ملنے کے لئے آیا ہو مگر اس بات سے اُس کی ذات کو کوئی تعلق نہ تھا وہ نہایت ادب سے بولا "کاغذ پنسل میرے پاس موجود نہیں۔ آپ ٹھہریئے میں اطلاع کئے دیتا ہوں"

کم حیثیت عاشق کے محبت بھرے دل میں نئے جذبے اور نئے تعشق سے آتشِ اضطراب بھڑک اُٹھی۔ بالآخر وہ اُس محبوبۂ جاں نواز سے ایک منٹ بعد شرفِ ملاقات

حاصل کرنے والا تھا جس نے گذشتہ رات عشق و محبت کے تیروں سے اُسکا دل مجروح کر دیا تھا اور مُلاقات بھی وہ ملاقات جس کی کامیابی و ناکامیابی پر اُس کی آیندہ زندگی بلکہ اُسکی ہست و بود کا انحصار تھا۔ اُس وقت اُس کے دل و دماغ پر مس گارڈن کی تصویر مسلط تھی اور ایک قسم کا نامعلوم خوف وہراس اور خوشی و مسرت جو اُسی وقت توام پیدا ہُوئے تھے اُس کے مضبوط دل پر کوہ گراں کی طرح بار ہو رہے تھے۔ لیکن جن منصوبوں کو وہ دل میں باندھ کر آیا تھا اس وقت اُنہیں کمرہ نمبر ۸۳ کے سامنے ایک ریتلی دیوار کی طرح مسمار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے انہیں خیالات میں غرق تھا کہ یکایک سامنے کا دروازہ کھلا اور مس گارڈن کا کمسن ملازم کاغذ کا ایک پرزہ لئے باہر نکلا اور چپکے سے نوجوان کے ہاتھ میں دے دیا جس پر زنانہ تحریر میں مرقوم تھا "مس گارڈن افسوس کرتی ہے کہ وہ ناسازیٔ طبیعت کے باعث اپنے معزز ملاقاتی سے نہیں مل سکتی"

اس آبرو ریز جواب کو پڑھتے ہی نوجوان ملاقاتی کے پاؤں تلے سے زمین نکلنے لگی۔ اُسے اپنے سر پر کوئی نامعلوم بوجھ گرتا ہُوا دکھائی دیا اور اُس کے کانوں میں تیز آندھی جیسی آوازیں آکر تمام عمارت کو گھما گئیں۔ اُس کی نظر ابھی تک اُنہیں الفاظ پر تھی جو سنگینوں کی تیز نوکوں کی طرح اُس کے دل کو زخمی بنا رہے تھے۔ وہ اس طرح "صم بکم" حواس باختہ کھڑا تھا جیسے کسی نے پھانسی کا پروانہ اُس کے ہاتھ میں دیدیا ہو۔ یکایک اندر سے ایک بلند قہقہہ کی آواز اُس کے کانوں میں پہنچی اور ایک عالی ہمت انسان کی طرح اُس نے اپنے گم شدہ حواس کو قابو میں کر کے مس گارڈن کے ملازم کی طرف دیکھا جو تبسم زیرلب کے ساتھ اُس کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا تھا۔ لیکن اس قہقہہ میں اُس کی زندگی کا راز مضمر تھا۔ یہ بانگ جرس تھی جس نے اُس کے دل کے خوابیدہ قافلہ کو بیدار کر دیا۔ جس قہقہہ پر دو منٹ پہلے وہ خود کو نثار کر دینے پر تیار تھا اُس کی آواز اس وقت اُس کے دل میں جذبۂ انتقام پیدا کر رہی تھی۔ اُس کے شریف اور پُرحوصلہ دل پر نئے خیالات و جذبات کی خار دار جھاڑیاں اُگنے لگیں جس نے اُس کا خوبصورت چہرہ گلنار کر دیا۔ پھر طیش زدہ حالت میں اُس نے کاغذ کے بیسیوں ٹکڑے کر کے سنگین فرش پر بکھیر دیئے۔

لیکن جن خیالات کے ساتھ وہ اُس زاہد فریب رقاصہ سے ملنے آیا تھا اُسکی اپنے ہاتھوں

سے تجہیز و تکفین کر چکا تھا۔ نئے خیالات اور نئی امنگوں کے زیر اثر بڑی تیزی سے قدم بڑھاتا اپنی جائے رہائش پر جا پہنچا۔ وہ قوتِ انتقام جو اُس کے دل میں لحظہ بلحظہ بڑھ رہی تھی صرف مس گارڈن کے خلاف ہی نہ تھی بلکہ وہ صنفِ نازک کو ہی گردن زدنی و سوختنی سمجھ رہا تھا۔ اور فرقۂ اناث کی بے وفائی اور عیاری و غداری اُس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ اس ذاتی تاثر نے بعدۂ اُس سے وہ قصّے لکھوائے کہ دو سال کے اندر امریکہ میں اُس نے عورتوں کے متعلق ایک قسم کا انقلاب پیدا کر دیا۔ اُس کے افسانے روزمرہ کی گفتگو تھے۔ گھروں میں۔ کلبوں میں سیر و تفریح کے مقامات اور تماشا گاہوں میں اُس کے خیالات پر بحث ہوتی تھی۔ ہزاروں عورتیں مرد اور بچے اُس ہونہار مصنف کو دیکھنے ملنے اور اس سے تبادلۂ خیالات کے لئے آتے تھے۔ عورتیں اُس سے مل کر ایک نیا حظ اُٹھاتی تھیں جس نے صنفِ نازک کے عشق و محبت کے بوسیدہ ڈھانچہ کو ایک ہی ٹھوکر سے پائمال کر دیا تھا۔ اس فرقہ کا وہ سخت دشمن تھا۔ انکی جھوٹی اور عارضی محبت کا تار و پود بکھیر کر صنفِ ذکور پر اُس نے وہ اثر ڈالا جو شاید صدیوں تک بھی فراموش نہ ہو سکے۔

"ایک دن وہ اپنے ہوٹل کے شاندار کمرہ میں صبح کے ناشتہ سے فارغ ہو کر اخبار دیکھ رہا تھا کہ اُس کے ملازم نے سنہرے حروف میں چھپا ہُوا ایک کارڈ اُس کے سامنے پیش کیا جس پر لکھا ہُوا تھا۔

"مس مارگرٹ گارڈن"

ہونہار نوجوان کے دل میں گذشتہ حسن و عشق کی یاد نے یکلخت بیداری پیدا کر دی بالاخر وہی ناعاقبت اندیش خوبصورت مکار رقاصہ اُس کی شہرت اور دولت و ثروت کے زیر اثر خود بخود اُس سے ملنے آئی تھی اور اُسی طور ملاقات کی خواہشمند اُس کے دروازہ پر کھڑی تھی۔ جس طرح تین سال پیشتر وہ اُس کے دروازہ پر کھڑا اُس سے دردِ دل بیان کرنے کا آرزومند تھا۔ لیکن اُس نے کس روکھے پھیکے جواب اور ذلیل برتاؤ کے ساتھ اُسے بے نیل مرام واپس کر دیا تھا۔ اُسکے دل میں ایک نیا جوش اور لبوں پر تمسخر آمیز تبسم پیدا ہُوا اُس نے پنسل اُٹھا اُسی کارڈ

کے نیچے لکھ دیا "میں افسوس کرتا ہوں کہ ناسازئی طبیعت کے باعث اس وقت اپنے معزز ملاقاتی سے نہیں مل سکتا"۔ جونہی یہ کارڈ مس گارڈن کے پاس پہنچا اُس کا چہرہ سُرخ انگارے کی طرح تمتا اُٹھا۔ گذشتہ واقعات آنِ واحد میں اُس کی نظروں تلے پھر گئے جبکہ اُس نے نہایت دیدہ دلیری سے صرف اُس کے غریب ہونے کے باعث ملاقات سے انکار کر دیا تھا۔ اور اُس عرصہ میں اُسے معلوم ہوگیا کہ ہر ایک غریب ایسے کمزور دماغ اور اوچھے ظرف کا آدمی نہیں ہوتا۔ وہ بڑا آدمی تھا اور یقیناً بڑا بننے کے لئے پیدا ہُوا تھا +

مگر جہاں آر مسٹرانگ نے اس بے مثل اور قابلِ تقلید ہستی کا نام پردۂ اخفا میں رکھا ہے وہیں مسٹر ایس۔ ڈبلیو ہیلر نے ہاؤ ٹو رائیٹ میں صاف طور پر لکھدیا ہے کہ "دورِ جدید کے جادو نگار فسانہ نویس ریکس بیچ اور جیک لنڈن میدانِ صحافت میں قدم رکھنے سے پیشتر ایلاسکا کی کانِ طلا کے کان کن تھے۔ اور اپنے افسانوں کی بدولت اتنی دولت کمائی جو بحالتِ مزدوری اُنہوں نے یُوکان میں آنکھوں سے بھی نہ دیکھی تھی"۔ اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں یقیناً ہم حق بجانب ہونگے کہ کسی خاص تاثر نے ہی اُنہیں کان کن سے افسانہ نویس بنادیا ہوگا +

(باقی آئندہ) محمد ضیاء الدین شمسی

اے کسل مند روحوں کو تازگی بخشنے والی نیند! تو امن وسکون کی دیوی ہے۔ مگر تیرا آغوش اُنہیں کے لئے کشادہ ہے اور تیرے لب انہیں کی آنکھوں کو چومتے ہیں جنکے دل مسرت سے لبریز ہیں۔ مصیبت زدوں سے تو بھی کنارہ کرتی ہے۔ رنج وغم کے پاس سے تو کس سبک پروازی کے ساتھ گزر جاتی ہے اور ان پلکوں میں آرام کرتی ہے جو اشک آلودہ نہیں ہیں۔ آہ! آج بھی میں خواب سے چونک پڑا ہوں خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو ابدی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ لیکن اگر کنجِ لحد بھی ایسے ہی پریشان خوابوں سے معمور ہے تو یہ آرزو بھی بے سُود ہے۔

(ایڈورڈ ینگ) صہبائی

۱؎ فسانہ نویسوں کی ایک مشہور یونیورسٹی کا پریذیڈنٹ جو کسی زمانہ میں ایک ایسے قومی میگزین کا مدیر رہ چکا ہے جس کی تعدادِ اشاعت بیس۲۰ لاکھ سے زائد تھی +

جاں نثار

(۱)

دیوالی کی رات تھی، زمین آسمان بنی ہوئی تھی۔ جہاں تک نگاہ جاتی تھی۔ چراغوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ جیسے آسمان کے تاروں کا شمار نہیں۔ مگر یہی چاندنی (؟) رات ہے۔ جب ہزاروں حریص ہاتھ خیالی ثروت کی آرزو میں اپنا اثاثہ لُٹا بیٹھتے ہیں اور پھر اپنی حماقت پر بیٹھے روتے ہیں انسان محنت نہیں کرنا چاہتا مگر اُس کے شیریں پھل کھانا چاہتا ہے۔ امید عقل کو دھوکا دے جاتی ہے

پورن چند بھی اسی منتر سے محو ہو چکا تھا۔ وہ دن رات جُوا کھیلتا رہتا تھا۔ اور دیوالی کے قریب آکر تو اُسے کھانے پینے کی سُدھ نہ رہتی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ کسی نہ کسی دن نصیبہ چمک اُٹھیگا۔ اُمید ہر بار یاس کی صورت اختیار کرتی تھی۔ مگر پورن چند حوصلہ نہ ہارتا تھا۔ اور قسمت کے بساط پر برابر پانسہ پھینکتا جاتا تھا۔ وہ ایک دفتر میں خزانچی تھا۔ دیوالی قریب آئی۔ تو دفتر سے غیر حاضر رہنے لگا۔ مگر مہینے کے آخری دنوں میں دفتر جانا ضروری ہو گیا۔ عملہ کی تنخواہوں کا بل تیار کرنا تھا۔ حسن اتفاق سے دیوالی یکم نومبر کو تھی۔ ۳۱، اکتوبر کو تنخواہوں کا روپیہ آیا۔ مگر پورے چار بجے۔ کلرک گھر جا چکے تھے۔ تنخواہ اُس دن تقسیم نہ ہو سکی لیکن پورن چند نے اپنی تنخواہ اُسی وقت لے لی اور خوش خوش گھر چلا۔ دیوالی کی رات کا سامان مہیا ہو گیا تھا۔ رات کو جب لکشمی پوجا ہو چکی۔ تو وہ دیپ مالا دیکھنے کے بہانے گھر سے چلا۔ اور جوئے خانہ میں جا پہنچا۔ بدقسمتی پہلے ہی سے انتظار کر رہی تھی جاتے ہی سب کچھ ہار گیا۔ اب اُس کی حالت اُس پرندہ سے مشابہ تھی۔ جو مصروفِ پرواز ہونے سے پہلے ہی پر قینچ ہو چکا ہو۔ اُس وقت اُسکی بے بسی کیسی دلخراش ہوتی ہے۔ وہ اُڑنا چاہتا ہے۔ مگر اپنے کترے ہُوئے پروں کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھرتا ہے اور تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ پورن چند کو ایسا معلوم ہُوا گویا دیوالی کی رات کے ساتھ ہی اُس کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو رہی ہے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑائی مگر کہیں سے روپیہ ملنے کی صورت نظر نہ آئی۔ یکایک اُس کے دل میں ایک خیال نے سر اُٹھایا یا امید سامنے کھڑی دکھائی دی ——— عملہ کی تنخواہوں کے روپے دفتر میں موجود تھے اور وہ خزانچی تھا

پورن چند پر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں دفتر کی طرف روانہ ہُوا۔ رات کے دس بج

جھکے تھے۔ چراغوں کی بہار میں خزاں کے پہلو نمودار ہو رہے تھے۔ بازاروں کی رونق کم ہو رہی تھی۔ مگر پورن چند کی آنکھیں اس طرف سے بند تھیں۔ وہ اس طرح بھاگتا ہُوا جا رہا تھا۔ جیسے کسی عزیز بیمار کیلئے کوئی ڈاکٹر کو بلانے جا رہا ہو۔ دفتر میں پہنچا تو چوکیدار دکھائی دیا۔ پورن چند کا ارادہ متزلزل ہو گیا۔ چوکیدار نے پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں گنگا دین! کہو کیا حال ہے؟"

گنگا دین نے آواز سے فوراً پہچان لیا اور آگے بڑھ کر بولا" آئیے بابو صاب۔ بجار میں تو کھوب رونق رہیو ہے۔ آپ ایہاں کیسے آگئے؟"

پورن چند کا دل دھڑک رہا تھا مگر زبان پر پورا پورا قابو تھا ہنس کر بولا "کچھ کاغذ بھول گیا ہوں۔ ذرا دروازہ کھول دے"

گنگا دین نے فوراً تعمیل کی۔ اگر کوئی اور ہوتا۔ تو شاید وہ انکار کر دیتا۔ مگر پورن چند خزانچی تھا۔ اُس سے کچھ عذر نہیں کیا۔ بعض دفعہ پیشگی کی ضرورت آبنتی تھی۔ پورن چند کمرے میں پہنچا۔ اور روشنی کر کے میز کے سامنے ہو بیٹھا۔ اِس وقت اُس کی عقل اِس طرح بیتاب تھی۔ جیسے کبوتر شکرے کے پنجے میں پھنس گیا ہو۔ بار بار خیال آتا تھا۔ کہ یہ قدم تباہی کی طرف لے جانے والا ہے۔ مگر اس تاریکی میں امید کا دلفریب چہرہ بھی کبھی کبھی نظر آجاتا تھا۔ آخر پورن چند پر اُمید کا جادو چل گیا۔ اُس نے تجوری کھول کر چارسو کے نوٹ جیب میں ڈال لئے۔ اور کمرہ بند کر کے باہر نکل آیا۔ اس وقت اُسے ایسا معلوم ہُوا کہ کامیابی کا ایک مرحلہ طے ہو چکا ہے۔ حالانکہ اُس کا ہر ہر قدم اُسے سرزمین کامرانی سے دُور لئے جا رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ پھر اُسی جوئے خانہ میں تھا۔ جہاں قسمتیں برباد ہوتی ہیں اور تباہی ہنستی ہے۔ اُمید اُسے راستہ دکھا رہی تھی۔ مگر بدقسمتی اوٹ میں کھڑی مسکراتی تھی۔ پورن چند نے پھر داؤ لگائے اور پھر سب کچھ ہار گیا۔ اب چاروں طرف تاریکی تھی۔ لیکن اس تاریکی سے زیادہ خوفناک وہ سپیدئ سحر تھی۔ جو آہستہ آہستہ نزدیک سرک رہی تھی۔ اس سپیدی سے پورن چند اتنا خائف تھا کہ اُس کے تصور ہی سے اُس کی رُوح کانپ جاتی تھی سوچتا تھا۔ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی۔ کہ کل صبح کا سورج ہی طلوع نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا پورن چند گھر پہنچا۔ اس وقت اُس کے پاؤں اِس طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ جیسے شراب پی رکھی ہو۔ اُس کا باپ رائے صاحب سرجن لال امیر آدمی تھا مگر اُس کی امارت سے زیادہ مشہور اُس کے بخل کے قصے تھے۔ پورن چند کو کئی بار خیال آیا۔ کہ چل کر اُن کے سامنے ساری بات ظاہر کر دوں تو یقیناً وہ مجھے چارسو روپیہ دینے سے انکار

نہ کریں گے۔ مگر پھر سوچا۔ کہ یہ نہیں ہو گا۔ اگر ایسے نصیب ہوتے۔ تو وہ مجھے کوئی کارخانہ نہ کھول دیتے ناحق ذلیل ہونے سے کیا حاصل؟ کوئی اور طریقہ سوچنا چاہیئے۔ اب اُسے عقل آگئی تھی، اُمید کوئی نیا دھوکا نہ دے سکی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی۔ مگر صبح ہوئی۔ تو اُس کا چہرہ قدرے بحال ہو چکا تھا۔ ایک گناہ پر پردہ ڈالنے کے لئے نئے گناہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس وقت اُس کا خیال اپنے نوکر رونقی کی طرف تھا۔

(۲)

رائے صاحب سرجن مل کے تین نوکر تھے اُن میں رونقی سب سے پُرانا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ رائے صاحب ہی کی خدمت گذاری میں صرف کیا تھا۔ اس لئے رائے صاحب اُسے سخت لفظ نہ کہتے تھے۔ رونقی کو بات چیت کرنے کا سلیقہ نہ تھا۔ بولتا تو ایسا معلوم ہوتا گویا لڑ رہا ہے۔ کام کرنے سے بھی جہانتک ہو سکتا کترا جاتا تھا۔ ہاں دوسرے ملازموں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے میں بہت ہوشیار تھا۔ اور اس کام کو ایسی مستعدی سے سرانجام دیتا کہ ملازم بلبلا اُٹھتے تھے۔ رونقی کی اس مستعدی کے خلاف رائے صاحب کے پاس اکثر اپیلیں دائر ہوتی رہتی تھیں۔ مگر رائے صاحب رونقی کے فیصلوں کو عموماً بحال ہی رکھتے تھے اس سے رونقی کا چہرہ شگفتہ ہو جاتا تھا۔ اکڑ کر کہتا "کسی کا (میرا) تم نے کیا بگاڑ لیا"۔

مگر رونقی میں کوئی خوبی نہ ہو۔ یہ بات نہ تھی۔ وہ مالک کے لئے جان تک نثار کرنے کو تیار رہتا تھا رائے صاحب کو اس پر روپے پیسہ کے معاملات میں کامل طور پر اعتماد تھا۔ اُن کو اس امر کا یقین ہو گیا تھا کہ رونقی مرتا مر جائے گا مگر ایک پائی کی بھی بے ایمانی نہیں کریگا۔ کئی مواقع ایسے آئے، جب رونقی چاہتا تو سینکڑوں روپے بالا ہی بالا اُڑا سکتا تھا، ترغیب نے سنہری جال بچھائے مگر رونقی نے اپنی طبیعت کو ڈانواڈول نہیں ہونے دیا۔ وہ پرائے روپے کو مٹی کے برابر سمجھتا تھا۔ رونقی کی اس خوبی نے اُسکے تمام عیوب پر پردہ ڈال دیا تھا۔

(۳)

دیوالی کے دوسرے دن صبح کے وقت رونقی اپنے کمرے میں بیٹھا حقہ پی رہا تھا اور آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں غرق تھا۔ اتنے میں پورن چند بھاگا بھاگا اندر آیا اور بولا "رونقی! مجھے بچالو"

آواز میں حسرت تھی، الفاظ میں گھبراہٹ رونقی کے ہاتھ سے حقہ چھوٹ گیا۔ اُسے پورن چند سے انتہا درجہ کی اُلفت تھی۔ اُس نے اُسے گودیوں میں کھلایا تھا۔ وہ رات کے وقت عموماً بے سُدھ پڑا سوتا رہتا تھا۔ مگر جب کبھی پورن چند بیمار

ہوجاتا۔ تو وہ ساری ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھ کر کاٹ دیتا تھا۔ کئی آدمیوں نے اُسے زیادہ تنخواہ پر اپنے ہاں لیجانا چاہا۔ مگر پورن چند کے خیال سے اُس نے سب جگہ انکار کر دیا۔ محبت نے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ اُس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ مگر وہ پورن چند سے پدرانہ شفقت رکھتا تھا جس طرح جنگل کے درخت کو پانی دینے والا اُس درخت کی شاخوں اور ٹہنیوں سے محبت کرنے لگتا ہے اُسی طرح رونقی پورن چند اور اس کے مستقبل سے محبت کرنے لگا تھا۔ جب اُسے عمر میں بڑا ہوتے دیکھتا۔ تو اُس پر روحانی سرور سا چھا جاتا تھا۔ گویا وہ اُس کا نوکر نہیں بلکہ باپ تھا۔ وہ جب کبھی تنہائی میں بیٹھتا۔ تو پورن چند ہی کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اُسی کے خیال میں محو تھا۔ سوچتا یہ تھا کہ رائے صاحب جلد اُس کا بیاہ کیوں نہیں کر دیتے۔ رائے صاحب کی دُور اندیشیاں اُس کے لئے بخل سے کم نہ تھیں۔ اچانک پورن چند کو کمرے میں آتے دیکھ کر اُس کا دل دہل گیا۔ گھبرا کر بولا "کیوں سرکار! معاملہ کیا ہے؟"

(۴)

یہ کہتے کہتے اُس نے کونے میں پڑی ہُوئی لاٹھی اُٹھالی اور اس طرح تیار ہو گیا۔ جیسے پورن چند کے تعاقب میں کوئی خوفناک ڈاکو آرہا ہو پورن چند کے غمگین چہرے پر ایک لمحہ کے لئے ہنسی نمودار ہُوئی۔ جیسے رات کو آسمان میں جگنو چمک جاتا ہے۔ اُس نے آہ سرد بھری اور کہا "رونقی لاٹھی رکھ دو اس کی ضرورت نہیں"

رونقی کے سینہ سے بوجھ سا اُتر گیا۔ لاٹھی رکھتے ہُوئے بولا "تو سرکار ایسی کیا آپھت آئی ہے۔ جو مُوں سوکھ گیو ہے"

پورن چند نے چاروں طرف اس طرح دیکھا جیسے چور چوری کرنے سے پہلے دیکھتا ہے انتہائے فکر نے اُس کے ہوش و حواس باختہ کر دئے تھے اُسکو اندیشہ تھا۔ کہ کہیں کوئی مجھے دیکھ نہ لے۔ آہستہ سے بولا "میرے سر پر سچ مچ آفت ہی آگئی ہے تم چاہو۔ تو مجھے بچا سکتے ہو۔ کہو میرا ایک کام کر دوگے؟"

رونقی نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا۔ "ہجور حکم دیں تو کھی دیں، بھاڑ میں کُود پڑوں"

پورن چند کا چہرہ منور ہو گیا۔ تاریکی یاس میں شعلۂ اُمید چمک گئی تھی۔ اُس نے جیب سے ایک ہار نکالا۔ اور رونقی کے ہاتھ پر رکھ کر کہا۔ یہ بازار لے جاؤ۔ اور بیچ آؤ۔ مجھے ابھی روپے کی ضرورت ہے"

رونقی پر بجلی سی گر پڑی۔ ہار دیکھ کر وہ اس طرح سہم گیا۔ جیسے کسی سانپ نے سونگھ لیا ہو۔ اُس کی

زبان بند ہوگئی دماغ میں ہزاروں خیالات سما گئے رہ رہ کر سوچتا تھا کہ پورن چند کو ایسی کیا ضرورت آ پڑی ہے۔ جو ہار بیچنے کی نوبت آئی ہے۔ اور پھر وہ کوئی غریب آدمی نہیں۔ رائے صاحب چاہیں تو آدھا شہر خرید سکتے ہیں۔ اُن کو زیور فروخت کرانیکی کیا ضرورت ہے۔ رونقی سمجھ گیا کہ پورن چند یہ کام رائے صاحب سے یہ چھپا کر رہا ہے۔ مگر چوری کیوں کرتا ہے۔ اس کی وجہ نہ سمجھ سکا۔ بحر خیالات میں بہت دیر تک غوطے لگانے کے باوجود اُسے ساحل نہ مل سکا۔ اُس نے عجیب انداز سے پورن چند کی طرف دیکھا۔ نگاہوں میں دل رکھا ہُوا تھا۔ پورن چند اُسے تذبذب میں پڑے ہُوئے دیکھ کر پھر گھبرا گیا۔ شعاعِ اُمید آنکھوں سے اوجھل ہوگئی تھی۔

رونقی نے پوچھا" سرکار! مالمہ کیا ہے اِتی جرورت کیا بن گئی۔ جو ہار بیچو ہو؟"

پورن چند کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہار جیب میں ڈال کر واپس چلنے لگا۔ اس وقت اس کا چہرہ حسرت و یاس کی زندہ تصویر تھا۔ رونقی کے کلیجے پر سانپ لوٹ گیا۔ پیچھے دوڑ کر بولا" سرکار تم کو کتنے روپے کی جرورت ہے؟"

سوکھے دھانوں میں پانی پڑ گیا۔ پورن چند نے پھر امید کے لہجہ میں جواب دیا" چار سو کی"۔

"روپا کب چاہیئے؟"

"ابھی"

رونقی کے پاس چھ سو کے قریب روپیہ موجود تھا۔ یہ روپیہ اُس نے کئی سالوں میں جمع کیا تھا۔ وہ ساری تنخواہ گھر نہیں بھیج دیا کرتا تھا۔ تین چار روپے ماہوار بچا رکھتا تھا۔ یہ روپے اُس نے اپنے کمرے کے ایک کونے میں دبا رکھے تھے۔ رونقی نے سوچا۔ کہ ہار لیکر بازار میں کہاں بیچتا پھروں گا۔ اپنے پاس سے روپے دیدوں تو کیا ہرج ہے۔ پورن چند کوئی اس طرح ہمیشہ تھوڑے ہی تنگدست رہے گا جب اُس کے ہاتھ چار پیسے آئیں گے۔ تو اُس سے اپنا روپیہ واپس لیکر ہار لوٹا دوں گا۔ اس وقت اُس کا کام چل جائیگا۔ یہ سوچ کر اُس نے پورن چند کے ہاتھ سے ہار لے لیا اور کہا" اچھا سرکار! تمرا کام کری دیں گے"۔

پورن چند کی جان میں جان آگئی۔ اُسکو ایسا معلوم ہُوا۔ گویا رونقی اُس کا نوکر نہیں بلکہ فرشتۂ رحمت ہے۔

(۵)

تھوڑی دیر کے بعد رونقی نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ اس وقت اُس کا دل سینہ میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اُس نے چوری نہیں کی تھی۔ بدنیتی نہیں کی تھی۔ مگر

پھر بھی اُس کا کلیجہ کانپ رہا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا۔ کہ پورن چند کا کام ہو جائے اور اُس کو رائے صاحب کے سامنے اپنے گناہ کا اعتراف نہ کرنا پڑے۔ وہ ہر چند کہ جاہل ان پڑھ تھا۔ تاہم اُسے یہ یقین ہو گیا تھا۔ کہ اگر پورن چند کا یہ قصور جس کے بارے میں وہ تا حال تاریکی میں تھا۔ رائے صاحب کے سامنے ظاہر ہو گیا۔ تو پورن چند کا مستقبل خراب ہو جائیگا اس خیال سے اس کا خون خشک ہو جاتا تھا۔ وہ سب کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر پورن چند کا رنجیدہ چہرہ دیکھ کر اُس کا تحمل ہاتھ سے چھوٹ جاتا تھا۔ اُس نے جلدی جلدی زمین کھودی، روپیہ گن کر نکالا اور زمین پھر سے ہموار کر دی۔ اس وقت اُس کے چہرے پر پھر وہی بے فکری و اطمینان کا رنگ ہویدا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورن چند اُمید و بیم کی صورت بنا ہُوا آیا اور ہچکچاتے ہُوئے بولا "رونقی"

رونقی حقہ پی رہا تھا۔ اُس نے زبان سے کوئی جواب نہ دیا مگر ہاتھ سے اپنے سرہانے کی طرف اشارہ کر دیا۔ پورن چند نے روپیہ دیکھا۔ تو تن مردہ میں جان آ گئی۔ رونقی کی طرف احسانمندی کے انداز سے دیکھتے ہُوئے چلا گیا۔

یکایک رونقی چونک پڑا۔ جیسے کسی کی کوئی قیمتی شے گم ہو جاتی ہے۔ وہ زمین کھودتے وقت ہار دبانا بھول گیا تھا۔ وہ تیر کی طرح تیزی سے اپنی چارپائی کے سرہانے پہنچا۔ ہار وہیں پڑا تھا۔ سوچنے لگا اب اسے رات کو دبانا چاہیئے۔ دن میں کسی کو شبہ بھی ہو گیا۔ تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ یہ فیصلہ کر کے اُس نے ہار کمر کے گرد لپیٹ لیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ مگر طبیعت میں سارے دن انتشار رہا۔

رات ہو گئی تھی رونقی نے دروازہ بند کیا اور زمین کھودنے لگا۔ مگر ہاتھوں میں سکت نہ تھی دل اس طرح دھڑک رہا تھا۔ جیسے کوئی سپاہی گرفتار کرنے کو آ رہا ہو۔ جسم برسوں کے مریض کے مانند شل ہو رہا تھا۔ یہ ہونے والے واقعات کا پیش خیمہ تھا۔ پر رونقی اس سے بے خبر اپنے کام میں مصروف تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں نہ چلتے تھے۔ مگر وہ زمین کھود رہا تھا۔ یکایک کسی نے دروازے پر ہاتھ مارا۔ رونقی کے وسوسے پورے ہو گئے گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور سننے لگا کہ کیا یہ میرا واہمہ ہی تو نہیں دروازے پر پھر کسی نے ہاتھ مارا۔ رونقی کے چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہُوئے۔ سردی کے دن تھے، مگر اُس کا دم گھٹا جا رہا تھا تاہم اُس نے حوصلے سے پوچھا "ایس وکت کون ہے؟"

"دروازہ کھول دے"

رونقی کا چہرہ فق ہو گیا یہ رائے صاحب کی آواز تھی۔ جو حالت بکری کی شیر کی دھاڑ سُن کر ہوتی ہے وہی حالت اس آواز کو سُن کر رونقی کی ہوئی

اُسے اپنی رسوائی آنکھوں کے سامنے ناچتی ہُوئی دکھائی دی۔ اُس نے بولنا چاہا۔ مگر گلے سے آواز نہ نکل سکی۔ رائے صاحب نے کڑک کر کہا۔ "دروازہ کھول دے"

رونقی نے لپک کر ہار کو بستر کے نیچے چھپا دیا۔ ٹمٹماتا ہُوا دیا بُجھا دیا۔ اور دروازہ کھول دیا۔ اس وقت اُس کے پاؤں من من کے بھاری ہو رہے تھے۔ رائے صاحب نے اندر آتے ہی کہا " دیا کیا ہُوا ؟"

رونقی نے جواب دیا" سرکار بجھائے دیو"

ابھی تو جل رہا تھا۔ بجھائے کیسے دیو ؟ فوراً روشن کرو"

رونقی کے اندیشے مادی صورت اختیار کر رہے تھے۔ حیل و حجت کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ یہ وقت ٹل جائے۔ تو بعد میں سینکڑوں بہانے تراشے جا سکتے ہیں۔ وقت اخفائے جرم کے لئے بہترین امداد ہے۔ مگر رائے صاحب نے اس کی مہلت نہ دی۔ جیب سے دیا سلائی نکال کر خود چراغ جلا دیا۔ اور زمین کی طرف دیکھ کر بولے۔ یہ تو کیا کر رہا تھا ؟"

رونقی نے ہاتھ باندھ کر جواب دیا" سرکار جو مہینہ ملتا ہے۔ اُس سے بچائے بچائے کر کسی بکت کے لئے کبھی ہیاں کچھ داب دیا کرتا ہوں"

" مگر آج کیا دابنے لگا تھا۔ ابھی تو تنخواہ بھی نہیں ملی"

جھوٹی زبان بند ہو گئی۔ رونقی رائے صاحب کا منہ دیکھنے لگا۔ رائے صاحب نے آگے بڑھ کر زمین سے مٹی ہٹائی اور روپوں کی پوٹلی دیکھی پھر بستر ہلایا۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ شاید رونقی نے جوا کھیلا ہے کیونکہ اُس سے اور کسی بے ایمانی کی اُنہیں مُطلقاً توقع نہ تھی۔ مگر اُنہیں یہ دیکھ کر کیسی حیرت ہُوئی۔ کہ رونقی کے بستر کے نیچے ہار پڑا تھا وہ اُسے دیکھ کر سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھے۔ اگر کوئی دوسرا شخص یہی فعل کرتا۔ تو رائے صاحب ممکن ہے درگذر کر جاتے۔ مگر رونقی کو رنگے ہاتھوں دیکھ کر اُن کا خون جوش مارنے لگا۔ اُنہوں نے نہایت نرمی سے جو سخت غصے سے بھی خوفناک ہوتی ہے پوچھا" رونقی ! یہ ہار کہاں سے اُڑایا ؟ یہ تو ابھی چند ہی دن ہُوئے خریدا تھا

رونقی میں خواہ لاکھوں عیب تھے۔ مگر وہ چور نہ تھا۔ اس صفت کے لئے رائے صاحب اُس کی اکثر تعریف کیا کرتے تھے۔ اس وقت اُس کی وہ تمام نیکنامی مٹی میں ملنے کو تھی۔ رونقی نے سوچا۔ اب تمام واقعہ صاف صاف کہہ دینا چاہیئے پورن چند آخر رائے صاحب کا بیٹا ہے۔ اُسے کھا تو نہ جائیں گے۔ یہ سوچ کر اُس نے حوصلہ مندی کے انداز سے سر اُٹھایا اور ہاتھ باندھ کر جواب دیا

سرکار! معاملہ یوں ہے کہ . . . .

اِتنے میں اُس کی نگاہ پورن چند پر گئی۔ وہ اس طرح کانپ رہا تھا۔ جیسے کسی کو بخار چڑھ رہا ہو۔ اُس نے ایک عجیب انداز سے رونقی کی طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔ رونقی کو ایسا معلوم ہُوا۔ جیسے پورن چند نے اُسے کہا ہے۔ آخر تم کمبخت نکلے۔ مَیں نے تم پر اعتبار کیا تھا۔ مگر تم اس کے ناقابل ثابت ہُوئے۔ کاش میں یہ پہلے سے سوچتا تو اس وقت رُسوا نہ ہوتا،

جس طرح ہوا کا رُخ بدلنے سے پتنگ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اُسی طرح اس نگاہ سے رونقی کا ارادہ تبدیل ہوگیا۔ اُس نے فیصلہ کر لیا۔ کہ خود بدنام ہونگا مگر پورن چند پر حرف نہ آنے دونگا۔ یہ سوچ کر اُس نے رائے صاحب سے کہا۔ سرکار معاملہ یوں ہے کہ مَیں ہی نے چوری کری ہے،،

رائے صاحب اُس کی چارپائی پر بیٹھ گئے اِس وقت اُن کو ایسا افسوس ہُوا، گویا ہزاروں کا نقصان ہوگیا ہے مگر پورن چند دل ہی دل میں اس پر عش عش کر رہا تھا۔ دنیا میں ایسے آدمیوں کی کمی نہیں جو اپنی غرض کے لئے دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ مگر دوسروں کے لئے جھوٹ بولنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔

رائے صاحب نے تھوڑی دیر سکوت کیا اور پھر کہا۔ تم صبح ہونے سے پہلے پہلے میرے مکان سے نکل جاؤ۔ بس یہی تمہاری سزا ہے،،

رونقی اور پورن چند دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

(۶)

اس کے ایک سال بعد رائے صاحب سرجن مل کا انتقال ہوگیا۔ اب سارے روپیہ پیسے کا پورن چند ہی مالک تھا۔ اُس نے کریاکرم سے فارغ ہوکر رونقی کے نام چار سو روپیہ کا منی آرڈر بھجوایا۔ اور ساتھ ہی خط لکھا کہ تم فوراً میرے پاس آجاؤ۔ مگر ایک ہفتہ کے بعد منی آرڈر واپس آگیا۔ ساتھ ہی اُس کے بھائی کا خط آیا جس میں لکھا تھا۔ کہ اُسے مرے ہُوئے ایک سال گذر گیا ہے وہ جب آپ کے ہاں سے آیا تو ہمیشہ اُداس رہا یہ اُداسی اُس کے چہرے سے دمِ واپسیں تک نہیں گئی ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُسے کوئی روگ ہے۔ مگر کیا روگ ہے ؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوسکا۔

پورن چند پر اس خط کا ایسا اثر ہُوا۔ کہ کئی دن تک روتا رہا۔ اب اُس نے جُوا کھیلنا ترک کر دیا ہے اور رونقی کے نام پر ایک دھرم سالہ بنوادی ہے۔ اور اُس میں اُسکی قدآدم تصویر رکھی ہے لوگ اُسکی حماقت پر ہنستے ہیں۔ مگر وہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ رونقی کی جاں نثاری کے مقابلہ میں اتنی وقعت بھی نہیں رکھتا۔ جتنی ذرہ آفتاب کے مقابلہ میں۔

سُدرشن

اعترافِ گُناہ

کُھلے دروازے کے سامنے، میں کوئی ایک لمحہ تک پس و پیش کے عالم میں کھڑا رہا۔ لیکن جب بڑھیا نے، جو مجھے وہاں تک لائی تھی، دوبارہ کہا کہ "یہی جگہ ہے" تو میں اندر گیا۔

پہلے پہل تو میں ایک دھندلے سے 'فانوس پوش لمپ' کے سوا اور کچھ نہ دیکھ سکا' لیکن ذرا دیر کے بعد مجھے دیوار پر ایک لمبے پتلے جسم کا بے حرکت سایہ نظر آیا۔ کمرہ پیٹرول اور ایتھر کی بد بو سے معمور تھا صرف چھت کی سلیٹوں پر بارش کے پڑنے کی آواز سُنائی دیتی تھی، یا ٹھنڈی چمنی میں سے گذرتی ہُوئی ہوا کا غمگین ترنم، ورنہ چاروں طرف ایک سکوتِ مزار طاری تھا۔

"موسیو!" بڑھیا کسی چیز پر جھک کر (جو مجھے بعد میں معلوم ہُوا کہ ایک بستر ہے) ملائمت کے لہجہ میں بولی "موسیو! جن صاحب سے آپ ملنا چاہتے تھے۔ وہ یہاں تشریف لے آئے ہیں"

سایہ اُٹھتا ہُوا نظر آیا اور ایک نحیف سی آواز سُنائی دی کہ "بہت خوب .... جاؤ۔ میڈم تم جاؤ"

جب بڑھیا دروازہ بند کر کے چلی گئی تو آواز آئی "موسیو۔ میرے نزدیک آجائیے۔ میں تقریباً اندھا ہوں۔ میرے کانوں میں ہر وقت سنسناہٹ سی رہتی ہے۔ مجھے بہت کم سُنائی دیتا ہے۔ یہاں میرے پاس ہی ایک کُرسی ہو گی۔ اس تکلیف دہی کی معذرت چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے آپ سے ایک نہایت ضروری بات عرض کرنی ہے"

میری طرف مڑے ہُوئے چہرے کی آنکھیں ٹکٹکی لگائے مجھے گھور رہی تھیں۔ بوڑھا کانپتا ہُوا بولا، "لیکن پہلے یہ بتائیے۔ کیا آپ موسیو گرینسو ہیں۔ کیا میں موسیو گرینسو سرکاری وکیل سے مخاطب ہوں؟"

"ہاں"

اُس نے ایک اطمینان کا سانس لیا

"تو پھر میں آخر کار اپنے گناہ کا اقبال کر سکتا ہوں۔ میں نے خط پر اپنا نام پیریئر لکھا تھا لیکن اصل میں میرا نام یہ نہیں ہے۔ اگر قریب آئی ہوئی موت نے میری قلب ماہیت نہیں کر دی تو آپ مجھے کچھ نہ کچھ ضرور پہچان سکتے ہیں .... لیکن خیر کوئی مضایقہ نہیں۔

"کچھ برس ہونے کو آئے۔ بلکہ بہت عرصہ گذرا، میں حکومتِ جمہوری کا سرکاری وکیل تھا۔

میں اُن معدودے چند اشخاص سے تھا جن کی بابت زبانِ خلق کی پیشینگوئی یہ ہُوا کرتی ہے کہ "اُس کا مستقبل شاندار ہوگا" اور میں نے اپنے مستقبل کو شاندار بنانے کا ارادہ صمیمِ دل سے کر رکھا تھا۔ میرا اظہارِ قابلیت صرف ایک موقعہ کا محتاج تھا۔ وہ موقعہ مجھے عدالت سشن کے ایک مُقدمے کی صورت میں مل گیا۔ جُرم ایسا تھا کہ اگر وہ پیرس میں رُونما ہوتا تو کسی خاص توجہ کا جاذب نہ بنتا لیکن اُس مختصر سے قصبے میں اُس سے بڑی سنسنی پھیلی۔ جس روز عدالت میں مقدمے کی رُوداد پڑھ کے سُنائی گئی مجھے محسوس ہُوا کہ مقدمہ سہل نہیں، بڑی بحث و تکرار کا موضوع ہوگا۔ ملزم کے خلاف شہادت بڑی زبردست تھی لیکن اُس میں وہ فیصلہ کُن عنصر مفقود تھا، جس کی موجودگی میں ملزم کے لئے عموماً اقبالِ جُرم کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا۔ ملزم نے اپنی معصومیت کو کچھ ایسے پیرائے میں بیان کیا کہ حاضرین جلسۂ عدالت کے دلوں پر شک اور ہمدردی کا ایک مخلوط جذبہ طاری ہوگیا۔ اور آپ ایسے جذبہ کی اثر ریزی سے بخوبی واقف ہیں۔

"لیکن ایسے جذبات مجسٹریٹ پر کوئی اثر مرتب نہیں کرسکتے۔ میں نے ملزم کے منکرانہ بیان کے جواب میں ایسے ایسے واقعات بیان کئے جن سے شہادت کی ایک مسلسل زنجیر سی تیار ہوگئی۔ میں نے ملزم کی زندگی کے کُل سوانح عدالت کے پیشِ نظر کردیئے اُسکی ساری کمزوریوں اور بُرائیوں کو بے نقاب کردیا۔ جیوری کے سامنے میں نے جُرم کا مرقع بڑی نفاست سے کھینچا اور پھر جس طرح شکاری کُتا شکاریوں کو ساتھ لے کر شکار کے غار کے پاس جاتا ہے۔ اُسی طرح میں نے بھی آخیر میں ملزم کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ "مجرم یہی ہے"۔

پیرو کارِ صفائی نے میری دلیلوں کے جواب دیئے۔ اپنی بساط بھر اُس نے میرا مقابلہ خوب کیا۔ لیکن محض بے سُود۔ میں قیدی کے سر کا سائل تھا اور وہ مجھے مل گیا۔

وہ تھوڑی بہت ہمدردی جو میرے دل میں قیدی کے لئے جاگزیں ہوگئی تھی، میرے غرورِ بلاغت کے سامنے بہت عرصے تک موجود نہ رہ سکی۔ عدالت کا فیصلہ قانون کی اور خود میری ایک مہتم بالشان فتح تھا۔

میں نے اُس آدمی کو سزایابی کے دن پھر دیکھا جلّاد اُس وقت اُسے جگا کر قتل گاہ کی طرف لیجانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

جب میں نے اُسکے مایوس چہرے کی طرف نظر کی، میرے دل کو ایک شدید صدمہ پہنچا۔ اُس خوفناک وقت کی ہر ہر بات میرے دماغ میں ابتک تازہ ہے۔ جب اُنہوں نے اُس کے دست و پا کو زنجیر و سلاسل میں جکڑ دیا۔ تو وہ بالکل خاموش رہا

اُس کی طرف دیکھنے کی مجھے جرأت نہ ہوتی تھی۔ اُس کی سکوں ریز آنکھیں ایک عجیب اندازِ سکوت سے میری طرف جمی ہُوئی تھیں۔ جب وہ زندان کے دروازے سے باہر آ کر گلوتین کے سامنے کھڑا ہُوا اُس نے دو مرتبہ چلا کر کہا "میں بیگناہ ہوں میں بیگناہ ہوں" اور وہ لوگ جو اُسے مرکزِ لعنت و ملامت بنانے پر آمادہ کھڑے ہُوئے تھے چُپ کے چُپ رہ گئے۔ پھر وہ میری طرف رجوع ہُوا اور بولا "مجھے قتل ہوتا دیکھو۔ یہ تمہاری محنت کا انعام ہے" وہ اپنے پادری اور وکیل سے لپٹ گیا...... کچھ ایسے یاد آتا ہے کہ پھر وہ خود بخود گلوتین پر جا چڑھا۔ اور انتظارِ موت کے انجام پذیر نہ ہونے والے لمحہ کے لئے، بغیر کسی ہچکچاہٹ کے، چاقو کا انتظار کرتا ہُوا تختہ پر پڑا رہا۔ میں سر برہنہ پاس کھڑا تھا...... مجھے کچھ دھندلا دھندلا خیال ہے..... کیوں کہ میں کچھ بھی نہ دیکھ رہا تھا، میرا دماغ ایک لمحہ کے لئے تو بالکل سُن ہو گیا تھا۔

اُس کے بعد کے دنوں میں ایک خاص تکلیف نے میرے جسم کو بے حس و حرکت کر دیا۔ میرا دماغ اس قدر پریشان خیال ہو گیا کہ اُس تکلیف کا باعث معلوم کرنے سے قاصر تھا۔ اُس شخص کی موت کا خیال ایک بے نام سے بوجھ کی طرح ہر وقت میرے دل پر رہتا تھا۔ ساتھی وکیلوں نے مجھ سے کہا کہ شروع شروع میں ایسا ہی ہُوا کرتا ہے،

میں نے اُنکی بات کا اعتبار کیا۔ لیکن رفتہ رفتہ مجھے معلوم ہو گیا کہ میری تکلیف کی ایک خاص وجہ ہے...... شک! ..... جس لحظہ سے مجھے یہ علم ہُوا میری راحتِ جگر کافور ہو گئی۔ ذرا سوچو تو سہی کہ ایک مجسٹریٹ کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہوگی جب وہ کسی کے قتل کا حکم دینے کے بعد اپنے دل میں سوچتا ہوگا کہ

"شاید وہ مجرم نہ ہو"

مَیں نے اپنی تمام طاقت اس خیال کو رفع دفع کرنے میں صرف کر دی۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ یہ خیال محض بیہودہ ہے۔ میں نے استدلال کی مدد سے اپنے دل و دماغ کے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہا، لیکن میری تمام دلیلیں اس ایک سوال کے آگے رد ہو جاتی تھیں کہ کوئی اصلی ثبوت بھی تھا کہ نہیں؟ تب میں اُس شخص کے واپسیں لمحوں کی سوچ میں محو ہو جاتا۔ اُس کی پرسکون آنکھیں میرے سامنے آ جاتی تھیں۔ اور اُس کی آواز میرے کانوں میں گونجنے لگتی تھی۔

"اور ایک دن اُسی قتل گاہ کا دردانگیز سماں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا کسی نے مجھ سے کہا "اُس شخص نے اپنی صفائی نہایت خوبی سے پیش کی تھی بڑی حیرت خیز بات ہے کہ وہ بری نہ ہو سکا..... یقین جانو کہ اگر میں تمہاری آخری دلیل نہ سنتا تو میں

یہی سمجھے رہتا کہ وہ معصوم تھا۔

تو گویا میرے زورِ بیان کی سحر طرازی اور میری مقدمہ جیتنے کی مستقل خواہش نے اُس تماشائی کے شکوک رفع کر دیئے تھے۔ شاید جیوری کے ساتھ بھی ایسا ہی ہُوا ہو۔ . . . اگر ایسا ہے پھر تو میں ــــــ صرف میں ــــــ اس آدمی کی موت کا جواب دہ ہونگا اور اگر وہ ناکردہ گناہ مارا گیا تو پھر اس کا خون میری گردن پر سوار ہے۔

کوئی شخص کسی الزام کو چپکے سے اپنے سر پر نہیں لے لیتا۔ وہ کوئی نہ کوئی مدافعانہ کوشش ضرور کرتا ہے۔ اپنے ضمیر کو کسی نہ کسی طرح مطمئن کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال سے میں نے مقدمہ کے کاغذات کو از سرِ نو دیکھنا شروع کیا۔ تمام دستاویزات و تحریرات کے دوبارہ دیکھنے کے بعد بھی میں اُسی پہلے نتیجے پر پہنچا لیکن وہ تمام تحریرات، تمام دستاویزات میرے ہی متعصب دماغ کی تیار کردہ تھیں میری ہی ہوسِ ترقی کی زائیدہ، اور اُس شخص کو مجرم ثابت کرنے کی ضرورت کا نتیجہ تھیں۔

پھر میں نے مقدمہ کے دوسرے پہلوؤں کی طرف توجہ کی۔ ملزم سے کئے ہُوئے سوالوں کے جواب دیکھے۔ گواہوں کی شہادتیں پڑھیں۔ چند نکات ہنوز حل طلب تھے، اُن کے سمجھنے کو میں محلِ واردات پر گیا۔ میں نے قاتل کے استعمال کردہ ہتھیار کو ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ کوئی بیس مرتبہ میں نے تمام امور پر غور و خوض کی۔ آخر کار میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ بیچارہ معصوم تھا۔

اور پھر تاسّف کی سلگتی آگ کو بھڑکا دینے کے لئے مجھے چندروز بعد ایک عہدۂ جلیلہ عطا کیا گیا ــ آہ۔ یہ میری انتہائی دناءت کا تہدیہ عوض تھا!

موسیو! میں نہایت ضعیف دل واقع ہُوا تھا۔ میں نے بغیر اظہارِ سبب کے استعفا دیکر اپنے زعم میں یہ فرض کر لیا کہ بس گناہ کا کفارہ ہو گیا۔ میں نے ایک دور دراز سفر شروع کیا۔ لیکن افسوس! دل کا گم کردہ سکون طول طویل سفروں سے مل نہیں سکتا۔

اب میری زندگی کا مقصدِ وحید یہ ہو گیا کہ جس طرح ہو سکے اُس نا انصافی کی تلافی کروں۔ لیکن وہ آدمی کوئی آوارہ بے خانماں تھا۔ اس کا نہ کوئی رشتہ دار تھا نہ مونس۔ اس حالت میں مجھے ایک ہی بات زیبا تھی۔ وہ یہ کہ میں اپنی خطاکاری کو صاف صاف مان لیتا۔ مگر نہیں مجھے اس کی ہمّت کہاں؟ ــــ یہ خوف کیا کم تھا کہ میرے ہم پیشہ واقف کار مجھ پر خفا ہوں گے، مجھے ہدفِ استہزا بنائیں گے!

آخر کار میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اپنے تمام سرمایہ کو محتاجوں اور مجرموں کی حاجت روائی اور کشود کار میں صرف کر دوں۔ بھلا مجھ سے زیادہ اور کون اُن تیرہ بختوں

کو قانون کے سخت گیر شکنجے سے بچانیکا کفیل تھا؟ میں نے زندگی کے تمام لذایذ و مسرات سے مغائرتِ کلّی اختیار کر لی۔ اہلِ دنیا کی نظروں سے اوجھل تنہائی میں رہتا رہا۔ وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میں نے اپنے لوازمِ زندگی کو بہت کم کر دیا ہے۔ مہینوں میں اس تاریک خلوتخانہ میں پڑا رہا ہوں اس مرض الموت میں بھی یہیں مبتلا ہوا، اور آرزومند ہوں کہ یہیں مروں + — اور ہاں اب میں نفس مدّعا عرض کرتا ہوں

اُس کی آواز اس قدر دھیمی ہو گئی تھی کہ مجھے اسکی باتوں کا مفہوم اُس کے کپکپاتے ہُوئے ہونٹوں سے کان لگا کر ہی سمجھنا پڑتا تھا۔

میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ میری کہانی بھی مدفونِ فراموشی ہو جائے۔ میری تمنّا ہے کہ آپ اسے اُن اشخاص تک پہنچا دیں جن کا فرض مقتضائے انصاف کی رُو سے مجرموں کو سزا دینا ہے۔ آپ اُن پر واضح کر دیں کہ ملزموں کو ضروری طور پر سزا دینے کا خیال کس قدر ہولناک ہے۔ آپ یہ بات سرکاری وکیلوں کے ذہن نشین کرنیکی کوشش کریں کہ جب وہ کسی ملزم کو سزا دلانے کھڑے ہوں تو اس بات کا لحاظ رکھیں کہ مبادا کوئی ناقابلِ تلافی غلطی سرزد ہو جائے۔"

میں نے اُسے یقین دلایا کہ "آپکی ہدایت پر ضرور کاربند ہونگا"

اُسکا چہرہ نیلگوں اور سیاہ ہو رہا تھا۔ اُسکے ہاتھ تھرتھرا رہے تھے۔ وہ بولا "لیکن محض یہی نہیں.... میرے پاس ابھی تک کچھ روپیہ ہے.... جسے میں کسی مصرف میں نہیں لا سکا..... وہ وہاں میز کے خانہ میں پڑا ہے..... میرے بعد اُسے غریبوں میں تقسیم کر دینا.... میرے نام سے نہیں اُس شخص کے نام سے جو آج سے تیس برس پیشتر میری غلطی کا شکار ہُوا تھا..... یہ تمام روپیہ اُسی رینل کے نام سے تقسیم کر دینا"

میں چونک اُٹھا۔

"رینل۔ لیکن اُسکا وکیل تو میں تھا میں نے......"

اُس نے اپنا سر ہلایا۔

"میں جانتا ہوں۔ اسی لئے تو میں نے آپکو بلایا تھا۔ آپکے آگے تو مجھے اپنے گناہ کا اعتراف کرنا لازمی تھا میں ڈیوروکس سابق سرکاری وکیل ہوں"

اُس نے اپنے بازوؤں کو اوپر اُٹھانیکی کوشش کی وہ زیرِ لب آہستہ سے بولا "رینل.... رینل....."

شاید میں نے اپنے پیشہ کا ایک راز فاش کر دیا۔ اور ایک ایسے قاعدے کی خلاف ورزی کی جس پر عمل پیرا ہونا میرا فریضۂ واجبی تھا۔ لیکن اُس مرتے ہُوئے شخص کی قابلِ رحم حالت نے میرے منہ سے بے اختیار نکلوا ہی دیا:-

"موسیو ڈیوروکس۔ موسیو ڈیوروکس — رینل در اصل مجرم تھا۔ اُس نے قتل گاہ کو جانے سے پہلے اس کا اقبال کر لیا تھا مجھ سے رخصت ہوتے وقت اُس نے سب کچھ مجھے بتا دیا تھا"

لیکن وہ تو پہلے ہی ختم ہو چکا تھا میں ہمیشہ یہ یقین کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں کہ اُس نے میری آخری بات ضرور سُن لی تھی!

(ترجمہ) محمد ہادی حسین (مشن کالج لاہور)

چاند

اے چاند! ممکن ہے کہ تجھے اپنی چاندنی پر ناز ہو کیونکہ بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جب تو چمکتا ہے تو ایک چاندی کا دریا ہماری اس میلی زمین پر لہریں مار کر اسے خوبصورت بنا دیتا ہے۔ بظاہر پتھر۔ سبزہ۔ پانی سب کو تو پیار کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور ان میں ایک نئی رونق۔ نیا جوبن پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ تیری نورانی شعاعوں سے انسان کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی پھر تر و تازہ ہوتی ہے۔ دماغ میں نئی روشنی آتی ہے اور وہ جذبات جو اس دنیا کی کش مکش سے دب جاتے ہیں وہ ازسرنو جوانی کی مستانہ ادا سے جھومتے ہوئے انسانی دماغ کے باغ میں خوشی خوشی سیر کرنے لگتے ہیں۔ تیری چاندنی کیا ہے سنگِ پارس ہے، جسے چھو گئی اسے سونا کر گئی، آبحیات ہے جو مردہ دلوں کو زندہ کرتی ہے پیغام بقا ہے جو انسانی روحوں کو دیوتاؤں سے بالاتر رتبہ عطا کرتی ہے۔ لیکن اے چاند کیا تجھے معلوم ہے کہ تیری سطح پر نہ پانی نہ ہوا نہ کوئی جاندار چیز، تیرا سینہ۔ ایک جھلسا ہوا داغدار بھیانک غاروں اور چٹانوں کا مجموعہ، جوانی کی آگ بجھی ہوئی، بڑھاپے کی پیاس مری ہوئی۔ زندگی کی آس ٹوٹی ہوئی بلکہ یہ چاندنی بھی تیری اپنی نہیں تیرے گدائی کے پیالے میں سورج کی خیرات ہے۔ اور کیسی خیرات کہ مہینے بھر میں دو چار دن پیٹ بھر کر۔ ورنہ کبھی نصف روٹی کبھی اس سے بھی کم۔ اور کبھی کچھ بھی نہیں۔

اے چاند کیا تجھے معلوم ہے کہ ہمارے ملک کا بھی یہی حال ہے۔ دور سے دیکھیں تو اچھا، سارے زمانے میں مشہور، اغیار کیلئے مالدار، مغربی سورج کا تختۂ مشق، ورنہ در اصل وہی جھلسا ہوا بے جان صدیوں کا مردہ۔

اے چاند مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تو اس زمین سے جدا ہوا تو بدبختی کی مٹی کچھ تو ساتھ لے گیا اور کچھ ہندوستان میں ڈالی گئی تیری اور ہندوستان کی مٹی کا خمیر ایک ہے۔ تو دیوانہ وار دنیا کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ ہمارا ملک غلامانہ وار دنیا کے با اقبال زبردستوں کے گرد پھرتا ہے۔ نہ تیرے لئے رہائی ہے نہ ہمارے لئے نجات۔

اے بے نصیب ہندوستان کے بدبخت بچھڑے ہوئے بھائی۔ کاش کہ تو روشن نہ ہوتا اور کاش کہ ہندوستان آباد نہ ہوتا۔ اس زمین کی اولاد میں سے ایک تو اور ایک ہمارا ملک دونو نامراد۔ دونو کے سینے داغدار۔ دونو کی آس ٹوٹی ہوئی آ۔ تو اور میرا ملک یہاں سے کوچ کریں۔ آسمان کے ہرے بھرے کھیت میں ہزاروں جگہ اور ہیں چل کہیں اور بسیرا کریں

عبدالعزیز

بہترین دُنیا

"میں تجھے بہترین دُنیا کا تذکرہ کرتے ہُوئے سُنتا ہوں، تو وہاں کے بچّوں کو جماعتِ فرحناک بتاتی ہے! اماں! وہ نورانی ساحل کہاں ہے؟ کیا ہم اس کی جستجو نہ کریں، اور اُس کے لئے آنسو نہ بہائیں؟ وہ وہاں تو نہیں ہے جہاں نارنگی کے پھول شگفتہ ہوتے ہیں، اور جہاں کنجہائے حنا میں جگنو چمکتے ہیں؟"

"نہیں میرے بچے وہ وہاں نہیں ہے!"

"کیا وہ وہاں ہے جہاں پر رکھنے والے کھجور کے درخت اُگتے ہیں" اور جہاں آفتابی آسمان کے تلے کھجوریں پکتی ہیں؟ یا چمکتے ہوئے سمندروں کے بیچ میں، ہرے ہرے جزیروں کے درمیان جہاں خوشبو سے بھرے ہوئے جنگل نسیم سحر کو معطر کرتے ہیں" اور خوبصورت چمکیلی چڑیاں اپنے پھڑپھڑاتے ہُوئے بازوؤں پر دُنیا کے تمام الوانِ خوشرنگ کی حامل ہوتی ہیں؟"

"نہیں میرے بچے وہ وہاں نہیں ہے!"

"کیا وہ یہاں سے بہت دور کسی قدیم کرۂ ارض پر تو نہیں ہے، جہاں دریا سنہری ذرات پر مصروف تگ و دو ہوتا ہے؟ — جہاں تابندہ یاقوت کی درخشاں شعاعیں چمکتی ہیں، اور ہیرے پوشیدہ معادن کو منور کرتے ہیں، اور موتی حلقہ ہائے مرجان سے ضیاء پاشِ انوار ہوتے ہیں؟ — اچھی اماں! بہترین دُنیا کیا وہیں ہے؟"

"نہیں میرے بچے وہ وہاں بھی نہیں ہے!"

"آنکھوں نے اُس کا مشاہدہ نہیں کیا ہے، کانوں نے اُس کے عمیق نغماتِ مسرت کو نہیں سُنا ہے، تصور ایسی حسین دنیا کا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہے — موت اور اندوہ وہاں بار نہیں پا سکتے! اس کی سدا بہار کلیوں پر زمانہ اپنا تاثر نہیں پیدا کر سکتا — بادلوں کی سرزمین سے بہت پرے، قبروں کے عمق سے بہت دُور —

میرے لاڈلے! بہترین دُنیا وہاں ہے!"

(ترجمہ) نعمت۔ گورکھپوری

محبّت

ہوا، آغوشِ سحر میں تھک کر مثل اُس بچّے کے سو رہی ہے جو رات بھر چیخ چیخ کر رو یا ہو
ناشگفتہ کلیوں کی دلفریب چٹک چھیڑ چھیڑ کر اُسے بیدار کر رہی ہے

آدھی رات کے خاموش منظر کے بعد جب تاروں کی خاموش ضیاء پاشی پر اضمحلال طاری ہوتا ہے
سمندر کی موجیں دامنِ سکون میں مُنہ چھپانے لگتی ہیں اور پہاڑ کی بلند و برفانی چوٹیاں تاریکی میں
غائب ہو جاتی ہیں تو آہ . . . . اُس وقت میری روح تیری آواز کی منتظر ہوتی ہے

محبت! محبت تیری مہربانیاں میری قاتل ہیں۔

آہ اے میری رفیقِ زندگی، خدا کیلئے اپنی روح کو "سمندر پار" سے میرے سوالوں کا جواب دینے کی اجازت دے
آرام و آسایش کی خوشبو انقطاعِ نفس کے بعد محبت کی پُراسرار خاموشی میں اڑتی ہے، آہ اسی
کو لوگ موت کہتے ہیں۔

ہاں میں استدعا کرتی ہوں کہ تو مجھے ایک بوسۂ محبت سے پھر زندہ کردے۔

آرزو و بیخودی کے پُرپیچ راستوں اور نشیب و فراز سے تھک گئی اور غنودگی کی خاموش وسعت
میں محو رہنے والا دل جو کبھی فردوسِ محبت تھا اب نالہ کش ہے۔

آہ میں چمکتی ہُوئی گھاٹیوں اور چاند کو فریفتہ کرنیوالی خلیجوں میں تنہا ہوں . . . چشمۂ حیات کا مدّ و جزر،
اُمید کے عمیق سمندر، خواہش کی متلاطم امواج میرے مسکن ہیں اور میں ان سب سے واقف، مگر آہ ہوا کا کوئی دردمند جھونکا
یا شبِ ہجراں میں عاشقوں کو بہلانیوالے ستارے، اُس مقام کا پتہ نہیں دیتے جہاں تو ہے، کاش تو ہی بتا کہ تو کہاں ہے؟

آہ اے میری تقدیر مجھے وہ وقت کب میسّر ہوگا جب میں اُسکے چہرۂ سیمیں کی پرستش سے اپنے خلوصِ
نیازمندی کا ثبوت دے سکونگی۔

اے گذرے ہُوئے دنوں کے خیال بتا کہ انبساطِ رُوح کا کیا ساماں کروں . . . خیر اگر تو نہیں بتاتا تو نہ
بتا، مگر میں خوش ہوں کیونکہ خوابِ گذشتہ کی جگمگاتی ہُوئی رُوحیں اس اندھیرے میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

"ناٹیڈو"

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

محفلِ ادب

نغمۂ مغموم - آج پرانے مسودوں میں ہمیں سرور مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ نظم کا مسودہ مل گیا جس کو دیکھ کر بزم سُرور کے چھلکتے ہوئے ساغر یاد آ گئے اور گذشتہ بزم آرائیوں کی ایک دُھندلی سی تصویر آنکھوں میں پھر گئی، ہم ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے یہ بادۂ کہن پیش کرتے ہیں۔

وہ ایذائے خلش سے آہ میرے قلبِ مضطر پر
نظر آتا ہے اک قطرہ لہو کا نوکِ نشتر پر
شبِ غم میں گریں کچھ آہ ایسی بجلیاں سر پر
گماں نبضِ رگِ شعلہ کا ہے ہر تارِ بستر پر
شرارِ جستہ کا دھوکا ہے مجھکو جسمِ لاغر پر

تپِ سوزِ دروں نے دل میں ڈالے سینکڑوں چھالے
جگر کے اُڑ رہے ہیں نالۂ سوزاں سے پرکالے
پریشاں رُخ پہ گیسو ہیں کہ لہراتے ہیں دو کالے
شبِ غم میں کہاں آنکھوں میں وہ سُرمہ کے دنبالے
برستی ہے اُداسی ہجر میں اب دیدۂ تر پر

چبھوتا ہے مرے پہلو میں رہ رہ کر کوئی نشتر
ٹپکتا ہے کلیجہ چشمِ تر سے اشکِ خوں ہو کر
برنگِ لالہ داغوں سے شگفتہ ہے دلِ مضطر
دوپٹے کا کہاں اب سرخ آنچل دوشِ نازک پر
کہ دھبے جابجا اب اشکِ گلگوں کے ہیں چادر پر

وہ نقشہ اب کہاں اگلا سا شانِ دلربائی کا
وہ عالم قدِ رعنا میں کہاں رنگیں ادائی کا
گلہ کس سے کروں میں بختِ بد کی نارسائی کا
نہ پوچھو مجھ سے کچھ عالم خلش ہائے جدائی کا
بدلتی ہوں شبِ غم کروٹیں میں نوکِ نشتر پر

نہ نکلے جسکے ارماں وہ دلِ درد آشنا ہوں میں
فغانِ بے اثر ہوں، نالۂ حسرت فزا ہوں میں
نہ گلگونہ ہوں چہرے کا، نہ ہاتھوں کی حنا ہوں میں
وہ بیکس ہوں، شہیدِ پرسشِ تیغِ جفا ہوں میں
نہ پوچھو، کچھ قیامت کے ہیں چرکے قلبِ مضطر پر

کہوں کیا کس کشاکش میں ہے جانِ ناتواں میری
کلیجہ تھام کر اُٹھتی ہے اب دل سے فغاں میری
وہ جوڑا ہے عروسی کا، نہ اب وہ چُندریاں میری
وہ بیکس ہوں کہ توڑیں آسماں نے چوڑیاں میری

انگریزی نقادوں نے تو مصور جذبات شکسپیئر کے اکثر ناٹکوں کی سطریں تک شمار کر ڈالی ہیں اور دکھایا ہے کہ یورپ کا یہ بہترین ڈرامانویس کس طرح دوسرے شعرا کے خیالات کو بے دھڑک نظم کرتا جاتا ہے ہنری ششم شیکسپیئر کا بہت مشہور ناٹک ہے۔ اُس میں کل ۶۰۴۳ سطریں ہیں۔ ان میں سے ۱۸۱۱ سطریں تو شیکسپیئر کی تصنیف ہیں۔ بقیہ تمام حصہ دوسرے شعرا کا ہے جسے شیکسپیئر نے بعینہٖ یا قدرے ردو بدل کے بعد اُٹھا کر اپنے ناٹک میں رکھ لیا ہے۔ ہندی کے ایک مشہور نقاد کا قول ہے۔ کہ اگر اپنے سے پہلے شاعروں کے خیالات کو اپنے کلام میں جذب کرنا چوری میں داخل ہے۔ تو ہندی کا کوئی بھی شاعر اس الزام سے خالی نہ بچے گا۔ آسمان شہرت کے سُورج اور تاروں کو بھی گرہن لگ جائیگا۔ یہی حال دوسری زبانوں کا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ قدیم شعرا کے خیالات کو لے لینا ایک عام بات ہوگئی ہے۔ پھر ایک امر کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ ایسا کرنے کا حق اُسے اور صرف اُسے حاصل ہے جو درحقیقت باکمال ہو۔ اور اُس خیال پر ہاتھ ڈالنے کا مستحق ہو۔ پرانے ادب کی عمارت سے اگر وہ کوئی اینٹ لیکر اپنی عمارت میں استعمال کرتا ہے۔ اور وہ ٹھیک نہیں بیٹھتی ـــــ اُس کا رنگ، اُس کی بناوٹ، اُس کی چمک دمک سب سے الگ دکھائی دیتی ہے۔ تو یہ بلاشبہ سرقہ ہے۔ اور اس پر ملامت ہونی چاہیئے۔ لیکن اگر وہ اُس اینٹ کو ایسے طریقہ سے استعمال کرتا ہے کہ اُسے عام نظر شناخت نہ کرسکے۔ اور اُس کی عمارت [illegible] خوبصورتی بڑھ جائے۔ تو یہ سرقہ نہیں کہلاتا۔ اور یہ خیال ہمارا نہیں بلکہ سنسکرت اور انگریزی کے علما کا ہے۔ دھونیا لوک اور ایمرسن نے اس کو بوجہ احسن تسلیم کیا ہے۔ اور اس کی اجازت دی ہے۔　　　اُوشا (ہندی)

اُس کی آنکھیں۔ اُس نے مجھ سے پوچھا "میری آنکھیں کیسی ہیں"

میں نے جواب دیا "ہرن کی سی"

"ہرن کیسا ہوتا ہے، میں نے تو اُسے کبھی نہیں دیکھا"

"معصوم بچے کی طرح"

لیکن وہ کس سے ملتا جلتا ہے، اُسے دیکھ کر کیا یاد آتا ہے؟"

"پرماتما"

اُس نے تنگ آکر کہا "پرماتما کیسا ہے؟"

میں نے جواب دیا "تمہارے جیسا"

"مگر میں کیسی ہوں"

میں نے ہنس کر کہا۔ میرے دل کی رانی!

میرے آئینۂ دل کے سامنے آ اور اُس میں اپنی شکل دیکھ۔ تو اپنے ہی جیسی ہے میں تجھ کو کس سے تشبیہ دوں ـــــ نہیں مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا۔

اور ان سب کے عوض میں صرف خود میرا بن جا۔

کیا یہ قیمت کافی نہیں۔ تو میں پھر اور کیا دوں

ایک ہلکی سی آواز آئی "اپنی خودی"

کیا یہ تو ہے۔ تو آ۔ اور میری خودی کو پاؤں تلے مسل کر مجھے زمین سے اُٹھا + کنج دبگالی

میں اور تو۔ جب میں دیکھتا ہوں۔ کہ تو نے اپنا مندر میرے حوالے کر دیا ہے، تو میں تیری مہربانیوں کے بار سے نیچے دب جاتا ہوں۔ مگر جب یہ دیکھتا ہوں۔ کہ تو خود اُس میں دکھائی نہیں دیتا۔ تو وہ مندر میری نگاہوں میں تیرہ و تار ہو جاتا ہے۔

جب میں دیکھتا ہوں کہ تو نے میرے کانوں کی ضیافت کے لئے کیسا دلآویز نغمہ چھیڑ رکھا ہے۔ تو میری روح تیرے شکریہ میں زمین بوس ہو جاتی ہے۔ مگر جب میں اُس میں تجھے گم پاتا ہوں تو اُس نغمہ کی قدر و قیمت غائب ہو جاتی ہے۔

جب میں باغ میں تیرے حسن کا جلوہ دیکھتا ہوں تو میری محبت تجھ پر نثار ہونا چاہتی ہے۔ مگر جب مجھے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ تیرا جلوہ حسن ہے۔ مگر حسن نہیں۔ بُو ہے مگر پھول نہیں۔ تو میری اُمید یاس بن جاتی ہے اور میں بیتاب و مضطرب ہو جاتا ہوں۔

کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ تو مجھ سے اپنا مندر، اپنا نغمہ، اپنا حسن، اپنی نکہت سب کچھ لے لے

نغمۂ زندگی۔ اے فانی انسان! اپنے کانوں کو میرے نغمہ کی طرف متوجہ کر۔ اور جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں، اُسے پورے اطمینان سے سُن + تاکہ جب تیری موت کی خوفناک گھڑیاں قریب آئیں تو تجھے کراہنے اور پچھتانے کی ضرورت نہ پڑے۔

اپنی حرص محنت کے حوالے کر اور ہر وقت خیال رکھ۔ کہ اطمینان قلب ہی دنیا کا بہترین تحفہ ہے۔ اور جو تو محنت سے پیدا کرتا ہے۔ صرف اُسی پر تیرا حق ہے۔

راہ راست سے نہ بھٹک، حسین عورتوں کی ترچھی نظروں سے بچ اور اُن کے چہروں کی فانی دلفریبیاں دیکھ کر اپنے آپ کو نہ بھول جا۔ یہ تیرے لئے تباہی آور ہے۔

تیری زندگی ہمیشہ متزلزل ہے۔ جس طرح کنول کے پتے پر پڑے ہوئے شبنم کے قطرے ہر لمحہ خطرے میں بستے ہیں ـــــ یہ دنیا آخرکار انتہائی رنج کے بحر میں غرق ہو جانے والی شئے ہے

توجب تک کماتا ہے، تیرے دوست تیری مدح سرائی کرتے ہیں۔ مگر جب تو بوڑھا ہو جائیگا۔ تو اُن میں سے تیرے صادق ترین دوست کی سرگرمیاں بھی سرد مہری میں تبدیل ہو جائینگی۔

جب تک تیرے جسم میں سانس ہے اور خون میں حرارت کا شائبہ ہے۔ تو اپنے لواحقین کا عزیز ہے۔ مگر جس وقت تجھ سے تیری زندگی جدا ہو گی اُس وقت تیری پیاری بیوی کو بھی تجھ سے خوف معلوم ہو گا۔

دوستوں پر فخر نہ کر اعلیٰ خاندان پر مغرور نہ ہو۔ اپنے شباب کو دیکھ کر اپنا مآل نہ بھول تاکہ جب وقت آکر ان اشیا کو تیرے ہاتھوں سے زبردستی چھین لے گا۔ اُس وقت تجھے آہ سرد بھرنے اور ہاتھ مل مل کر یہ نہ کہنا پڑے۔ کہ میں کیسا بیوقوف تھا۔

غفلت سے جاگ اور وقت کے گذرنے سے پہلے سنبھل۔ اس نغمۂ زندگی کو سن اور اپنے کانوں میں بند کرلے۔ یہ تیری بہتری کا ضامن ہے۔

ایوری مینتھ ریویو (مدراس)

وادیٔ تخیل۔ ایک بوڑھا آدمی وادی تخیل میں لمبے لمبے قدم بڑھائے چلا جاتا تھا۔ ایک فرشتہ اُس کی رہنمائی کر رہا تھا۔

راستہ میں ایک آدمی شاہانہ شان و شکوہ سے آتا دکھائی دیا۔ اسکے چہرے پر شادمانی کھیلتی تھی اور آنکھوں میں امارت بھری ہوئی تھی۔ شباب اُس کے جسم کے ذرے ذرے سے نمایاں تھا۔ بوڑھے نے پوچھا "یہ کون ہے؟"

فرشتہ بولا "یہ تیری بیوی کا تصور خود تیرے متعلق ہے" تھوڑی دور جا کر ایک تخت دکھائی دیا۔ اُسکے اوپر ایک حکیم مسند لگائے بیٹھا تھا۔ سینکڑوں آدمی آتے تھے اور اُس سے صلاح مشورہ طلب کرتے تھے۔ وہ حکیم ہنس ہنس کر ہر ایک سے مخاطب ہوتا تھا اور حکمت و دانائی کے مختصر الفاظ میں ہر ایک کو مشورہ دیکر وداع کر دیتا تھا۔ لوگوں کے ہونٹوں پر اُسکی تعریف کے کلمات دکھائی دیتے تھے۔

بوڑھے نے پوچھا۔ "یہ کون ہے؟"

فرشتے نے جواب دیا "یہ تیرے متعلق تیرے بیٹوں کا تصور ہے"

دونو پھر چلنے لگے۔

راستہ میں ایک کنواں تھا۔ جس میں ایک تباہ حال شخص گرا ہوا تھا اور لوگ اُس پر اینٹیں پھینک رہے تھے۔ وہ بچارا بچنے کے لئے پناہ کی جگہ ڈھونڈتا تھا۔ مگر پناہ کہاں تھی؟ اُس کی سراسیمگی اُسکی بے بسی کا مکمل اظہار تھی۔ بوڑھے نے ہمدردی سے پوچھا۔ "یہ بدنصیب کون ہے؟"

"تیرے پڑوسی تجھے اس حالت میں دیکھنا چاہتے ہیں"

جب سفر قریب الاختتام ہوا تو ایک اوسط درجہ

کا آدمی درختوں کے نیچے کھڑا پھل توڑتا دکھائی دیا اُسکے کپڑے میلے تھے اور جوتوں کے تلے پھٹے ہُوئے تھے وہ پتھر مار مار کر پھل توڑ رہا تھا۔ مگر بسا اوقات اُن پتھروں سے خود اسی کا سر ٹوٹتا تھا۔ اس کا سارا جسم لہو لہان ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی وہ پھل توڑنے میں ہمہ تن محو تھا۔ اور جونہی کوئی پھل کسی درخت سے گرتا۔ اسکی خوشی نعرہ کی شکل میں ظاہر ہوتی تھی۔ بوڑھے نے فرشتے سے سوال کیا۔ "اب یہ کون ہے؟"

"تو اپنا عکس آئینہ میں دیکھ رہا ہے"

بڈھا حیرت سے فرشتے کا منہ تکنے لگا۔

سمارٹ سٹ (لنڈن)

نئے مضمون نویسوں کے لئے

ہم نے انگلینڈ کے بہترین مصنفوں سے درخواست کی تھی۔ کہ وہ نئے مضمون نویسوں کو ایک فقرہ میں کیا نصیحت کریں گے اس کے جو جوابات موصول ہُوئے ہیں اُن میں سے بعض حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ اگر تمہیں کسی کی تقلید کرنا ہے۔ تو تم پر شہرت کے دروازے کبھی وا نہ ہونگے۔

۲۔ اگر تمہیں بطور مصنف کے زندہ رہنا ہے۔ تو تصنیف کے لئے اپنی قربانی کرو۔

۳۔ مضمون لکھنے سے پہلے سوچو۔ کہ اس سے دُنیا کو کیا فائدہ ہوگا۔

۴۔ جب کوئی مضمون لکھو تو اُسے صندوق میں بند کردُ اور چند ماہ کے بعد اُسے پھر پڑھو۔ اُس وقت اگر تمہیں اُس میں لطف محسوس ہو۔ تب اُسے شائع کرنے کے لئے بھیجو۔ ورنہ جلا دو۔

۵۔ عبارت خیال کا لباس ہے۔ اس لئے خیال کی طرف توجہ کرو۔

۶۔ ہر ایک شخص مضمون نویس نہیں ہو سکتا۔

۷۔ دُنیا میں مضمون نویس بہت ہو چکے ہیں۔ اب مزید کی ضرورت نہیں۔

۸۔ اگر تم محسوس کرتے ہو۔ کہ تم عام آدمیوں سے مختلف نہیں تو لکھنا فضول ہے۔

۹۔ کیا تم روپے کے لئے لکھتے ہو۔ اس سے تو قہوے کی دوکان کھول لینا بدرجہا بہتر ہے۔

۱۰۔ تھوڑا عمدہ لکھنا زیادہ فضول لکھنے سے اچھا ہے۔

۱۱۔ اس سفر میں استقلال کی اشد ضرورت ہے ناکامی سے ہراساں نہ ہو۔ طعنوں سے ہمت نہ ہارو۔ نکتہ چینی سے دل برداشتہ نہ ہو۔ آگے بڑھو منزل قریب ہے۔

آرٹ اینڈ لیٹرز (لنڈن)

حصۂ نظم

جلوۂ سحر

نکلا وہ آفتاب شبستانِ شرق سے
پھیلی ضیائے صبح درخشاں قریب و دور
ملبوس بادلوں کے ہیں کیا زرق برق سے
افلاک سے زمیں پہ برستا ہے ایک نور

تاروں کی اب کہاں ہیں وہ جلوہ نمائیاں
گُل ہیں چراغ مہرِ منوّر کے سامنے
چھُٹتی ہیں ماہتاب کے رُخ پر ہوائیاں
کیا رنگ جم سکے شہِ خاور کے سامنے

زرتار ہو گئیں ہیں پہاڑوں کی چوٹیاں
سیماب پیرہن ہے ہر اک موجِ آبشار
پانی میں کوندتی ہیں شعاعوں سے بجلیاں
خیمے حباب کے ہیں لبِ آب زر نگار

ہیں نغمہ زن، طیورِ سحر خیز باغ میں
محوِ سپاسِ حق ہیں یہ طاعت گذارِ صبح
شبنم کی ہے شراب گلوں کے ایاغ میں
کتنی سرور خیز ہے۔ سیرِ بہارِ صبح

انگڑائی لے کے سبزۂ خوابیدہ جاگ اُٹھا
اُترا خمار۔ نرگسِ بدمستِ خواب کا
سُورج مکھی کا اخترِ قسمت چمک گیا
کھولی ہے آنکھ دیکھ کے مُنہ آفتاب کا

کیا تازگی ہے خندۂ گُل کی شمیم میں
فرحت فزائے قلب ہے۔ تازہ کُنِ دماغ
اعجازِ جانفزائی ہے موجِ نسیم میں
وقتِ سحر بجھے ہُوئے دل بھی ہیں باغ باغ

مصروفِ کاروبارِ جہاں ہے ہراک بشر
ہو کر شرابِ خوابِ شبانہ سے تازہ جاں
منزل سے قافلے بھی ہیں گرم رہِ سفر
پرچم شعاعِ مہر کا ہے کُوچ کا نشاں

بیٹھا جہاں پہ سکۂ خورشیدِ خاوری
زیرِ نگینِ مہر ہے اورنگ کائنات
ظاہر ہیں ذرّے ذرّے سے آثارِ زندگی
چاروں طرف ہے گرمیئے ہنگامۂ حیات

برق دہلوی

رباعیات

از آتشِ گرما جگر از دیدہ چکید
از گردش چرخ رنگ از چہرہ پرید
خود ابر بگوشِ تشنگاں میگوید
خاکم بر سر کہ آبم آتش گردید

دیباچۂ اسرارِ نہانی مائیم
درخورد جوابِ لن ترانی مائیم
جولانگۂ ماخط وجود و عدم ست
بازیچۂ مرگ و زندگانی مائیم

گرامی

مسجد میں ہیں رندانِ خوش اوقات کہاں
جو بات ہمیں چاہیئے وہ بات کہاں
رکھتا ہے مرا نام خرابانی تو
اے خانہ خراب آہ خرابات کہاں

زر

ہے دولت و زر مایۂ آرامِ جہاں
بے دولت و زر باغِ جہاں ہے زنداں
ہے دستِ تہی سے سربزانو بلبل
ہے کیسۂ زر سے گل چمن میں خنداں

پی بادہ کہ ہے دولتِ محمود یہی
سُن نغمہ کہ ہے سنتِ داؤدؑ یہی
کیا نیک و بدی کی فکرِ باطل اختر
ہر حال میں خوش رہ کہ ہے مقصود یہی

اختر دہلوی

جذباتِ عالیہ

گرامی

جہل آمد یقینِ ما بگریخت   عقل بگریخت دینِ ما بگریخت

آتشیں آہِ ما اثر دارد   آسمان از زمینِ ما بگریخت

نکتۂ لا الہ بر خواندیم   نقشِ غیر از جبینِ ما بگریخت

آنچناں از وجود رم کردیم   کہ اجل از کمینِ ما بگریخت

ز آب و گل رفتہ ایم بر درِ دل   فتنہ از ما وطینِ ما بگریخت

عشق سر برزد از گریبانے   عقل از آستینِ ما بگریخت

عشق نام و نشاں نمیخواہد   نقشِ ما از نگینِ ما بگریخت

اجل آمد نشست بربالیں   نفسِ واپسینِ ما بگریخت

علم افراخت امتحانِ فراق   جانِ اندوہگینِ ما بگریخت

زندگانی چناں رمید از مرگ   کہ گمان از یقینِ ما بگریخت

تا گرامی بخانقاہ نشست   شیخ خلوت نشینِ ما بگریخت

ابرِ قدوائی

گلے پر رکھکے خنجر پوچھتے ہو مدعا کیا ہے   نویدِ عیش وقتِ مرگ یہ طرزِ ادا کیا ہے

وہ شوخیٔ نگہ کیا تھی یہ تمکینِ حیا کیا ہے   ارادہ اس فریبِ حسن سے او بیوفا کیا ہے

لبوں تک جان آئی جان جانے میں رہا کیا ہے   نہیں حدِ وفا گر یہ تو پھر حدِ وفا کیا ہے

محبت میں کسے یاں ہوشِ فرقِ امتیازی کا   کسے فرصت جو یہ سوچے ادا کیا ہے قضا کیا ہے

ہمارے سادہ دل نے کی اجل کی نازبرداری   نہ کچھ سمجھا کہ یہ چینِ جبینِ خنجر نما کیا ہے

سرشکِ غم میں خونِ دل کی رنگ آمیزیاں توبہ   بلائے جان ہے یہ خون گرمیٔ جوشِ حنا کیا ہے

نہ آہِ نارسا جس بیخبر کے کان تک پہنچے   وہ کیا جانے شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا ہے

کھلا اب تک نہ کچھ او نازپرور ! مرنیوالے پر   کہ تیری نازبرداری کی آخر انتہا کیا ہے

یہ مانا ہمنے نازِ حسن ہے اک شانِ محبوبی   مگر یہ شیوۂ پندارِ ہمت آزما کیا ہے

اثر کچھ چاشنیٔ مرگ کا کچھ لذتِ غم کا   سوا اسکے شکستہ دل کے ٹکڑوں میں مزا کیا ہے

ہم اپنی جان سے اے ابر جاتے ہیں وہ ہنستے ہیں   تماشا گاہ ہے یہ امتحانگاہِ وفا کیا ہے

وقار الاعظم شرف (جاورہ)

ہر سانس میں دردِ آرزو ہے   ہر پھر کے اُسی کی جستجو ہے

کیا ہنستے ہو میرے حال پر تم   ان پھولوں میں رنگ ہے نہ بُو ہے

خنجر ہو ترا کہ بادۂ ناب   جو کھنچ گیا اُس کی آبرو ہے

کیا پوچھتے ہو مزاج میرا   آئینہ تمہارے روبرو ہے

شمشاد نے اُنگلیاں اُٹھادیں   گلزارِ جہاں میں تو ہی تو ہے

مارا تری نرم بولیوں نے   ظالم یہ کہاں کی گفتگو ہے

کیا ایسے پہ تمکو رشک آیا   تم تم ہو شرف عدو عدو ہے

وحشت کلکتوی

دل ہنگامہ جو ہے اور ہجومِ صد تمنا ہے   نہیں کھلتا کہ آخر خاص اسکا مدعا کیا ہے

نہیں اک ذرہ بھی عالم میں جد و جہد سے خالی   کشاکش سعی کی ہے عام، گویا سب کو سودا ہے

تلاش آخر ہے کسکی باعثِ محویتِ عالم   سمجھ ہی میں نہیں آتا الٰہی ماجرا کیا ہے

جہاں کی دلفریبی نے گوناگوں کام کیا کہنا   مگر جب غور سے دیکھو تو ہر نقش ایک دھوکا ہے

اُسی کا حق ہے جو ثابت کرے حق زورِ بازو سے   یہ لفظِ دلفریبِ خلق معنی سے معرا ہے

ضعیف ازبسکہ ہے بنیاد فرق اتیازی کی | بہت مشکل ہے کہنا کون ادنی کون اعلیٰ ہے

جبینِ شوق ہے اور سجدۂ محرابِ دلِ وحشت
یہ کس کا گوشۂ ابرو نہ جانے کارفرما ہے

حافظ رام نگری

میں بے پتہ کروں تو کروں جستجو کہاں | اتنا مجھے بتا دے کہ ملتا ہے تو کہاں
مرحوم دل کے ساتھ گئی دل کی آرزو | دل ہی نہیں رہا تو رہے آرزو کہاں
باغوں کے پھول اور ہیں داغوں کے پھول اور | اُن میں فنا کا انکی طرح رنگ و بو کہاں
یہ کہکے بزمِ عیش سے اٹھوا دیا ہے مجھے | اے غمکشیدہ محفلِ عشرت میں تو کہاں!

پائیگا تو بھی بار یہ سود اے خام ہے
حافظ وہ بزمِ ناز کہاں اور تو کہاں

احسن مارہروی

چاک ہوتے نظر آتے ہیں گریباں دو چار | کہ تری بزم سے نکلے ہیں پریشاں دو چار
ایک دو حسرت و ارماں ہیں تو پیکاں دو چار | رونقِ خانۂ دل ہیں یہی مہماں دو چار
غیر ہمراہِ جنازہ ہیں بہت دوست ہیں کم | مجھ پہ خنداں ہیں جو دس بیس تو گریاں دو چار
نظر آتا نہیں کچھ اور شبِ ہجر ہمیں | دیکھ لیتے ہیں مگر خوابِ پریشاں دو چار
کیا تعجب ہے جو دنیا کو اٹھالیں سر پر | اور ہوں تجھ سے اگر ناصحِ ناداں دو چار
زخم کھانیکا مزا ابھی تو کچھ آئے ہمکو | ساتھ رکھے ستم ایجاد نمکداں دو چار

ایک عالم پہ ہزاروں ہیں ترے لطف و کرم
کاش احسن بھی اٹھاتا ترے احسان دو چار

آغا حشر کاشمیری

روتا ہے دل جفائے محبت سے ٹوٹ کے | اچھا ہے آبلہ جو یہ بہ جائے پھوٹ کے
دل چھیدتی ہے شرم سے سمٹی ہوئی نظر | خنجر بنی ہے آپکی تلوار ٹوٹ کے
غمزے ہیں انکے اور مرا سرمایۂ نشاط | حصے لگا رہے ہیں مرے دل کی لوٹ کے
اک لطف کی نظر ہے علاجِ شکستِ دل | جڑ جاتا ہے یہ آئینہ سو بار ٹوٹ کے
دل ہے ادا پرست تغافل بھی ہے ادا | عاشق ہیں ہم تو وعدہ وفا تیرے جھوٹ کے
کتنی گھٹائیں آئیں برس کر نکل گئیں | آنسو مگر مرے نہ تھمے تجھ سے چھوٹ کے
دیکھا فریبِ رہزنِ دنیا و دین کہ حشر | یوں لٹ گئے خوش ہے گویا کہ آیا ہے لوٹ کے

تاجور

علاج دردِ دل اے چارہ سازِ مہرباں کردم
کہ دردِ جانستانش را شریکِ بزمِ جاں کردم
ندادی رخصتِ فریادم از جورِ زباں بندی
دو چشمم را برنگیں اشک لبریزِ فغاں کردم
بخندید آسماں بر حالِ زارم از سرِ کینہ
من آہ آتشیں را بزم سوزِ آسماں کردم
زبانم را برید از بیم فریاد آں جفا پرور
بہ فریادِ جفایش ہر بنِ مو را زباں کردم

مردِ خسیس

یہ ایک دلچسپ و نتیجہ خیز ڈراما ہے ترکی زبان سے ایران کی مروجہ فارسی میں ترجمہ ہوا ہے اس کی گرانقدری کا ثبوت اس سے مل سکتا ہے کہ پنجاب یونیورسٹی نے اسے منشی فاضل اور بی اے کے کورسوں میں داخل کر دیا ہے۔ چونکہ ایران کی مروجہ فارسی۔ ترکی۔ فرانسیسی اور انگریزی الفاظ سے پُر ہے۔ فارسی دان جو ایران کی موجودہ زبان اور اہل ایران کے محاورات سے واقف نہ ہو اس قسم کی کتابوں سے کما حقہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ طلبار بچاروں کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ ان کو تو ہر ہر سطر سمجھنے میں دقت ہوتی ہو گی۔ طلبار کی مشکلات کو مدنظر رکھ کر مولانا سید اولاد حسین شادان لکھنوی پروفیسر اورینٹل کالج رامپور نے اس ڈرامہ کا فارسی سے بامحاورہ اردو زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ مولانا شادان قدیم فارسی ادب کی طرح جدید فارسی لٹریچر سے بھی واقفیت تامہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس قابلیت سے ترجمہ کیا ہے کہ ہر فارسی دوست اور اردو دان کے لئے یہ ڈراما دلکشی رکھتا ہے۔ شروع میں ۷۵ صفحات میں ہر ملک کے ڈراما کی تاریخ اسکی تدریجی ترقی پر ایک محققانہ مقدمہ لکھا ہے۔ مصنف اور مترجم کے حالاتِ زندگی، کتاب میں فارسی کے جتنے جدید الفاظ، جدید محاورات اور ترکی فرانسیسی وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں انکے بحوالۂ لغت معنی اور تشریح کیلئے آخر کتاب میں ۴۸ صفحات کی فرہنگ لکھی ہے یہ فرہنگ نہایت مفید ہے۔ ترجمہ اس طور پر کیا ہے کہ ایک صفحہ میں اصل فارسی عبارت اور اسکے بالمقابل ایک ہی صفحہ میں اردو ترجمہ ہے گویا کہ اس ترجمہ کو لینے والا اصل کتاب خریدنے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ ترجمہ کیا ہے اسکے لئے مولانا شادان کا نام لے دینا کافی ضمانت ہے انکی عمر فارسی تراجم اور تصانیف میں گذرتی ہے یہ ترجمہ منشی فاضل اور بی اے میں فارسی پڑھنے والے طلبار کیلئے تو مفید ہے ہی (کہ انکے کورسوں میں یہ کتاب داخل ہے) فارسی پڑھانے والے پروفیسروں اور جدید فارسی سے واقفیت پیدا کرنیوالے حضرات کیلئے بھی مفید ہے۔ کتاب کا حجم تین سو صفحات کے قریب ہے۔

قیمت ڈیڑھ روپیہ (عہ) - ذیل کے پتہ سے کتاب مل سکتی ہے۔

دی رائل ٹریڈنگ کمپنی

بیرون اکبری دروازہ لاہور

اُجرت نامہ اشتہار رسالہ ہُمایوں

اُجرت اشتہار پیشگی لی جاویگی فحش اور دل آزار اشتہار نہیں لیا جاویگا۔ ٹائیٹل کے اشتہارات فی صفحہ ٹائیٹل ۲۵ روپے۔ دوسرا صفحہ سالانہ دوسو روپیہ ۔

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ
۱۲	۶۵ روپے	۳۵ روپے
۹	۵۳ روپے	۲۷ روپے
۶	۳۵ روپے	۱۸ روپے
۳	۱۸ روپے	۱۰ روپے
۱	۶ روپے	۳ روپے

تیسرا صفحہ ایک سو اسّی روپیہ چوتھا صفحہ سالانہ دوسو روپیہ اشتہارات کے چربے بھیجوانے چاہئیں یا اگر خود کاتب سے نہ لکھوا سکیں تو ایک روپیہ کاتب کی اجرت اشتہار کی اجرت کے علاوہ بھیجیں، نصف صفحہ سے کم کا اشتہار نہ بھیجیں۔

مینجر رسالہ ہمایوں۔ مزنگ روڈ۔ لاہور

خریدارانِ ہُمایوں

خط و کتابت کرتے وقت نمبر خریداری کا ضرور تحریر فرمادیں

۱ - ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اوّل میں شائع ہوا کرے گا۔

۲ - علمی [illegible] - تمدنی و تاریخی - اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اُتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔

۳ - دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے۔

۴ - جواب طلب خطوط کے لئے ار کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵ - کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائے گا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶ - سالانہ قیمت پانچ روپے - ششماہی تین روپے - نمونہ کا پرچہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک۔

۷ - ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحات سالانہ ہوگی۔

۸ - خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں

۹ - ناپسندیدہ مضمون ار کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جاسکتا ہے۔

۱۰ - رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۲۰ تاریخ کے بعد اور ۲۷ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۱۱ - منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

منیجر رسالہ ہمایوں

۳۰ - مزنگ روڈ - لاہور

(باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور چھپوا کر شائع کیا)

زمامِ ابلقِ ایام در دستِ ہمایوں شد
نوید دورِ خوش کامی انیسِ طبعِ موزوں شد

بیادگار علامۂ فصیح آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہمایوں

مرتبہ
میاں بشیر احمد بی۔ اے۔ (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا۔ ایڈیٹر
مولانا تاجور نجیب آبادی (فاضل دیوبند) جائنٹ ایڈیٹر

منشی محمد صادق منیجر رسالہ ہمایوں نے
مرکنٹائل پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا
(عبدالمجید خوشنویس لاہور)

ہمایوں

جلد ۲ نومبر ۱۹۲۲ء نمبر ۵

اکبر اور اخلاقیات

اکبر اور کلام اکبر پر ایک بسیط تبصرہ غالباً شروع سال سے "ادارہ" کی جانب سے پیش ہوگا۔ ہماری خواہش تھی کہ مولانا اکبر کی تصویر کے ساتھ ادارہ کا تبصرہ شائع کیا جائے۔ لیکن کثرتِ مشاغل نے اس کی تکمیل میں رکاوٹ پیدا کر دی۔ سردست تصویر کے ساتھ پنجاب کے اک ہونہار ادیب میاں محمد تصدق حسین صاحب خالد بٹالوی بی اے کے زیر تحریر تبصرہ کا ایک حصّہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس مضمون کو درج کرتے ہوئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ حضرات اہل الرائے کے حملوں سے بچنے کے لئے اس مشہور سپر کو پیش کر دیں کہ

"اڈیٹر کا کسی مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں"

تاجور

آرٹ سچے معنوں میں انسانی جذبات اور خیالات کی حقیقی ترجمانی ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ جو کچھ کہا جائے تہِ دل سے کہا جائے، جس میں تصنع اور ریاکاری کی کوئی آمیزش نہ ہو، جو کچھ کیا جائے راستی کے لئے کیا جائے نہ کہ نمود کے لئے۔ اور بلند سے بلند خیالات کو جو حسنِ معنوی سے لبریز ہوں، نہایت سادگی، بے ساختہ پن، اور اختصار لیکن وضاحت سے بیان کیا جائے۔ حُسنِ شعری اور حُسنِ اخلاق ایک ہی جڑ سے نمو پاتے ہیں اس لئے دونوں کے لئے حقیقی بلا تصنع اور راست ہونا چاہیئے۔

انسان فطرتاً حسنِ اخلاق کا شیدائی ہے، اگر کسی کا مذاق اخلاقاً گرا ہوا ہے تو وہ ہر گناہ کا مرتکب ہوسکتا ہے۔ انسان کی اخلاقی صحت کے بغیر اس کی تمدنی، معاشرتی اور سیاسی تندرستی ہمیشہ معرض خطر میں رہتی ہے۔
مولانا حالی فرماتے ہیں کہ شعر سے جس طرح نفسانی جذبات کو اشتعال ک ہوتی ہے اسی طرح روحانی خوشیاں بھی زندہ ہوتی ہیں۔ اور انسان کی روحانی اور پاک خوشیوں کو اس کے اخلاق کے ساتھ ایسا صریح تعلق ہے جس کے بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ شعر اگرچہ براہِ راست علم اخلاق کی تلقین اور تربیت نہیں کرتا لیکن از روئے انصاف اس کو علم اخلاق کا نائب مناب اور قائم مقام کہہ سکتے ہیں[1]"

پس اگر ایک شاعر یا مصنف کا اخلاقی اثر مخرب تہذیب ہے، یا اس کی تصانیف پوچ اور لچر ہیں۔ یا اس کی فطرت اس قسم کی واقع ہوئی ہے کہ اس کی قوت متخیلہ درست سوچ نہیں سکتی۔ نہیں اگر اس میں محض اتنی اہلیت نہیں کہ وہ رفیع و عالی ہوسکے تو ہمارے خیال میں اس کی دماغی استعداد یا شاعرانہ محاسن کسی صورت میں اسے بری التشنیع نہیں کرسکتے۔ لیکن اس معاملہ میں ہمارا فرض ہے کہ ہم بڑے فیاض اور کشادہ دل ہوں اور کسی سے یہ توقع نہ رکھیں کہ فطرت سے بڑھ کر اخلاق آموز ہو، ورنہ یہ ہماری تنگدلی کا بیّن ثبوت ہوگا۔ شاعر کو انسان کے اخلاقی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اور اس سے ملکوتی محاسن اور صفات کی تمنا نہ رکھنی چاہیئے۔ اس سے حسنِ شعریت عنقا ہوجاتا ہے۔ البتہ شاعر کے لئے راست گو اور حقیقت شناس ہونا ضروری ہے کیونکہ حقیقت حسن کا پہلا اصول ہے"

اس بات کے تسلیم کرنے میں کوئی شک نہیں کرسکتا کہ بعض مصنف یا شاعر اخلاق کو پس پشت ڈالتے ہوئے اور فطری تناسب کی پروا نہ کرتے ہوئے ایک فانی مقبولیت اور وقتی ہردلعزیزی حاصل کرلیتے ہیں۔ نہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ان کی کامیابی اس سے بڑھ کر ہو۔

عام خیال اشخاص اکثر اُن لوگوں کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور بعض اوقات عام خیال نہیں بلکہ وہ بھی جو اس زمرہ میں شامل نہیں لیکن جو حقیقی ادبی مذاق نہ ہونے کے باعث خواہشِ حسیات کی شور شوں اور اُلجھنوں میں گرفتار ہوکر معنیِ حسن کھو بیٹھتے ہیں اور جو سفلی جذبات کو علویات سمجھنے لگتے ہیں، ان شعرا کو یکتائے روزگار تصور کرلیتے ہیں۔ لیکن یہ شہرت (اگر اسے شہرت کہا جاسکے) نہایت ہی فانی اور

---

[1] شعر و شاعری صفحہ ۱۱

ناپائدار ہوتی ہے، ان عام خیال لوگوں کی رائیں روز بروز تبدیل ہوتی رہتی ہیں

وہ شاعر یا مصنف جو حال میں شہرت کی تمنا رکھتا ہے یا جس کے دل میں اس مقبولیت کی خواہش بھی ہوتی ہے ہرگز بقائے دوام حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ وہ جمہور عامہ کی توجہ کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریگا، وہ ایسے خیالات نظم کریگا جو ان لوگوں کے دلوں پر اثر کریں۔ اور ان کے مرغوب خاطر ہوں۔ لیکن عوام ہمیشہ ایسے خیالات کو پسند کرتے ہیں جو ان کی سفلی کیفیتوں کے ساتھ منطبق ہوسکیں۔ شاعر ان لوگوں میں (جو اکثر تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں) مقبولیت حاصل کرنے کے لئے انہیں کے خیالات کی ترجمانی کریگا، وہ اپنے عالی جذبات اور رفیع خیالات اپنے حسن اخلاق اور نہ صرف یہی بلکہ اپنی شاداب ذہانت، خداداد قابلیت اور معاملہ شناس فراست کو ایک فانی شہرت اور ناپائدار مقبولیت کی بھینٹ چڑھا دیگا۔

علاوہ ازیں انسانوں کا جزو غالب، کوئی ایک وقت لے لیں، ہمیشہ غیر متناسب اور غیر مترتب اشیاء کو پسند کرتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ اخلاق تناسب کے اصول کو توڑتا آیا ہے۔ اس سے یہ مطلب نہیں کہ جمہور میں "حسن" کی سچی شناخت نہیں بلکہ ان کے دلوں میں یہ قوت اتنی مدھم اور کمزور ہوتی ہے کہ ان کو اُس چیز کے تاثرات سے محفوظ نہیں رکھ سکتی جو اُن کے سفلی جذبات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

پس جو اس اصول پر کاربند ہوتا ہے کہ "مجھے مناسب دائرۂ ادبیہ کی ضرورت ہے خواہ محدود ہی کیوں نہ ہو" جو ادب شناس، ادب آموز اور ادب نگار شخصیتوں سے خراج تحسین لیتا ہے اور عوام کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا بالآخر عوام کو بھی اپنی طرف کھینچ لاتا ہے۔ وہ عوام کا پہلا انتخاب نہیں بلکہ آخری انتخاب ہوگا۔ ذوق نے عوام میں شہرت حاصل کی آج بہت کم اس کے کلام کے پڑھنے والے ملینگے۔ غالب عوام سے مستغنی تھا۔ آج جو ہر دلعزیزی اسے حاصل ہے کسی تشریح کی محتاج نہیں +

ہماری اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک شاعر لازماً مذہبی اور متقیانہ جذبات مواعظ و عبر اور پند و نصائح کو نظم کرتا رہے۔ ہمارا موضوع اس وقت اثاث شاعری نہیں بلکہ منبع شعری ہے۔ اخلاقی نصائح کی شعر میں کوئی ضرورت نہیں۔ شاعر کا یہ فرض نہیں کہ ایک خاص مقصد کو لے کر

وعظ کرتا پھرے، شاعر کے لئے واعظ ہونا لازمی نہیں۔ ہم پھر کہینگے اور زور سے کہینگے کہ اخلاقی تادیب اور شاعری میں باہمی مماثلت تطابق قطعاً غیر ممکن ہے یہ دونوں غیر نوعی اور متضاد چیزیں ہیں لیکن ایک شاعر کے دل و دماغ میں ایک وہبی اخلاقی طاقت کا رہنا ضروری ہے تاکہ اس کی تصانیف حقیقت کی ضوریزیوں اور حسنِ فطرت کی جلوہ پاشیوں کا مجموعہ ہوں۔ اگر اس میں اس قدر اہلیت اور قابلیت ہے کہ اپنے جذبات اور واقعاتِ عالم کی صحیح ترجمانی کر سکے تو اس کی شاعری مؤید اخلاق ہوگی اور ضرور ہوگی۔ لیکن اگر وہ کسی مقصد کو لے کر، خواہ وہ کتنا ہی مؤید اخلاق کیوں نہ ہو چیزوں کو فطرت کے خلاف بیان کریگا تو اس کی تعلیم محرومِ اثر ہوگی۔ اگر وہ، جیساکہ بہت سے طباع اور فہیم اشخاص نے کیا اپنے اخلاقی خیالوں کی جلوہ آرائی سے ہماری آنکھوں کو خیرہ کرنا چاہتا ہے اگر اسکے دل میں نمود زہد کی ٹھنی ہے تو پھر یا تو وہ شاعر نہیں اور یا شاعر سے بڑھ کر کوئی اور ہستی ہے۔ ہم اس کا غلطی سے مطالعہ بھی کرتے رہینگے لیکن اس میں "حسن وحقیقت" کی کشش نہ ہوگی۔

اردو شاعری میں فلسفۂ اخلاق کا معتد بہ حصّہ ہے، اخلاق کا موضوع وہ اصول وعملیات ہیں جن کی بنا پر انسانی زندگی ہر حیثیت سے کامیاب ہوسکتی۔ اس کا تعلق زیادہ تر علم معاشرت اور علم سیاست مدن سے ہے لیکن چونکہ تمدن اور معاشرت کا اثر شاعر پر بہت گہرا ہوتا ہے اور چونکہ شاعر کی اختصار نگاری اور سحر طرازی کا طبائع انسانی پر عمیق اور فوری اثر ہوتا ہے۔ اس لئے اور مضامین کے ساتھ شعرا نے اخلاق کو اپنا موضوعِ سخن قرار دیا۔ ایران میں اخلاقی شاعری کی ابتدا "بدایعی بلخی" سے ہوئی جس نے نوشیرواں کی اخلاقی تعلیمات موسومہ **پندنامہ** کو نظم کیا اور اس کے بعد غالباً ہر قابلِ قدر شاعر نے فلسفۂ اخلاق پر کچھ نہ کچھ ضرور کہا[1]۔ جس میں سعدی، حافظ، عمر خیام، ابن یمین، اور عرفی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن اس بارہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ جملہ شعرائے ایران نے اخلاق کی حقیقت کو قطعِ نظر کرتے ہوئے پند و نصائح اور مواعظ وعبر کو اپنے کلام میں جگہ دی وہ لوگوں کو نیکی کی راہ پر لانے کے لئے تلقین و ہدایت کرتے رہے اور یہ نہ جانا کہ وہ شاعر ہیں واعظ نہیں۔ ترکِ دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم، جود و سخا، رضا بالقضا، کم آمیزی، قول و عمل، ترکِ طمع وغیرہ، ان کی تلقین ایک مذہبی واعظ اور مبلغ اخلاقیات کا کام ہے نہ کہ شاعر کا +

[1] علامہ شبلی شعر العجم جلد پنجم

اس میں شک نہیں کہ آرٹ مذہب کی طرح عمیق اور زندگی کی طرح وسیع ہے لیکن آرٹ کا یہ مقصد نہیں کہ انسانیت کے نظریوں کے متعلق وعظ کرے نہ اس کا یہی مقصد ہے کہ شرافت اور نیکی کے بڑے بڑے سبق جو انسانوں اور قوموں کی زندگیوں میں مرموز ہیں لوگوں کو پڑھائے۔ اسکا مقصد یہ ہے کہ زندگی میں جو راستی اور اچھائی نظر آتی ہے اسے "حسن" کا جامہ پہنائے، جس طرح سائنس خوبصورتی اور اچھائی کو "حقیقت" میں بدل دیتا ہے اور مذہب، حقیقت اور حسن کو شرافت اور راست روی میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اردو ادب نے فارسی کے آغوش میں پرورش پائی اس لئے اکثر شعرا نے اخلاق کو پند و موعظت سمجھا اور حقیقت شعری سے دور پڑتے چلے گئے گو بعض پیغمبران سخن (جن میں غالب اور اقبال کا پایہ سب سے بلند ہے) ایسے بھی اُٹھے جن کی اخلاقی عظمت ان کے کلام میں طاری و ساری ہو گئی۔

اکبر ان شاعروں میں سے ہے جن کے کلام میں اکثر اخلاقی تعلیم کی جھلک دکھائی دیتی ہے اس نے اگرچہ اپنی زندگی میں ایک قابلِ رشک شہرت حاصل کر لی تھی لیکن اس کی شہرت کا آغاز عوام سے نہیں ہُوا بلکہ ہندوستان کی تمام ادبی شخصیتوں نے اس کی شاعرانہ استعداد کو تسلیم کیا اس لئے اس کی شہرت کو ایک کامیاب شہرت کہا جا سکتا ہے۔

اکبر کے کلام میں اکثر اخلاقی اشعار اور اخلاقی تعلیم نظر آئیگی لیکن یہ تعلیم ایک واعظ کی حیثیت سے نہیں دی گئی بلکہ اکبر کے ضمیر میں ایک زبردست اخلاقی طاقت مضمر تھی۔ جو اکثر اس کے کلام میں ایک خاص اثر اور لطف پیدا کر دیتی تھی۔ وہ انسانی فطرت کی گہرائیوں کا غور و خوض سے مطالعہ کرتا رہتا تھا، دنیا کی نیرنگیاں اسے حقیقتِ دہر کا سبق دیتی رہتی تھیں۔ اس لئے اس کی اخلاقی تعلیم جو کسی خاص مقصد کے لئے نہیں بلکہ خود اس کی پُر سوز و گداز طبیعت کا نتیجہ تھی۔ ہمیشہ ابنائے وطن کی بزمِ حیات کے لئے شمعِ ہدایت رہی اور رہیگی۔ اسی لئے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ اس کا ایک اخلاقی جذبہ لوگوں کو نجیب تر بنانے کے لئے واعظوں کی اخلاقی نصائح کی ضخیم جلدوں سے مفید ثابت ہوتا ہے۔ اکبر نے اپنی روح کو جس اخلاق کے ازلی شعلوں کے سپرد کر دیا تھا جس سے تمام وساوس جل کر خاکستر ہو گئے اور اسکی مشتِ خاک اکسیر ہو گئی

اکبر کو ایک اخلاقی شاعر کی حیثیت سے سعدی شیرازی سے زیادہ مشابہت ہے جنہوں نے اس خدائے سخن کی کلیات کا مطالعہ کیا ہے ان کو معلوم ہوگا کہ جہاں ان کا کلام گوناگوں پند و نصایح کا دلچسپ مجموعہ ہے وہاں وہ اخلاق سوز اور مخرب اخلاق اشعار بھی نظم کئے ہیں کہ آنکھیں بند کرنا پڑتی ہیں۔ ان مطائبات و مضحکات کے متعلق "حیات سعدی" کا فاضل مصنف لکھتا ہے کہ "یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارض کمال پر ایک بدنما مسّہ ہے جو شیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے۔ حضرت نے اس حصہ میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزادی اور بیباکی سے دل کھول کر فحش اور ہزل کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ [illegible] اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا خطادار اور ناقص ہونا یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے۔ اور اس کے اقوال و افعال کا تفاوت اور اختلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطہ اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کو ایک نادان بچہ کی حرکتوں سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ جس کی ایک حرکت پر بے اختیار پیار کرنیکو جی چاہتا ہے اور دوسری عادت پر حد سے زیادہ غصہ آتا ہے"[۱]

اکبر کے کلام کا مطالعہ بھی یہی عبرت انگیز منظر پیش کرتا ہے۔ اکبر کی روحانی اور اخلاقی وجاہت میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا لیکن ؎

اقتضا فطرت کا رکتا ہے کہیں اے ہمنشیں
شیخ صاحب کو بھی آخر کار شب کرنا پڑا

اکبر نے بھی وہ وہ خرافات نگاریاں کی ہیں کہ "سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پھکڑ کا جواب ہو سکتی ہیں" ظاہر ہے کہ "جو برائی سوسائٹی میں عام اور بے عیب ہو جائے اس سے بالکل پاک اور مبرّا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے"۔ اردو زبان کے کسی شاعر کا دیوان دبا تشنائے

[۱] مولنٰا الطاف حسین صاحب حالی پانی پتی حیات سعدی صفحہ ۱۹۱

بعض) اُٹھالیا جائے۔ فحش۔ رکاکت اور ہزل کی وہ اخلاق سوز مثالیں نظر آئینگی کہ جن کی تصریح کرنے سے شرم آتی ہے[1]۔ ہم اس موضوع کو طول نہیں دینا چاہتے اور صرف چند اشعار نقل کر دیتے ہیں جو ان کے دامنِ تقدس پر بدنما دھبا ہوکر باعثِ خراش ہو رہے ہیں۔

دل میں جو ہے وہ ہوگا شبِ وصل میں ضرور — ہوگا حضور آپ کی شرم و حیا سے کیا

خدا کے واسطے تشریف لائیں آج ضرور — رہیں وہ دو ہی گھڑی پاس رات بھر نہ سہی

کہا جو میں نے کہ دل چاہتا ہے پیار کروں — تو مسکرا کے وہ کہنے لگے کہ پیار کے بعد

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسے پر — خموش ہوگئے آخر کو تین چار کے بعد

لیا نہ خلوت میں ان کا بوسہ چوک ہوئی — بلا سے مجھ پہ وہ ہوتے اگر خفا ہوتے

تخلیہ بھی ہے ہوا سرد بھی ہے رات بھی ہے — پھر بھی انکار مری جاں یہ کوئی بات بھی ہے

خیر چپ رہیئے مزا ہی نہ ملا بوسے کا — میں بھی بے لطف ہوا آپکے جھنجھلانے سے

کس ناز سے کہتے ہیں وہ جھنجھلا کے شبِ وصل — تم تو ہمیں کروٹ بھی بدلنے نہیں دیتے

وغیرہ وغیرہ۔

اس میں شک نہیں کہ اکبر کی طبیعت پر ظرافت اور مزاح غالب تھا لیکن جب یہ صفت حد سے گذر جاتی ہے تو اس سے فحش اور ہزل پیدا ہوتا ہے جیسا کہ ذیل کے اشعار سے ظاہر ہے۔

مجھے اک بوسہ دینے پر بھی وہ مس بخل کرتی ہے — نصیب اچھے نہیں اپنے لئے حاتم بھی ممسک ہے

لیا صبحِ شبِ وصل اس کا بوسہ میں نے یہ سچ ہے — اسی پر بول اٹھی وہ شوخ بس یہ فائنل ٹچ ہے[2]

ان اخلاق سوز اشعار کو قطع نظر کرتے ہوئے جو کچھ پند و موعظت کے بارہ میں اکبر نے کیا وہ اس کی اخلاقی عظمت کے شایانِ شان ہے۔ ایرانی شاعری جس چیز کو اخلاق فی الشعر سمجھتی ہے غالباً اس کا حقیقی پرتو شعرائے اردو میں اکبر کے سوا اور کسی میں کامل طور پر نظر نہیں آتا۔ اکبر کی پند و موعظت کو طرزِ بیان کے لحاظ سے دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:۔

---

[1] بہت سے حیا سوز اشعار میں ہم نے وہ چند شعر انتخاب کئے ہیں جن میں تفحش کم ہے۔

[2] آخری جنبش کو فائنل ٹچ کہتے ہیں۔

۱۔ اخلاقی نصائح کی تنظیم
۲۔ ضمیر کی اخلاقی طاقت کا فطری اظہار

حصہ اول کے شاعرانہ پہلو پر کچھ کہنا فضول ہے۔ اس میں زاہدانہ پند و نصائح و مواعظ و عبر کو موزوں طریقہ سے ادا کر دیا گیا ہے جس میں تخیل، موسیقی، اثر یا جوش کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ البتہ ان نصائح پر وہی اعتراض عائد ہو سکتا ہے جو شعرائے ایران کے فلسفہ اخلاق پر عموماً کیا جاتا ہے کہ "اس سے بجائے ترقی کرنے کے پستی کی طرف میلان ہوتا ہے۔ جو مسائل بار بار مختلف پیرایوں میں ادا کئے جاتے ہیں یعنی ترکِ دنیا، قناعت، توکل، تواضع، خاکساری، عفو، حلم۔ ان میں کچھ باتیں پست ہمتی پیدا کرنے والی ہیں کچھ اعتدال سے متجاوز ہیں۔ کچھ اصولِ تمدن کے خلاف ہیں[۵]"۔ شعرائے ایران کے فلسفہ اخلاق کی عذرخواہی علامہ شبلی نے معقول فرمادی البتہ اکبر کی ان تعلیمات کا سبب اس کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا کہ یہ ان کی یاس پرستی کا لازمی نتیجہ ہیں۔

قناعت۔ اکبر کے نزدیک قناعت وہ واحد راستہ ہے جو منزلِ عافیت کی خبر دیتا ہے لیکن وہ قناعت کے معنی یہ نہیں لیتا کہ انسان عالمِ اسباب سے بے نیاز ہو کر سعی عمل کے جھگڑوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ وہ قناعت کو اس لئے پسند کرتا ہے کہ ان اُلجھنوں سے آزاد ہو جن میں اہل حرص گرفتار رہتے ہیں۔ وہ سعی و عمل کا مخالف نہیں۔ ذوق آرام اور طلبِ رزق کو وہ جائز خواہشات قرار دیتا ہے۔ وہ صرف اعتدال پسندی کی تعلیم دیتا ہے اور ہوسِ جاہ کے خلاف اپنی آواز بلند کرتا ہے

جو اہلِ حرص ہیں ان پر مصیبت پڑ ہی جاتی ہے　　جو قانع ہے کسی دن اسکی قسمت لڑ ہی جاتی ہے
طلبِ رزق ہو لیکن ہوسِ جاہ نہ ہو　　ذوق آرام بجا شوقِ تعلی بےجا
قناعت مری رہنما ہو گئی　　نہ تھا منزلِ عافیت کا پتا
یہی بہتر ہے رہے اپنے بہی خواہ کے ساتھ　　طفلِ دل چھوڑے نہ دامانِ قناعت ہرگز

صبر و توکل　اکبر توکل کی تعلیم دیتا ہے لیکن توکل کو تعطل نہیں سمجھتا۔ ایشیا والوں نے توکل کی تعلیم کو نہایت غلط سمجھا اور اس کا نتیجہ قوم میں دون ہمتی اور افسردہ دلی کے قاطع حیات امراض ہیں۔ توکل کے صحیح معنے یہ ہیں کہ اگر انسان پر مصیبتوں کا آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ ہر طرف سے

---

[۵] علامہ شبلی شعر العجم جلد پنجم

بلائیں نازل ہو رہی ہوں۔ امید کی جھلک کسی طرف سے دکھائی نہ دے، مایوسیوں سے خودکشی تک کی نوبت پہنچی ہو تو اس وقت تسکینِ دل کے لئے صبر تقدیر اور اعتقاد کو مضبوط پکڑ لیا جائے اور یہی وہ واحد راستہ ہے جو مصیبت کے سمندر میں ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہو گا۔ اکبر توکل کی تلقین کرتا ہے کیونکہ یہ دنیاوی سہاروں کو ترک کرنے اور خدا کو پکڑنے کی تعلیم دیتا ہے۔

جھکتا نہیں بندہ کسی بدخواہ کے آگے ——— کیا غم ہے توکلت علی اللہ کے آگے
ہووے مطلوب جسے زادِ رہِ منزلِ قبر ——— گرہ صبر میں وہ نقدِ توکل باندھے
آدمی کے لئے دنیا میں مصائب ہیں بہت ——— خوش نصیبی ہے جو وہ صبر کی عادت رکھے
نالہ و فریاد جائز ہے مصیبت میں مگر ——— صبر ہی بہتر ہے انسان کو جہانتک ہو سکے

ہوا و ہوس اُردو اور فارسی کے ہر اخلاقی شاعر نے غالباً ان عنوانات پر کچھ نہ کچھ ضرور کیا
حرص و طمع ہو گا اور ان کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ انسان کو ضرورت سے زیادہ طلب نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ اپنی خواہشات پر قابو رکھنا چاہیئے۔ حرص اور طمع دنیا پرستی کی تعلیم دیتے ہیں۔ انسان کی ضروریات کبھی اختتام پذیر نہیں ہو سکتیں۔ اگر ایک خواہش پوری ہوتی ہے تو دس اور نمودار ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ایک طامع کی زندگی ہمیشہ پیچ و تاب اور کاوش میں گذرتی ہے۔ سچی راحت اسے کبھی میسر نہیں آ سکتی۔ اس کا آتشکدۂ حرص کبھی بجھنے نہیں پاتا اور اسے ہمیشہ پُر اضطراب رکھتا ہے۔ اکبر کی تعلیم بھی یہی ہے کہ انسان کو قدرِ کفاف سے زیادہ کی طلب نہیں کرنا چاہیئے بلکہ اپنی ضروریات اور خواہشات کو اعتدال پر لانے کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اسکے ساتھ وہ دُنیا کے باہمی جھگڑوں اور فسادوں کو جو خلقِ خدا میں دشمنی اور عناد کا باعث اور انسانی ہلاکت کا ذریعہ ہوتے ہیں بے جا حرص کا نتیجہ بتاتا ہے :-

علم ہوتا گر زیادہ اور ہوتی حرص کم ——— صلح ہوتی بیشتر لوگوں میں اور کم تر نزاع
کیا پا گئے جو حرص کے کوچہ میں سگ رہے ——— وہ کیا بُرے رہے کہ جو اس سے الگ رہے
حرص گھٹ جائے وہی نعمتِ عظمیٰ ہو گی ——— میری دولت نہیں بڑھنے کی تو اچھا نہ بڑھے
تھا سر میں کمال وہ تو سلطان بنا ——— تھا دل میں جمال وہ مُسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا ——— تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

قول وعمل ۔ انسان کی عزت واحترام اس کے قول وعمل کے توافق و اتحاد پر ہے، اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے بڑے زہادِ خشک "چوں بہ خلوت میروند آں کارِ دیگر می کنند"۔ ان کی نصیحتیں نمود نہ ہیں، وہ دوسروں کے لئے ہوتی ہیں نہ کہ اپنے لئے۔ اکبر عمل اور زندگی کو لازم وملزوم سمجھتا ہے۔ اگر زندگی جسم ہے تو روح عمل روح جس زندگی میں عمل نہیں وہ بمنزلہ اس جسم کے ہے جس میں روح کی حیات آفرینیاں ہیں اور جو ایک تو وہ خاک سے بدتر ہے۔ قومی زندگی کا راز قول وعمل کے توافق پر ہے ورنہ محض باتوں سے نہ تو کسی نے ترقی کی اور نہ کوئی کرسکیگا اکبر لوگوں کو "اعمال کے حسن سے سنورنے" کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے ایمان کی جستجو ہے۔

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے — کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسنِ عمل سے
یہ دعوئے توحید مبارک تمہیں اکبر — ثابت بھی کرو اس کو مگر حسنِ عمل سے
کیجئے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں — یہ نمودِ جبہ و دستار رہنے دیجئے
واعظ کو بھی سلام ہے پنڈت کو بھی سلام — مذہب نہ چاہیئے مجھے ایمان چاہیئے
علم وہ خوب ہے جو حسن عمل تک پہنچے — ذوق وہ خوب ہے جو رازِ ازل تک پہنچے

رشوت اور خوشامد ۔ عصرِ جدید کی قبیح ترین کمزوریاں رشوت ستانی اور خوشامد ہیں اور انکا مخربِ اخلاق اثر تمام ملک اور قوم میں جاری وساری ہے، اگر رشوت کی ظلمت نے نورِ ایمان کو دھندلا کر دیا ہے تو بیجا خوشامد نے ایک طرف خود پسندی اور نفرت اور دوسری طرف ذلت اور دون ہمتی کو ترقی دی ہے اور خودداری، آزادیِ خیال اور آزادی رائے کی بیخ کنی کردی ہے۔ اکبر نے رشوت اور خوشامد دونو کو نہایت مذموم عادات سے قرار دیا ہے اور اس کی یہ تعلیم جیسا کہ اس باب میں ہم نے اور اخلاقی تعلیمات کو دیکھا ہے تخریبی ہونے کی بجائے تعمیری ہے اور قوم میں تمکنت، خودداری، ایمانداری اور آزادی پیدا کرنے کی طرف راجع ہے:۔

کیجئے رشوت ستانی سے ذرا پرہیز آپ — خیرخواہی کا یہ سب اظہار رہنے دیجئے
رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھرا — عیاشی ہے بدی کے پیٹنے کا دُھرا
ہرچند کہ بے محل خوشامد ہے بُری — گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

ریا، مکاری اور بیحیائی ۔ ریا اور مکاری انسانی سوسائٹی میں ہر جگہ موجود ہیں۔ لیکن ہر جگہ

مذموم بھی خیال کی جاتی ہیں۔ روباہ طینتی انسان کے دل سے ہمت اور راستبازی کو نکال کر اسکے خیالات کو پست کر دیتی ہے۔ عالی نظری اور وسیع المشربی کی ستودہ صفات اپنا اثر نہیں دکھاتیں اخلاق گر جاتے ہیں، روحانی ترقی رُک جاتی ہے اور وجاہت اور بلند ہمتی کا خاتمہ ہو جاتا ہے اس لئے اکبر یہ تعلیم دیتا ہے کہ:۔

رفیق حرص و مکاری دلیری ہو نہیں سکتی جو ہوں روباہ طینت ان سے شیری ہو نہیں سکتی
دسترس صید پہ حاصل تجھے ہو خواہ نہ ہو شیر ہی بن کے نکل صورت روباہ نہ ہو

اور اسے یہاں تک مذموم سمجھتا ہے کہ ایک رندکی لا ابالی زندگی کو بھی اس پر ترجیح دیتا ہے۔

گھٹی گو کہ رندی سے وقعت مری طبیعت مگر بے ریا ہو گئی

لیکن مکاری اور ریا سے بڑھ کر ایک اور اخلاق کش حرکت ہے یعنی بے حیائی جس انسان میں بے حیائی کا مادہ پیدا ہو گیا وہ نہ دنیا کا رہا نہ آخرت کا۔ اس کی تمدنی اور معاشرتی۔ ملی اور ملکی، دینی اور دنیوی، اخلاقی اور روحانی ترقی ہمیشہ کے لئے رک جاتی ہے۔ وہ دن بدن قعر ضلالت میں گرتا جاتا ہے۔ اغیار اس پر سخت سے سخت اور رکیک سے رکیک حملے کرتے ہیں۔ لیکن اس کی خودداری کا مادہ مر چکتا ہے اور وہ انہیں اس بے حیائی سے برداشت کرتا ہے کہ گویا ہوا ہی کچھ نہیں

ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلت بد واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

عزلت۔ جملہ اخلاقی شاعر ترک دنیا کی تعلیم دیتے رہے ہیں اور بالخصوص ایشیاکی صوفی منش طبیعتیں جو زندگی کی شورشوں اور قید ہستی کے علایق سے بیزار رہتی ہیں جن کے نزدیک دنیا ایک بازیٔ طفلاں ہے جہاں انسان کو نقصان کے سوا اور کچھ نہیں۔ جو دار المحن ہے۔ بلکہ جس کی عشوہ فریبیاں دلوں کو مسخر کر لیتی ہیں اور شاہد حقیقی کے قرب و وصال سے محروم رکھتی ہیں، ہمیشہ آبادی کے ہنگاموں سے دور راہبانہ زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہیں۔ لیکن اکبر اس قسم کی زندگی کو پسند نہیں کرتا وہ عزلت کا جویا ہے لیکن اس لئے نہیں کہ دنیا کو ترک کر دیا جائے اور خانقاہوں میں زیست کے بار آور ایام برباد کر دیئے جائیں۔ اس کی خانقاہ دل کا کونا ہے۔ خانقاہ میں بیٹھنا اور پیری مریدی کے کاروبار کچھ اور ہیں اور دل شناسی، دل آگاہی دل پر نظر کرنا کچھ اور ہے

حرص دنیا سے نہیں ہے ہمنشیں عزلت مری خانقاہیں اور ہیں اور دل کا کونا اور ہے

فراخدلی ۔ اکبر کی ایک اور تعمیری تعلیم جو قابلِ ذکر ہے وہ فراخدلی اور وسیع المشربی کی تلقین ہے، وہ کسی کی بُرائی نہیں چاہتا بلکہ سب کو آپس میں شیر و شکر ہو کر رہنے کی تمنا ظاہر کرتا ہے، وہ لوگوں کو فراخ دل اور روشن خیال بننے کی استدعا کرتا ہے کیونکہ اس طرح وہ نہ صرف مقبولِ جمہور ہونگے۔ بلکہ جمالِ ازلی بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آشکار ہو جائیگا۔

تم اگر چاہو بُرائی نہ کسی کی اکبر ــــ پھر تمہارا بھی جہاں میں کوئی بدخواہ نہ ہو
دل ہو جو وسیع اور روشن ہو خیال ــــ ہر رنگ دکھائے تجھ کو خالق کا جمال
ساری دنیا ہے اس کو پیاری اکبر ــــ کہتا ہے کم آل[1] جس کو حاصل ہے کمال
خدا ہی کی عبادت جن کو ہو مقصود اے اکبر ــــ وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو باہم عبادت میں
انسان ہے یہ جو بات اچھی چاہے ــــ بدیوں سے محترز ہونی چاہے
شیطان سے وہ فلاسفی ہے منسوب ــــ جس کا مطلب ہے کہ کرو جو جی چاہے

ان کے علاوہ اکبر نے اور بہت سے موضوعات پر اظہارِ خیال کیا۔ جن پر مفصل لکھنا غیر ضروری ہے البتہ ان کو اکٹھا لکھ دیا جاتا ہے تاکہ اس کی تعلیمات کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

حد اعتدال سے زیادہ ارتباط نہ بڑھاؤ ؎
یہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا
جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گلا اچھا

شیریں زبانی ؎
بنو گے خسروِ اقلیم دل شیریں زباں ہو کر
جہانگیری کریگی یہ ادا نورِ جہاں ہو کر

لیکن محض شیریں زبانی کچھ نہیں جب تک دل اچھا نہ ہو:۔ ؎
بدی طینت کی چھُپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے ــــ دل اچھا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بدزباں ہو کر

لوگوں کی تعریف اور مدح کرنا حسن اخلاق کی سند نہیں ہو سکتی ؎
مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند ــــ خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

کہنا قول ہے اور خوب ہونا عمل ہے۔ قول اور عمل میں جو تفاوت ہے وہ ظاہر ہے جب تک خوب بن کر نہ دکھا سکیں تب تک خوب کہنے کی کوئی وقعت نہیں ہو سکتی۔

---

[1] come all

لوگوں کو آرام پہنچاؤ ؎
دلوں کا قرب حاصل کیجئے راحت رساں ہو کر
نفس نے سینہ میں جا پائی ہے آرام جاں ہو کر

خاکساری کرو ؎
زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی
خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانپا آسماں ہو کر

تمکنت اور وقار ؎
محو تمکیں رہے نفرت ہو سبک وضعی سے
صورت کوہ ہو انساں صفت کاہ نہ ہو

سیرت کو صورت پر ترجیح دینا چاہیئے ؎
اے حُسن کے مائل یہ نصیحت مری سن لے
صورت پہ نظر چاہیئے سیرت سے زیادہ

اپنی وضع پر قائم رہنا چاہیئے ؎
شعر میں اکبر یہی مضمون تو ہر بار باندھ
اے مسلماں سبحہ لے لے برہمن زنار باندھ

سچی خیر خواہی ؎
جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

راست روی اور تواضع ؎
روش ہو راست آزادانہ ساتھ اس کے تواضع بھی
چلو تم مثلِ تیر اکبر جھکو لیکن کماں ہو کر

کسی سے کینہ مت کرو ؎
اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

علم یا دولت پر غرور نہ کرو ؎
لطف ساقی سے نہ چھلکے جام دل
ظرف عالی کی یہی پہچان ہے

جھوٹ اور طمع سے نفرت کرو ؎
جھوٹ سے نفرت کلی ہو طمع سے پرہیز
ہو نہ کچھ اور پر اتنا تو مسلمان میں ہو

استقلال کو ہاتھ　　　اپنی جگہ سے تم نہ ہٹو گو ہو گردشیں
سے نہ جانے دو[5]　　　ایسے رہو کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے

اخلاق کیا ہے؟ اور اس کا ضمیر سے کیا تعلق ہے؟

اخلاق سے وہ حالت یا طاقت مراد ہے یا اخلاق وہ ہے جس سے انسان اپنے قوائے طبعی کے صحیح استعمال کا طریقہ سیکھتا ہے اور ان امور سے آگاہی پاتا ہے، جو اسے خود اپنی ذات یا اغیار کے مقابلے میں موجود، ہستی یا زندگی میں آسائش، راحت مسرت، عزت، اعتبار کی حیثیت سے عمل میں لانا ضروری یا لابدی ہیں" یا اخلاق وہ شریعت اور وہ قانون ہے جو اس کی قوتِ ضمیر سے ترتیب پاتا ہے۔ اخلاقی فلسفے، اخلاقی کتابیں ہمارے ہی افعال اور اعمال کا نچوڑ ہیں۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں ایک فلسفی انہیں ایک ضابطہ کی صورت میں لاکر "باعتبار سود مندی اور ناسود مندی ہمیں دکھاتا ہے" اخلاق ضمیر سے نشوونما پاتا ہے اور اس کا پروردہ بھی ہے، حقیقی اخلاقی تعلیم وہی ہے جس کا تعلق ضمیر سے ہو +

اکبر کی پند و موعظت کا دوسرا حصہ اس کے ضمیر کی اخلاقی عظمت اور روحانی وجاہت کا اظہار ہے اور یہی اس کی اخلاقی شاعری کا وہ نمایاں حصہ ہے جو اسے متقدمین اور متاخرین ہر دو میں ممتاز کر رہا ہے، اس جگہ اکبر اپنی لطیف کیفیات اور پاکیزہ تاثرات سے حسن اخلاق کی زندہ تصویریں زیبِ قرطاس کرتا ہے، اور اس کے ساتھ حسن اسلوب کی کیفیت انگیز دلپذیری اور ترنم جوش سے جذباتِ صحیحہ کی ایک وسیع تریں مستور دنیا آشکار کر دیتا ہے۔ یہ اشعار اس کے سویدائے قلب سے نکلتے ہیں اور دلوں میں گھر کر جاتے ہیں۔ اکبر کے ظلمت کدۂ یاس میں اگر امید کی کوئی جھلک ہے تو یہی ہیں جو اپنی ضیا پاشیوں سے نفسانیات کی تاریکیوں کو "آداب گریز" سکھا کر ایک ارفع زندگی کا پتہ دیتی ہیں۔

اکبر یہاں وعظ نہیں کر رہا، اسے اپنے زہد و ورع کی نمود منظور نہیں۔ ایک اخلاقی طاقت ہے جو خود بخود ظاہر ہو رہی ہے ایک پُر از سوز و گداز طبیعت کی آمد کی رَو ہے کہ بہتی

---

[5] کھینچ کر خنجر کرن کا پھر ہو سرگرم ستیز + ہاں سکھا تاریکیٔ باطل کو آداب گریز　　(اقبال)

چلی جارہی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو شاعر کو واعظ سے متمیز کرتی ہے۔ پروفیسر ریلے مصنف اور اخلاقیات پر بحث کرتا ہُوا لکھتا ہے کہ :-

" اسے کسی خاص قسم کے ایسے اخلاقی قوانین کے زیر اثر نہیں رہنا پڑتا جن کی خلاف ورزی کی جاسکے۔ البتہ اس وسیع اخلاقی نظام کی واقفیتِ تامہ اس کے لئے ضروری ہے جس کا کسی قسم کے ارتکاب جرم سے ٹوٹنا اسی طرح غیر ممکن ہے جیسا کہ کسی شیشے کے برتن کا گر کر ٹوٹ جانا کششِ ثقل کے قانون کو نہیں توڑ سکتا ـــــ وہ اخلاق جن کے بغیر حیاتِ انسانی کا امکان نہیں ـــــ یعنی بنی نوعِ انسان کے باہمی تعلقات اور وہ احساسات وخیالات جو سوسائٹی کا تارو پود ہیں۔ اخلاق کی ان وسیع معنوں میں اہمیت شناسی کے لئے تخیل اور حسن آشنائی کے گرانقدر اور رفیع ملکات کی ضرورت ہے"

تخیل اور قبولِ اثر کی یہ صفات اکبر کی حساس اور فہیم طبیعت میں خاص طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس کی تمام نظموں میں وقتاً بعد وقتٍ حیاتِ انسانی کے متعلق "عمیق نتائج غور و فکر" کی وجہ سے برق بار ندرت کوشیاں نظر آتی ہیں۔ جو اس کی دقیق النظری اور علوِ اخلاق کا پتہ دیتی ہیں کہتا ہے :-

کہنے سننے کی گرم بازاری ہے
مشکل ہے مگر اثر پرائے دل میں
ایسا سُنئے کہ کہنے والا ابھرے
ایسی کہئے کہ بیٹھ جائے دل میں

خوشی سے مرو۔

اعمال کے حسن سے سنورنا سیکھو
اللہ سے نیک اُمید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر
بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

آپس میں موافق رہو طاقت ہے تو یہ ہے — دیکھو نہ بہم عیب محبت ہے تو یہ ہے
سچی نعمت. صحت بھی ہو روزی بھی ہو دل کو بھی ہو تسکین — دنیا میں بشر کے لئے نعمت ہے تو یہ ہے

سچی شہرت
شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہ ہو — دولت تری خادمہ ہو۔ محبوبہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جائے — لیکن بہ تکلفات مطلوبہ نہ ہو۔

سچی آزادی
ہونی ہے نصیب تلخ کامی تم کو — محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو
اغیار نہیں بنا سکتے تم کو غلام — ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

سچی عزت
تحصیلِ علم کر کہ دولت ہے یہی — اخلاق درست کر کہ زینت ہے یہی
اکبر کی یہ بات یاد رکھ اے عشرت — محفوظ ہو ہر معصیت سے عزت ہے یہی

حقیقی عزت
دولت وہ ہے جو عقل و حکمت سے ملے — لذت وہ ہے جو جوشِ صحت سے ملے
ایمان کا ہو نور دل میں وہ راحت ہے — عزت وہ ہے جو اپنی ملت سے ملے

انسان اور شرافت
انسان میں معتبر لیاقت بھی ہے — محسوب اس وزن میں وجاہت بھی ہے
اندازِ سخن سے بھی ہے اندازۂ طبع — اک جزوِ قوی مگر شرافت بھی ہے

ایمرسن ایک جگہ لکھتا ہے کہ بڑا آدمی صرف وہی ہو سکتا ہے جو کچھ کہ وہ ہے فطرتاً ہے اور جسے دیکھ کر ہمیں کوئی اور شخص یاد نہیں آتا"

ایک عظیم الشان انسان کی یہ تعریف واقعی بہت درست ہے اور یہی تعریف ایک "عظیم تعلیم" کی کسوٹی ہو سکتی ہے۔ ایک دریا اپنے ساحل خود پیدا کرتا ہے اسی طرح ہر "پُرحسن خیال" اپنی راہیں خود نکالتا ہے، پرانی راہیں نہیں بلکہ نئی راہیں۔

اکبر کی اخلاقی تعلیم کو ہم اس کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا یہ تعلیم واقعی "عظیم" کہلائے جانے کی مستحق ہے یا نہیں۔ اکبر کی پند و موعظت کو پڑھ کر انسان کا دماغ فوراً ایران کے "واعظانِ پختہ کار" کی تعلیمات کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تقدیر، توکل، قناعت، ترکِ ہوس، وغیرہا۔ ایسے موضوعات ہیں جو شاعری کی دنیا میں نہایت فرسودہ اور پامال ہو چکے ہیں جس ایرانی شاعر کا دیوان اٹھا لیا جائے یہی تعلیم نظر آئیگی اور اردو شعرا میں چند ایک کو مستثنیٰ

کرتے ہوئے جس کسی کی کلیات کی ورق گردانی کرینگے انہیں مواعظ و عبر کو الٹ پلٹ کر بار ہا ادا کیا ہوا پائینگے۔ اس لحاظ سے اکبر نے اخلاقی شاعری میں کوئی خاص تنوع یا جدت پیدا نہیں کی جیسا کہ عرفی نے کی، اور اگر وہ اپنی رباعیات اور ان دردانگیز نظموں میں جہاں قوم کی درماندگی پر حسرت کے آنسو گرائے گئے ہیں اپنی اخلاقی وجاہت اور سوز باطن کا عکس نہ اتارتا تو اسکا اخلاق آموز کلام جس کا بیشتر حصہ شاعرانہ نقطۂ نگاہ سے بھی کسی تحسین کے قابل نہیں (جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے جو مضمون کے پہلے حصہ میں نقل کئے گئے ہیں) کیونکہ وہ نثر سے صرف اسی قدر متمیز ہے کہ موزون ہے "اخلاقی اثر" (moral effect) سے محروم رہتا گو اب بھی اسے وہ اخلاقی اثر حاصل نہیں جو شکسپیئر، غالب یا اقبال یا ٹیگور کو ہے جنہوں نے ظاہرا اخلاقیات کی بہت کم تلقین کی ہے لیکن جن کی کلیات بحیثیت مجموعی اخلاق کا ایک دلچسپ اور بصر افروز گلدستہ ہیں۔

فلسفۂ اخلاق اور شاعری کو ایک سمجھنا ایک غلطی تھی جس میں شعرائے ایران مبتلا ہو گئے اور جس غلطی کا ہندوستان کے شعرا نے بدقسمتی سے اعادہ کیا۔ شاعری کا ایک مقصد انسان کی اخلاقی بہبودی کی خلاقی ہے لیکن اس کے لئے جس اسلوب کی ضرورت تھی وہ اسلوب نظرانداز کر دیا گیا۔ "فلسفۂ اخلاق ان عناصر کو ترتیب دیتا ہے۔ جنہیں شاعری خلقت کا جامہ بخشتی ہے وہ صرف سیاست مدن و انتظام خانہ داری کے نظام پر روشنی ڈالتا اور اس کی مثالیں پیش کرتا ہے" لیکن شاعری ایک اور طریقہ سے اثر انداز ہوتی ہے" یہ انسان کے دل کو بے شمار جدت بار خیالات کا جولانگاہ بنا کر بیدار اور وسیع کر دیتی ہے۔ شاعری دنیا کے پوشیدہ حسن کا نقاب اٹھا دیتی ہے اور عام چیزوں کو وہ دلفریبی بخشتی ہے کہ وہ فوق الفطرت معلوم ہونے لگتی ہیں۔ شاعری جو کچھ دکھاتی ہے اس کی تخلیق کرتی ہے۔ اخلاقیات کا سب سے بڑا راز محبت ہے یعنی ہماری فطرت کا اشیاے خارجی پر محیط ہونا، ہماری ہستی اعلی ہستی کا اس حسن کے ساتھ ہم روح ہو جانا جو دوسری ہستیوں کے خیالات، حرکات یا ذاتیات میں چھپا ہوتا ہے۔ وہ انسان جو سچے معنوں میں نیک ہونا چاہتا ہے اسے تخیل کے وسیع اور عمیق سمندر میں غوطہ زن ہونا اور اس کے ہر قطرہ سے قطعی واقفیت رکھنا چاہیئے۔ اسے چاہیئے۔ کہ

اپنے آپ کو اور ہر دوسرے انسان کو ہر ایک دوسرے انسان کی جگہ میں رکھ کر دیکھے۔ حتیٰ کہ بنی نوع انسان کے غم اور خوشیاں اس کے غم اور خوشیاں ہو جائیں۔ حسنِ اخلاق کا سب سے بڑا آلہ تخیل ہے۔ شاعری تخیل کے محیط کو خیالات کے تنوع اور جدت سے وسیع کرتی ہے، شاعری اس قوت کو جو انسان کی اخلاقی فطرت کا آلہ ہے اسی طرح تقویت بخشتی ہے جس طرح ورزش جسم کو مضبوط کرتی ہے۔ اس لئے وہ شاعر جو نیکی اور بدی کے متعلق ان خیالات اور احساسات کو نظم کریگا جو بالعموم اس کے عصر اور وقت سے متعلق ہونگے وہ شاعری سے دور پڑ تا جائیگا، وہ جہاں تک اخلاقیات کے اس معیار کی تائید کریگا ایک بلند اور رفیع مقام کو چھوڑ کر ایک ادنےٰ مقام پر گرتا جائیگا اور ایک حقیقی شوکت کی زندگی سے مستعفی ہوگا گو اسے اپنی محدود دنیا میں ایک غیر مکمل کامیابی ہی حاصل کیوں نہ ہو جائے"

پرسی بشی شیلے کا یہ نظریہ نہ صرف شاعری اور اخلاقیات کا فرق دکھلاتا ہے۔ بلکہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اخلاقی شاعری کیا چیز ہے اور اس شاعر کے لئے جو ہر وقت، ہر ملک اور ہر زمانہ میں اپنی اخلاقی وجاہت اور اخلاقی اثر قائم رکھنا چاہتا ہے، کس طرح رہنا، کس طرح سوچنا، اور کس طرح لکھنا چاہیئے۔

اُردو کی دُنیا میں اگر کوئی ایسے شاعر ہیں تو وہ غالب یا اقبال ہیں اکبر کا محدود حلقۂ اثر اس کے لئے یہ قابلِ رشک شہرت اور لاثانی وقعت حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

محمد تصدق حسین خالد بٹالوی

چاند اور سمندر

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپیدا کنار!

جب تیرے جمال کی خوبصورت اور رنگین شعاعیں میرے دل کو منور کرتی ہیں تو وہ جوشِ محبت سے متلاطم ہو جاتا ہے، رنج و مصیبت اور اندوہ و غم کی مہیب اور بھیانک چٹانیں سرور و انبساط کی موجوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپید اکنار!

لیکن جب تو آنکھیں پھیر لیتا ہے جب تیرا سکون بخش اور سرور انگیز چہرہ میری نظروں سے پوشیدہ ہو جاتا ہے تو بحرِ دل کا تلاطم فرو ہو جاتا ہے اور غم و اندوہ کی ایک ایک چٹان نمودار ہو جاتی ہے۔

اس خوفناک تاریکی اور سنسناہٹ کے عالم میں ایک مغموم اور مایوس صدا اٹھتی ہے۔

تو چاند ہے اور میرا دل بحرِ ناپید اکنار!

(ولکاکس)　　　　(صہبائی)

دوشیزۂ فرانس

(۳)

تکمیلِ کار

دعوے کی تصدیق عمل اور صرف عمل ہی سے ہو سکتی ہے!

ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ جس وقت اِس کسان لڑکی نے کارزار کی طرف قدم بڑھایا فرانس کی سیاسی حالت ازحد نازک اور خطرناک تھی۔ نہ صرف یہی کہ مُلک کا بہترین حصّہ اور دار السلطنت انگریزوں کے قبضے میں تھا بلکہ وہ فرانسیسیوں کے دل و دماغ پر اپنی سطوت و قوت کا سکّہ جما چکے تھے۔ دریائے لُوار پر صرف اورلیاں اک ایسا مقام تھا جو ہنوز مطیع نہ ہُوا تھا لیکن وہ غنیم کے پنجے میں تھا اور غیر اغلب تھا کہ اُس کی گرفت سے نکل سکے۔ دلوں پر پستی کے بادل چھائے ہُوئے تھے، رات کی بڑھتی ہُوئی تاریکی قوم مغلوب کو آنے والی ذلت کا پتہ دے رہی تھی کہ دکھیا وطن کے اُفق پر روشنی کی ایک ننھی سی کرن چمکی، مدھم ہُوئی اور پھر آسمان کے بیچوں بیچ ایک تڑپنے والی بجلی بن کر کوندی! اورلیاں کے محاصرے کو سات ماہ گذر چکے تھے، ژان دارک کی رہبری میں آٹھ روز کافی تھے کہ غنیم اپنے قلعے چھوڑ کر دریا کے شمال کی طرف کوچ کر جائے۔ اب لوگ اُسے ژان دارک، دومرمی کی کسان لڑکی نہ کہتے تھے بلکہ "دوشیزۂ اورلیاں" کہہ کر پکارتے تھے" اُس نے عمل سے اپنے دعوے کی تصدیق کر دی تھی، جو کہا وہی کر کے دکھا دیا۔ پھر بھی حسد کرنے والے اور شک کرنے والے اُسے فسوں ساز ہی سمجھتے تھے۔ بھلا اگر ژان جادوگرنی تھی تو کسے انکار ہوگا کہ جادو اور معجزہ میں فقط اک اضافی فرق ہے؟ اور یہ ایک مانی ہُوئی بات ہے کہ آسمانی قوت اُسی زمانے میں رُونما ہوتی ہے جب شیطانی طاقت اپنے زوروں پر ہو، کج روش اُسے بھی بناوٹ ہی خیال کرتے ہیں اور رہِ راست کی ہدایت اُنہیں کو ملتی ہے جن پر خدا کی نعمت سایہ افگن ہو؟

اورلیاں کا محاصرہ اُٹھ جانا اور اجیت انگریزوں کا بازی ہار کے چل دینا ایسی خبر تھی جو

آگ کی طرح گردونواح میں پھیل گئی اور جس سے وہ تمام دل جو جذبۂ قومیت سے معمور تھے پھر گرما گئے۔
ادھر ژان جو اپنے وقت کی قدر جانتی تھی پہلی فتح سے مطمئن ہو کر اپنی سفارت کو بھول نہیں گئی۔ بلکہ چندروز ٹھیرنے کے بعد پھر "بادشاہ" کی طرف لوٹی اور چاہا کہ اُسے ترغیب دے کر جلد ریمز کو لے چلے تاکہ تاج پوشی کی ضروری رسم ادا ہونے میں دیر نہ ہو۔ لوش پہنچ کر اُس نے دیکھا کہ "بادشاہ" بدستور اپنے دربار کی دلدل میں پھنسا ہُوا ہے۔ کچھ لوگ اُس کے نقال اور بھاٹ بنے ہُوئے ہیں۔ کچھ لڑائی کے خطروں سے ڈرا ڈرا کے کہتے ہیں کہ ایسے وقت میں باہر قدم رکھنا حضور کی سلامتی نہیں۔ الغرض "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" کی راگنی چھڑ رہی تھی۔ اُدھر دوشیزہ جو اب تک نہ ہو سکا تھا کر چکی تھی، اِدھر شہزادہ جو نہ کرنا چاہیئے تھا وہی اب بھی کر رہا تھا۔ ژان جو ایک ایک لمحے کو قیمتی تصور کرتی تھی دیکھ رہی تھی کہ دن گذرے جاتے ہیں اور یہاں کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اُسے کچھ احساس سا تھا کہ کام کے لئے اُسے تھوڑا ہی وقت دیا گیا ہے۔ وہ ان نیند کے ماتوں کو جھڑکتی کوستی، منت کرتی اور کہتی کہ "میں فقط ایک برس تک ہوں، جب تک ممکن ہے مجھ سے فائدہ اُٹھالو!" وہ مسکراتے، دل ہی دل میں ہنستے، اور اپنے آئندہ کا حال پوچھتے۔ یہ اس دخل در معقولات پر چیں بہ جبیں ہوتی کہ کرنے کیا آئی تھی یہاں کیا ہو رہا ہے؟ ژان کوئی خیال پرست یا شرمیلی دوشیزہ نہ تھی بلکہ اک قوی زبردست نوجوان عورت تھی جو ہمیشہ ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دینے اور کوئی اُسے ناجائز طور پر چھوئے تو تھپڑ تک مارنے کو تیار رہتی تھی۔ وہ آخر انتظار کرتے کرتے اُکتا گئی اور ایک دن جب "بادشاہ" خلوت میں اپنے چند مصاحبوں کے ساتھ بیٹھا تھا اُس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر آنے کی اجازت پا کر وہ "بادشاہ کے قدموں پر گر پڑی اور عاجزی کے ساتھ بولی "شریف دوفین! (ژان کے نزدیک وہ رسم تقدس ادا کئے بغیر شاہِ فرانس نہ بن سکتا تھا) کیوں نہ ریمز کو چلیئے اور اپنا شاندار تاج پہنیئے"! ایک اسقف نے جو وہاں موجود تھا کہا "اب جب کہ تم بادشاہ کے حضور میں ہو تو ہمیں بتاؤ کہ تمہارے مشیر تم سے کیسے ہم کلام ہوتے ہیں"؟ ژان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ اُس نے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے کہ تم جاننا چاہتے ہو، میں تمہیں خوشی سے مطمئن کر دونگی"۔ اس پر "بادشاہ" نے کہا "ژان بہتر ہو اگر تم اِن صاحبوں کو جو کچھ یہ پوچھتے ہیں بتادو"۔ دوشیزہ فوراً بول اُٹھی اور نہایت مؤثر پیرائے میں کہنے لگی "جب میں وہ باتیں کہتی ہوں جو خدا کی طرف سے ہیں اور اُن پر یقین نہیں کیا جاتا

تو میں دُنیا سے الگ ہو کر خدا کے حضور دُعا کرتی ہوں اور شکوہ گلہ کرتی ہوں کہ لوگ کیوں میری باتوں پر کان نہیں دھرتے۔ تو جب دُعا کر چکتی ہوں میں ایک آواز سُنتی ہوں جو کہتی ہے "اے خدا کی بچی! جا! جا! جا! میں تیری مدد کروں گا، جا! جب میں یہ آواز سُنتی ہوں تو میں خوشی سے پھولی نہیں نہیں سماتی۔ اُس کے تاباں چہرے میں جب وہ اپنی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھائے ہوئے تھی شانِ ایزدی کی جھلک نظر آتی تھی، مصاحب سبھی بُت کی طرح خاموش نرگس کی طرح ٹکٹکی باندھے حیرت سے اُس کی طرف دیکھتے تھے؛

چارلس متاثر ہوا اور وعدہ کیا کہ جب دریائے لُوآر کے کنارے کے سب شہر دشمن کے قبضے سے نکل کر رستہ اُس کے لئے صاف ہو جائیگا تو وہ دوشیزہ کی درخواست کو منظور کرے گا۔ یہ تھا فرانس کا فرماں روا جو اپنی قوم کا رہنما یا فوج کا قائد بن کر غنیم سے برسر پیکار ہونے کو اپنا فرض و عزت سمجھنا تو کُجا صرف اپنی عنایت سے اتنی اجازت دے سکتا تھا کہ اُس کے لئے اُسکی غیر حاضری میں حملہ آوروں کو چند شہروں سے نکالنے کی کوشش کی جائے۔ تو مضائقہ نہیں ! ژان کے لئے یہ اجازت ہی بہت تھی خواہ اس کام کی تکمیل میں اُسے کتنی ہی دقتیں پیش آئیں اور ان دقتوں کے رفع کرنے میں "بادشاہ" کی طرف سے کوئی مدد یا ہمدردی تک بھی نہ ملے۔ دلوال اپنی ماں کو خط لکھتے ہوئے ان لفظوں میں اُس کا ذکر کرتا ہے" اُسے دیکھنا اور اُس کی باتیں سُننا اک واقعی معجزہ دیکھنا تھا۔ میں نے اُسے اپنے گھوڑے پر سوار دیکھا کہ سوائے سر کے ساری کی ساری سفید زرہ میں ملبوس ہے اور ہاتھ میں ایک چھوٹی سی کلہاڑی ہے۔ گرجا کے سامنے پہنچ کر اُس نے عورتوں کی سی آواز میں کہا" گرجا والو! خدا کی بارگاہ میں دُعا کرو اور نماز پڑھو" پھر رستے کی طرف دیکھ کے بولی" بڑھے چلو"!"

دیوک دالانسوں کو ژان کی سفارش پر اپنی بیوی سے بمشکل میدانِ جنگ میں جانے کی اجازت ملی۔ دوشیزہ نے کہا" بڑی بی! ڈرو مت۔ میں اُسے تمہارے پاس صحیح و سلامت واپس لے آؤں گی"!

ژان کی فوج گرد و نواح سے جمع ہونی شروع ہوئی۔ دریائے لُوآر کے کنارے کے شہروں کو دشمن کے قبضے سے چھیننا اُن کے مدِّ نظر تھا۔ پہلے وہ مشرق کی طرف یارژو پر بڑھے۔ کُل تین ہزار

چھ سو جنگجو ہم رکاب تھے، کپتانوں کی طرف سے حملہ کرنے میں وہی پہلی سی جھجک دکھائی دی لیکن ژان پھر اُسی طرح فصیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ لڑنے والے بڑھے، دوشیزہ کے سر میں ایک پتھر لگا جس سے وہ گر پڑی لیکن چوٹ لگنے سے بچ گئی۔ وہ للکاری "ہمارے آقا نے انگریزوں کو قصوروار ٹھیرا دیا ہے ــــ اور سب کچھ تمہارا ہی ہے!" تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں اُس کا برہنہ سر عین کارزار میں، سب سے آگے، مستعدی کے ساتھ، کھڑے رہنا، جانفروشوں کو لڑنے مرنے پر آمادہ کرنا، اُسکا کسی پر ہاتھ نہ اُٹھانا اور خود بھی بے ضرر رہنا! ایسی باتیں تھیں جن کے حیرت انگیز اثر کا اندازہ کرنا ہمارے لئے قطعی ناممکن ہے! جو دیکھتے تھے وہی جانتے تھے اور وہ بھی فقط کچھ محسوس ہی کرتے تھے کہ اک ایسی قوت ہے جس کا رد کرنا اُن کے اختیار سے باہر ہے! لڑائی کے دَوران میں ژان کا دیوک دالانسوں کی حفاظت کرتے رہنا خوب مزے کی بات تھی" اچھے دیوک! چلو! بڑھے چلو! تم ڈرتے ہو؟ میں نے تمہاری بیوی سے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں صحیح سلامت واپس لے آؤں گی" انگریزی قائد سفک نے بالآخر ہتھیار ڈال دیئے۔ اِس کے بعد ژان نے مغرب کا رُخ کیا۔ پہلے بوژانسی پھر بلو آ کا قلعہ مار لیا۔ اِن دنوں ایک دِقّت طلب واقعہ پیش آیا۔ کونت دَرِش مَوں جس کے ساتھ چارلس کی رنجش تھی اچانک ایک بھاری جمعیت کے ساتھ شاہی فوج کی اعانت کو آپہنچا فرنساوی قائد لگے آپس میں اختلاف کرنے، دالانسوں نے کہا کہ میں تو اُس کے ہوتے فوج میں نہ رہوں گا، اُدھر بادشاہ کے خط پر خط آتے تھے کہ اُس کی شرکت منظور نہیں۔ ژان بھی اُس کی آمد اور کمک سے زیادہ خوش نہ تھی اس لئے کہ وہ ہمیشہ آسمانی اعانت پر بھروسہ رکھتی تھی، فوج کے بڑی چھوٹی ہونے کی اُسے چنداں پروا نہ تھی۔ لیکن وہ کسی محبِّ وطن کی حوصلہ شکنی کو بھی اک گناہ سمجھتی تھی۔ رشموں یہ اور ژان اک دوسرے کو دیکھ کر اپنے اپنے گھوڑے سے اُتر پڑے۔ رشموں بولا "ژان! میں سُنتا ہوں تم میرے خلاف ہو، میں نہیں جانتا تم من جانب اللہ ہو یا نہیں۔ اگر تم خدا کی بھیجی ہوئی ہو تو میں تم سے نہیں ڈرتا اور اگر تم شیطان کی طرف سے ہو تو ڈرنے کی بالکل ہی ضرورت نہیں!" "بہادر کانستیبل" ژان نے کہا "تم میرے کہنے سے یہاں نہیں آئے لیکن چونکہ اب تم یہاں آگئے ہو۔ میں تمہارا خیر مقدم کرتی ہوں"

انگریزی فوج بیکار حملے کرتی اور شکستیں اُٹھاتی ہوئی پیرس کی طرف لوٹ رہی تھی کہ بوس

کے میدان میں اُن کی فرانسیسیوں سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ ابھی تک ژان نے میدان میں دشمن کا سامنا نہ کیا تھا۔ لڑائی قلعہ بندیوں اور مستحکم مقامات ہی پر ہوتی رہی۔ انگریز میدان میں لڑائی لڑنے میں مشہور تھے۔ سو فرانسیسیوں کی زیادہ تر یہی رائے ہوتی کہ بوژانسی کو لوٹ جائیں لیکن ژان کی رائے وہی تھی جو ہمیشہ پہلے ہُوا کرتی تھی + وہ بولی "اُن سے گتھم گتھا ہو جاؤ۔ دلیری سے اُن پر جا پڑو۔ وہ اگر بادلوں میں بھی گھس جائیں تو ہم اُن کو جانے نہ دیں گے، شریف بادشاہ کو آج سب سے زیادہ شاندار فتح نصیب ہوگی" +

میدان میں جا بجا غلّے کی کھیتیاں اور انگور کے باغ تھے۔ فوجیں ابھی ایک دوسرے سے پوشیدہ تھیں کہ ایک بارہ سنگا فرانسادی پہرہ داروں سے ڈر کے بھاگا اور انگریزی فوج میں جا گھسا۔ یہ لوگ فرانسیسیوں کی تاک میں چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بارہ سنگے پر گولی چلائی تو فرانسیسیوں کو اُن کا پتہ لگ گیا + وہ بے تحاشا اِن پر لوٹ پڑے اور ایک ہی ہلّے میں کہیں کے کہیں نکل گئے + فرانسیسیوں میں ایک سے ایک بڑھ جانے کی کوشش میں تھا اور اُن کے جوش کی کوئی انتہا نہ تھی + الانسوں نے ژان سے کہا کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا؟ اُس نے پوچھا "کیا تمہاری ایڑی مضبوط ہے؟" ڈیوک نے حیرانی کے ساتھ کہا کیا؟ تمہارا مطلب ہے کہ ہم لوگ دشمن کو پیٹھ دکھائینگے ژان نے جواب دیا "نہیں نہیں! انگریز لڑیں گے ہی نہیں۔ وہ بھاگ نکلیں گے اور تمہاری ایڑی مضبوط ہوگی تو اُن کا تعاقب کر سکو گے" + غنیم پر دوشیزہ کا جادو چل گیا۔ فوج میں افراتفری پڑ گئی۔ سپاہی اپنی اپنی جان بچا کر بھاگے، افسروں نے راہِ فرار اختیار کی۔ صرف ٹالبٹ تندی کے ساتھ لڑا اور قید کر لیا گیا + پاتے کی بھاگڑ (جیسا کہ اس لڑائی کو کہتے ہیں) فرانسیسیوں کی سب سے زیادہ مکمل اور شاندار فتح تھی۔ انگریزوں کے اجیت ہونے کی شہرت جاتی رہی۔ اُن کا فوجی رعب قطعی طور پر مٹ گیا۔ اور یہی" اس فتح کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت تھی جس کا سبب ژان اور صرف ژان ہی کی ذات تھی۔

اب دوشیزہ نے دشمن کو قطعی شکست دے کر شہزادے کا رستہ صاف کر دیا تھا لیکن وہاں ہچکچاہٹ ہی شاہی عزم کی صورت تھی۔ درباریوں اور اُن کے "بادشاہ" کی رائے تھی۔ کہ اب تو دشمن میں کچھ دم باقی نہیں رہا، وہ فرانسیسیوں کو پیٹھ دکھا کے مقابلے سے دست بردار

ہوچکا ہے، اب بھی "حضور" کو آرام نصیب نہ ہوا تو کب ہوگا؟ پھر "بادشاہ" ناراض تھے کہ دشمنوں کو اُس کا جانب دار بناکر نصرت ہیں شامل کرلینا مفسدہ پردازی سے کم نہ تھا۔ لیکن اس وقت تک رائے عامہ کا زور اس قدر شدید ہوچکا تھا کہ "حضور" کے لئے بھی اُس کا اعتنا نہ کرنا بالکل ناممکن ہوگیا۔ بالآخر چارلس اپنے سکون کو حرکت دینے پر مجبور ہوگیا۔ اب کوئی دوشیزہ کو علانیہ طور پر جادوگرنی کہنے کی جرأت نہ کرتا تھا اگرچہ حسد و نفرت کا سلسلہ بجائے گھٹنے کے بڑھ رہا تھا۔ کلیسا والے جی ہیں کُڑھتے تھے۔ کہ یہ پابندِ مذہب لڑکی اِس آسمانی کام میں ہمیں شریک نہیں کرتی، بغیر کلیسا کے واسطہ کے براہِ راست آسمان سے باتیں کرتی ہے، کہتے تھے "یُوں تو سب کچھ خدا ہی کی برکت سے ہے مگر ہم اتنا جانتے ہیں کہ یہ لڑکی ضرور گنہگار ہے"۔ "بادشاہ" ۲۸ جون کو فوج کے ساتھ ژیاں سے چلا۔ ژاں کے وفادار مددگار اُس کے ساتھ تھے بہادر دُنوا، الانسوں جس کی حفاظت دوشیزہ کے ذمہ تھی، لائیر جسے ڈنڈے کی قسم کھانے کی اجازت تھی، لوال جو اپنی جائداد بیچ بانٹ کر اِس جنگ میں شریک تھا ان ہیں سے کوئی نہ کوئی برابر دوشیزہ کے قریب رہتا تھا یا وہ خود کبھی فوج کے اگلے حصے ہیں کبھی پچھلے ہیں کوچ کرنے والوں کو ڈھارس دینے والی لڑنے والوں کو جوش دلانے والی تھی۔ اوزئیر کے برگندیئے تو رشوت ستانی کی برکتوں سے فائدہ اُٹھاکر بچ گئے لیکن اس کے بعد کے شہروں ہیں ژاں کے قائدوں کی دال نہ گلی۔ ایک ایک کرکے سب نے اطاعت قبول کرلی۔ آخر تروآ، وہ مقام جہاں فرانس کی قسمت تباہی سے تبدیل ہوچکی تھی، نظر پڑا۔ تروآ کی بدشگونی کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوتا کہ اُسے دیکھتے ہی فرنساوی فوج میں اختلافات ہونے لگے، "بادشاہ" پہلے سے بھی زیادہ بزدل بنگیا ایک مشیر نے جو ژاں کے مخالفین ہیں سے تھا کہا کہ اگر اتنا کچھ اس لڑکی کے کہنے پر کیا ہے تو یہاں بھی اُسی کی رائے پر عمل ہونا چاہیئے۔ دوشیزہ باہر کھڑی تھی۔ حسنِ اتفاق سے عین اسی وقت اُس نے بے صبری کے ساتھ دروازہ کھٹکھٹایا جیسا کہ پہلے بھی ایک بار شینوں ہیں اُس نے بے تابی ظاہر کی تھی، اندر داخل ہوئی تو سراسقف نے یہ جتانے کے لئے کہ وہ ژاں کے مخالفین ہیں سے نہیں ہے جلدی سے کہا، "ژاں" "بادشاہ" اور اُس کے مشیر اس تذبذب میں ہیں کہ اب کیا کیا جائے؟" دوشیزہ بولی "اگر میں کچھ کہوں تو مانو گے؟" "بادشاہ" بیچ ہیں بول اُٹھا کہ "میں یہ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں اگر تم مناسب و مفید مشورہ دوگی تو میں ضرور مان لونگا"۔ اُس نے پھر دوہرایا "مجھے مانو گے؟" بادشاہ

نے کہا "ضرور جیسی تمہاری بات ہو گی" ژان نے کہا "شریف دو فیں! اپنے آدمیوں کو حکم دے دو کہ ٹروآ کے شہر پر حملہ کر دیں اور زیادہ سوچ بچار نہ کریں۔ کیونکہ خدا کی قسم تین دن میں نرمی سے ہو یا سختی سے میں آپ سب کو ٹروآ کے اندر لے چلوں گی اور جھوٹا برگندی منہ تکتا رہ جائے گا" چانسلر نے کہا "ژان اگر یہ چھ دن میں بھی ہو سکے تو ہم خوشی سے انتظار کریں گے" + دوشیزہ نے بادشاہ کو مخاطب کر کے استقلال کے ساتھ کہا "آپ چھ دن میں نہیں کل ہی یہ شہر مار لیں گے"!

اس کے بعد وہی واقعات ہوئے جو پہلے سے ہوتے آئے تھے۔ ژان اپنا علم تھام کر فصیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔ لیکن اب وہ زیادہ کار آزمودہ ہونے کے باعث جنگی تیاریوں میں ایک معتدبہ حصہ لینے لگی۔ اُس نے ساری رات آنکھوں میں کاٹ دی اور شہر کے گرد مناسب طور پر جگہ جگہ توپیں جما دیں۔ شہری یہ شور وغل سن سن کر اور زیادہ بدحواس ہوئے۔ جنگجوؤں کے بازو بھی گویا جادو کے اثر سے کانپنے لگے اور سوچنے لگے کہ ہتھیار ڈال دینا ہی قرینِ مصلحت ہو گا + پو پھٹنے سے پہلے ابھی اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ پادریوں کا ایک جلوس شہر کے دروازے سے نکل کر باہر آیا اور شہریوں کی طرف سے "بادشاہ" کی خدمت میں حاضر ہو کر پیمانِ اطاعت باندھا اور کہا کہ قلعے کی فوج کو کوچ کر جانے کی اجازت دیجئے! یہ بات مان لی گئی اس قلعے والی فوج میں فرنساوی قیدی بھی شامل تھے جو ژان کے اصرار پر فدیہ دے کر چھڑا لئے گئے + ژان فوراً شہر میں داخل ہوئی لیکن یہاں آؤ بھگت کا سوال نہ تھا وہ اور لیاں ہی کے ساتھ مخصوص تھا۔ دوشیزہ کو دیکھ کر لوگ جی میں ڈرتے تھے کہ یہ جادوگرنی آخر کار ہمارے شہر میں بھی آپہنچی۔ برادر رشار شہر کا متقرر بھی جب ژان سے ملا تو اپنے آگے "پوتر پانی" چھڑکتا ہوا بڑھا تاکہ شیطان کو جو ژان کے اندر چھپا بیٹھا ہے دور کر دے + دوشیزہ نے کہا "تشریف لائیے! میں بھاگوں گی نہیں"! + مغلوبیت کے بعد دوسرے روز ژان "بادشاہ" کو لے کر گرجا گئی اور وہاں اُس مقدس مقام میں دوبارہ چارلس نے وہ وعدے دہرائے جو داخلے سے پہلے کئے تھے کہ شہریوں کے سب حقوق ملحوظ رکھے جائیں گے! ٹروآ کے بعد شالوں کا شہر تھا۔ یہاں کے لوگوں نے بھی اپنے شہر کے دروازے قوم پرستوں کے لئے کھول دئے۔ اور حلقۂ اطاعت میں داخل ہو گئے +

اب ریمز تک سارا رستہ صاف نظر آرہا تھا + کوئی رکاوٹ نہ تھی، ژان نے جو کچھ کہا

نمادہ کر کے دکھا دیا، اورلیاں کا محاصرہ اُٹھایا، دریائے لُوار کے کنارے کے سبھی شہروں کو زیر نگیں کیا، دشمن نے جہاں میدان میں مقابلہ کرنے کی ٹھانی اُسے پچھاڑا اور انگریزوں کے رُعب داب کو فرانسا دی دلوں سے قطعی طور پر محو کردیا۔ ترد آجہاں منحوس معاہدہ کیا گیا تھا" بادشاہ" کے قدموں سے مشرف ہوا اور اب ریمز جو شہزادے کی رسمِ تقدس اور تاجپوشی کا مقررہ مقام تھا تھوڑے ہی فاصلہ پر تھا۔ ژان کے آنے کی خبر دُور دُور تک مُلک میں پھیل چکی تھی۔ دومرمی کے ناخواندہ غریب کسان بھی اُس انبوہ میں شریک تھے جس سے سڑک آباد ہو رہی تھی۔ وہ سُن چکے تھے کہ ہمارے گاؤں کی چھوٹی عبادت گذار سب قائدوں کی سردار بن کر غنیمِ قدیم کو کئی بار فاش شکستیں دے چکی ہے۔ فرشتۂ میکائیل اُس کے پاس آتا جاتا ہے اور ربِّ دو عالم کے پیغامات لاتا ہے۔ لیکن اُنہیں یقین نہ آتا تھا کہ حقیقت میں ایسا ہی ہوگا۔ یہاں تک کہ وہ اطراف سے ہو کے گذرے اور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ وہی ژان ہے اَور کوئی نہیں، بادشاہ اس کے جلو میں ہے اور وہ فتحمند فوجوں کو فرانس کے بلند نصیبے کی طرف لئے جارہی ہے! کیا وہ جنگ سے ڈرتی نہیں۔ تیروں کی اُس بوچھاڑ سے، توپوں کے اُن گولوں سے، اُس دیوانہ کر دینے والے شور و غل اور کُشت و خوں سے؟ دوشیزہ کا قول تھا" میں سوائے دغا کے اور کسی چیز سے نہیں ڈرتی"!

بادشاہ اور اُس کے مصاحب خائف تھے کہ نہیں معلوم ریمز کے سر کرنے میں کتنی دشواریں اُٹھانی پڑے۔ خوبئ قسمت سے ریمز والوں نے خود ہی شہریوں کا ایک وفد شہر کی چابیاں دیکر شہزادے کے استقبال کو بھیجا۔ "بادشاہ" اور اسقفِ اعظم دونوں کے لئے، ایک شاندار کامیابی تھی، دونوں اپنے اپنے حقوق سے محروم کئے گئے تھے اب دونوں نے دوشیزہ کی پیروی میں اپنے کھوئے ہُوئے خزانے کو پالیا! سب پیشینگوئیاں پُوری ہوگئیں! اسقفِ اعظم شہر میں صبح کے وقت داخل ہُوا، چارلس اُس کے درباری اور سب باقاعدہ - اور بے قاعدہ فوج، ژان کے چیلے، قواعدداں فوج، ہزاروں وہ کسان جو ریمز میں ژان کو دیکھ کر اپنا کام چھوڑ چھوڑ کے راہِ خدا میں چل کھڑے ہُوئے تھے سب کے سب شام ہوتے شہر میں داخل ہُوئے! شہر ان نو وارد فتح مندوں کی آمد آمد اور شہریوں کے جوش و خروش کے ساتھ خوشی کا جشن منانے میں مصروف ہوگیا اور ہر سو اک جدید قومی زندگی لہریں لینے

لگی! ژان شہزادے کے ساتھ ساتھ گھوڑے پر سوار چلی آتی تھی اور اُس کا عَلَم اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اُس کا باپ ژاک دارک اور اُس کا ماموں دیوراں لاکسار بس نے پہلے پہل مشکل کے وقت اُس کی مدد کی تھی شہر کے چوک میں ایک سرائے میں اُس سے ملے۔ اس ملاقات کا حال ہمیں معلوم نہیں۔ اُس کے ماموں کو شہزادے نے بھی طلب کیا اور اُس سے ژان کے بچپن کے حالات دریافت کئے۔

تاج پوشی سے ایک دن پہلے شام کے وقت فرانس کے اُمرا شہزادے کو گرجا کے باہر لے گئے اور ایک قدیم دستور کے مطابق اُسے ایک مرتفع مقام پر کھڑا کر کے لوگوں کو علی الاعلان کہا "یہ ہے تمہارا بادشاہ جسے ہم فرانس کے اُمرا تاج پہناتے ہیں، یہ ہوگا ہمارا بادشاہ اور حاکمِ اعلیٰ اگر یہاں کوئی متنفس ہے جسے کوئی اعتراض کرنا ہو تو وہ بول اُٹھے تاکہ ہم جواب دے سکیں اور کل رُوح القدس کی برکت سے اس کی "رسمِ تقدس" ادا ہوگی۔ کیا تم کو کچھ اعتراض ہے؟" لوگوں نے چِلّا کے کہا "مبارکباد! مبارکباد!" رات ریمز والوں نے رتجگے میں کاٹی۔ شب بھر جشن کی تیاریاں ہوتی رہیں، غریب سے غریب گھر والی نے اپنا بہترین ریشم نکال کر گھر کی آرائش کی، بازار سجنے لگے لوگوں نے اپنا بہترین ملبوس زیبِ تن کیا، دُور دُور کے شہروں سے فرانس کے رہنے والے فرانس کے نام پر فخر کرنے والے، جوق جوق ریمز میں آنے شروع ہوئے۔ ایسا دن برسوں کے بعد نصیب ہوا تھا، غنیم کی شکست قوم کی فتح کسے خیال تھا کہ یہ ہمارے جیتے جی نصیب ہونگی، لندن تک اس جشن کی دُھوم تھی، پیدل اور سوار صبح ہوتے شہر کے دروازوں پر ہجوم کئے کھڑے تھے، "بادشاہ" کے جشن کا تماشا اور پھر اُس آسمانی قاصد دوشیزہ اورلیاں کا جلوہ دیکھنا معراجِ انبساط تھا! علی الصباح اسقفِ اعظم کے مکان سے ایک جلوس نکلا۔ چار بانکے امیر، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے ہوئے اپنے جھنڈے پکڑے ہوئے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر سین ریمی کی قدیم عبادت گاہ کی طرف چلے۔ یہاں کا پادری اپنے کارندوں کے جھرمٹ میں فرنساوی فرماں رواؤں کی مقدس و پاکیزہ قدیم بوتل ہاتھ میں لئے نمودار ہوا اور قسماقسمی ہونے کے بعد یہ خزانہ ان جنگجوؤں کے حوالے کیا گیا۔ لوٹتے وقت اُنہیں راہ میں اسقفِ اعظم کا شاندار جلوس ملا اور یہ "مقدس تیل" اُن کے سپرد کر دیا گیا۔ ادھر یہ تمہیدی رسمیں ہو رہی تھیں۔ اُدھر ژان فارغ نہیں

تھی۔ جیسا کہ اُس نے لڑائی سے پہلے انگریزوں کو ایک نامۂ تنبیہ لکھا تھا ایسے ہی اب اُس نے ڈیوک برگنڈی کو جو شاہِ فرانس کے خلاف انگریزوں کا جانب دار تھا۔ ایک ہدایت نامہ تحریر کیا جس کا مضمون حسبِ ذیل تھا:۔

یسوع مریم

عالی مرتبت دلاور شہزادے ڈیوک برگنڈی ؟ ژان، دوشیزہ آسمانوں کے بادشاہ کی طرف سے جو میرا منصف مزاج حکمران و آقا ہے چاہتی ہے کہ شاہِ فرانس اور تم آپس میں صلح کر لو ایسی صلح جو مضبوط و پائدار ہو اور قائم رہے۔ ایک دوسرے کو دلی ارادے کے ساتھ درگذر کرو جیسا کہ اچھے مسیحیوں کا فرض ہے اور اگر تم کو لڑنا ہی ہے تو کافروں سے لڑو۔ شہزادۂ برگنڈی! میں التجا کرتی ہوں منت کرتی ہوں حلم و انکسار کے ساتھ چاہتی ہوں کہ تم مقدس ملکِ فرانس کے خلاف لڑنا ترک کر دو۔ فوراً جتنی جلد ہو سکے اپنی فوج کو جو قلعوں میں جمی بیٹھی ہے ہٹا لو۔ شاہِ فرانس تمہارے ساتھ اپنی عزت و ناموس کو مدِّنظر رکھ کر مصالحت کو تیار رہے اور تمہاری جان کی قسم! تم وفا شعار فرانسیسیوں کے برخلاف کبھی فتح نہ پاؤ گے اور سب وہ لوگ جو اس مقدس سلطنت کے ساتھ برسرِ پیکار ہونگے گویا آسمان کے بادشاہ کے ساتھ لڑائی کرینگے۔ اور میں ہاتھ جوڑ کر منت کرتی ہوں کہ اب لڑائی نہ کرو۔ نہ ہم سے لڑو بھڑو نہ تمہارے دوست نہ تمہاری رعایا۔ اور یہ یاد رکھو کہ تم تعداد میں کتنے بھی کیوں نہ ہو تم کبھی نہ جیتو گے پھر کتنی حسرت ناک ہوگی وہ لڑائی اور وہ خون جو وہاں بہے گا۔ تین ہفتے ہُوئے میں نے ہرکارے کے ہاتھ تم کو ایک خط لکھا تھا کہ تم آج اتوار کے دن بتاریخ ۱۷ جولائی ریمؔ میں آکر بادشاہ کی "رسمِ تقدس" میں شامل ہو جاؤ جس کا مجھے جواب نہیں ملا نہ اُس ہرکارہ سے کچھ حال معلوم ہُوا۔ میں تم کو خدا کے سپرد کرتی ہوں اور اگر اُس کی مرضی ہو تو وہ تمہاری حفاظت کرے اور میں خدا سے دُعا کرتی ہوں کہ وہ اک اچھے امن کی صُورت پیدا کر دے! المرقوم ۱۷ جولائی ۱۴۲۹ء بمقام ریمؔ

خط لکھنے کے بعد ژان نے اپنی زرہ پہنی اور جشن میں شریک ہونے کی تیاری کی۔ اس شرکت کے مفصل حالات معلوم نہیں ہیں صرف اتنا پتہ ہے کہ اُس کا عَلَم اُس کے ساتھ تھا۔ اُس نے بعد میں فخر کے ساتھ کہا یہ خطرے کی حالت میں سب کے آگے ہوتا تھا مناسب

تھا کہ عزت کے وقت بھی سب کے ساتھ شریک ہو۔ ژاں اُمرا اور قائدوں کے زمرے میں قربان گاہ کے گرد کھڑی ہُوئی۔ اُسے گرجا میں کوئی مخصوص جگہ نہیں دی گئی۔ شہزادہ اسقفِ اعظم کے سامنے دوزانو ہُوا، اسقف نے اُس پر مقدس تیل چھڑکا۔ اور اُس کے سر پر تاج رکھ کر رسم کی تکمیل کی، گرجا "مبارکباد، مبارکباد" کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ خدا نے جو کام ژاں کے ذمہ کیا تھا وہ آج پورا ہو گیا، اس کے سرانجام دینے میں اُسے جن صعوبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا وہ اب راحتِ جان بن کر نظر آ رہی تھیں۔ بادشاہ کو تاج پوش دیکھ کر ژاں سے نہ رہا گیا۔ لوگوں کے انبوہِ کثیر میں سے نکل کر اُس نے اپنے تئیں بادشاہ کے قدموں پر ڈال دیا اور اُس کے زانو سے لپٹ گئی۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ وہ بولی "شریف بادشاہ خدا کی مرضی آج پُوری ہو گئی۔ اُس کا حکم تھا کہ میں اور لیاں کا محاصرہ اُٹھا دوں اور آپ کو اِس شہر ریمز کو لے آؤں جہاں آپ کی "رسمِ تقدس" ادا ہو۔ اب اُس نے دکھا دیا ہے کہ آپ ہی اصلی بادشاہ ہیں اور فرانس کی مملکت فی الحقیقت آپ ہی کی سلطنت ہے۔" یہ کہکر ژاں نے رخصت چاہی کہ اب مجھے جانے دیجئے، میرا کام ہو چکا ہے؟

ژاں کی سیرت نگار لکھتی ہے کہ انسانی دلوں کی یہ دُعا کہ "اے آقا! اب تُو اپنے خادم کو سلامتی میں رخصت ہو جانے دے" عُمر رسیدہ لوگوں کے لئے تو موزوں ہے لیکن جب وہ کسی نو عُمر کے لبوں سے نکلے تو سننے والوں کے دل کو پاش پاش کر دیتی ہے۔ لوگوں پر رقت کا سماں چھایا ہُوا تھا، ژاں کے دل میں بھی رقت تھی اور اگرچہ اُس کے خیالات مسرت و انبساط سے لبریز تھے لیکن اس تکمیلِ کار کا احساس بھی تھا کہ مجھے زندگی میں جو کچھ کرنا تھا میں کر چکی، یہی تھا میرا مقصدِ حیات، اب کارزارِ دہر سے مجھے واسطہ نہیں!

ژاں کی اس بے تابانہ گفتگو کے صحیح معنی کی بابت مورخین میں بہت اختلافِ رائے ہے۔ کیا دوشیزہ کا مطلب یہ تھا کہ اُس کا کام پورا ہو چکا ہے اور اُس کا ربانی فرض ادا ہو گیا؟ کیا اُس کے اعتقاد کے مطابق اُس کا کارِ مقررہ ختم ہو چکا تھا؟ یا کیا اُس کے دل میں یہ تھا کہ ابھی اُسے انگریزوں کو فرانس سے باہر نکالنا ہے؟

اگر پہلی حالت تھی تو اُسے چاہیئے تھا کہ وہ یہ کام ترک کر کے چل دیتی اور ایسا نہ کرنے

ہیں وہ ربّانی ظلِّ عاطفت سے نکل گئی + اس امر کا صحیح فیصلہ دشوار ہے، بعض وقت ژان کہا کرتی کہ میرا کام اورلیاں کا محاصرہ اُٹھانا اور شہزادے کو ریمس میں لیجا کر تاج پہنانا ہے، لیکن بعض دفعہ وہ پیرس کو سر کرنے اور انگریزوں کو فرانس سے نکال دینے کی باتیں بھی کرتی، اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کرتی کہ میری قوت محدود ہے اور ختم ہونے والی ہے، اُس نے بادشاہ سے کہہ دیا تھا کہ "میں صرف ایک برس تک ہوں" + غالباً دُونوا کی شہادت سب سے زیادہ قوی ہے کیونکہ وہ اکثر اُس کے قریب ہی رہتا تھا۔ ژان کی موت کے مدت بعد اُس نے کہا کہ "اگرچہ ژان بعض اوقات لوگوں کے دل بہلا دے کے لئے ایسے امور کا تذکرہ کرتی جو بعد میں پُورے نہ ہوئے لیکن جب کبھی وہ متانت کے ساتھ جنگ کا ذکر چھیڑتی اور اپنا اصلی ارادہ ظاہر کرتی تو صرف یہی کہتی کہ میں اس غرض سے بھیجی گئی ہوں کہ اورلیاں کا محاصرہ اُٹھادوں اور بادشاہ کو ریمس کی طرف تاج پوشی کے لئے لے چلوں" + اگر اصلیت یُوں ہے تو کیا اُس نے احکامِ ربانی سے سرتابی کی؟ یا کیا بادشاہ اور اُس کے دربار کی ریشہ دوانیاں اُس کی زنجیرِ پا بن گئیں؟ مسز اولیفنٹ کا خیال ہے کہ صرف اِنہی دو چیزوں کا سرانجام دینا اُس کے ذمہ تھا، اِس کے بعد جو کچھ اُس نے کیا وہ نیک نیتی اور عالی ہمتی سے بحیثیت ایک حسّاس و دلاور انسان کے کیا۔ اس میں ربّانی منظوری کا پہلو شامل نہیں تھا! یہ اُس کی مرضی تھی کہ لڑے یا اپنے گھر کو لوٹ جائے۔ اُس کے حالات و عادات میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا، اُس کے خیال میں اب زندگی کی خوشی اسی میں تھی کہ وہ اپنے وطن کو قطعی طور پر آزاد کرنے کے لئے اپنی باقیماندہ زندگی نذر کردے +

ہم دیکھ چکے ہیں کہ دوشیزہ کو بات بات میں اپنے ہموطنوں کی حاسدانہ مخالفت سے دوچار ہونا پڑا۔ ریمس کے بعد یہ عداوت اور جلن دُگنی چوگنی ہوگئی۔ بادشاہ اب فی الحقیقت بادشاہ بن گیا تھا، اب شکست سے کچھ کھو دینے کا احتمال زیادہ تھا فتح سے کچھ حاصل ہونے کا خیال کم اس لئے ایسے کاہل الوجود بادشاہ اور ایسے حاسد و زباں کار درباریوں سے توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ حصولِ مقصد کے بعد ژان کو اپنی نظروں سے اوجھل کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت کرینگے، مگر باوجود دوشیزہ کے انکسار کے "لوگوں کی وجہ سے" اُس کا نکال

دیا جانا اک مشکل امر تھا اور غالباً اُس کے ہمراہی بھی ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے کہ ابھی اُس کے کارنامے سب کے دل و دماغ میں تازہ تھے۔ دوشیزہ کی آوازوں نے بھی اُس کو اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیا۔ نہ اُسے منع کیا کہ اس کام کو ترک کر دے لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اُن کا لہجہ زیادہ غمگین ہوگیا، بتدریج اُس کے دل میں القا ہونے لگا کہ اُس پر کوئی نہ کوئی آفت نازل ہونے والی ہے۔ لیکن اس آفت میں خدا اُس کا ساتھ دیگا۔ کچھ شبہ نہیں کہ اگر وہ اپنی اس مکمل کامرانی کے بعد خلوت نشیں ہوجاتی تو اُس کا کارنامہ نہایت شاندار ہوتا لیکن ایسا کرنا تقاضائے بشری نہ تھا، اب وہ ایک قائد (رہنما) تھی جس میں جنگی جوش کی کمی نہ تھی، اُسے کافی تجربہ حاصل ہوچکا تھا، اب دومری کی فضا میں اپنے خیالات کے ساتھ اُڑنا اُس کی ذکاوت کے لئے موزوں نہ تھا، اب یہی کام تھا جس کو وہ اپنے حسبِ حال سمجھتی تھی خواہ قدم قدم پر اُس کے لئے رکاوٹوں کا سامان پیدا کیا جائے، بات بات میں رخنہ اندازی کے پہلو نکالے جائیں اس کام سے مفر نہ تھا! اور اس میں شک نہیں کہ اگر وہ اپنے دل کے کہنے پر عمل کرسکتی اگر وہ بلا تامل پیرس پر حملہ آور ہوسکتی تو جیسا کہ خود انگریزوں کے سرِ حکومت نے اعتراف کیا دار السلطنت کا فتح ہوجانا یقینی تھا لیکن وہ ابو کسلان جس کی تاج پوشی ریمز میں ہوئی تھی اب اتنی شان و شوکت کے بعد کیونکر اس قدر جلد میدانِ جنگ کی طرف رُخ کرتا۔ چارلس نے درپردہ ڈیوک برگنڈی کے ساتھ معاہدہ کرلیا کہ یہ پندرہ روز کے اندر اندر پیرس اُس کے حوالے کر دے گا۔ ڈیوک کی اس وقت عجب حالت تھی، وہ اُدھر انگریزوں سے بیزار تھا اِدھر شاہِ فرانس سے متنفر، وہ اس کشمکش میں تھا کہ کس کی اعانت کا دم بھرے اُدھر اجنبی دوست ہے۔ ادھر ہم وطن دشمن!

ژان کو ان ساری مشکلات کا ریمز چھوڑنے سے پہلے ہی احساس ہونے لگا۔ اُس کی باتوں میں اُداسی برسنے لگی۔ اُس نے دل ہی دل میں جان لیا کہ وہ لطیف و مسرور وقت اب انجام کو پہنچ گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تاج پوشی کے بعد بادشاہ گرد و نواح کے دیہات میں اپنے جلوس کے ساتھ نکلا، لوگ ہر طرف مبارکباد کے پھول نچھاور کرتے تھے اور خوش تھے کہ اُن کا بادشاہ پھر اُن کے درمیان راج کرنے کو آ پہنچا ہے، لافرتے کے گاؤں میں ژان جو اس جلوس میں شریک تھی اسقفِ اعظم اور ڈونوا کے بیچ میں گھوڑے پر سوار جا رہی تھی کہ لوگوں نے بادشاہ کو دیکھ کر مبارکباد

مبارکباد" کے نعرے لگائے۔ ژان آبدیدہ ہوکر بولی "آہ! بھولے بھالے لوگ! یہ اپنے شریف بادشاہ کو دیکھ کر کیسے خوش ہو رہے ہیں، میں کس قدر خوش نصیب ہوں اگر میرے دن ختم ہو جائیں اور میں انہیں لوگوں میں یہاں دفن کر دی جاؤں! حضرتِ اسقف ہمیشہ تاک میں رہتے تھے کہ کوئی موقع پائیں تو ژان کو جھٹلائیں۔ بولے "ژان بتاؤ تو تم کہاں مروگی؟" دوشیزہ نے بغیر سوچے سمجھے اپنے بھولے پن کے ساتھ کہا "جب بھی خدا کی مرضی ہو، مجھے تو نہ مقام کا علم ہے نہ وقت کا!"

اتنا صلہ ژان کو اُس کی خدمات کا ضرور ملا کہ اُس کے باپ اور ماموں کو حکومت کے مصرف پر شہر میں ٹھہرایا گیا اور ژاک کو ایک سند عطا کی گئی جس کی رُو سے دومرمی اور گریٹو کے گاؤں کو تمام قسم کے محاصل اور مالگذاری کی معافی دے دی گئی! مدتوں تک سرکاری خزانے کے حسابات میں ان دونوں دیہات کے نام کے سامنے رسید کے بجائے یہ لفظ لکھے ہوتے تھے "دوشیزہ کی خاطر"!

اپنے باپ اور ماموں سے رخصت ہوتے وقت ژان بے اختیار رو پڑی۔ وہ چاہتی تھی کہ اُن کے ساتھ دومرمی کو لوٹ جائے اور مدت کے بعد اپنی پیاری ماں کو پھر ملے "لیکن ایسا کرنا اُس کے بس میں نہ تھا۔ باپ اور ماموں دونوں اُسے خدا حافظ کہہ کر چل دیئے اور جہانتک ہمیں معلوم ہے پھر کبھی اُس سے ملنا نہ ہُوا!!

(باقی)

بشیر احمد

فنِ قصّہ نویسی

۶

سر والٹر سکاٹ نے ایک دفعہ کہا کہ جب پلاٹ بنانے میں مجھے وقت محسوس ہوتی تھی۔ تو میں شہر کی کسی ایک آسان گذرگاہ پر چہل قدمی کرتا نکل جاتا تھا۔ بلاشک بعض اوقات پلاٹ کی تربیت کے لئے قدرت کا معاون ہاتھ عجیب طریقوں سے ہماری رہنمائی کرتا ہے مگر ہر ایک فسانہ نگار تربیتِ پلاٹ کو ایسا آسان مشغلہ نہیں پائیگا جیسا سر والٹر سکاٹ نے بیان کیا تھا لیکن بعض اکابرِ فن نے تو اس کو نہایت محنت طلب کام تسلیم کیا ہے۔ بہرحال ہر ایک فسانہ نویس کو یہ زریں اصول ضرور مدِ نظر رکھنا چاہیئے کہ جب تک پلاٹ اور کہانی کی کامل و اکمل طور پر پرورش و تربیت نہ ہولے اسے زینتِ اوراقِ جرائد ہونے کے قابل ہرگز نہ سمجھے +

کہانیوں کے مختلف مدارج پر بحث کرنے سے پیشتر میں یہ بتا دینا لازمی خیال کرتا ہوں کہ عمدہ کہانی کئی حصّوں میں تقسیم ہو سکتی ہے۔ بعض فسانہ نویسوں نے تمہید۔ پلاٹ اور اختتام تک ہی اکتفا کی ہے۔ ڈاکٹر ہارن[1] ادب لطیف کی اس صنف کو پلاٹ۔ مدعا۔ مطالعہ۔ افرادِ قصّہ۔ تحریکِ جذبات۔ مشاہدہ اور طرزِ بیان پر مشتمل جانتا ہے۔ لیکن ان سب سے آسان تر۔ بہترین اور کارآمد تقسیم ایک اور نامور فسانہ نویس نے کی ہے جو کہانی کو (۱) آغاز (۲) واقعات (۳) جوش یا حرکت (۴) تعویق (۵) منتہا (۶) انکشاف اور (۷) خاتمہ پر منقسم کرتا ہے +

(۱) آغاز:- ہر ایک کہانی کا آغاز ضرور ہونا چاہیئے لیکن یہ ضروری امر نہیں کہ ہر ایک آغاز "تمہید" ہو۔ فسانہ نویس کا فرضِ اولیں قارئین کی چشمِ دل کے سامنے تصویر کا نہایت جلد لیکن سادہ الفاظ میں ایسی خوبصورتی کے ساتھ پیش کرنا ہے کہ وہ مصنف کے جذبات و خیالات سے فوراً متکیف و سرشار ہو جائیں گویا اُن کے دماغ پر کسی نے جادو کر دیا ہو۔ شوکت الفاظ کی گرہیں ڈال کر نفسِ مضمون کو اُلجھانا۔ متقدمین کی طرح پیکرِ الفاظ کی پرستش کرنا اور پڑھنے

---

[1] دی ٹکنیک آف دی ناول

والوں کو دماغی تخیل کی بھول بھلیاں میں پھنسا دینا تحصیل لاحاصل ہے جو بلاشبہ دماغی دلچسپی کی بجائے ذہنی اضمحلال کا باعث ہوجاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کہانی کس طرح شروع کی جائے؟ یہ کہانی کی نوعیت اور اُس اثر پر موقوف ہے جو مصنف قارئین کے دلوں پر چھوڑنا چاہتا ہے۔ ممکن ہے کہ پڑھنے والا تشریحات سے پہلے فسانہ کے بنیادی اصولوں سے واقف ہونا لازمی سمجھتا ہو۔ اس حالت میں کم و بیش کہانی کی تمہید ضرور ہونی چاہیئے۔ برعکس اس کے میرے نزدیک کہانی کو ایسی طرز پر شروع کرنا چاہیئے کہ پڑھنے والا فی الفور واقعات کی دلچسپی محسوس کرنے لگے اور انہیں منتہاؤں کے درمیان تمام اقسام و مدارج آجاتے ہیں۔

۲۔ واقعات: ۔یہاں سے کہانی کا وہ جزو شروع ہوتا ہے جس پر قصہ کا دار و مدار ہو یعنی پلاٹ کا آغاز۔ جہاں مصنف بتاتا ہے کہ اس بات پر اُسکی کہانی لکھی جائیگی اور بقول سٹیونسن[1] "پھر کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے . . . . اور اس وقت ہم افراد قصہ کو بالکل محو کردیتے ہیں فسانہ کے ہیرو کو علیحدہ کرکے کہانی کے سمندر میں غوطہ زن ہوکر نئے تجربات سے شادکام ہوتے ہیں، اُس وقت اور صرف اُس وقت ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ہم کوئی داستان پڑھ رہے تھے" ذیل کی مثال اس امر کو بخوبی واضح کردیگی کہ کہانی کے آغاز میں کس طرح کوئی بات وقوع پذیر ہوسکتی ہے جو فسانہ کی دلچسپیوں کے سلسلہ کو قائم رکھ سکے:۔

> "دوسرے لمحہ میں اُس کی وفادار کنیزیں آنکھیں ملتی ہوئی اُس کے آگے حاضر تھیں۔ جو اپنی بیگم کو خلافِ معمول بیدار و مضطرب دیکھ کر گھبرا گئیں اور اُنھوں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "بیگم جہان کیا حکم ہے" بیگم موصوف نے کانپتی ہوئی آواز میں لیمپ روشن کئے جانیکا حکم دیا اور چند منٹ میں سواری کے کپڑے پہن کر بولی" میرے ساتھ چلو اور ریشم قبض اُٹھا لو۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ میرے سپاہی شب میں کیسی محافظت کرتے ہیں۔ بیدار ہیں یا سو گئے"

یہ دو تین منٹ کی بات تھی۔ اور اس مہیب تاریک شب میں جبکہ بالائی وزیرین

---

[1] اے گوسپ آون رومینس

مکانات کے ہر ایک کمرہ میں تاریکی چھا رہی تھی یہ تینوں عورتیں دھڑکتے ہُوئے دل اور کانپتے ہُوئے ہاتھ پاؤں سے آگے بڑھیں۔ اور دو منٹ کے بعد شاہی نشستگاہ کے اس کمرہ میں پہنچیں جس کی شمالی دیوار میں ایک چھوٹے جنوب رویہ کمرہ میں شاہی تاج اور کُرسی بند تھی۔ اس کمرہ کے دروازہ میں مضبوط اسپات کے کیواڑ تھے۔ جن پر رنگ برنگ بیل بوٹے بنے ہُوئے تھے۔ کمرہ کے دروازہ پر پردہ پڑا تھا۔ زہرہ بیگم نے عجلت اور اضطراب کے ساتھ پردہ ہٹایا اور اپنی جیب میں چابیوں کا گُچھا نکالنے کے لئے ہاتھ ڈالا۔ مگر اُسی لمحہ میں اُس کے مُنہ سے چیخ نکلی اُدھر بیرونی دروازہ کے سنتریوں میں تہلکہ پڑ گیا اور اُنہوں نے چلانا شروع کیا" کون۔ کون۔ چور۔ بھاگو۔ بھاگو"

زہرہ بیگم حالت اضطراب و یاس میں کمرہ کے دروازہ پر گر گئی۔ کنیزوں نے اُسے بآہستگی اُٹھایا اور ایک کنیز نے لالٹین کی روشنی دروازہ کے آئینوں سے باہر پہنچا کر پہرہ دار سے کہا" بیگم جہاں جواہر خانہ کا ملاحظہ کر رہی ہیں۔ کوئی بات نہیں چلاؤ مت" +

مگر اسی لمحہ میں زہرا بیگم اپنے منہ پر نقاب درست کر کے آگے بڑھی اور غضبناک آواز میں بولی" سنتریو۔ تمہارے چوکی پہرے سے کیا فائدہ۔ جواہر خانہ لُٹ گیا قفل ٹوٹا پڑا ہے۔ شاہی تاج اور کُرسی ندارد۔ میں لُٹ گئی۔ کروڑوں روپیہ پر پانی پھر گیا[1]۔ اسی لمحہ میں بیگم نے حُکم دیا" تم لوگوں میں سے کوئی باہر نہ جانے پائے۔ یکلخت بندوقیں فائر کرو۔ بارک کے سپاہیوں کو جگا دو"

پھر دوسری طرف مُنہ پھیر کر اپنی ایک کنیز سے کہا" تو زہر یر فوراً ٹیلیفون پر جا مولوی وہاج الدین صاحب اور سیکرٹری کو طلب کر۔ جلدی۔ جلدی۔ میری رُوح کانپ رہی ہے"

اُدھر ہر ہائنس اپنی پیشانی پکڑ کر مکلّف قالینوں کے نیچے گر گئی اور پٹاخ پٹاخ۔ دہام دہام۔ سینکڑوں فائر بیاپے تمام وادی جہانپورہ میں ہلچل ڈالنے لگے" +

ہمارا تمام زور قلم اس بات پر صرف ہونا چاہیئے کہ ہم کہانی کو ایسے طور پر لکھیں۔ کہ وہ

---

[1] واقعہ ہائلہ

من وعن سچ معلوم ہو بلکہ ہماری تمام کوششیں اُسے تمثیلی بنانے میں صرف ہونی چاہئیں کسی واقعہ کو اس طور پر قلمبند کرنے کے لئے کہ وہ بالکل صحیح معلوم ہو یہ بات کبھی نظرانداز نہ ہونی چاہیئے کہ ہم ایک فسانہ لکھ رہے ہیں نہ کہ کوئی طبعی مسئلہ۔ جب ڈارون نے اس امر کا فیصلہ کرنا چاہا کہ اُس کے دو پودوں میں سے کس نے زیادہ بیج پیدا کئے وہ اُس وقت تک مطمئن نہ ہو سکا جب تک کہ اُس نے بیس ہزار بیج گن نہ لئے۔ یقیناً ہر دفعہ ایسی سعئ لاحاصل ایک فسانہ نگار کو اُس کے عروجِ کمال سے بہت جلد تحت الثرا ئے میں پھینک دیگی۔

۳۔ جوش یا حرکت۔ ہر ایک فسانہ نگار کا منتہائے خیال قارئین کے دل پر ایک خاص اثر پیدا کرنا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اثر محبت کے ذریعہ ہو۔ غم و غصہ کے ذریعہ یا حسد و رشک۔ خوف و ہراس، جذبۂ انتقام۔ جرات و مردانگی۔ ندامت و شرمندگی۔ دلسوزی و دل برداشتگی یا مسرت و شادمانی کے ذریعہ ہو۔ اور جس فسانہ میں کسی قسم کا جوش یا حرکت نہ ہو میں اُسے ایک پیکرِ بے جان سے تشبیہ دونگا۔ بالزک[1] اپنے ایک ناول میں ایسے "بے جان" فسانوں کی حقیقت آشکارا کرتا ہُوا لکھتا ہے "خوشی و شادمانی کی کوئی تاریخ نہیں —— اور تمام روئے زمین کے فسانہ نویس اس بات کو نہایت خوبی و وضاحت سے سمجھے ہُوئے ہیں کہ جو قصّہ ظاہری و باطنی محرکات کا باعث نہ ہو وہ "زندہ لٹریچر" کی صفِ اوّلیں میں شمار ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا" جس طرح شعرا اُس شعر کو "شعریت" سے مبرّا سمجھتے ہیں جو نشتر و سناں کی طرح دل میں نہ اُتر جائے اُسی طرح ہم اُس فسانہ کو "فسانہ" نہیں کہہ سکتے جو انسانی جذبۂ دل کو متحرک نہ کر سکے۔ غالباً زبانِ اُردو میں بالخصوص ایسے قصص بہت کمیاب ہیں جو پڑھنے والے کے دل میں جوش یا حرکت پیدا کر کے اُن اثرات کے زیرِ نگیں کر دیں جہاں تک صرف آتش نگار فسانہ نویسوں کی ہی رسائی ہے اور جنکو مدِنظر رکھ کر فسانہ لکھا گیا تھا۔ علامہ[2] محمد احسان اللہ عباسی کے ایک قصہ "المجاہد" پر ڈاکٹر مظہر السبحان رئیس بردوان اظہارِ رائے کرتے ہُوئے لکھتے ہیں " واقعی المجاہد نہایت مفید کتاب ہے

[1] ایسٹھر ہے پی۔ [2] نشترِ سخن۔ تتمہ۔ صفحہ ۴۶۹

اور بہت ہی با اثر۔ جس غرض کے لئے ہے اکسیر ہے۔ اور مظلومین کے لئے پوری وکالت کرتی ہے میرے وطن میں ایک رئیس نے اپنی جائداد عورتوں کو محروم کر کے تقسیم کی تھی۔ یہ کتاب دیکھ کر وہ راہ راست پر آگئے اور لکھا ہوا قبالہ چاک کر ڈالا۔ اُس وقت سے اس کتاب کا میں بیحد قائل ہوں" اس ایک ہی قابل رشک مثال سے میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ علامہ عباسی کو انکی محنت کا معاوضہ حاصل ہو گیا +

لیکن یہ کمال اُس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ مصنف خود اپنے دل میں ایسا جذبہ پیدا نہ کرلے۔ اگر وہ دوسروں کو تہوّر و مردانگی کا سبق پڑھانا چاہتا ہے تو سب سے پہلے اپنے دل میں شجاعت و بسالت کی موجیں پیدا کرے۔ بہ خلاف اسکے اگر اُسکے دل میں کوئی سوز نہیں تو وہ دُوسروں کو کیا رُلائیگا اور اُنکے قلب پر کیا اثر پیدا کر سکیگا۔ جس طرح اُس کا دل جذبۂ انسانیت سے ناآشنا ہے اُسی طرح اُسکے افسانے جوش یا حرکت سے بیگانہ ہونگے۔ اپنے دل کا مطالعہ کرو لیکن دوسروں کے قلوب کا اندازہ کرنے میں بھی غافل نہ رہو۔ بقول پو[۱] ہمدردی سے ناآشنا وحشی و سنگین دلوں میں ایسے رگ و ریشے ہوتے ہیں جنہیں سوائے جوش یا جذبۂ دل کے دنیا کی اور کوئی چیز متحرک و متاثر نہیں کر سکتی۔ ڈکنسن نے ایک دفعہ لکھا کہ اُس نے "دی اولڈ کیوری آوسٹی شاپ" کی پُر جوش و پُر تاثیر طرز تحریر پر اپنا دل بیچ دیا تھا ــــــــ اور اُس وقت سے لے کر آجتک دُنیا اُس زبردست تصنیف پر فریفتہ ہے۔ برق[۲] کہتا ہے "وہ مغرور سر جو ہمیل محبت کے سامنے بلند رکھتے ہیں "ہمدردی" کے سامنے خم کر دیتے ہیں" بعض اوقات یہی لطیف جذبہ لال زبانوں کو طاقتِ گویائی عطا کر دیتا ہے۔ کروسس کی نسبت رولن بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اُس کا صرف ایک اکلوتا فرزند تھا اور وہ بھی گنگ زبان۔ جب سائرس نے سارڈس کو گرفتار کر لیا۔ ایک سپاہی جو کروسس کو نہیں پہچانتا تھا، قریب تھا کہ وہ بادشاہ کے سر پر ایک مہلک ضرب لگائے۔ کہ اُس نوعمر گونگے شہزادہ کے دل میں محبت و خوف کا جذبہ ایسا متحرک ہُوا۔ کہ

---

[۱] مسلمانوں میں عورتوں کے حقوق جو خلاف کتاب اللہ اور کتاب الرسول غصب کئے جا رہے ہیں اُنکے متعلق نہایت پُر اثر فسانہ ہے

[۲] دی ماسک آف دی ریڈ ڈیتھ [۳] آن دی سب لائم اینڈ بیوٹی فل [۴] این شنٹ ہسٹری۔ جلد ۴۔ فصل اول۔

باوجود لال زبان رکھنے کے وہ چلا اُٹھا "سپاہیو۔ کروسس کی جان بچالو" !!

۴۔ تعویق:۔ ہر ایک کہانی میں اور خصوصاً افسانہائے راز میں بعض مواقعات ایسے بھی آتے ہیں جہاں مصنف پڑھنے والے کو ایک عجیب شاہراہ پر لا کھڑا کرتا ہے۔ جہاں سے مختلف اطراف کو کئی ایک گذرگاہیں نکل جاتی ہیں اور قارئین کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ کونسی سڑک ہمیں منتہائے داستان کی طرف لے جائیگی۔ بعض اوقات ایک راز کے حل کرنے میں کئی آرا پیش کی جاتی ہیں مگر سوائے مصنف کے کوئی نہیں جان سکتا کہ کونسی کامیابی کے زینہ تک پہنچائیگی۔ سرقۂ جواہر یا اسی قسم کے دیگر معاملات میں ہزاروں شبہات پیدا ہوتے ہیں مگر بعد میں ہر ایک قسم کی سعیٔ پیہم بجائے خود ایک عقدۂ لاینحل بن جاتی ہے اور قصہ خواں دلی اضطراب و حیرانی سے کہتا ہے "دیکھیں اب کیا ہوتا ہے" ایسے قصص کے لئے جس میں کوئی راز کوئی عقدہ یا کوئی گرہ نہ ہو "تعویق" بے سود ہے اور جہاں ہو وہاں پڑھنے والوں کو زیادہ دیر تک حالتِ انتشار میں نہ رکھنا چاہیئے ۔

۵۔ منتہا۔ کہانی میں منتہا ایک ایسے "زینہ" کا نام ہے جو واقعات کی دلچسپیوں کے توازن کو قائم رکھتا ہوا افسانہ کی انتہائی بلندی تک پہنچا دے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ فسانہ کی دلچسپیوں سے بہرہ اندوز ہونے کے بعد جس طرح مقام انتہا تک مختلف مدارج (یعنی آغاز واقعات۔ جوش یا حرکت اور تعویق) طے کر کے پہنچے تھے اُسی طرح اُس بلندی سے نیچے اُترنے کے لئے بھی قدم بقدم آنا چاہیئے۔ داستان کو منتہا تک بتدریج پہنچا کر یکلخت خاتمہ کی طرف کود جانا ایسا ہی خطرناک ہے جیسا در و دیوار کی بلندی سے چھلانگ مارنا ۔

۶۔ انکشاف:۔ افسانہائے راز یا سراغرسانی کے پلاٹ میں قصہ نویس داستان کی دلچسپی کے تحفظ اور واقعات کو حیرت زا بنانے کے لئے نتیجہ کا پسِ پردہ رکھنا ہی بہتر خیال کرتا ہے۔ جب داستان اس منزل پر پہنچتی ہے جہاں اُن سب رازہائے سربستہ کو طشت از بام کر دیا جاتا ہے جنہیں فسانہ نگار دیدہ و دانستہ پردۂ خفا میں رکھتا چلا آیا تھا اُس منزل کا نام "انکشاف" ہے۔ مختصر افسانوں میں قصہ نویس کو واقعات ہالہ کے اردگرد ایسی خوش اسلوبی سے تار بکھیرنے چاہئیں کہ انکشاف کے وقت ایک ہی جھٹکے میں وہ تمام دارالحیرت ڈگمگاتا

ہُوا ہماری آنکھوں کے سامنے زینہ پر آرہے اور ایک ہی نظر میں سب رازوں کا انکشاف کر دے۔ اس قسم کے افسانوں میں بہ نسبت ناولوں کے راز زیادہ گنجلک یا پیچیدہ نہ ہونا چاہیئے کیونکہ جتنی پیچیدگیاں کم ہونگی اُتنا ہی انکشاف کے وقت تھوڑا وقت خرچ ہوگا۔ ایک اس قسم کا پلاٹ اختراع کرنا جس میں تا اختتام قاری کو "دم بخود" رکھا جائے اور پھر صرف چند ایک الفاظ میں اُس کا انکشاف کر دیا جائے یقیناً پُرشان جدت ہوگی۔ انگریزی میں صرف ایک ایسا ناول "دی ہاؤس آف ہیٹ" میری نظر سے گذرا ہے مگر اُردو علم ادب افسوس ابھی تک ایسی تصنیف سے محروم ہے۔ پُرہنر داستان گو کہانی کے دوران میں جابجا "انکشاف" کی بنیادیں قائم کرتا رہتا ہے مگر ایسے مواقعات پر نہایت ہوشمندی درکار ہوتی ہے ممکن ہے کہ فطرتاً دقیقہ رس نگاہیں اُس عمیق نکتہ کو فوراً تاڑ لیں جسے انکشاف کی منزل پر پہنچ کر تاریک واقعات پر آفتاب بن کر چمکنا ہے۔

۷۔ **خاتمہ**:۔ فسانہ کو ختم کرنے کے لئے اپنی ذہانت طبع سے کام لینا چاہیئے۔ کیونکہ داستان کا اختتام مختلف طبائع پر منحصر ہے۔ بعض فسانہ نویس اُس خوش نصیب جوڑے کا خوشی وخرمی سے ہمیشہ کے لئے یکجا ہونا ہی خاتمہ تصوّر کرتے ہیں۔ بعض افرادِ قصہ کو ہوا میں معلق چھوڑ کر رخصت ہو جانا پسند کرتے ہیں اور بعض ایسے مبہم اور متعسر طریق سے ختم کرتے ہیں کہ فسانہ کی سب دلچسپی زائل ہو جاتی ہے عموماً بہت سی کہانیوں میں صرف چند ایک جملے کہانی کو کامیاب خاتمہ پر پہنچانے کے لئے کافی ہیں۔

مندرجہ ذیل شکل سے فسانہ کے سب بیان کردہ مدارج بخوبی ذہن نشین ہو سکتے ہیں:۔

انکشاف
خاتمہ
منتہا
تعویق
جوش یا حرکت
واقعات
آغاز
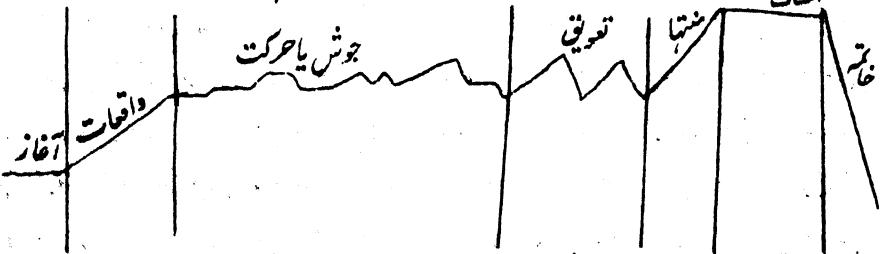
سطورِ مندرجۂ بالا میں کسی جگہ ضمناً بیان کیا گیا ہے کہ فسانہ لکھتے وقت یہ لازمی امر نہیں

کہ اُس میں اتنی وضاحت پیدا کی جائے کہ ہر چیز سچ معلوم ہونے لگے۔ گو تھ[1] اس بات کا شاکی ہے کہ ایوون ہو کے وسیع طعام خانہ میں داخل ہوتے وقت سکاٹ نے اتنی باریکیوں سے کام لیا کہ اُس کے جوتے تک کی تفصیل بھی دے دی جو یقیناً اُس عریض کمرہ کی تاریکی میں بالکل دکھائی نہ دے سکتے تھے۔ اسی طرح لاہور کے ایک فسانہ نویس نے اپنے ایک قصہ "عورت کی لاش" میں کئی ایک فروگذاشتوں کا اظہار کیا ہے جس کی نسبت اُن کی رائے ہے کہ "سوائے اسمائے افرادِ قصہ کے اور کوئی واقعہ فرضی نہیں اور اُس میں شاید تخیل کی کم از کم آمیزش کو بھی روا نہیں رکھا گیا" قصہ کا ماحصل مندرجہ ذیل ہے:۔

"۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کی شام کو چھ بج کر ۵ منٹ پر انارکلی کے تھانہ میں ٹیلیفون پر یہ اطلاع پہنچی کہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں ایک لکڑی کے بکس میں کسی عورت کی لاش پائی گئی ہے۔ تھانہ سے انسپکٹر بمعہ اپنے ایک سب انسپکٹر کے موقع واردات پر پہنچے۔ بکس کا تختہ اُٹھا کر دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ وہ ۲۴-۲۵ سالہ نوجوان عورت تھی۔ بالوں میں سیندور تھا۔ ہاتھ پاؤں پر سُرمے کے بیل بوٹے بنے ہُوئے تھے۔ کانوں میں بڑے بڑے چھید تھے جو وزنی بالیوں کے بوجھ سے بڑھ گئے تھے۔ گلا کسی تیز چاقو سے کاٹا گیا تھا جسکو مٹی سے چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ عورت قوم کی پوربیا تھی۔ بکس اور لاش تھانے لائی گئی۔ لاش کی تصویر لیکر اُسے پوسٹ مارٹم کی غرض سے ہسپتال بھیج دیا گیا ــــــ"

قصہ لکھتے وقت قابل فسانہ نویس نے اس بات کو بالکل نظرانداز کر دیا کہ دسمبر کے مہینہ میں سُورج کس وقت غروب ہوتا ہے۔ ۸ دسمبر ۱۹۱۷ء کو لاہور میں آفتاب ۵ بج کر ۲۹ منٹ پر غروب ہُوا تو اس واقع کی اطلاع تھانہ میں غروب آفتاب سے قریباً ایک گھنٹہ بعد پہنچی جبکہ موقع واردات (میدان گھوڑ دوڑ) پر گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا تھا۔ بدقسمتی سے اُس روز صفر المظفر ۱۳۳۶ہجری کی ۲۲ تاریخ تھی اور طلوع ماہتاب کا وقت جنتری میں ۱۲ بج کر ۳۰ منٹ کے قریب درج ہے۔ ایسی حالت میں اُس مہیب تاریک شب میں موقع واردات

[1] دی سٹڈی آف اے ناول۔ وائیٹ کومب۔

پر کسی روشنی کا بالکل ذکر نہ کرنا ایک فسانہ نویس کے نقطۂ نگاہ سے بہت بھاری فروگذاشت ہے۔ اگر بہ فرضِ محال یہ مان بھی لیا جائے کہ پولیس کے آدمیوں نے کچھ روشنی بہم پہنچائی تھی (جس کا اظہار قطعاً لازمی تھا) تو لاش کا صندوق میں پڑے ہُوئے ایسی باریک بینی سے لالٹین کی دھندلی روشنی میں معائنہ ہوجانا امر محال معلوم ہوتا ہے اور پھر لاش کو تھانہ میں لاکر رات کے وقت اُس کا فوٹو لینا بھی قرینِ قیاس نہیں۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ فسانہ میں معمولی فروگذاشتوں سے جو عام طور پر ناگزیر ہوتی ہیں ضرور قطع نظر کرلینی چاہیئے مگر جب یہ بیان کیا گیا ہو کہ قصہ کا پلاٹ واقعاتِ اصلیہ پر مبنی ہے تو فسانہ نویس کو ایسی فروگذاشتوں کا ضرور خیال رکھنا چاہیئے +

مجھ سے بار ہا یہ سوال کیا گیا ہے کہ آیا قصہ نویس پیدا ہوتا ہے یا اکتساب سے بھی کامل ہو سکتا ہے؟ میرا خیال ہے دونو۔ لیکن صرف ذکاوت طبع ہی پر قانع ہونا درست نہیں۔ قابلیت + (جمع) تربیت بہترین فسانہ نگار بنا دیتی ہے۔ مارک ٹوین[1] جیسا فسانہ نویس اپنے ایک نوجوان دوست کو اس امر پر نصیحت کرتا ہُوا لکھتا ہے "دنیاداروں کی کامیابی کیلئے ایک غیر مرقوم قانون ہے اور تمہاری ہمشیرہ کو اس قانون کے سامنے گردن خم کرنی چاہیئے مختصراً وہ قانون ہے۔

(۱)۔ کوئی ملازمت بغیر اُمیدواری کے نہیں۔

(۲)۔ امیدوار کے لئے کوئی تنخواہ نہیں۔

اور یہی قانون اُس ادنٰے سپاہی کی راہ میں بھی سدِ سکندری کی طرح حائل ہے جو بغیر بارود کی بُو سونگھے جرنیل بن جانے کی موہوم اُمید پر جی رہا ہو۔ اور یہ ہر اُس شخص کے راستہ میں حائل ہوتا ہے (اور اُسے حائل ہونا چاہیئے) جو ملازمت اور تنخواہ کا مطالبہ کرتا ہے بغیر امیدواری کئے اور بغیر اس بات کو ثابت کئے کہ وہ اس ملازمت کے ہر طرح قابل ہے" +

کیسے اولوالعزم ہیں دنیائے مغرب کے لوگ۔ کتنے بلند ہیں اُنکے حوصلے اور کس قدر مستحکم ہیں اُنکے ارادے۔ ایک[2] نو عمر لڑکی نے ایک فسانہ میں اپنے جذبات قلمبند کرکے

---

[1] رائیٹنگ دی شارٹ سٹوری صفحہ ۳۱۵ [2] دی مارٹ آف سٹوری رائیٹنگ صفحہ ۳ +

کسی بلند پایہ رسالہ میں چھپنے کے لئے بھیجے تو ایڈیٹر نے لڑکی کے باپ کو (جو اُسکا دوست تھا) وہ معصومیت سے لبریز پریشان خیالات کا مسودہ دیکر کہا "اپنی لڑکی کو نصیحت کرو کہ وہ فسانہ نویسی کا خیال چھوڑ دے کیونکہ اُس کے کسی فقرہ سے بھی ہونہاری مترشح نہیں ہوتی" لیکن اُس کمسن لڑکی نے جواب دیا "ابا میں لکھوں گی اور اس وقت تک لکھونگی جب تک کہ اس فن میں کامل ہوجاؤں۔ کسی جریدہ کے مدیر کا میرا فسانہ لاکھ بار واپس کرنا بھی میرا حوصلہ پست نہیں کر سکتا" اور کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ چند ہی سال بعد وہی ایڈیٹر اُس نوجوان خاتون کے افسانوں کو اپنے رسالہ کے صفحات کی زینت سمجھتا تھا +

میرا یقین ہے کہ ہندوستان کی خاک پاک بھی ایسے فسانہ نگار پیدا کرسکتی ہے اگر اُن کی طرف توجہ کی جائے۔ مجھے یہ معلوم کرکے افسوس ہُوا کہ مدیران رسائل تین روپے سے پانچ دس روپے تک کہانیوں کا معاوضہ دیتے ہیں۔ کس قدر مقام افسوس ہے کہ ایک معمولی بڑھئی۔ مزدور اور معمار تو اپنی محنت کا صلہ اچھے داموں میں وصول کرلے۔ اور وہ مصنف جو راتوں کی نیند حرام کرکے جب کہ پڑھنے والے بستر استراحت پر کروٹیں بدل بدل کر گہری نیند میں غرق ہوتے ہیں، دماغ سوزی کرکے علم ادب کی شیرینیوں میں معتدبہ اضافہ کرتا ہے اُس کا معاوضہ کس قدر تنگ دلی سے عطا کیا جاتا ہے۔ جسکا نتیجہ بقول ایک مذاق پسند شخصیت یہ ہے کہ "موجودہ لٹریچر بھُس کے بھاؤ بھی مہنگا ہے" جو زیادہ تر مدیران جرائد کا پیدا کردہ ہے جو قلیل اُجرت پر ایسے فسانے تلاش کرتے ہیں جن میں نہ واقفیت ہو نہ تخیل۔ غیر متین و غیر مؤثر ہونے کے ساتھ ہی ان میں نہ جدت ہو نہ جاذبیت۔ برعکس اس کے "دی سیٹرڈے ایوننگ پوسٹ" جس کی ہفتہ وار تعدادِ اشاعت ۲۰ لاکھ سے زائد ہے پندرہ سو روپیہ فی مختصر فسانہ سے شاذونادر ہی کم دیتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ان قدر افزائیوں کا کیا نتیجہ نکلا؟ اس کا ظہور "اِنّو سنٹس ابروڈ" اور "لٹل وومین" میں ہوا جنہیں نئی دنیا کی "غیر فانی" کہانیاں کہا جاتا ہے۔ اُن کے مصنفین اگرچہ اس دُنیا سے رحلت کرچکے ہیں مگر بے شمار آدمی ہر سال زائرین جیسے جوش و خروش

سلہ ہاؤ ٹو رائیٹ

کے ساتھ ابھی تک اُن مکانوں کو دلی عقیدت مندی سے دیکھنے جاتے ہیں جن میں وہ مصنفین رہا کرتے تھے اور جہاں وہ کہانیاں لکھی گئی تھیں۔ ذرا ہندوستان کی کس مپرسی بھی ملاحظہ کیجئے جہاں کے اخبار نویس بجائے اس کے کہ کسی کی حوصلہ افزائی کریں اُن کی تصنیفات پر اس برہمی اور اس بغض سے نکتہ چینی کرتے ہیں گویا قدیم عداوت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ بالکل درست ہے کہ ذلیل لٹریچر کو فنا کرنے کے لئے تنقید سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں لیکن ایسے مہلک ہتھیار کو استعمال کرنے والا بھی نہایت مشاق و تجربہ کار آدمی ہونا چاہیئے میں اس امر کے باور کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مولانا راشد الخیری کی تصنیف جدید "سمرنا کا چاند" اُس انداز خصوصی کے ساتھ نہیں لکھی گئی جس طرح کہ اُن کی دوسری تصانیف شام غم و صبح زندگی وغیرہ۔ مگر جس طریق پر ایک روزانہ اخبار مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۲۲ء میں اُس پر نظر تنقید ڈالی گئی ہے اور جس بلند آہنگی سے اُس کے معائب کا صور پھونکا گیا ہے وہ یقیناً قابل تحسین نہیں کیونکہ فسانہ کے محاسن بالکل نظر انداز کر کے تنقید کا فرض ادا کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ نقاد کو مولانا سے کوئی خاص عناد ہے۔

آخر میں مجھے ہونہار فسانہ نویسوں سے یہ درخواست کرنی ہے کہ وہ اپنی ذہانت طبع کا ثبوت متحرک تصاویر کے ڈرامے لکھنے میں پیش کریں جن کی اس ملک میں دن بدن مانگ بڑھ رہی ہے اور جن پر نہایت معقول معاوضہ حاصل ہو سکتا ہے میں اس فن پر انشاءاللہ کسی آئندہ وقت میں مفصل بحث کرونگا۔ اگرچہ اس مضمون پر لکھنے کے لئے بہت کچھ باقی رہ گیا ہے مگر "الاطناب مُمِل" کے خطرہ سے آگاہ ہوں اور اس لئے اس سلسلہ کو ختم کرنا ہی مناسب سمجھتا ہوں۔

محمد ضیاء الدین شمسی

اس مضمون کے کسی گذشتہ نمبر میں "مطالعۂ بدون استمداد غیر" چھپ گیا ہے اسکی بجائے "مطالعۂ نفس" تصور کرنا چاہیئے ۱۲

زکریا کی عروسی

زکریا اپنے تئیں قبیلہ قریش سے بتایا کرتا تھا۔ اور اپنے عربی النسل ہونے پر اسے ایسا ہی فخر تھا۔ جیسے آریہ ورت کے برہمنوں یا بخارا کے سیدوں کو اپنی نجابت پر۔ لیکن اس قبیلے کی چند پشتیں اسلام آباد میں گذری تھیں اور کشمیر کے اصلی باشندوں میں کھپنے کی وجہ سے اس کا رنگ و روغن چشم و بینی اور سنہری بال اطالوی لوگوں کی مانند تھے۔ شاید اسی نسبت سے وہ یورپین سوسائٹی اور ادبی دنیا میں زکریا کے نام سے مشہور تھا۔ ورنہ اسکے تمام رشتہ داروں نے جن سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا۔ بنی ہاشم کے نام آپس میں بانٹ رکھے تھے زکریا کی شکل و شباہت۔ لب و لہجہ اور روانئ زبان سے ظاہر بین لوگوں کو اس کے انگریز ہونے کا شبہ ہوتا تھا اسے بھی اپنی زباندانی کے ناز کے ساتھ عالم فریبی میں مزا ملتا تھا۔ چنانچہ کالج میں داخل ہوتے ہی اس نے مکمل انگریزی لباس اختیار کر لیا اور پابندی اوقات کے ساتھ دن میں دو بار موچھوں کو صاف کرنے کی اس نے قسم کھالی تھی۔ انگریزی میں تو وہ اہل زبان کی طرح مضامین لکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اردو میں بھی دو چار ایڈیٹروں کو اپنے پیچھے لگائے رکھتا تھا۔

زکریا کے دوست تقریباً سب کے سب یکساں سکون سے بیزار ہنگامہ خیز زندگی کے دلدادہ تھے۔ شعیب گرمی کی تعطیلیں شملہ کی پہاڑیوں میں گذارنا چاہتا تھا۔ جہاں سے اسے شہباز اور حمید الدین متواتر شکار اور سیاحت کی تحریص دلا کر اپنے پاس بلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس چار یاری میں کوہ پیمائی کے ارادے سے پروگرام مرتب ہو رہا تھا کہ زکریا نے شرکت سے انکار کر دیا اور کہا کہ اگر مدعا ہنگامہ خیزی ہی ہے۔ تو میرے لئے پشاور کی زندگی میں کافی مواد دلچسپی کا ملجاتا ہے۔ میں اپنی مصروفیتوں کو آوارہ گردی پر قربان نہیں کر سکتا۔

چنانچہ زکریا کی پشاوری مصروفیتوں کا جو علم ہمیں فسانہ باف راویوں کی زبانی ہوتا رہا ہے اس میں سے فقط ایک شب کی سرگذشت نمونہ کے طور پر قلمبند کی جاتی ہے۔

ایک روز زکریا ٹہلتا ہوا پرانی چھاؤنی کے صدر بازار تک پہنچ گیا۔ واپسی پر چونکہ

تاریکی پھیلتی جاتی تھی۔ اس لئے وہ تیز رفتاری کی حالت میں دھیمی سروں میں اپنی تازہ فارسی غزل گا رہا تھا۔ لب سڑک ایک مکان سے تیز روشنی سڑک پر پڑ رہی تھی اور باہر برآمدے میں ایک روسی عورت استرخانی ٹوپی سر پر رکھے اور اودے رنگ کا ریشمی چینا کوٹ پہنے ٹہل رہی تھی۔ جونہی زکریا نیچے سڑک پر سے گذرا وہ عورت بے تابانہ برآمدے میں نکل کر زکریا کے استقبال کو بڑھی اور اشتیاق اور گھبراہٹ کی حالت میں اس نے زکریا کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیکر کہا "آخر تم پہنچ گئے" .... "اوہ معاف کرنا مجھے غلطی ہوئی میں آپ کو پہچان نہیں سکی"۔ زکریا نے ٹوپی اتار کر گردن کے اشارے سے سلام کیا اور آگے چلدیا لیکن پھر اسے خیال آیا۔ کہ شاید یہیں اسے کوئی ایسا واقعہ پیش آئے جو اس کی یکساں زندگی میں دلچسپی کا باعث ہو۔ عورت حسین بھی تھی اور پریشانی اس پر مستزاد تھی۔ جس سے اس کی شربتی آنکھوں میں آتشیں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ زکریا نے دو قدم پیچھے مڑ کر کہا "میڈم۔ کیا مجھے آپکی خدمت کا شرف حاصل ہو سکتا ہے"؟

اسکی تیز آنکھوں سے امید کا ایک شرارہ نکلتا ہوا معلوم ہوا۔ جو زکریا کو مستعد کرنے کے لئے کافی تھا۔ "اگر آپ گوارا کریں"

"مجھ پر آپ کلی اعتماد رکھیں"

"کمرے میں تشریف لے چلیں تو بتاؤں"

چبوترے پر چڑھ کر برآمدے کے دائیں ہاتھ کو سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے ہی زکریا کو معلوم ہوا کہ تھوڑی دیر میں اس کمرے میں کئی آدمی اس نووارد روسی خاتون کی میزبانی کا فخر حاصل کرینگے۔ کیا مجھے بھی انہیں میں ایک ناخواندہ مہمان کی حیثیت میں رہنا ہوگا؟

"ایک لحظہ آپ توقف کریں تو میں دیکھ لوں کہ کوئی اجنبی ہماری باتیں نہ سن سکے"

اب زکریا کے دل میں پہلی دفعہ ہراس طاری ہوا کہ کہیں مجھے جال میں پھنسا کر تو یہاں نہیں لایا گیا۔ کیونکہ سرحدی اضلاع میں روزمرہ کے حادثات میں چلتے پھرتے آدمی کا ہمیشہ کے لئے سوسائٹی سے غائب ہو جانا کوئی عجیب بات نہ تھی۔ لیکن پھر اسے خیال آیا کہ میرے پاس سوائے سگریٹ کیس پائپ اور وزیٹنگ کارڈ کے اور کیا ہے۔

جس کے لئے مجھے کوئی آزار پہنچائے۔ میری جان ایسی نادر نہیں کہ اسکے بدلے کسی کو کچھ تاوان ملنے کی بھی اُمید ہو۔ اور پھر میں تو خود تلاش ہنگامہ میں یہاں آیا ہوں۔ اس سے بڑھ کر اور عجیب موقعہ انسانیت کے مطالعہ کا کیا مل سکتا ہے۔

"آپ اگر میرے ساتھ اوپر تشریف لے چلیں تو میں زیادہ اچھی طرح اپنی حالت بیان کرسکونگی۔ لیکن آہستہ قدم آیئے تاکہ میرے ملازمین کو پتہ نہ لگے کہ آپ میرے ہمراہ ہیں"

زکریا چلنے کو ساتھ ہولیا۔ لیکن اب اس کا دل ایسی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ کہ اسے شُبہ پیدا ہُوا۔ کہ کہیں میری قلبی حرکت چہرے سے تو ظاہر نہیں ہوتی۔ بہر حال وہ دبے پاؤں چٹائی دار سیڑھیوں سے گذر کر ایک بڑے ملاقی کمرے میں داخل ہُوا۔ کمرہ ایسی خوش سلیقگی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ کہ زکریا کو شُبہ نہیں ہو سکتا تھا۔ کہ اس عشرت کدے میں کوئی خلاف معمول حادثہ واقع ہو سکتا ہے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک مخملی سوفے پر پڑی۔ جس پر ایک آدمی بے تحاشا لیٹا ہُوا خراٹے لے رہا تھا۔

عورت نے ناٹک کے انداز میں ہاتھ پھیلا کر اور رونی صورت بنا کر کہا۔ "دیکھئے یہ آپکے سامنے میرا خاوند پڑا ہے۔ اس کی بدمستی نے آبرو خاک میں ملا دی ہے"۔ زکریا نے تعجب سے دیکھ کر اپنے دل میں کہا "تو کیا مجھے اپنے شرابی خاوند کی ملاقات کے لئے یہاں بلایا گیا ہے"

اس نے سرد مہری اور متانت سے جواب دیا "معلوم ہوتا ہے۔ آپکا خاوند بہت بے اعتدال ہے۔ مجھے بتائیں میں آپکی کیا مدد کر سکتا ہوں"

عورت نے ملتجی نگاہوں سے اپنے دونوں ہاتھ زکریا کے شانوں پر رکھ کر بصد الحاح کہا۔ "کیا آپکو خیال ہے۔ کہ میں نے آپ کو بے سود زحمت دی ہے۔ آپ پہلے میری دُکھ بھری کہانی تو سُن لیں۔ تین سال ہُوئے میں نے ہارڈنگ کے ساتھ طہران میں اپنے خاندان کی خلاف مرضی شادی کی تھی۔ میرے چچا نے جو روس کی تباہی کے بعد پشاور میں چلے آئے تھے۔ مجھے ایران سے اپنے پاس بُلا لیا۔ انکا ارادہ تھا کہ میرے والدین اور تمام رشتہ داروں کو جو آجکل یہاں ہیں۔ کہہ سُن کر میرا قصور معاف کرا دیں۔ چنانچہ آج شام اُنہوں نے سب کو دعوت پر میرے خاوند سے ملانے کے لئے بُلایا ہے۔ آج تیسرے پہر تک میرا

پیارا ہارڈنگ انسان تھا۔ مگر اس وقت اس پر وحشت طاری ہے۔ کیا میں ایسے وحشی کو اپنے عزیزوں کے سامنے پیش کرونگی؟"

"میں انہیں تو درکنار اپنے ملازموں کو بھی اس ذلیل حالت سے آگاہ نہیں کرسکتی۔ وہ ضرور کہینگے کہ مجھے شرم سے ڈوب مرنا چاہیئے اور میرے عزیزوں کے چہروں پر انتقامی تبسم ہوگا۔ وہ سب کہینگے۔ ہم نہ کہتے تھے! میں اپنی شرمناک حالت کو ان کی نگاہ سے چھپانا چاہتی ہوں۔ بتایئے میں کیا کروں؟

زکریا کو مشکل پڑنے پر جھوٹ بنانے اور حکایت سازی میں کبھی دریغ نہیں ہوا۔ اس نے کہا" ہارڈنگ کو بسترے میں سلادو۔ وہ بالکل بے ہوش ہوگا۔ کہنا اچانک بیمار ہوگیا۔ اس طرح وقت گذر جائیگا۔"

"کیا وہ اوپر آکر بیمار پرسی نہ کرینگے۔ اگر میں کہوں کہ ڈاکٹر نے ملنے سے منع کیا ہے۔ تو کہینگے۔ ایسی بیماری کی حالت میں اگلے جمعہ کو وہ کراچی کا سفر کیسے کریگا۔ کیونکہ میں نے اس قضیہ کو مٹنے کے واسطے ارادہ کیا ہے کہ چار روز بعد اپنے رشتہ داروں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاؤں۔ اور اپنی شرم کو اپنے ساتھ لئے پھروں۔ میں نے ایک لڑکا ڈاکٹر کی طرف دوڑایا تھا کہ وہ آکر انہیں ہوش میں لائے۔ لیکن وہ ابھی تک نہیں لوٹا اور وقت بہت کم باقی ہے۔ میں اسی کے انتظار میں تھی۔ کہ آپ آگئے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس معاملے میں ملازموں سے اخفا کیوں کرتی ہوں۔ لہٰذا مجھے بتایئے میں کیا کروں۔ یہ کہہ کر وہ زکریا کے قدموں میں فرش پر بیٹھ گئی اور ایک انداز دلربائی کے ساتھ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لئے اور لمبے سنہری بالوں کو پیشانی پر بکھیر دیا۔ زکریا اس تھیٹریکل حرکت کو دیکھکر کچھ محظوظ ہوا اور کچھ اس کی بدگمانی میں اور اضافہ ہوا۔ کہ کہیں مجھے کسی جال میں تو نہیں پھنسایا جارہا۔ زکریا کو معلوم ہوگیا۔ کہ ایسی تیزفہم عورت کے سامنے وہ پہلے ہی اپنی پھیکی سی تدبیر بتا کر شرمندہ ہوا ہے۔ اب مزید کوشش کرنا اپنی بیوقوفی کا اظہار ہے۔ اس لئے اس نے کہا" جیسے کہو میں ہر طرح حاضر ہوں۔"

"آپ انہیں اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر تو ڈالیں۔" زکریا نے کہا بہت خوب"

اس نے ریشمی رومال اپنے کف سے نکال کر اپنے لبوں پر پھیرا اور جیب میں رکھ لیا اور پائپ کی راکھ جھاڑ کر میز پر رکھ دی اور آستین چڑھا کر لاش کو سیدھا کیا۔ ہارڈنگ کی چھوٹی سرخ رنگ کی ڈاڑھی اور لمبی مونچھیں خاک سے اٹی ہوئی تھیں۔ اس کا رنگ سُرخ اور سر کے گھونگریالے بال اُلجھے ہوئے تھے۔ کالر میں شکن پڑے تھے اور نکٹائی کالر سے اُتر کر گلے میں پھانسی کے پھندے کی طرح اُلجھی ہوئی تھی۔ واسکٹ اور قمیص کے بٹن کھلے تھے۔ اس ہیئت کذائی میں بھی وہ خوبصورت آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑی مشکل سے زکریا نے ہارڈنگ کو کھڑا کیا اور وہ دیوانوں کی طرح اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا اور پھر زور سے کھنکار کر فرش پر اوندھے مُنہ گر پڑا۔ زکریا نے اسے اپنے شانوں پر اُٹھا کر دوسرے کمرے میں چارپائی پر ڈالا اور دروازہ بند کر کے نکل آیا۔

"کمرے کو مقفل کر دینا چاہیئے۔ کہیں وہ پھر باہر نہ نکل آئیں"

زکریا حیرت زدہ عورت کے پیچھے پیچھے نیچے کمرے میں چلا گیا۔ وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ یا اللہ اب میری معلمہ مجھے کیا کہتی ہے "شاید آپ خیال کریں کہ میں آپ کو ضرورت سے زیادہ زحمت دے رہی ہوں۔ لیکن میں بالکل حواس باختہ ہوں"

زکریا تسلیم کے انداز میں جُھکا اور کرسی عورت کے سامنے رکھ کر سرو قد کھڑا رہا۔ دو منٹ سکوت کے بعد عورت بولی "کیا آپ آج دعوت کی تقریب پر میرے خاوند کی حیثیت میں شامل ہو سکتے ہیں"؟

زکریا اپنی زندگی میں کسی بات پر اچنبا ظاہر کرنا انسانی کمزوری کی دلیل سمجھا کرتا ہے مگر یہ تجویز سُن کر اچھل پڑا۔ پھر سنبھل کر بولا "لیکن اس پارٹ کو انجام تک نبھانا دشوار ہوگا۔"

"و بیفکر رہیں۔ ذرا بھی دقت نہیں ہوگی۔ ان میں سے کسی نے بھی میرے خاوند کو نہیں دیکھا۔ آپکا قد میرے خاوند کے قد کے برابر ہے۔ آپکی آنکھیں ذرا زیادہ شوخ اور ناک قدرے موٹی ہے۔ ڈاڑھی لگا کر آپ بالکل میرے خاوند کے مشابہ ہو جائینگے"

"ڈاڑھی!"

"میں اپنی ملازمہ کو ابھی آرم جی ماموں جی کی دوکان پر بھیجتی ہوں۔ وہ خسخسی داڑھی لے آئیگی۔ ابھی مہمانوں کے آنے میں آدھ گھنٹہ باقی ہے"

زکریا نے دیکھا کہ وہ اس کے جواب کی منتظر کھڑی ہے۔ لیکن اپنی زندگی میں پہلی بار زکریا کی زبان جو قینچی کی طرح چلا کرتی ہے۔ خاموش رہ گئی۔ اس نے سوچا۔ مشکلات کا متلاشی تو میں ہمیشہ رہا ہوں۔ لیکن کہیں یہ مشکل آخری نہ ہو۔ کیا یہ عورت اپنے مہمان بُلاکر ان کی تواضع کے لئے مجھے بے وقوف تو نہیں بنا رہی۔ کیونکہ اس کا ذرا سا غمزہ مجھے بھری محفل میں بے داڑھی کرسکتا ہے۔ اس وقت میری کیا حالت ہوگی۔

"خدا کے لئے آپ انکار نہ کریں۔ مجھ پر عجب وقت آپڑا ہے۔ آپ فرشتۂ رحمت بن کر آئے ہیں۔ میری دستگیری کریں تو میں ہمیشہ کے لئے شرم کی زندگی سے بچ جاؤنگی یہ مرحلہ طے ہو جائے۔ تو میں ہارڈنگ کو لے کر بغداد چلی جاؤنگی — وہاں جاکر اسے شراب پینے کا موقعہ نہیں ملیگا۔ لیکن للہ اس وقت میرے پیارے خاوند کو بے آبروئی سے بچائیے"

"میڈم میں ہر طرح حاضر ہوں"

ملازمہ داڑھی لینے گئی۔ زکریا کو ہارڈنگ کا سوٹ پہنا دیا گیا۔ اور روسی عورت نے بڑی محبت کے انداز میں اسے اپنے پاس سوفے پر بٹھا کر اس کے رخساروں پہ اپنی اُنگلیوں سے سرخ روغن ملنا شروع کیا۔ پھر داڑھی اس کے چہرہ پر مڑھ دی گئی زکریا پر جتنے عرصہ تک یہ سحر ہوتا رہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند رکھیں۔ عورت نے پُرترنم لہجہ میں اس کا شانہ ہلاکر کہا "ہنری پیارے۔ ہنری باہر مہمان آپکا انتظار کر رہے ہیں" اور یہ کہکر وہ قہقہہ لگاتی اور اپنی ایڑیوں پر ناچتی ہُوئی نیچے اُتر گئی۔

۹ بجے وہ مہمانوں کے کمرے میں داخل ہُوا۔ روسی عورت بولی "گھبراؤ نہیں میں نے سب کو کہدیا ہے۔ کہ تم شام کو اکثر دیر بعد شہر سے آتے ہو اور میرے سامنے عذر کردیتے ہو۔ کہ میں یکہ توت میں مواجبات وصول کرنے گیا تھا۔ یہ ہیں میرے چچا جوزف۔ یہ میری خالہ میریا ہیں۔ یہ میری خالہ زاد ایمیلا کیتھرائن ہیں۔ آبا نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ شاید بہت دیر

بعد آئیں۔ اس لئے ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ ہنری تم خالہ جان کو راستہ بتاؤ۔ کھانا چنا گیا ہے۔"
وہ سب دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ہنری ہارڈنگ نے بھاری بھرکم نئی خالہ میریا سے اپنے تئیں بے تکلف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے میز کے گرد نگاہ دوڑا کر اپنے دل میں کہا "اف میری بیوی کے رشتہ دار کیسے بدصورت ہیں۔ شکر ہے۔ میرا ان سے سابقہ ایک رات تک ہی ہے۔"
کھانا بافراط اور کئی قسم کا تھا اور چٹنی مربے کی زیادتی نے کھانے کو ایشیائی بنادیا تھا زکریا کو تعجب تھا کہ کھانے پر تو میری بیوی نے اس قدر اصراف اور نفاست برتی لیکن ویٹر اس نے ایسے بے تمیز رکھے ہیں۔ جو میری طرف یوں گھور رہے ہیں گویا کھا جائینگے۔
زکریا نے خالہ میریا سے کہا " یہ آدمی یا تو بالشویک سپاہی ہے یا پولیس میں رہا ہے دیکھو تو میری بیوی کی کرسی کے پیچھے کیسا تنا کھڑا ہے۔ گویا کہ پہرہ پر کھڑا کیا گیا ہے۔"
خالہ میریا یہ بات سنتے ہی اچھل پڑیں اور اس تیزی سے سانس لینے لگی کہ زکریا سمجھا اب انہیں غش آیا چاہتا ہے۔ اس نے کہا "خیر یہ تو مذاق تھا۔ لیکن فوج سے اس قدر سپاہی نکل کر آئے ہیں کہ جہاں دیکھو۔ بہرہ۔ ویٹر۔ چپڑاسی۔ سب کے سب سبکدوش شدہ فوجی سپاہی ہی نظر آتا ہے۔"
خالہ میریا نے سنبھل کر کہا "ایسے بھیانک مذاق کے رنگ میں سننے سے مجھے بہت الجھن پیدا ہوتی ہے۔"
زکریا نے بیوی کی خالہ کا خیال چھوڑ کر مہمانوں کی طرف توجہ کی تو دیکھا کہ سب لوگ بے دلی سے کھانا کھا رہے ہیں اور سب سے زیادہ پرُخور اس مجلس میں یا تو زکریا خود تھا یا اس کی نئی بیوی۔ وہ اب اپنے نئے عارضی خسر کے انتظار میں تھا۔ کیونکہ اس کی بیوی نے ایک سے زیادہ دفعہ افسوس ظاہر کیا تھا۔ کہ ابّا ابھی تک نہیں پہنچے ابھی آتے ہی ہونگے۔
زکریا نے سوچا کہ میں تو ایسا خوش نصیب نہیں کہ اس لیڈی کے خاوند بننے کی عزت مجھے دائمی میسر ہو۔ لیکن معلوم ہوتا ہے۔ میری بیوی کے رشتہ داروں نے مجھے پسند نہیں کیا

میرے بعد ہارڈنگ کی زندگی اپنی سسرال میں ضرور بے مزہ ہوگی۔

آخر خواتین ہاتھ صاف کرکے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ اور اب کمرہ تھری کیسل سگریٹ کے دھوئیں سے بھر گیا۔ زکریا کو اپنے مہمانوں سے ایسی نفرت تھی کہ اس نے زور زور سے کش لگا کر اپنے چہرے کے سامنے دھوئیں کی ایک دیوار حائل کردی۔

اسنے ابھی سگریٹ سے کھیلتے تین منٹ بھی نہیں ہوئے تھے۔ کہ ہوٹل کے ویٹر واپس کمرے میں داخل ہوئے۔ دو تو دروازہ پر ایستادہ ہوگئے اور تیسرے نے زکریا کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کہا" بحکم بادشاہ سلامت ہنری ہارڈنگ میں تمہیں جعل سازی کے جرم میں گرفتار کرتا ہوں" زکریا نے مسکرا کر کہا" شیطان تجھے یہ حوصلہ کس طرح ہوا" کیونکہ زکریا اس ڈرامے میں اپنا پارٹ خوش اسلوبی سے کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ مہمان گھبراہٹ میں کرسیوں پر گرنے لگے اور اس کے ہاتھوں میں زنجیریں ڈالدی گئیں۔

یورپین سارجنٹ نے کہا" ولیمز! میں اور "ہیبت کھاں" تو ان کو قابو میں کریں گے لیکن بوڑھا کریوال پھر چکمہ دے گیا۔ تم ذرا لیڈی صاحبہ کو حراست میں کرلو۔ ولیمز یہ سُن کر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ سارجنٹ نے پھر تحکمانہ لہجے میں کہا" ہیبت کھاں ان سب کے پتے لکھ لو۔

"صاحبان! مجھے آپ سے کچھ سروکار نہیں۔ آپ فقط اپنا پتہ دے جائیں تاکہ ممکن ہے۔ آپ کو شہادت کے لئے بلایا جائے۔

زکریا کی سسرال والے جب سب کانپتے ہوئے اپنے پتے لکھا کر رخصت ہوئے۔ تو اس نے کہا" اس ڈرامے کا اب خاتمہ ہونا چاہیئے۔ کیا واقعی آپ ہنری ہارڈنگ کو گرفتار کرنے کے لئے آئے ہیں"

"ہاں یہ ہے وارنٹ۔ نہ فقط تمہیں بلکہ تمہاری بیوی مسز ہارڈنگ اور تمہارے ساتھی کریوال کو بھی۔"

"خوب! تو میں آپ کو مطلع کرتا ہوں۔ کہ آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ ہنری ہارڈنگ اگر بھاگ نہیں گیا تو بدستور اوپر کی منزل میں اپنے بستر پر بے ہوش پڑا ہوگا۔"

"اوہ اب تم میرے قابو سے نہیں نکل سکتے۔ تم ہی اس گھر کے مالک ہو اور ہنری ہارڈنگ کے نام سے مشہور ہو۔ میرے پاس تمہاری تصویر ہے"

"کیا آپ میری ڈاڑھی زیادہ غور سے ملاحظہ کر سکتے ہیں؟"

سارجنٹ نے ڈاڑھی کھینچ لی اور کہا "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری کیفیت کا آدمی گذشتہ جرائم کی پاداش سے بچنے کے لئے مصنوعی ڈاڑھی لئے پھرے تو کیا عجب ہے"

زکریا اپنی بیگناہی پر مطمئن پولیس والوں کی ذہانت پر دل میں مسکرا رہا تھا۔

دوسرا سارجنٹ اتنے میں لیڈی کو گرفتار کر کے لے آیا اور فاتحانہ انداز میں اپنا طپنچہ میز پر رکھ کر خود تن کر کھڑا ہو گیا۔

لیڈی نے قہقہہ لگا کر کہا "واقعی پولیس نے آج تو کمال کر دکھایا۔ اصلی شکار تو مدت ہوئی۔ نکل گیا۔ آپ نے بیگناہ آدمی کو پکڑ رکھا ہے۔ آپ نے اصلی ملزم کی بیوی کو گرفتار کر لیا ہے۔ جس کا آپ کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ جب آپ بطور ویٹر کے میرے پاس آئے تھے۔ تو آپ کو یقین تھا کہ آپ ہارڈنگ اور کریوال کو نہایت سہولت سے گرفتار کر لیں گے لیکن کریوال آسانی سے آپ کے قابو میں آنے والا نہ تھا۔ وہ آپکی سازش سے واقف تھا اور اس نے ہمیں بھی مطلع کر دیا تھا" پھر زکریا کی طرف ملتجی نگاہوں سے مخاطب ہوئی۔

"میں آپکی بیش قدر امداد کے لئے ممنون اور فریب سازی کے لئے شرمسار ہوں۔ مگر میں حفظ جان کے لئے ایسا کرنے پر مجبور تھی۔ آپ کی مہربانی اور خلق سے میں اس قدر متاثر ہوئی تھی۔ کہ اگر آپ کے بغیر گذارہ چل سکتا تو میں کبھی آپ کو تکلیف نہ دیتی۔ میں اپنے دروازہ پر کھڑی اپنے پیغامبر کا بیتابی سے انتظار کر رہی تھی۔ جسے میں نے امداد مہیا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ کہ اتنے میں آپ نظر پڑے۔ آپکی شکل میرے خاوند سے اس قدر مشابہ تھی کہ بجلی کی طرح میرے دماغ میں موجودہ تدبیر روشن ہوگئی۔ پھر جو کچھ میں نے آپ سے خاوند کے بارے میں کہا۔ وہ محض سازش فریب تھی۔ میرا خاوند نشہ میں نہ تھا۔ بلکہ جب آپ نے اسے مقفل کر دیا اور آپ اس کی جگہ مہمانوں میں آ گئے۔ تو وہ پولیس کی آنکھوں میں خاک جھونک کر بھاگ گیا۔ جو لوگ یہاں میرے رشتہ دار بن کر آئے تھے۔ ان سے محض ہمارا کاروباری

تعلق ہے۔ اور انہیں میں نے بنت اس ڈرامے کے لئے تیار کیا تھا۔ بعض نے اپنا پارٹ
ایسی سنجیدگی سے کیا کہ آپ کے دل میں شاید شبہ پیدا ہوا ہو۔ میرا باپ جو آخری وقت
تک نہ پہنچا۔ حقیقت میں میرے خاوند کا دوست کریوال تھا۔ میں اس کے متعلق بےتابی
اور انتظار کا اظہار اس لئے بھی کر رہی تھی کہ مہلت پاکر دونوں ملزم پولیس کے چنگل سے
نکل جائیں اور دوسرے کریوال کو گرفتار کرنے کی ہوس نے سراغرساں ویٹروں کو بہچیل
مجلس درہم برہم کرنے سے باز رکھا۔ اب وہ دونوں پولیس کے ہاتھ سے بالکل محفوظ
ہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔ آپکا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ میرے قصور کو بخشدیں "

"میڈم میں آپ کے حیرت انگیز فسانہ باف دماغ اور ایکٹ کرنے کی قابلیت پر
آپ کو مبارکباد دیتا ہوں "

اب لیڈی نے اپنی شربتی شوخ آنکھیں حجاب سے نیچے جھکالیں اور پولیس سے
یوں مخاطب ہوئی۔

"آپ یقین کریں۔ اگر اسوقت آپکی ناحق کی زحمت کا کوئی ذمہ وار ہے۔ تو فقط میں
اس جنٹلمین کا کوئی قصور نہیں "

لیکن پولیس زکریا کو بغیر اپنا کامل اطمینان کئے کب چھوڑنے والی تھی۔ بیچارے
کو تمام رات اسی مکان میں پولیس کے پہرے میں گذارنی پڑی۔ صبح کو اس کا پتہ لکھ کر
اسے رخصت کیا گیا۔ پشاور میں رہ کر ہنگامہ کی تلاش کا یہ پہلا تجربہ تھا۔

(ماخوذ)

---

*

چمنستان

جلوۂ ربّانی

خدا کم ظرف لوگوں کو اپنا جلوہ نہیں دکھاتا! وہ جو راستی کا طالب ہے اپنے ضمیر کی آوازوں کو کان دھر کے سنتا ہے اور دوسروں کے طریقِ عبادت سے متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ اُن کی نمازیں اُسے دکھ دیتی ہیں جب تک وہ خود دست بدعا نہ ہولے" روح اپنے خلاف دادرسی کے لئے کبھی دستِ گدائی دراز نہیں کرتی + ہمارے مذہب اپنے ماننے والوں کی تعداد پر نازاں ہیں۔ جب کبھی تعداد کا ذکر فخریہ طور پر ہوتا ہے (خواہ وہ ذکر کسی پیرائے میں کیوں نہ ہو) تو گویا یہ صاف صاف اعلان کر دیا جاتا ہے کہ مذہب مٹ چکا + وہ جو خدا کو ایک شیریں مستغرق کرنے والا خیال تصور کرتا ہے کبھی مصاحبت یا غیروں کی اعانت کا خواہاں نہیں ہوتا۔ جب میں اُس خلوت میں بیٹھا ہوں تو کس کی جرأت ہے کہ اُس گھڑی میں خللِ اندازِ محبت ہو۔ جب میں انکسار سے سرشار ہوں جب میں سچی محبت سے سوزاں ہوں تو بڑے سے بڑا مصلح یا سچے سے سچا ولی کیا کہہ سکتا ہے؟

اپنی دُنیا

میں آج صبح بیدار ہو کر اپنے پُرانے اور نئے دوستوں کی محبت کے شکریہ میں دست بدعا ہو گیا" میں خدائے عزوجل کو کیوں حُسن کا پتلا نہ کہوں جب وہ مجھے ہر روز اپنی بخششوں میں اپنی حُسن آفرینی کے کرشمے دکھاتا رہتا ہے! میں بزم آرائی سے متنفر ہوں، میں خاموشی اور تنہائی کا دلدادہ ہوں۔ تاہم میں ایسا قدرناشناس اور خود کار نہیں کہ میرے دریچے کے سامنے جو عقلمند۔ جو شکیل اور جو نیک سرشت لوگ گذرتے رہتے ہیں اُن کی خردمندی اور عالی وقاری کو قدر و منزلت کی نگاہوں سے نہ دیکھوں۔

جو میری سنتا ہے اور مجھے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہ میرا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صرف میرا ہو جاتا ہے!

اور نہ قدرت کچھ ایسی کم مایہ ہے بلکہ وہ بارہا مجھے یہ خوشیاں دیتی ہے اور اس طرح ہم اک ایسا حلقۂ معاشرت قائم کر لیتے ہیں جو تعلقات کا ایک وسیع دائرہ بن جاتا ہے۔ اور جوں جوں یہ نت نئے خیالات یکے بعد دیگرے ہمارے دل میں رو نما ہونگے ہم بتدریج اپنے تئیں اک اپنی بنائی ہوئی نئی دنیا میں پائیں گے۔ ہم اک پرانی اور دقیانوسی دنیا میں اجنبی اور مسافر بن کر آوارہ و سرگرداں نہ رہیں گے!!

قُدرت اور فطرت

قدرت ہماری فطرت کے بہترین جزد کو پیاری ہے! وہ ہمیں پیاری ہے کیونکہ وہ خدا کی بستی ہے اگرچہ یا غالباً اس لئے کہ رہنے والا اس میں کوئی نہیں + کیا دنیا میں کوئی شے غروبِ آفتاب کی خوبی کو پہنچ سکتی ہے؟ البتہ اس کے نظارے کے لئے سچے انسانوں کی ضرورت ہے! اور بلاشبہ قدرت کا حسن ہمیشہ غیر حقیقی اور مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ جب تک اس کے مناظر میں ایسی ہستیاں موجود نہ ہوں جو اس کی سی نیکی رکھتی ہوں۔ اگر نیک آدمی ہماری دنیا میں کثرت سے ہوں تو قدرت میں یہ خلا کبھی محسوس نہ ہو!

جادۂ زرّیں

آہ! کس قدر شیریں اور کیف آور ہوتی ہے وہ گھڑی جب دن کی روشنی مدھم پڑ جاتی ہے اور مہرِ جہانتاب کی سنہری کرنیں بحرِ خاموش کی ساکن سطح پر اپنا الوداعی رقص کرتی ہوئی غائب ہو جاتی ہیں! کہ اس وقت گئے گذرے دنوں کے پیارے خواب دل میں ننھی لہروں کی طرح اٹھتے ہیں اور شام کے اس خاموش دھندلکے میں میں تجھے چپکے چپکے یاد کیا کرتا ہوں!! —— اور جب میں اس ضیاء آخریں کو جو مغربِ سوزاں کی سمت سکوں پذیر موجوں سے کھیلتی ہے ٹکٹکی باندھے دیکھتا ہوں تو میرا غمگین دل شعاعوں

کے اُس جادۂ زریں کو طے کرنے کی اُمنگ سے لبریز ہو جاتا ہے کہ شاید اسی طرح وہ کسی درخشاں جزیرے میں پہنچ کر سکون و اطمینان کی نعمت کو پالے! آہ!

خاموشی

جُملۂ قدیم کہتا ہے ,, خاموش! کہ خدا بھی خاموش ہے!'' خاموشی شخصیت کو حل کر دیتی ہے اور ہمیں عظمت اور ہمہ گیری سے دوچار کر دیتی ہے!

پرندہ گیت گاتا ہے!

پرندہ گیت گاتا ہے شب و روز
کہ ہوتا کاش میں ابرِ گہر بار

اُدھر ہے ابر کو ہر دم یہ رونا
پرندوں کی سی ہوتی میری چہکار

نہیں ہے مطمئن ہستی سے کوئی
ہر اک دل زندگانی سے ہے بیزار

کسی کو کب ملی دُنیا میں تسکین
گُلوں کے دل میں بھی چبھتا رہا خار

کِسی کے حال کو سمجھا نہ کوئی
ہیں سب اپنے خیالوں میں گرفتار

ہر اک کو دہر کے عشرت کدے میں
نظر آتی ہے اپنی حالتِ زار

نغمات

مجُھے حکم دے کہ میں اپنے پھلوں کو خوشنما ٹوکریوں میں اکٹھا کر کے تیرے صحن میں لے آؤں اگرچہ اُن میں کچھُ تو ضائع ہو چکے ہیں اور کچھُ ہنوز خام ہیں! کیونکہ بہار اپنی پختگی کے ساتھ بوجھل ہو چلی ہے اور سائے میں چرواہے کی بانسری کی غم بھری آواز سُنائی دیتی ہے۔

مجُھے حُکم دے کہ میں دریا پر اپنے بادبان کو پھیلا دوں، بہار کی ہوائیں غصّے سے بھری ہُوئی ننھی لہروں سے پُر شکایت آوازیں نکال رہی ہیں'' چمن اپنا سارا خرمن لُٹا چُکا ہے اور شام کی مضمحل ساعت میں غروبِ آفتاب کے وقت اُس ساحل پر تیرے

گھر سے ندا آرہی ہے !

بہار کا تیوہار کیا صرف تازہ شگوفوں ہی کیواسطے ہے؟ کیا وہ مُرجھائے ہُوئے پتّوں اور پژمُردہ پھُولوں کے لئے نہیں ؟ کیا سمندر کا گیت صرف اُٹھتی ہُوئی موجوں ہی کا ہم نوا ہے ؟ کیا وہ گرنے والی لہروں کے ساتھ نغمہ زن نہیں ہوتا ؟ ؟

قالین ہیروں سے پرویا ہُوا ہے جہاں میرا بادشاہ ایستادہ ہے لیکن کئی مٹی کے ڈھیلے بھی صبر کے ساتھ اس انتظار میں ہیں کہ وہ اُن کو اپنے پاؤں سے چھُودے "

صرف چند ہی عاقل و فرزانہ میرے آقا کے پاس حقِ نشست رکھتے ہیں لیکن نادانوں کو اُس نے اپنے پہلو میں جگہ دی ہے اور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا خادم بنالیا ہے ؟

جہاں رستے بنائے جاتے ہیں میں اپنا رستہ بھُول جاتا ہوں ؛ وسیع پانیوں میں، نیلے آسمان میں کہیں کسی رستے کا نشان تک بھی نہیں۔ راہ تو پرندوں کے پروں، تاروں کی روشنیوں، جاتی بہاروں کے پھُولوں سے مستور ہے اور میں اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ کیا تیرے خُون میں اُس اَن دیکھی راہ کی پہچان موجود ہے ؟

اے میرے دل ! تُو اپنی کشتی ڈال دے اور اُنہیں لنگر انداز رہنے دے جو رہیں ! کیونکہ تیرا نام آسمانِ سحر میں پُکارا جاچُکا ہے تُو کسی کا انتظار نہ کر؛ کلی رات اور شبنم کو چاہتی ہے لیکن شگفتہ پھول آزادیٔ نور کا طالب ہے۔ اے میرے دل ! تُو اپنے قبضۂ حیات کو توڑ دے اور باہر نکل آ !

گلچیں

نغمۂ محبت

شام کے پُرسکون گھنٹوں میں اُس نے اپنے "ستار" کے تاروں کو ایک خفیف سی جنبش دی، فضائے خاموش میں ایک اضطراری کیفیت پیدا ہوگئی، اور اُسکے دلکش نغموں کی آوازیں ہوا کے دامن سے کھیلتی ہُوئی میری پژمردہ تمناؤں کو چھیڑنے لگیں کائنات کا ذرہ ذرہ خاموش ہوگیا اور نسیم سحر کے جھونکے عالم بے اختیاری میں اُسکی صبر سوز آواز پر نثار ہونے لگے وہ گاتی رہی اور میری روح کیف ترنم سے مست ہوتی رہی،

وہ خاموش ہوگئی اور اُس کے خاموش ہوتے ہی میں بے چین

بُلبل نے ترانۂ دل آویز چھیڑا لیکن میں نے اس سے کہدیا کہ تیری نغمہ سرائی میری روح کو خوش نہیں کرسکتی۔ کوئل اپنے حیات سوز لہجے میں دل کھول کر کوکی، لیکن میں نے کہا، یہ مجھے پسند نہیں،

مور نے جھنکار لی، اسکی آواز فضائے بسیط اور پہاڑیوں کے نشیب و فراز میں دیر تک گونجتی رہی، لیکن میں نے اُسے بھی ناپسند کیا اور اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ شاید وہ اپنی نرم و نازک اُنگلیوں کو حرکت دیکر ستار کے زریں تاروں کو چھیڑے، اور اُسکے ترنم ریز نغمے ایک مرتبہ پھر فضا میں ہلچل ڈالدیں۔۔۔ لیکن آہ وہ اپنے سر کو جھکائے خاموش ہی رہی،

دفعتاً اُس نے اپنے ستار کو پھر چھیڑا، کائنات کانپنے لگی، نغمۂ مغموم نے ساز کا ساتھ دیا، سوز نے درد اور درد نے تاثیر پیدا کی اور گاتے گاتے اُسکی آنکھیں پُرنم ہوگئیں، آنکھوں کا کاجل آنسوؤں کے ساتھ مل کر اُس کے گُلابی رُخساروں پر پھیل گیا، اور وہ اُسی دردآمیز لہجے میں گاتی رہی اور میرا دل اُس کی آنکھوں کے ساتھ روتا رہا۔

یہانتک کہ تارے سپیدۂ سحر میں ڈوب گئے اور آسمان صاف، آفتاب طلوع ہُوا، سُنہری کرنیں بڑھیں اور ہلکی ہلکی روشنی جنگل کے اونچے اونچے درختوں اور شہر کے بلند میناروں پر پڑنے لگی، چڑیوں نے اپنے آشیانوں سے سر نکالے اور اُڑ گئیں لیکن وہ اُسی طرح گاتی رہی،

میں سُنتا رہا اور سُنتے سُنتے بیہوش ہوگیا، جب مجھے ہوش آیا تو وہاں ایک خاموشی چھائی ہُوئی تھی اور وہ نغمہ پرست "جوگن" اپنا ستار لیکر جا چُکی تھی *

سید ابو محمد ثاقب کانپوری

کرتے ہیں سر جھکا کر سجدہ حریم دل کو
گھر خوب جانتے ہیں اہل نیاز تیرا

اُٹھتا نہیں نظر سے جب تک حجاب ہستی
کھلتا نہیں کسی پر سربستہ راز تیرا

پیش نظر ہو ندرت خود شاہد حقیقی
پردہ اگر اُٹھا دے عشق مجاز تیرا

ندرت میرٹھی

شورشِ حیات

سر بھی کٹ جائے تو جاتا نہیں سودائے حیات
دو جہاں گیر ہے اک گیسوئے لیلائے حیات

ایک فانوس ہے انسان کا خاکی پیکر
شمع فانوس ہے یہ عارضِ زیبائے حیات

تو وہ خاک بھی انسان کو کہہ دیتے ہیں
اور اسی خاک میں دیکھا ہے تماشائے حیات

ہر تڑپ دل کی ہے اک گام کی صورت غافل
سوئے منزل ہے رواں ناقۂ لیلائے حیات

آگیا ہاتھ جو تقدیر سے گلگونۂ عشق
اور پُر نور ہوا عارضِ زیبائے حیات

لن ترانی کی صدا کان میں آتی ہی رہی
عالم ہوش میں جب تک رہا موسائے حیات

کھول کر آنکھ ذرا دیکھ تو او تنگ نظر!
بیضۂ مور پہ لکھا ہے سراپائے حیات

پھر وہ کیوں سنگِ درِ غیر پہ ہو سر بسجود
جب ترے نور سے معمور ہے سیمائے حیات

آگیا مسلم جاں باز کا بر وقت خیال
عرصۂ زیست میں جسکو نہیں پروائے حیات

ایک وہ ہیں کہ دل و جاں سے ہیں شیدائے حیات
ایک تو ہے کہ نہیں تجھکو تمنائے حیات

مقتل عشق میں یوں جان کو رکھتا نہ عزیز
تو نے دیکھا ہی نہیں جلوۂ لیلائے حیات

تیری تخلیق جو خالق کو نہ ہوتی منظور
سچ ہے پیدا ہی نہ ہوتی کبھی دنیائے حیات

آج مٹ جائے زمانے سے اگر تیرا وجود
عرصۂ دہر میں خاموش ہو غوغائے حیات

تھا کبھی نعرۂ تکبیر ترا حشر فروش
آج تک گونجتا ہے گنبدِ خضرائے حیات

تو وہ یوسف ہے کہ ہے جاں سے سوا اسکو عزیز
کھینچتی ہے ترے دامن کو زلیخائے حیات

تیری تقدیر کی ساقی بھی قسم کھاتا ہے
خود جھکی تیرے لئے گردنِ مینائے حیات

وہ ہویدا ہوئے آثارِ سحر گردوں پر
وہ کھلا دیکھ درِ مسجدِ اقصائے حیات

نیر آب دم شمشیر میں مثلِ ماہی
ہے یہی مشہدِ عالم میں تقاضائے حیات

موت کا خوف نہ کر مسلمِ شوریدہ مزاج
تیرے پہلو میں ہے موجود مسیحائے حیات

نظیر لدھیانوی

جذباتِ عالیہ

یاس

دل عجب جلوۂ موہوم دکھاتا ہے مجھے
جلوۂ دار و رسن کوئی دکھاتا ہے مجھے

دل کو لہراتا ہے ہنگامۂ زندانِ بلا
شورِ ایذا طلبی وجد میں لاتا ہے مجھے

پائے آزاد ہے زنداں کے چلن سے باہر
بیڑیاں کیوں کوئی دیوانہ پنہاتا ہے مجھے

بارشِ سنگ حوادث بھی ہے بارانِ کرم
حق بجانب ہے مقدر جو دکھاتا ہے مجھے

ننگِ محفل مرا زندہ مرا مردہ بھاری
کون اٹھاتا ہے مجھے کون بٹھاتا ہے مجھے

پھٹ پڑیں اب بھی در و بام تو پردہ رہ جائے
فلک خانہ خراب آنکھ دکھاتا ہے مجھے

عشق پر حسن کو کب تک نہ ہنسی آئے گی
بیچ بازار میں کھویا ہوا پاتا ہے مجھے

پاؤں سوئے ہیں مگر جاگتے ہیں اپنے نصیب
کیا سمجھ کر جرسِ گنگ جگاتا ہے مجھے

دیدنی ہے چمن آرائیِ چشمِ عبرت
سیرِ تازہ گلِ پژمردہ دکھاتا ہے مجھے

ہنس کے کہتا ہے کہ گھر اپنا قفس کو سمجھو
سبق الٹا مرا صیاد پڑھاتا ہے مجھے

جیسے دوزخ کی ہوا کھا کے ابھی آیا ہے
کس قدر واعظ مکار ڈراتا ہے مجھے

ترک مطلب سے ہے مطلب تو دعائیں کیسی
صبح تک کیوں دلِ بیمار جگاتا ہے مجھے

لبِ دریا کا ہوائیں نہ تہِ دریا کا
ناخدا کو نسے گھاٹ اب لئے جاتا ہے مجھے

یاسؔ منزل ہے مری منزلِ عنقائے کمال
لکھنؤ میں کوئی کیوں ڈھونڈھنے آتا ہے مجھے

فکر آروی

رہ گیا عکس روئے قاتل کا　　اُف رے آئینہ چشمِ بسمل کا
قطرۂ خوں ہے نوکِ مژگاں پر　　مختصر ہے یہ ماجرا دل کا
جلوۂ طور اور کیا تھا کلیم!　　ایک دُھندلا چراغ منزل کا
اُن کا خنجر نیام میں رہ کر　　حوصلہ بن گیا مرے دل کا
منتِ خضر اے خدا کی شان　　خود نشاں ہوں میں اپنی منزل کا
اشکِ اک روشناس آنکھوں کا　　درد اک صورت آشنا دل کا
دیدۂ خونفشاں کا حال نہ پوچھ　　دیکھ لے رنگ اپنی محفل کا
حیف صد حیف آپ کی غفلت　　ہائے رے ہائے حوصلہ دل کا

جل بجھا فکر کا دل زندہ
ہو گیا گل چراغ محفل کا

وقار الاعظم شرف

یہ بت کچھ اور کہتے ہیں خدا کچھ اور کہتا ہے　　یہ دل اپنی مصیبت جانے کیا کچھ اور کہتا ہے
سرِ مقتل لپٹ جاتا ہے ظالم ہاتھ پھیلا کر　　تمہارا خنجرِ رنگ آشنا کچھ اور کہتا ہے
تمہارا نقشِ پا چوموں نہ چوموں راہ دشمن میں　　کہ دل جھکتا نہیں یہ رہنما کچھ اور کہتا ہے
نئی ہے سرگذشت عشق اُنکے جاں نثاروں کی　　جسے دیکھو وہ اپنا ماجرا کچھ اور کہتا ہے
ادھر تمکو ہنسی آئی کہ اُس کو بھی ہنسی آئی　　تم اِس مطلب کو سمجھے آئینہ کچھ اور کہتا ہے
تمہارے سامنے لاؤں کہاں سے ہوش کی باتیں　　میں کچھ کہتا ہوں میرا مدعا کچھ اور کہتا ہے

تپش

حسن یوسف شد خجل از رُوے تو　　خندہ زد بر مصر رنگ و بُوے تو
بہر کسب معرفت سرگشتہ اند　　کعبہ و بتخانہ اندر کوے تو
می نماید در حریم نجد من　　چشم مجنوں دیدۂ آہوے تو
ہستی من از تو آمد در وجود　　یا فتم خود راز جستجوے تو

خوردۂ شائد تپش جام الست! مست شد بزمِ جہاں از ہُوئے تو

شائق

جذبِ اُلفت کا اثر لے دلِ ناشاد رہے
یعنی تاثیر میں ڈوبی مری فریاد رہے

جور و بیداد سہی لُطف و مروت نہ سہی
بھُولنے والے تجھے کچھ تو مری یاد رہے

دارِ فانی ہے حقیقت میں مقامِ عبرت
ہُوئے برباد جو اس دہر میں آباد رہے

لذتِ ذوقِ خلش راحتِ جاں ہے مجھکو
شوق سے دل میں ترا ناوکِ بیداد رہے

صُورتِ سروِ سہی باغِ جہاں میں شائق
جتنے پابند ہُوئے اُتنے ہی آزاد رہے

مشتاق الہ آبادی

تھی "چشمِ لطف" ساقی جانے سے رات بھر
بھر دی "شرابِ جلوہ" پیمانۂ نظر میں

یہ انقلابِ عالم آنکھوں میں کیا سمائے؟
پھرتا ہے تیرا پھرنا ظالم! مری نظر میں

انسانِ "خودغرض" کو اسکی خبر کہاں ہے؟
کیا "سود" میں "زیاں" ہے! کیا "نفع" ہے "ضرر" میں!

تاجور

قید میں وردِ زباں شکوۂ صیاد رہے
لبِ فریاد نہ بیگانۂ فریاد رہے

خود فراموشِ محبت کو بھی کرنا کبھی یاد
او مرے وعدہ فراموش اگر یاد رہے

غم نوازی نے تری کر دیا غم دوست ہمیں
شاد ہم تیری بدولت دلِ ناشاد رہے

بننا پڑتا ہے ستمگر کو ستم کش آخر
یاد یہ بھی تجھے او بانیٔ بیداد رہے

دلِ مایوسِ مسرت کو نہ بہلا ظالم!
یہ کبھی شاد رہا ہے نہ کبھی شاد رہے

ایسی گلگشت سے زنداں کی اسیری اچھی
جب چمن میں بھی نہ اہلِ چمن آزاد رہے

ریویو

جواہراتِ حالیؒ۔ اس مجموعہ میں مولانا حالی مرحوم کی وہ متفرق نظمیں ہیں جو صرف ایک مرتبہ کسی اخبار یا رسالے میں چھپ کر ہمیشہ کے لئے پبلک کی نظروں سے مخفی ہوگئیں تھیں نیز مولانا کا وہ تمام غیر مطبوعہ کلام جو آجتک کہیں شائع نہیں ہوا تھا، شروع میں جناب مرتب (شیخ محمد اسمعیل سیکرٹری اورینٹل پبلک لائبریری پانی پت) کا ایک مفید مقدمہ ہے، پھر مولوی خواجہ غلام الحسنین صاحب (نبیرۂ مولانا حالی) کا ایک مختصر دیباچہ، اس کے بعد کتاب شروع ہوتی ہے، پہلے حصہ میں چھوٹے بچوں کے لئے نظمیں ہیں، دوسرے حصہ میں رباعیات، تیسرے میں ترکیب بند، (اسی میں فلسفۂ ترقی بیش بہا نظم ہے) چوتھے حصہ میں مرثیہ جات، پانچویں میں قطعات، چھٹے میں غزلیات، ساتویں میں متفرق اشعار وغیرہ اسی کے ساتھ ڈیڑھ سو صفحہ پر کتاب ختم ہوجاتی ہے، لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت خوب، مگر سرورق باصرہ خراش ہے، قیمت غیر مجلد ۱۲؍ مجلد ۱؍

حالی بُک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیں ؂

سیرِ ایران۔ مولانا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی کا سفرنامۂ ایران ہے، شروع میں آغا طاہر نبیرۂ آزاد مرحوم کا دیباچہ ہے، اس کے بعد پروفیسر آزاد کے ایک لکچر سے کتاب شروع ہوتی ہے، لکچر کے بعد روزنامچہ ہے، جو کہیں فارسی کہیں اُردو میں لکھا گیا ہے، بعض جگہ عامیانہ فارسی کا رنگ ٹپکتا ہے جس کی آزاد کے قلم سے توقع نہ تھی، ممکن ہے مسودوں کی درستی میں کسی "مہمل" جدید فارسی جاننے والے سے مدد لی گئی ہو، اُردو میں کہیں تغیر و تبدل نہیں کیا گیا اکثر جگہ غلطیاں ہیں، چنانچہ صفحہ ۱۱ پر "بیڑا اٹھایا ہوا ہے"، صفحہ ۳۳ پر "دوستوں سے سُنا ہوا تھا" اسی صفحہ پر "میں نے سُنا ہوا تھا"، صفحہ ۴۵ پر "تاریخ ہرات میں دیکھا ہوا تھا"، صفحہ ۷۶ پر "لوگوں نے ڈرایا ہوا تھا"، صفحہ ۱۱۰ پر "گھنٹہ بھیجا ہوا ہے"، صفحہ ۱۱۵ پر "پتھر موجودہ کو لگوایا" وغیرہ، بہتر ہوتا اگر انہیں درست کردیا جاتا، کتاب کے آخر میں آغا طاہر کا لکھا ہوا "خاتمہ"

ہے، ایک سو چھیاسی صفحہ پر کتاب ختم ہوگئی ہے، شیدائیان زبان آزاد کے لئے ایک بہترین نعمت ہے، کاغذ، کتابت میں خاص اہتمام کیا گیا ہے، قیمت مجلد مطلا (عہ) معمولی عہ ر آغا طاہر منیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور سے منگایا جائے۔

سمرنا کا چاند۔ مصور غم مولانا راشد الخیری کا ایک نیا ناول ہے، لیکن وہ خاص رنگ جس کے لئے یہ قابل مصنف مشہور ہے، اس ناول میں ایک حد تک کم ہے) کتاب کے نام کا نفس مضمون سے اتنا علاقہ نہیں کہ اس کا اختیار کرنا ضروری ہو۔ تربیت اولاد پر جس قدر دلاویزی سے مصور غم لکھ سکتے ہیں اس کا ہندوستان کی ادبیات میں جواب نہیں، یہ ناول بھی اسی موضوع پر ہے، اور خوب ہے، ایکسو چوبیس صفحہ، کاغذ معمولی، چھپائی اچھی، قیمت عہ ر ملنے کا پتہ۔ عبد الرشید اینڈ برادر۔ تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

تجارت کی دوسری کتاب۔ خواجہ حسن نظامی کی تحریک پر، مولوی سید ظہور احمد وحشی نے تالیف کی ہے، اس حصہ میں اشتہار لکھنے اور چھپوانے کے مکمل اصول بتائے گئے ہیں، جنکا جاننا ہر تاجر کے لئے ضروری ہے، تجارت کے متعلق یہ سلسلۂ کتب ہر طرح قابل قدر ہے، قیمت مجلد عہ ر غیر مجلد عہ ر

تجارت کی تیسری کتاب۔ اس میں دوکانوں پر اسباب سجانے اور گاہکوں کے مرغوب نظر بنانے اور خریداروں سے بات چیت کرنیکے ڈھنگ اور وہ طریقے بتائے گئے ہیں جن سے معمولی دوکان بھی شاندار بن جائے۔ مولفہ مولوی سید ظہور احمد وحشی۔ قیمت مجلد عہ ر غیر مجلد ۱۲ ر

تجارت کی چوتھی کتاب۔ مولفۂ ماہر علم تجارت سید صفیر علی صاحب قادری، سند یافتہ سکریٹریز ایسوسی ایشن، (لندن)۔ لندن چیمبر آف کامرس وغیرہ وغیرہ،

اس کتاب میں مشرق و مغربی تجارتی خط کتابت کے عام فہم علمی و عملی اصول بیان کرکے اور ہر قسم کے تجارتی و کاروباری خطوط کے نمونے دیکر اردو انگریزی زبان میں تجارتی خط و کتابت کی تعلیم دی گئی ہے۔ قیمت لکھی نہیں،

ملنے کا پتہ نظامیہ دار الاشاعت و رسالہ دین و دنیا۔ دہلی

فہرستِ مضامین بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۲ء

جلد ۲ — نمبر ۶

حصۂ نثر

حصۂ نظم

اگلا نمبر وی پی ہوگا

جن حضرات کا سال خریداری جنوری سے شروع ہوتا ہے انکا منی آرڈر نہ پہنچنے کی صورت میں انکو جنوری کا خاص نمبر وی پی ارسال کیا جائیگا جن اصحاب کو خریداری منظور نہ ہو وہ براہ کرم دفتر کو ۲۰ دسمبر سے پہلے پہلے مطلع فرمائیں۔ اطلاع نہ آنیکی صورت میں وہ پہلے کی طرح خریدار سمجھے جائینگے اور وی پی کی وصولی انکا اخلاقی فرض ہوگا۔

مینیجر

آلنور کاتب چوک متی لاہور

شذرات

یہ نمبر سال کا آخری نمبر ہے۔ اسے پیش کرتے ہوئے ہم خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم نے شروع اشاعت میں مواعید و مقاصد کا ایسا کوئی سبز باغ نہیں دکھایا تھا جسکی خزاں اب ہمیں اپنے دوستوں سے شرمسار کرتی۔ بلکہ جہاں تک ہمیں یاد ہے کوئی وعدہ بجز اسکے ہماری جانب سے نہیں کیا گیا کہ ہم اپنی استعداد کے مطابق کام کرتے رہینگے۔ سو اِس مقصد کو ہم نے تمام سال پیش نظر رکھا ہے اب نیا سال نئی امیدوں اور نئے حالات کے ساتھ آرہا ہے۔ افسوس کہ آئندہ کے لئے بھی ہم ہمایوں کیجانب سے کوئی دلفریب وعدہ کرنیکی جرأت نہیں رکھتے کیونکہ ہم نئے سال کی جنوری کے ساتھ اُس کے دسمبر کو بھی دیکھ رہے ہیں۔

سال رواں میں ہمایوں کی رفتار ترقی ہمارے خیال میں قریب قریب اطمینان بخش اور ہمارے قابلِ احترام اہلِ قلم اور قدر شناس احباب کی رائے میں توقع سے بڑھ کر اُمید افزا رہی ہے۔

اپنے مکرم مرزا اعجاز حسین صاحب دہلوی بی اے ایل ایل بی وکیل کے اس یقین کو ہم توحوصلہ افزائی ہی پر محمول کرتے ہیں کہ "میں غور سے دیکھ رہا ہوں ہمایوں کا ہر دوسرا نمبر پہلے نمبر سے زیادہ گرانقدر بنکر شائع ہو رہا ہے اس کامیابی پر میں اس کے دونوں اڈیٹروں کو مبارکباد دیتا ہوں"

حضرت اعجاز کی طرح دیگر مشاہیر اہل قلم نے بھی ہمایوں کی تدریجی ترقی پر ایسی ہی ہمت افروز رائے کا اظہار فرمایا ہے۔

ہم اپنے آپکو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ اس حقیر بینی کے دَور میں بھی ہم ایسے ژرف نگر حضرات کی قدر افزائی سے محروم نہیں ہیں جو ہماری ناچیز کوششوں کو عزت کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔

آغاز کار میں ہمارا خیال تھا کہ سال کے ختم تک ہمایوں کی اشاعت پانسو تک بھی پہنچ گئی تو ہم سمجھیں گے کہ ہم ناکام نہیں رہے اس خیال پر ناامیدی دُور سے ہنستی ہوئی نظر آتی تھی مگر اُس کی اس قدر عریاں رسوائی کا تو وہم تک بھی نہ تھا کہ سال سے بہت پہلے ہمایوں کے ہزار سے زیادہ قدر شناس مُہیا ہو جائینگے۔ جنس ادب کی عام کساد بازاری کو دیکھتے ہوئے ہم اعتراف کرتے ہیں

کہ ہم ترقیٔ اشاعت میں امید سے بہت زیادہ کامیاب ہوئے ہیں ۔ مگر اس اعتراف سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمایوں کی اشاعت توقع سے زیادہ ہو گئی ہے تو اس سے نفع بھی اُمید سے بڑھ کر حاصل ہوتا ہوگا

افسوس ہے کہ اسکا جواب ضرورت سے زیادہ حوصلہ شکن ہے یعنی آمد کے مقابلہ میں خرچ بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ اسے ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے یا اصولِ تجارت کی خلاف ورزی پر کچھ بھی سمجھ لیجئے جو کچھ لکھا ہے یہ واقعہ ہے ادھر تو یہ حال ہے۔ دوسری جانب یہ خواہش بھی دل میں چٹکیاں لے رہی ہے کہ ہمایوں کا حجم بڑھا کر ممکن ہو تو سو صفحات تک کر دیا جائے۔ اسکے ساتھ اسکو ظاہری و معنوی حیثیت سے زیادہ گرانقدر بنایا جائے۔ ظاہر ہے کہ ہمایوں کے منتظمین کو نہ ایسا کوئی منتر یاد ہے کہ اسے پڑھ کر پھونکنے سے بہتّر کے سو صفحے اور ایک کی چار تصویر ہو جایا کریں۔ نہ وہ ایسے خدارسیدہ کہ براہ خدا ئے "کُن" کہلوایا اور ایک ضخیم و خوبصورت ہمایوں پیدا ہو گیا۔ یہ مہم تو اُسی قاضی الحاجات سے سر ہو گی جس نے بقول بعض عقیدت کیش بوڑھوں کے ہر روز ہزار مرتبہ "یا عزیز" کا ورد کیا ہے اور جس کا مشہور نام روپیہ ہے۔

ہم نے تو مالی حالات کیجانب سے آنکھیں بند کر کے بغیر اعلان اور بلا کسی سابقہ وعدہ کے چونسٹھ سے بہتّر صفحے کا بنا دیا اور کوئی قیمت نہیں بڑھائی لیکن ہمایوں کو بہتّر سے سو تک پہنچانا یہ ہمارے بس کا روگ نہیں ہے یہ مرحلہ ہمایوں کے قدر شناس ناظرین کو طے کرنا چاہیئے اگر وہ چاہتے ہیں کہ ہمایوں ویسا ہو جیسا اسے ہونا چاہیئے۔

ہمارے خیال میں ہمایوں کے ہزاروں ناظرین جو اسے قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اگر اپنے اپنے حلقۂ احباب میں سے ایک ایک خریدار بھی بہم پہنچا دیں تو انکی بالکل معمولی توجہ سے ہمایوں کے زریں مستقبل کا سوال حل ہو سکتا ہے۔ بہت سے قدردان ایسے بھی ہیں جو احساس ہمدردی سے کام لیں تو اپنے وسیع اثر سے ہمایوں کے دس دس بیس بیس خریدار بہم پہنچا سکتے ہیں۔ اس ادبی قمار سے اگر تجارت مقصود ہوتی تو ہم اس قسم کی تذلل آفریں درخواست کرنے کا ہرگز ارتکاب نہ کرتے کہ یہ ہماری افتادِ طبع کے بالکل خلاف ہے لیکن واقعتہً چونکہ یہ اک ادبی خدمت ہے جسے ہمایوں کے ذریعہ سے ہم کثیر نقصان برداشت کر کے بھی ادا کر رہے ہیں اس لئے جی چاہتا ہے کہ ہم دوسرے ادب دوست احباب کے ساتھ مل کر اس ادبی خدمت کو زیادہ مفید زیادہ گرانقدر اور زیادہ پائدار بنائیں اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہماری طرح ہمایوں کے قدر شناس بھی اپنے ادبی احساس کو بیدار کر کے ہماری مالی ذمہ داریوں کو کم کریں۔

ہمیں امید ہے کہ ہماری اس استدعا کو رسمی طور پر مینیجرانہ درخواست سمجھ کر محروم توجہ نہ کیا جائیگا

خدا نہ کرے کہ اپنے ناظرین کے متعلق اعتمادِ توجہ کی شکست کو دیکھ کر ہمیں لسان العصر مرحوم کا ہمنوا ہونا پڑے کہ

"اب اپنے دل کی عقیدت پہ رحم آتا ہے
یہ دیکھتا ہوں کہ وہ آپ کی نگاہ نہیں"

۲

اس فخر میں غالباً کوئی ہمارا حریف نہیں ہے کہ مشاہیر ادب کی دنیا ہمہ تن ہمایوں کیجانب متوجہ ہوگئی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس ہر وقت چھ ماہ کا ذخیرۂ مضامین فراہم رہتا ہے۔ انکی اس غیر منقطع قلمی اعانت ہی کے سبب سے ہم میں سطحی مضامین شائع کرنے سے بے نیازی برتنے کی جرأت پیدا ہوگئی ہے خدا کرے کہ ہمایوں کی یہ متفنا طبیعت انکی توجہات کو ہمیشہ جذب کرتی رہے۔ قارئین کرام نے محسوس کیا ہوگا کہ ہمایوں کے صفحات کو بعض ایسی عالیجاہ شخصیتوں کے نظر فروز افادات بھی زریں بناتے رہے ہیں جنکی قابلیت وعظمت پر اردو دنیا کو ناز ہے بعض ایسے محترم انشا پرداز بھی بزم ہمایوں میں نظر پڑے ہونگے جو باوجودیکہ علمی دنیا کے لئے ازبس ضروری ہیں مگر انکا طبعی استغنا شہرت کی دردسری کو پسند نہیں کرتا۔ بعض انشا پردازوں کے ایسے گرانقدر مضامین بھی انکے مطالعہ میں آئے ہونگے جو اُردو ادب کیلئے سرمایۂ افتخار کہے جاسکتے ہیں۔ ہم نے ایسے تمام محترم حضرات کے مضامین بغیر کسی تعارف تحسین وتعریف کے شائع کردیئے اسلئے نہیں کہ انکی زریں نگاریاں تحسین وتعریف کی مستحق نہ تھیں بلکہ اسلئے کہ اک تو ہم انکی جلالتِ شان کو رسمی تحسین سے بالاتر سمجھتے ہیں دوسرے قصیدہ خوانی ہمارے مذاقِ طبع کو راس نہیں اسکے علاوہ اس مدحی انتخاب سے ہمارے باقی معاونین کی قائم کردہ توقعات کے مجروح ہونیکا سخت خطرہ تھا ہم آئندہ بھی حتی الوسع اسی پالیسی کو مطمح عمل بنائینگے مگر اظہارِ واقعیت کیلئے مختصراً اتنا عرض کردینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بلا امتیاز ہمارے تمام قلمی معاونین ہمایوں کو گرانپایہ اور جاذبِ نظر بنانے میں ہمیں گرویدۂ منت بناتے رہے ہیں۔ سچ پوچھئے تو انہیں کی توجہاتِ بیکراں ہمایوں کی صورت میں جلوہ طراز ہوئی ہیں۔

۳

مئی کے ہمایوں میں ہم نے اعلان کیا تھا کہ ہم ادب آفرینی کے ساتھ ہی اپنی استعداد کے مطابق ادیب آفرینی کے فرض کو بھی انجام دینا چاہتے ہیں۔ لہذا ایسے طلباء جو ادبی مذاق سے بہرہ ور ہیں مگر اس میدان میں قدم رکھتے ہوئے اسلئے جھجکتے ہیں کہ کوئی دل بڑھانے والا نہیں۔ ہم سے خط وکتابت کریں ہم انکو مفید مشورہ دینے سے دریغ نہیں کرینگے اور اگر اُن میں سے کسی کے مضامین نظم ونثر اس قابل ہوئے کہ اصلاح کے بعد ہمایوں کے صفحات

غازی کمال پاشا

اے غیرتِ مجسّم غازی کمال پاشا
اے مسلمِ مسلّم غازی کمال پاشا
ترکی کے بطلِ اعظم غازی کمال پاشا
یورپ کو تو نے اپنا لوہا منا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

محبوبِ قوم و ملّت اے فخرِ آلِ عثمان
اے ایشیا کے ہیرو۔ ترکی کے شیرِ غرّاں
دل سے ہیں تیرے شیدا ہر ملک کے مسلماں
ناموس جا چکا تھا۔ تو نے بچا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

یونان کے ستمگر خوشیاں منا رہے تھے
اپنی تعدیوں پر بغلیں بجا رہے تھے
نشہ میں چور ہو کر فوجیں بڑھا رہے تھے
لیکن انہیں کو تو نے نیچا دکھا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

ٹرکی کو مات دیکھ یورپ بپھر رہا تھا
برباد کن شرائط وہ پیش کر رہا تھا
جن سے نہ زور ہی کچھ باقی نہ زر رہا تھا
لیکن یہ نقشِ باطل تو نے مٹا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

سچ مچ فدائے ملّت ہے بال بال تیرا
آخر ہوا وہی کچھ جو تھا خیال تیرا
اعجاز سے نہیں کم ہرگز کمال تیرا
بگڑی ہوئی کو واللہ تو نے بنا کے چھوڑا
سارا تھریس آخر خالی کرا کے چھوڑا

امینِ حزیں

مصطفیٰ کمال

قائم ہُوا جہاں میں پھر اسلام کا جلال　　　پھر روکشِ صلیب ہوئی شوکتِ ہلال
یونانیوں کے قلبِ سیہ کی زباں ہے لال　　　مغرب کے رہنے والے ہیں شرمندۂ سوال
تُو نے کمال کر دیا اے مصطفیٰ کمال

دُنیا کی محفلوں میں نہ تھی اپنی آبرو　　　سمجھے ہُوئے تھے خاک سے بدتر ہمیں عدو
"مردِ علیل" کہتے تھے تُرکی کو کُو بکُو　　　اب چُپ ہیں دیکھ کر تری قوت ترا کمال
تُو نے کمال کر دیا اے مصطفیٰ کمال

سکّہ چلاؤ ظلم کا تا دیب ہے یہی　　　جابر بنو کہ رُعب کی ترکیب ہے یہی
قوت کے بُت کو پُوجئے تہذیب ہے یہی　　　یعنی کہ ہیچ جانئے اَوروں کا جان و مال
یُورپ کو سمجھا تو نے ہی اے مصطفیٰ کمال

قسمت سے دی گئی جو فضائے قفس ہمیں　　　باقی رہی نہ جاہ و طلب کی ہوس ہمیں
ملتا نہ تھا کہیں کوئی فریاد رس ہمیں　　　تُو نے بچا لیا ہے تباہی سے بال بال
امت کو تجھ پہ ناز ہے اے مصطفیٰ کمال

تُو شمعِ ایشیا مہِ اسلام ہے تُو ہی　　　شوریدگانِ دیں کا دل آرام ہے تُو ہی
پیشِ نظر یہاں سحر و شام ہے تُو ہی　　　آنکھوں میں پھر رہے ہیں مری تیرے خط و خال
تُو پیکرِ جمال ہے اے مصطفیٰ کمال!

تُو کس لئے عزیز ہے ہم کو؟ اِسی لئے　　　روشن ہیں تجھ سے ہمت و ایثار کے دیئے
بندش میں رہ کے کوئی جیئے بھی تو کیا جیئے　　　جینا ہے یہ کرے وطن و قوم کو نہال
اور بے غرض ہو تیری طرح مصطفیٰ کمال!

غازئ اسلام

ایشیا کا گلشنِ ہستی تھا تاراجِ خزاں
دیر سے برپا تھا اک ہنگامۂ جور و فساد
خاص کر مسلم کی دُنیا درد سے لبریز تھی
جان کے پیچھے پڑے تھے چارہ سازِ مہرباں
نشۂ فتح و ظفر میں سارا یورپ چُور تھا
ایشیائے کوچک اک جانب تھا مصروفِ فغاں
ہو رہے تھے نذرِ غم اہل سمرنا و تھریس
آسماں سے اُن پر آئی تھی مُصیبت ٹوٹ کر
کشورِ برطانیہ کا وہ خدائی فوجدار
"حکم برداری" ہے جس کے جور کا مشہور نام
مجلسِ اقوام میں وہ اہلِ عالم کے کفیل

گر رہی تھیں خرمنِ امن و اماں پر بجلیاں
بن رہے تھے پیکرِ ظلم و ستم یورپ نژاد
ہر مصیبت اِسکی اک طوفانِ دہشت خیز تھی
ہو رہا تھا درد سے "بیمارِ یورپ" نیم جاں
بادِ نخوت سے سرِ یونان تک معمور تھا
تھا اِدھر دار الخلافتہ پائمالِ "دوستاں"
سنگدل جلّاد کا یونان نے بدلا تھا بھیس
دربدر پھرتے تھے غربت میں وطن سے چھوٹ کر
زندگی چندروزہ کی طرح بے اعتبار
قومِ ایوبی سے لیتا تھا صلیبی انتقام
کر رہے تھے قومِ عثمانی کو برباد ذلیل

دل تھا ٹکڑے مسلموں کو گھر سے بے گھر دیکھ کر
ہوش اُڑے جاتے تھے یہ مایوس منظر دیکھ کر

جب مُصیبت بڑھ گئی حد سے دلِ ناشاد پر
حق کا فرمانِ "دعونی استجب" یاد آ گیا
اُس کو ڈھونڈا اپنے بیگانوں کو آخر چھوڑ کر
اُس کے در پر جُھک گئی ہر اک کی سیمائے نیاز

تب کیا مجبور فطرت نے خدا کی یاد پر
آرزو کی مشعلِ یخ بستہ کو گرما گیا
اُس سے جوڑا رشتۂ اُمید سب سے توڑ کر
اُس سے رو کر عرض کی سب نے کہ اے بیکس نواز!

مسلموں کو شکوۂ مہر و محبت تجھ سے ہے
اُمتِ احمدؐ کی درد انگیز بد حالی تو دیکھ!
ہم سے تیری رحمتِ عام اس قدر کیوں دُور ہے؟
غیب سے آئی ندا اے قومِ شوریدہ مآل!

آہ تیری بے نیازی کی شکایت تجھ سے ہے
اپنے کعبہ کے نگہبانوں کی پامالی تو دیکھ!
کچھ ہمیں معلوم تو ہو کیا تجھے منظور ہے؟
کر رہے ہیں خود ترے اعمال تجھکو پائمال

بن گئی ہے جب سے تو پابندِ کیشِ این و آں
اپنے مرکز سے بچھڑ کر ہو گئی بے خانماں

تجھ پہ لائی ہے یہ روزِ بد تن آسانی تری
اپنے ہاتھوں سے ہوئی ہے خانہ ویرانی تری

تیری خودداری کا شہرہ تھا کبھی نزدیک و دور
سمجھے جاتے تھے مرادف دونوں مسلم اور غیور

اپنی بداعمالیوں سے آج ہے خوار و ذلیل
تیری خواری تیری بداعمالیوں کی ہے دلیل

بدشعاری سے نہ اپنے نفس پر تو جور کر
"لَیسَ لِلانسانِ اِلّا ما سَعیٰ" پر غور کر

ہم سے برتی بے نیازی ہو گئی آخر تباہ
ہم سے سرکش ہوکے پائی بھی کہیں تو نے پناہ؟

اب کہ تو آئی ہمارے پاس سب کو چھوڑ کر
رُخ جہاں سے پھیر کر منہ ماسوا سے موڑ کر

سُن رہے ہیں ہم جو دردِ دل سُناتی ہے ہمیں
ہم بھی تیرے ہیں جو تو اپنا بناتی ہے ہمیں

تیری سب اُجڑی ہوئی عظمت دلائینگے تجھے
اب کرشمے اپنی قدرت کے دکھائینگے تجھے

یک بیک کروٹ جو بدلی چرخِ نیلی فام نے
دیکھتے کیا ہیں کہ غازی مصطفےٰ ہے سامنے

محوِ حیرت ہو گئی ہر آنکھ اُس کو دیکھ کر
پیکرِ انساں میں قدرت جلوہ گر آئی نظر

ہر طرف سے آ رہی تھی یہ نویدِ دل نشین
"مصطفےٰ ما جاءَ اِلّا رحمۃً للعالمین"

آلِ عثمانؓ سے یہ پوچھا اُس نے اے رُوحی فداک!
کس لئے تو ہو رہی ہے اس قدر اندوہناک

شامِ غم چھائی ہے کیسی تیری صبحِ عید پر؟
یاس کیوں طاری ہے تیرے مطلعِ امید پر؟

قومِ ناامید رسوا ہوتی ہے اقوام میں
ناامیدی کفر ہے اے بے خبر! اسلام میں

آس توڑی جب کسی نے پھر نہیں کچھ اُسکی خیر
یاس کر دیگی اُسے پامال بے امدادِ غیر

آیۂ "لاتقنطوا" پر غور کر قرآن میں
نکتۂ "اَلیاسُ موتُ الرّوح" کو رکھ دھیان میں

خلوتِ دل کو امیدِ عیش سے آباد رکھ!
تجھ سے وعدہ "اَنتُمُ الاَعلَون" کا ہے یاد رکھ!

کہہ کے یہ۔ اُس غارِ نکبت سے نکالا پھر اُنہیں
اپنے نظم و نسق کے قالب میں ڈھالا پھر اُنہیں

منتشر شیرازۂ ملت کو یک جا کر دیا
یعنی اِن قطروں کو اک طوفان برپا کر دیا

پھر یہ فوجِ قہر موج اک حشر برپا کر گئی
برقِ طوفاں تھی جدھر چمکی صفایا کر گئی۔

رک سکا آگے نہ اس بڑھتے ہوئے طوفان کے
لی خبر ایسی کہ چھکے چھٹ گئے یونان کے

ہو کے وہ ثابت قدم میداں میں جب اڑ گئے
شاہِ قسطنطین کو لینے کے دینے پڑ گئے

سرنگوں ہر سلطنت میں اُس کے جھنڈے کر دیئے
تعزیئے یونان کے ترکوں نے ٹھنڈے کر دیئے

بن گیا وہ شعلہ زارِ جنگ گلزارِ سمن
شامِ غربت ہی سے پیدا ہو گئی صبحِ وطن

آہ لائڈ جارج کی دنیا میں بدنامی نہ پوچھ
گرگِ باراں دیدۂ یورپ کی ناکامی نہ پوچھ

مسلم آزاری کی دُھن میں اپنی عزت کھو گیا
"چاہ کن را چاہ در پیش" آخرش سچ ہو گیا

آگیا اس وعدۂ زریں پہ مسلم کو یقین
"مصطفےٰ ما جاء اِلاّ رحمتہ للعالمین"

اے سپہ سالارِ اعظم اے دبیرِ بے نظیر
اے شہ سیف و قلم اے غازیٔ گردوں سریر

غازیٔ اسلام! فخرِ قومِ عثمانی ہے تو
شک نہیں امت کے حق میں خالدِ ثانی ہے تو

جمع تجھ میں شانِ دارا شوکتِ اسکندری
عزمِ طارقؔ۔ سطوتِ فاروقؔ۔ زورِ حیدریؔ

یورپ افگن! ہے ادب آموزِ قسطنطین تو
دورِ حاضر کا ہے سلطانِ صلاح الدین تو

تیری تدبیروں سے یہ از غیب ساماں ہو گیا
دفعتہً شیرازۂ یورپ پریشاں ہو گیا

خودسری یورپ کی رکھی رہ گئی سب طاق میں
تو نے ہل چل ڈال دی معمورۂ آفاق میں

دھاک یورپ پر بٹھا دی تو نے اپنے نام کی
لاج رکھ لی تیری تیغِ تیز نے اسلام کی

اے وہ یورپ نام جس کا ایشیا آزار ہے
اے کہ دنیا کے لئے اک فتنۂ بیدار ہے

بڑھ چلا ہے حد سے تیری بربریت کا جنوں
مغربی تہذیب سے آنے لگی ہے بوئے خوں

نقش کر! دل پر کہ یہ تاریخ کا فرمان ہے
جور ہی مظلوم کی امداد کا سامان ہے

ظلم۔ ظالم سوز بن جاتا ہے خود انجامِ کار
بیکسوں کا خونِ ناحق سر پہ ہوتا ہے سوار

ایشیا جس کو کیا پامال تو نے اس قدر
تجھ سے اب آمادۂ پیکار آتا ہے نظر

اپنے خونخواروں پہ ہے تجکو بہت کچھ فخر و ناز
بے سروساماں ترکوں کی بھی دیکھی ترکتاز

ملتِ اسلام کے ان برق آشاموں کو دیکھ!
فطرتِ خوابیدۂ مسلم کے ہنگاموں کو دیکھ!

تاجور نجیب آبادی

ترکوں کی جدوجہد آزادی کے لئے

اِس بات سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ ۱۹۱۹ء سے پیشتر ساڑھے چار سو برس تک جن لڑائیوں میں ترک یورپ والوں سے مصروفِ پیکار رہے ہیں وہ لڑائیاں یا تو سلطنت ترکی کو وسعت دینے کی غرض سے ہوئیں یا اس متزلزل وسعت کو برقرار رکھنے کے لئے!

پھر اس امرِ واقعہ کو کون تسلیم نہ کرے گا کہ ۱۹۱۹ء سے لیکر تا حال گذشتہ تین سال میں جو جنگ بعض اہلِ مغرب اور ترکوں کے درمیان ٹھنی رہی ہے وہ اک مٹتی ہوئی قوم کی جدوجہد تھی جس سے اُسے فقط اپنی ہستی کو قائم رکھنا مقصود تھا کہ یہ اُس کے نزدیک نہ صرف ایک ایسا حق تھا جو قدرت نے بلا امتیاز سب افراد و اقوام کو عنایت کیا ہے بلکہ جسے دُنیا کی مُدعی تہذیب قوموں نے کم از کم ظاہرا طور سے پچھلے چند سالوں میں بیسیوں موقعوں پر صحیح تمدن کی اصل و بنیاد قرار دیا ہے!

ترکی اور جنگِ عظیم۔ ہمیں اس گتھی کو سُلجھانے کی ضرورت نہیں کہ سلطنتِ عثمانیہ جنگِ عظیم میں کیوں شریک ہوئی؟ کیا اُس کے لئے بہتر ہوتا کہ وہ دُولِ وسطیٰ کے ساتھ شامل نہ ہوتی؟ کیا اُس آڑے وقت میں ترک مدبروں کے لئے نتائج جنگ کو پہلے سے دیکھ لینا ممکن تھا؟ لیکن یہ دنیا جانتی ہے کہ اکثر دُولِ یورپ مدت سے جنگ اور صلح ہر دو زمانہ میں علاقۂ ترکی پر اپنا قبضہ یا اثر قائم کرنے میں ہمہ تن مصروف رہی ہیں!

جب جنگِ عظیم شروع ہوئی تو روس کی للچائی ہوئی نگاہیں قسطنطنیہ پر جم گئیں چنانچہ مارچ ۱۹۱۵ء میں جو خفیہ معاہدہ رُوس برطانیہ اور فرانس کے درمیان ہُوا اور جس کے ساتھ شرکتِ جنگ کے بعد اطالیہ نے بھی موافقت ظاہر کی اُس میں تُرکی دارالسلطنت اور آبناؤں پر رُوسی حقوق کو تسلیم کیا گیا۔ دیکھئے کس طرح یہ قوی ہستیاں دوسروں کی ملکیت کے متعلق اپنے حقوق کا احساس کرنے لگتی ہیں! ۱۹۱۶ء کے موسمِ بہار میں اتحادیوں کے گلشنِ مسرت میں اُمید کا یہ نیا شگوفہ کھلا کہ انگلستان کو عراق عرب اور شام کے بعض حصے فرانس کو سواحلِ شام اور ولایت عدانہ وغیرہ اور رُوس کو ارضِ رُوم اور اناطولیہ کے تین اور صوبے اور کردستان کا کچھ علاقہ

حصے میں آیا۔ اسی سال ماہِ مئی میں جو سمجھوتہ انگلستان اور فرانس کے مابین ہوا اُس کی رُو سے گویا یہ طے ہو گیا کہ بہ حیثیتِ سلطنت ترُکی اقتدار کا قلع قمع کر دیا جائیگا!

۱۰ جنوری ۱۹۱۷ء کو اتحادیوں نے پریزیڈنٹ ولسن کے استفسار کے جواب میں کہا کہ ہمارے مقاصدِ جنگ میں ایک مقصد ترکوں کو قسطنطنیہ سے باہر نکالدینا ہے۔ اِس لئے کہ یہ لوگ ہمیشہ مغربی تہذیب و تمدن سے قطعی بے بہرہ رہے ہیں + اس کے تین ماہ بعد برطانوی فرانسیسی اور اطالوی وزرا کی ایک مجلس نے قرار دیا کہ اطالیہ کو مغربی اناطولیہ میں ایک وسیع علاقہ دیا جائے اور بتدریج وہ قونیہ اور سمرنا کو اس میں شامل کرلے لیکن التوائے جنگ کے بعد برطانیہ اور فرانس نے غالباً یہ عذر تراشا کہ چونکہ ہمارا حلیف رُوس اس فیصلے میں شریک نہ تھا ہم اُس کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے!

آئندہ سال (۱۹۱۸ء) کے مارچ میں زاریت کا خاتمہ ہونے اور اپریل میں ممالکِ متحدہ (امریکہ) کے جنگ میں شریک ہو جانے سے تُرکی کی طرف اتحادیوں کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ نئی رُوسی حکومت نے اپنی قدیم حکومت کی شاہنشاہیت کو چھوڑ کر اَوروں کے مال پر قبضہ جمانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ادھر اتحادیوں نے دیکھا کہ اب صورت حال اَور کی اَور ہو گئی ہے اور حکمت کا تقاضا بھی ہے کہ ہم جمہوری اصولوں پر عمل کرنے کو آمادہ ہو جائیں + لائڈ جارج نے ۵ جنوری ۱۹۱۸ء کو اپنی تقریر میں کہا کہ ہم تُرکی سے اُس کا دارالسلطنت نہ چھینیں گے نہ ایشیائے کوچک اور تھریس کے علاقوں پر ہاتھ بڑھائیں گے۔ صرف یہ چاہیں گے کہ آبنائیں کُھلی رہیں۔ اور ترُکی سلطنت کی محکوم قومیں اپنی جداگانہ قومیت حاصل کرلیں + جمہوری پریزیڈنٹ نے تین روز بعد اپنے مشہور "چودہ اصولوں" کو بیان کرتے ہُوئے اعلان کیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کے ترکی حصے ترکوں ہی کے زیر اقتدار رکھے جائیں گے + ۳۰ اکتوبر کو اتحادیوں اور ترکوں کے درمیان التوائے جنگ کا اعلان ہو گیا اور تُرکی نے بلاشرط ہتھیار ڈالدیئے +

یونانی سمرنا میں۔ اتحادیوں کے لئے یہ اک زریں موقعہ تھا کہ منصفانہ کارروائی سے اپنی نیک طینتی کا اظہار کرتے لیکن انہوں نے موقعہ کو ہاتھ سے کھو دیا اور مشرقِ قریب کی طرف سے بے پروا ہو کر یونان کے چالاک وزیر موسیو وینی زیلاس کے چکمے میں آگئے + اتحادی اطالیہ

کے ساتھ وعدہ تو کر چکے تھے کہ اناطولیہ کا بہت سا حصہ اُسے دیا جائیگا لیکن ایک زبردست طاقت کی بجائے ایک کمزور ملک کو قبضہ دے کر اپنا احسانمند بنالینا زیادہ مرغوبِ خاطر ہُوا۔ چنانچہ جب ۲۴ اپریل سے لے کر ۵ مئی ۱۹۱۹ء تک اطالوی سفارت عارضی طور پر پیرس سے غیر حاضر تھی تو اتحادیوں کی چشمک زنی پر یونانیوں نے ۱۵ مئی کو سمرنا کے ساحل پر اپنی فوج اُتار دی اطالوی اس سے چھ ماہ پہلے عدالیہ پر قابض ہو چکے تھے لیکن ایشیائے کوچک کا بہترین حصہ اب یونانیوں کی نذر کر دیا گیا۔ یونان و ترکی کے سب مصائب و آلام کا منبع و مرجع اتحادیوں کا یہی عقلمندانہ فیصلہ تھا!

مسٹر چارلز وُڈز اکتوبر ۱۹۲۲ء کے فورٹ نائٹلی ریویو میں لکھتے ہیں کہ وینی زی لاس نے میرے سامنے خود اعتراف کیا کہ یونانیوں نے پہلے ہفتے میں زیادتیاں کیں، اتحادیوں نے ان مظالم کی تفتیش کے لئے جو جماعت مقرر کی اُس کی رپورٹ کے شائع کرنے سے اُنھوں نے انکار کر دیا کیونکہ وہ یونان کے اعمالِ سیاہ کا ایک قطعی ثبوت تھی، یونانیوں نے سمرنا پر قناعت نہ کی بلکہ جب میدان صاف دیکھا تو بے دھڑک اندرونِ ملک میں بڑھتے چلے گئے، ان باتوں سے اناطولیہ میں عام بے چینی پھیل گئی اور بے دست و پا ہو کر ترکوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ بجز لڑنے اور لڑتے لڑتے مرجانے کے اور کوئی چارۂ کار اُن کے لئے باقی نہیں رہا!

ترکوں کی حالت زار۔ ترکوں کے لئے صورتِ حال تاریک تھی۔ یاس انگیز تھی ہولناک تھی! فرانس ساحلِ شام پر قبضہ کئے ہُوئے تھا۔ انگریز قسطنطنیہ اور دردانیال پر متمکن تھے اطالیہ عدالیہ میں لنگر انداز تھا اور یونانی سمرنا پر قدم جما کر اناطولیہ کی شاداب و پُرفضا وادیوں میں بڑھے جاتے تھے۔ عراقِ عرب تو خیر ہاتھ سے جا ہی چکا تھا فلسطین بھی چھن گیا تھا۔ عرب بھی علیحدہ ہو چکا تھا لیکن اک اناطولیہ تو باقی رہ جاتا لائڈ جارج کے وعدوں کے کچھ معنی تو نکلتے ولسن کی اصول بازی کسی کام تو آتی! وہ ترکی قوم کی سلامتی کا یقین کیا ہُوا، وہ قومیت کے تقدس کا رُعب کیا فقط اک ہیچ و ناکارہ بُت ہی تھا جو یونان کے نبرد آزماؤں کے سامنے دو منٹ بھی نہ ٹھیر سکا؟؟

ترکوں نے جان لیا کہ سانچ کو آنچ پہنچ گئی۔ دُنیا میں ہوتی آئی ہے کہ جس کی لاٹھی اُسی

کی بھینس یہی ہمارے ساتھ ہوئی! دُنیا بھر کے زبردست لوگ ہم پر آ پڑے۔ اب جائیں تو کدھر اور کریں تو کیا؟ کوئی دادرس نہیں کوئی فریادرس نہیں! نہ زر ہے نہ زور ہے فقط اک اپنے ہی نالوں کا شور ہے سو وہ بھی لاحاصل!

غیب سے آواز آئی "ہمت ہے کہ نہیں"؟ "آبرو کا خیال ہے یا نہیں ہے"؟ اگر ہے تو اُٹھو ورنہ جو کچھ رہ گیا وہ بھی جاتا رہیگا۔ پھر پچھتاؤ گے کہ ایسی زندگی سے تو موت کہیں بہتر تھی۔ جتنے دنوں جیتے ہو عزت کے ساتھ جیو۔ یہ نہ ہوسکے تو عزت ہی کے لئے جان دے دو کہ یہی بہترین زندگی اور یہی بہترین موت ہے!

اس آواز کو سُن کر جو اہلِ دل اُٹھے اُن کا سرگروہ وہ بطلِ حُریت تھا جسے آج مُصطفےٰ کمال کے نام سے مہذب دُنیا کا بچہ بچہ جانتا ہے!

تحریکِ آزادی کا آغاز۔ مصطفیٰ کمال (جسے قسطنطنیہ سے جلاوطن کرنیکی غرض سے داماد فرید کے اتحادی احکام بجالانے والے کابینۂ وزارت نے مشرقی ترکی افواج کا انسپکٹر مقرر کردیا تھا) بحیرۂ اسود کے ترکی بندر سمسون پر اُترا تو اُسے خبر ملی کہ یونانی چوبیس گھنٹے پیشتر (۱۵ مئی ۱۹۱۹ء کو) سمرنا میں داخل ہوچکے ہیں۔ کمال نے اپنے دل سے فیصلہ کرلیا اور وہیں آزادی کی تحریک شروع ہوگئی۔ ترکوں کی جمعیت تتر بتر ہوچکی تھی، اتحادی مُلک کے مختلف اطراف میں سیاہ بادلوں کی طرح چھائے ہُوئے تھے، فوج بے ترتیب ہوگئی تھی، نہ کوئی قومی حکومت تھی نہ کوئی ایسی ملکی مجلس جو بیرونی اثرات سے محفوظ ہوکر اطمینان اور بے باکی کے ساتھ وطن کی بہتری پر غور کرسکتی۔ ترکی وطن کے دشمنوں میں یورپ کی سبھی زبردست طاقتیں تھیں اور اُس کے دوست وہی دُنیا کے بے دست و پا مسلمان جو صرف خدا کے حضور وقارِ قومی کے لئے دعائیں مانگ سکتے ہیں! ایسے ترتیب و تہذیب یافتہ ایسے اپنی ہٹ کے پکے اپنی قوت سے مخمور مخالفین کا مقابلہ کیونکر ہو؟ ترک تہی دست ہیں۔ غنیم اپنے اور دُوسروں کے مال سے لدا ہُوا ہے! مصطفےٰ کمال نے اپنی جبلی تیزی کے ساتھ مدافعت کی تیاریاں شروع کیں۔ ایک مرکز سمرنا کے قریب علاقہ آدین کو بنایا جہاں رنگروٹ بھرتی کئے جانے لگے دوسرا مرکز دُور شمال مشرقی ولایتوں میں بنا جہاں باقاعدہ

فوج کے بچے کھچے جنگجوؤں کو اکٹھا کر کے ایک زبردست فوج کی بنیاد ڈالی گئی۔ ارض روم میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور رفعت بے اور علی فواد پاشا کے ساتھ مل کر سمسون اور سواس کے بندرگاہوں کو اجنبی گرفت سے بچا لیا گیا۔ سمسون میں انگریز قابض ہونے کو تھے۔ انگریزی کرنل کنارے پر اُترا تو اُس نے رفعت اور اُس کے ہمراہیوں کو اِدھر اُدھر گشت لگاتے دیکھ کر خیال کیا کہ یہ کسی بڑی ترکی جمعیت کا پیش خیمہ ہیں۔ چنانچہ اس ڈر سے وہ اپنے جہازوں کو لے کر لوٹ گیا اور قوم پرستوں نے اپنی پہلی فتح حاصل کی۔ لیکن اتحادی اتنی جلد پیچھا چھوڑنے والے نہ تھے۔ لندن میں قوم پرستوں کے نام پر ارباب حکومت مسکراتے تھے کہ یہ کم مایہ لوگ دولتِ برطانیہ کا کیا مقابلہ کرینگے۔ مصطفیٰ کمال نے قسطنطنیہ کی حکومت کے پاس اپنا استعفا بھیج دیا اور اپنے فوجی عہدوں کو خیرباد کہی۔ انگلستان کے اصرار پر حکومت نے اُسے باغی قرار دیا اور سُلطان نے اپنے خوانینِ اعزازی کے زمرے سے اس کو نکال دیا۔ قوم پرستوں نے آخری بار (۱۵ جولائی) کوشش کی۔ کہ خلیفۃ المسلمین کو اپنے مقاصد سے آگاہ کر کے اُسے اپنا مُربّی بنا لیں اور کہا کہ ہم تمام دُنیا کو قومِ عثمانی کی شجاعت دکھا دینگے اور کسی کے مٹائے ہرگز نہ مٹینگے۔ وہاں سے کچھ جواب نہ پا کر طوعاً و کرہاً یہ لوگ حکومتِ قسطنطنیہ سے الگ ہو گئے اور آپ اپنی مدد کرنے پر آمادہ ہوئے۔

ماہِ جون میں اتحادیوں نے حکومتِ قسطنطنیہ کو پیرس میں اپنا نمائندہ بھیجنے کی دعوت دی۔ لیکن جب داماد فرید پاشا جیسے نرم مزاج مُدبّر نے بھی قبلِ جنگ کی حالت کو شرائط صلح کی بنیاد قرار دیا تو اتحادیوں نے اُسے خوب ڈانٹا اور وہ اپنا سا منہ لے کر لوٹ آیا۔ ۲۷ نومبر کو بلغاریہ کے ساتھ وہ صلحنامہ ہُوا جس کی رُو سے بلغاری حدود ایڈریانوپل سے پرے پرے قائم کی گئیں۔

اُدھر مصطفیٰ کمال نے جولائی یا اگست ۱۹۱۹ء میں ارض روم میں ایک قومی کانگریس مدعو کی۔ ستمبر میں بمقام سواس اس کانگرس کا دوسرا اجلاس منعقد ہُوا۔ اور سال کے اخیر سے پہلے پہلے قومی آزادی کی تحریک منضبط ہو کر قوم کے منتشر شیرازے کو جمع و مرتب کرنے لگی

قوم پرستوں کی جنگی تیاریاں۔ چھاپہ مارنے والی جماعتیں تیار کی گئیں۔ اندرون ملک میں ڈاک اور تار کے سلسلوں پر قبضہ کر لیا گیا اور چند ہی ہفتوں میں مغربی اناطولیہ قوم پرستوں کے زیر نگرانی آگیا۔ بغداد کی طرف انگریزوں کی چالیس ہزار فوج علی فواد کے پندرہ سو سرکیشی سواروں کے آگے پیچھے کو ہٹنے لگی۔ اکتوبر ۱۹۱۹ء میں لڑائی کے دو محاذ قرار پائے ایک سمرنا اور آدین کے علاقے میں دوسرا بغداد کی طرف۔ دونوں میں انگلستان سے مقابلہ تھا ایک میں بالواسطہ دوسرے میں بلاواسطہ۔ حملہ آور آہستہ آہستہ ہٹتے گئے اور کمالئے اپنا قبضہ جماتے گئے۔ جرمن ملک کے مختلف مقامات میں جو بارود گاہیں چھوڑ گئے تھے اُن پر قبضہ کیا گیا۔ قفقاز میں جس سامان حرب کو بوقتِ التوائے جنگ انگریزوں نے اپنے قابو میں لے لیا تھا وہ ترکوں نے چھین لیا اور اُدھر اطالیوں نے عدالیہ اور قونیہ کے رستے ہر قسم کے آلات و ذخائرِ حرب کے آنے کی عام اجازت دیدی۔ کمال پاشا ان ابتدائی فتوحات سے مسرور ہوکر مغرور نہیں ہوگیا۔ وہ ہر وقت صلح کرنے کو تیار رہتا تھا اُس نے فرنساوی افسروں کے سامنے سلسلۂ گفت و شنید میں اپنے مقاصد سینکڑوں بار صاف و صریح طور پر بیان کئے۔ لیکن یونانیوں ارمنوں اور اُن کے مغربی دوستوں کی سازشوں کے شور و شر میں کسی مشرقی آواز کو لندن و پیرس میں کون سنتا تھا؟ بتدریج مصطفیٰ کمال کو یقین ہونے لگا کہ ان لوگوں سے انصاف چاہنا سعی لاحاصل ہے۔ سو بغیر خیالِ صلح ترک کئے وہ ایشیا کی جانب متوجہ ہوا کہ وہاں اتحادِ اسلامی کا وہ سلسلہ قائم کرے جس سے آڑے وقتوں میں قومی محافظت اور ہمدردی کا کام سرانجام ہو۔

اتحادی اور قسطنطنیہ۔ اس اثناء میں یورپ کے زبردست صلح باز اپنی ریشہ دوانیوں کے ساتھ مصروف تھے۔ دسمبر ۱۹۱۹ء میں موسیو کلامانسو لندن میں آیا اور وہاں قرار پایا کہ ترکوں کو "مع ساز و سامان کے" یورپ سے نکال دیا جائے لیکن اس فیصلے سے اسلامی دنیا میں ایسی ہلچل مچ گئی کہ ۲۶ فروری ۱۹۲۰ء کو لائڈ جارج اپنی تقریر میں یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اتحادیوں نے فیصلہ کیا ہے کہ ترک قسطنطنیہ ہی میں رہیں اور یہ بھی کہا کہ ہمارا جنوری ۱۹۱۸ء کا وعدہ کہ ترکی علاقہ ترکوں سے چھینا نہ جائے گا صرف ترکوں کو ترغیب دینے کی غرض سے اک تجویز

کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ اس سے فقط ہمیں اپنے لوگوں کو یہ بتانا مقصود تھا کہ ہمارے مقاصدِ جنگ و جدال کیا ہیں۔ یہ بھی کہا کہ اس بیان کے تیار کرنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا گیا تھا۔ اور یہ بیان قطعی اور غیر مشروط تھا اور اسے قوم کے سب فرقوں کی مرضی سے دُنیا کے سامنے پیش کیا گیا تھا" اسی مُدبّرِ متلون مزاج نے بعد میں اپنے بیان کی تاویل اس طور پر کرنی چاہی کہ یہ تجویز فقط مشروط تھی۔ مشروط کیسے تھی؟ یہ انہیں حضرت کے خیالات کی کشمکش جانتی ہو گی۔

نومبر اور دسمبر ۱۹۱۹ء میں انگریز سلیشیا اور شام سے ہٹ گئے اور اُن کی جگہ فرانسیسیوں نے لی۔ ان لوگوں نے ترکوں کے خلاف ارمنی فوج کا استعمال کیا جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمانوں نے برافروختہ ہو کر ترکانِ احرار کو اپنی مدد کے لئے طلب کیا اور فرانسیسیوں کو مجبوراً پسپا ہونا پڑا۔ اتحادیوں نے بچاری قسطنطنیہ کی حکومت کو ذمہ دار قرار دے کر شہر پر زیادہ مضبوطی کے ساتھ قبضہ کر لیا تمام ترکوں کو جو قوم پرست حکومت کے نام لیوا تھے گرفتار کر کے مالٹا کو جلاوطن کر دیا اور سلطان کو مجبور کیا کہ مجلسِ شوریٰ کو (وہ مجلسِ شوریٰ جس نے ۲۸ر جنوری ۱۹۲۰ء کو مصطفیٰ کمال کا مشہور قومی پیمان منظور کیا تھا) برخاست کر دے۔ ۱۶ر مارچ کی وہ رات قومی تاریخ میں یادگار رہیگی جب بیسیوں قوم پرست جو اتحادی گرفت سے ابھی تک محفوظ رہے تھے دارالسلطنت سے بھاگ نکلے۔ اور کمال کے گرد انگورا میں آجمع ہوئے۔ ۱۱ر اپریل کو شیخ الاسلام نے فتوے دیا کہ قوم پرست باغی ہیں اور وزیرِ اعظم نے قومی تحریک کے خلاف فرمان نافذ کیا۔ اسی ماہ میں انگورا میں مجلسِ قومی قائم کی گئی اور ۲۳ر کو اُس کا ایک اجلاس منعقد ہوا جس میں پیمانِ قومی کو باقاعدہ طور پر منظور کر کے اُس کا اعلان کیا گیا۔ ان واقعات سے قسطنطنیہ اور انگورا میں علانیہ طور پر قطعِ تعلق ہو گیا اور قوم پرستوں کو آزادی مل گئی کہ وطن کے لئے جو چاہیں کریں۔ اُسے بچائیں یا خود بھی طوفانِ تباہی میں غرق ہو جائیں!

اتحادی اور یونان۔ ۲۷ر اپریل کو اتحادیوں نے اپنے بڑے چیلے موسیو وینی زی لاس کے حلقے میں آکر ترکوں کے گلے پر کند چھری پھیر دی یعنی بمقام سان ریمو اُن اصولوں پر اتفاق رائے ہو گیا جو مستقبل میں علاقہ ترکی کے لئے بمنزلہ بین الاقوامی قانون کے ہونگے۔ اس فیصلہ

کا فوری نتیجہ یہ ہُوا کہ ترکان احرار کمر بستہ ہوکر اپنے قومی کام میں پوری جانفشانی سے لگ گئے
کیونکہ انہوں نے جان لیا کہ اب بجز آپ اپنی مدد کرنے کے اور کوئی رستہ فلاح یا بقائے حیات
کا نہیں رہا + ۲۸ رمئی تک یونانیوں نے مغربی تھریس اور جولائی کے اخیر تک مشرقی تھریس
پر اپنے قدم جما لئے + لیکن اتحادیوں نے دیکھا کہ بغیر زبردستی کے اناطولیہ میں اُن کے فیصلہ
کو کوئی نہیں مانے گا لہذا انہوں نے ایک اور فیصلہ یہ بھی کیا کہ ہمارے فیصلے کو منوانے
کے لئے یونان کو اجازت ہے کہ اناطولیہ میں اپنا کام کرے + یہ امر قابلِ غور ہے کہ باوصف
مارشل فاش اور سر ہنری ولسن کی مخالفت کے موسیو و نی زیلاس کی رائے کو وقعت دی
گئی اور ۲۲ رجون تک یونان کو حملے کے لئے اذنِ عام مل گیا +

ترکی یونانی جنگ۔ پہلا دَور۔ ترکی یونانی جنگ چار حصّوں پر منقسم کی جاسکتی ہے۔ پہلے
دور میں یونانی شمال میں اسمد کی طرف اور مغرب میں سمرنا کے علاقے میں بڑھے۔ وہ ۸ جولائی
کو بروصہ میں اور ۲۹ ر اگست کو اوشک میں داخل ہوئے۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انہیں
اسمد سے ہٹنا پڑا + اس دوران میں پیرس میں صلحنامۂ سیورپر (۱۰ ر اگست کو) دستخط ثبت
ہو گئے اور برطانیہ فرانس اور اطالیہ نے اناطولیہ کو اپنے اپنے "اثر کے علاقوں" میں تقسیم کرلیا +
کہا جاتا ہے کہ اطالیہ اس انتظام بندی پر راضی نہ تھا اور یونان کو یہ رعائتیں زیادہ تر
اس غرض سے دی گئیں تا کہ حضرتِ و نی زیلاس کو اپنے وطن میں عزت حاصل ہو۔ اور
اُس کا اقتدار بڑھے + لیکن قسمت کے کئے سے کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ شاہِ یونان کو ایک
بندر نے کاٹ کھایا اور اُس کے مرنے کے بعد شاہِ قسطنطنین جو گویا اپنے نام کے ساتھ
ازل ہی سے قسطنطنیہ کو وابستہ کئے ہُوئے تھا ۱۹ ر دسمبر کو ایتھنز میں جلوہ افروز ہُوا + اس واقعہ
سے اتحادیوں اور بالخصوص فرانسیسیوں کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ وہ اس جرمن دوست فرمانروا
کو پسند نہ کرتے تھے۔ اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہونا شروع ہُوا کہ عہدنامۂ سیور کی کم
از کم ترمیم ضروری ہے + اس کا نتیجہ لندن کانفرنس تھی جس میں کچھ اختلافِ رائے کے
بعد باِلآخر انگورہ کا سفیر بکر سمیع بے ہی سلطنتِ عثمانیہ کی نمائندگی کرتا رہا + یہ کانفرنس اخیر فروری
سے شروع مارچ ۱۹۲۱ء تک قائم رہی۔ ترکوں نے اتحادیوں کی یہ تجویز کہ ایک بین قومی

کمیشن علاقۂ متنازعۂ فیہ کی قومیت کے متعلق تحقیقات کرے منظور کرلی لیکن یونانیوں نے اُسے مسترد کردیا۔ اگرچہ اتحادیوں کی بعد کی تجاویز میں تُرکوں کو مُراعات دینے کی جھلک پائی گئی لیکن فریقین کسی فیصلے پر راضی نہ ہوسکے۔ جانے سے پہلے بکر سمیع بے نے خفیہ طور پر فرانس اور اطالیہ سے دو عہد نامے کئے جن کی رُو سے فرانس سلیشیا کے تخلیے پر راضی ہوگیا۔ اور اطالیہ نے وعدہ کیا کہ وہ سمرنا اور تھریس کے معاملے میں تُرکی مطالبات کی داد دے گا اور اس امداد کے معاوضہ میں ان دونوں کو تُرک مشرقی و مغربی اناطولیہ میں تجارتی حقوق عطا کریں گے۔ انگورہ کی حکومت نے ان معاہدوں کو نامنظور کردیا لیکن ان سے یہ ضرور ہُوا کہ فرانس اور اطالیہ کے خیالات میں ایک بڑی تبدیلی کا پتہ چل گیا۔ اس کے ساتھ ہی کمالیوں نے ۱۶ مارچ کو دولتِ رُوس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جو اپنے آئندہ اثرات کے لحاظ سے غایت درجہ اہمیت رکھتا تھا۔ آرمینیا سے تو تُرک پہلے ہی نبٹ چکے تھے ۱۹۲۰ء کی فروری میں اُس سے جنگ چھڑی اور ۱۱ نومبر کو آرمنوں نے ہتھیار ڈالدیئے۔ اب جارجیا پر حملہ کرنے کے بعد یہ نیا معاہدہ سودیئے کے ساتھ ہُوا جس کی رد سے رُوس نے وعدہ کیا کہ وہ کسی عہدنامہ کو جو ترکوں کے پیمانِ قومی کے خلاف ہوگا یا جو اُن کی مجلسِ قومی کو منظور نہ ہوگا نہ مانیں گے۔ اُدھر تُرکی حکومت نے کہا کہ آبناؤں کی آمدورفت کے سوال میں بحیرۂ اسود کے ساحلی مُلکوں کی رائے کو نظرانداز نہیں کیا جائیگا۔ اس شرط کے ساتھ کہ تُرکی حکمرانی کمل طور پر تسلیم کی جائے گی۔

دوسرا دور۔ تُرکی یونانی جنگ کا دُوسرا دَور اس طرح شروع ہُوا کہ یُونان نے ایک ماہ کی مہلت سے (جو لندن کانفرنس میں مقرر ہُوئی تھی) پہلے ہی ۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء کو اناطولیہ میں پیش قدمی کا بول بالا کردیا اور شمالی اور مغربی ہر دو محاذ پر حملہ کیا۔ افیون قرہ حصار فتح ہوگیا اور عسکی شہر کے شمال کی طرف بھی ترک پسپا ہُوئے لیکن دو ہی ہفتے کے اندر ترکوں نے جوابی حملہ کیا اور سارا کھویا ہُوا علاقہ واپس لے لیا۔ اتحادیوں نے دلیر یونانیوں کو پٹتا دیکھ کر صلح صفائی کرا دینے کا پیام بھیجا لیکن ان لوگوں کا سر ابھی غرور سے بھرا ہُوا تھا۔ اکڑے اور انکار کردیا (جون ۱۹۲۱ء)۔

تیسرا دور۔ اس جاہلانہ جنگ کا تیسرا دور یونانیوں کی جارحانہ کارروائی سے شروع ہوا ۱۱؍ جولائی کو یونانی بڑھے۔ ۱۹؍ کو عسکی شہر اور افیون فتح ہوگئے اور ۱۴؍ اگست کو یونانی بڑی سرعت کے ساتھ انگورا کی طرف دھاوے مارتے ہوئے چلے + انصاف پسند اتحادیوں نے اعلان کر دیا کہ ہم کسی کی طرف داری نہیں کرینگے۔ دُنیا دیکھ رہی تھی کہ تُرکوں کی شجاعت و حریت اپنے بستر مرگ پر پڑی دم توڑ رہی ہے اور چند ہی دن میں اسلام کا آخری ملجا و ماوا سر ہونے کو ہے + ترکوں نے دریائے سقاریہ کے اُس پار اپنے قدم جمائے اور کمال پاشا کی قیادت میں اک شدید مقابلے کا تہیّہ کیا + وہ ۷۵ میل تک یونانیوں کے سامنے ہٹتے چلے آئے تھے اور اب انگورا سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر سقاریہ کے کنارے اُن کے وطن کی قسمت کا فیصلہ اُن کی شجاعت و مردانگی کے ہاتھوں ہونے کو تھا۔ اگر میدان دشمن کے ہاتھ رہا تو ترک، تُرکوں کا وطن، وطن کی آبرو، مذہب و ملت سب کے گلے پر کُند چھُری پھر جائے گی۔ اُن کے لئے بہتر یہی ہے کہ اگر بازی ہار دیں تو جان بھی توڑ دیں۔ مُلک کو نہ بچا سکیں تو خود تباہ و برباد ہو جائیں + اُن کا قائد بھی اناطولیہ کی خاک کا سب سے زیادہ درخشاں موتی تھا۔ اُس کی تابش کے ساتھ سیاہ دل عدو کی آنکھوں کو چندھیا دینا کچھ دشوار ہو لیکن ناممکن یا غیر اغلب نہیں تھا + ترک شمالاً جنوباً اپنا محاذ قائم کئے ہوئے تھے یونانیوں نے دریا کو اُن کے جنوب کی طرف عبور کر کے اُن کے میسرہ پر حملہ کیا اور چاہا کہ دھاوا کر کے غنیم کے عقب میں جا پڑیں۔ یونانی مشرق کی طرف پچاس میل تک بڑھتے گئے لیکن ترکوں کا میسرہ اُن کی گرفت سے دُور ہی رہا حالانکہ اُن کا میمنہ برابر وہیں قائم تھا۔ ترکی فوجی محاذ اب شرقاً غرباً پھیلا ہوا تھا۔ یونانیوں نے ۱۲ روز تک حملے پر حملہ کیا لیکن غنیم کی فوج میں اپنے قائد کا ضبط و استقلال برقی رو کی طرح دوڑ چکا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ اُن کی عقبی حرکت کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکے گی یونانی ۱۳؍ ستمبر کو دریا کو دوبارہ عبور کر کے لوٹے اور دس دن کے بعد پھر عسکی شہر اور افیون قرعہ حصار کے سامنے اپنے پُرانے مقام پر پہنچ گئے + کلیمنٹ پرائس لکھتا ہے کہ یہ جنگ کسی روز دُنیا کے سب سے زیادہ شدید معرکوں میں شمار ہوگی + کمال نے دردانیال کے بعد اس لڑائی میں اپنا جنگی کمال دکھایا اور مہذب دُنیا کو حیرت میں ڈالدیا +

انگورہ والوں پر اپنی قوت اور دشمن کی کمزوری عیاں ہوگئی اور اُن کی حکومت نے دو عہد نامے کئے۔ ایک اکتوبر میں آذربیجان آرمینیا اور جارجیا کی جمہوری حکومتوں کے ساتھ ہُوا جس (عہد نامۂ قارص) کے مطابق ترکوں کو سوائے باطوم کے وہ تمام علاقہ مل گیا جو وہ ۱۸۷۸ء میں کھو چکے تھے۔ دوسرا جو فرانس کے ساتھ ہُوا اور فرانس نے نہ صرف سلیشیا خالی کر دیا بلکہ ترکی حکمرانی کو عام طور پر تسلیم کرکے انگورہ کو ایک خود مختار ریاست سمجھ لیا + قوم پرستوں کا مرتبہ اَور کا اَور ہو گیا اور یونانی وزیر اعظم نے موسمِ خزاں میں لندن پہنچ کر اپنے ملک کی قسمت کا فیصلہ اتحادیوں کی مرضی پر چھوڑ دیا + مارچ ۱۹۲۲ء میں پیرس کانفرنس نے قرار دیا کہ التوائے جنگ ہو کر یونانی ایشیائے کوچک کو خالی کر دیں اور ترکوں کو آبناؤں کے متعلق کچھ زیادہ آزادی دی جائے + یونان کے بدقسمتوں نے تخلیئے پر ناک بھوں چڑھائی اور اُدھر مصطفیٰ کمال نے مطالبہ کیا کہ یونانی بلاشرط و بلا توقف ترکی علاقہ خالی کر دیں + جولائی کے اخیر میں یونان نے اتحادیوں کے نام دو پروانے بھیجے۔ پہلے میں لکھا کہ چونکہ صلح کی کارروائی لاحاصل رہی ہے اس لئے ہم اپنے تئیں آزاد سمجھتے ہیں کہ جو مناسب سمجھیں کریں۔ دوسرے میں بتایا کہ مناسب بات یہی ہے کہ ہم قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیں تاکہ صلح کی صورت پیدا ہو جائے + اتحادیوں نے کڑا جواب دیا۔ کہ ایسا نہیں ہو سکتا +

چوتھا اور آخری دَور۔ ۴ ؍ اگست کو مسٹر لائڈ جارج نے دارالعوام میں ایک پُرخروش تقریر کی جس میں اپنے یونانی بھائیوں کی شجاعت و تہذیب و انسانیت کو سراہا اور باغی کمالیوں کی زیادتیوں اور زبردستیوں کی دلخراش داستان چھیڑ کر یورپ سے بڑی رقت کے لہجے میں کہا کہ یونان کا ایثار لائقِ تحسین و آفرین ہے اور ترکوں کی ضد سراسر قابلِ الزام! دُنیا نے یہ پیام سُنا یا نہ سُنا لیکن کمال پاشا نے ضرور سُنا۔ سُنا اور لبیک کہا!

جنگ کا چوتھا اور آخری دور اگست ۱۹۲۲ء کے اخیر میں شروع ہُوا۔ اور دو اڑھائی ہفتے میں انجام کو پہنچ گیا۔ کمال پاشا نے افیون قرعہ حصار کے جنوب مغرب میں سوا لاکھ ترک فوج جمع کی۔ پہاڑی علاقے کے نشیب فراز میں ترکوں کی یہ فوج یونانی ہوا باز دو

کی نظروں سے اوجھل رہی اور خود یونانیوں نے بعد میں کہا کہ حملہ ہونے سے تین دن پیشتر تک ہم قطعی بے خبر تھے کہ کیا ہونے والا ہے + اُدھر افیون کے شمال مشرق میں ترکی سوار فوج قائم کی گئی تھی + ۲۳ راگست کو محاذ پر مختلف مقامات میں ترکوں نے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ اُدھر اسمد پر حملہ کیا اِدھر کوتاہیہ کے قریب نقل وحرکت کی یونانی نہ سمجھے کہ حملہ کہاں ہوگا + ۲۶ راگست کی صبح کو ترکوں نے افیون پر شدید حملہ کیا۔ حملے سے پہلے ترکی توپوں کی گولہ باری نے محمدؒ فاتح قسطنطنیہ کی یاد تازہ کردی اور ترکی ہوائی جہازوں کی تاخت سے صاف پتہ چلنے لگا کہ ترک تازہ ترین آلاتِ حرب سے مسلح ہیں اور جان چکے ہیں کہ "مہذب" دشمنوں سے مقابلہ کیونکر ہونا چاہیئے + شہر کی محافظ یونانی فوج مستعدی سے لڑی لیکن اُن کے بائیں طرف کو چوتھا رسالہ بھاگ نکلا +

۲۷ رکو افیون فتح ہوگیا۔ یونانی "فوجِ اول" پسپا ہوئی۔ "فوجِ دوم" بھی پیچھے کو ہٹی۔ اُن دونوں کے درمیان چوتھے رسالے کی فراری کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہوگیا تھا۔ ترکی سوار فوج شمال مشرق سے نکلی۔ اس خلا میں گھس گئی اور فوجِ دوم پر شمالی جانب میں زور کا حملہ کیا۔ فوج بھاگی اور کوتاہیہ پر جا ٹھہری۔ یہ شکست بھی پسپائی نہ تھی بلکہ قطعی فرار کی شکل میں تھی + ترکی سوار کافی تیزی کے ساتھ تعاقب نہ کرسکے اور فوجِ اول اس توقف کے دوران میں جان بچاکر نکل گئی + فوجِ دوم اعلیٰ شہر میں تنظیم پاکر مقابلے کو کھڑی ہوئی لیکن فوجِ اول سے مدد حاصل نہ ہوسکنے کے باعث ترکوں کے حملے کی تاب نہ لاسکی اور دو روز کی لڑائی کے بعد اوشک کی طرف مراجعت کرگئی + ترکوں نے ایک فوج کو دوسری سے قطعی طور پر جُدا کردیا۔ اور پھر اُن پر حملہ کرکے اُنہیں تتر بتر کردیا + اِس دوڑ میں یونانیوں نے سارا توپ خانہ اور سامانِ حرب وغیرہ پیچھے چھوڑ دیا اور سمندر کی طرف جس قدر سرعت کے ساتھ ہو سکا راہِ فرار اختیار کی + پھر طرّہ یہ کہ نیا یونانی قائد اعظم اپنے نقشے پھیلائے منصوبہ جنگ سوچ رہا تھا کہ ترک اُس پر آ پڑے اور وہ قید کرلیا گیا + ترکوں کی بہادری کمال پاشا کی قیادت اور یونانیوں کی کوتاہ اندیشی یہ باتیں اس جنگِ مختصر کے اختصار کا باعث تھیں + ۲۷ راگست کو کمال پاشا نے پیش قدمی کا حکم دیا ۹ ستمبر سے پہلے بچی کھچی یونانی فوج سمرنا کے بندرگاہ میں گرتی پڑتی

اپنے تیز رفتار جہازوں پر سوار ہوگئی۔ ساٹھ ستر ہزار یونانی قیدی ترکوں کے ہاتھ آئے اور دُنیا بھر میں تُرکی شجاعت و فراست کا ڈنکا بجنے لگا۔

اس غیر متوقع یونانی شکست سے یورپ کے یونان پسندوں میں ایک ہولناک تہلکہ مچ گیا۔ بہتیرا بھاگے دوڑے اور اُچھلے کودے مگر دُور ہی دُور سے دانت پیسنے سے کیا ہوسکتا تھا۔ آندھی کی طرح اُٹھے تھے مگر گرد کی طرح بیٹھنا پڑا۔ لائڈ جارج جو قدامت پسندوں یا جدّت طرازوں کے ہزار جتنوں سے اپنی کُرسی زور و طاقت سے اُٹھائے نہ اُٹھتا تھا۔ کمالی حملے کے ایک دھکے سے بل کھا کے گرا اور ایسا گرا کہ پھر نہ اُٹھ سکا۔ برطانوی نو آبادیوں کو اُس نے اس یاس و غصہ کی حالت میں پکارا کہ بھاگو "دوڑو کمال چال قیامت کی چل گیا" اور کسی نے جواب دیا کسی نے حیلہ بہانہ کیا لیکن نہ کسی کو آنا تھا نہ کوئی آیا۔ اُدھر فرانس اور اطالیہ جو پہلے ہی کمالیوں سے ہمدردانہ سلوک کرنا چاہتے تھے دردانیال سے اپنی اپنی فوجیں لے گئے بلکہ حُکم دیا کہ ہمارے جھنڈے بھی وہاں سے اُکھاڑ لئے جائیں۔ انگریز اڑے رہے کہ آبناؤں کی آزادی کے ہمیں محافظ ہیں۔ قریب تھا کہ لڑائی چھڑ جائے لیکن انگریزی مقامی جرنیل اور کمال پاشا کی دوربینی اور سرد مزاجی نے حالات کو بدتر نہ ہونے دیا اور بالآخر ۱۳ اکتوبر کو بمقام مدانیہ کانفرنس ہُوئی جس میں فیصلہ ہُوا کہ یونانی تھریس خالی کردیں اور تُرک تھوڑے دنوں کے بعد اُن کی بجائے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مشرقی رُوس اپنے حلیف کی امداد پر تُلا ہُوا تھا۔ اور تُرکوں کا پلّہ بھاری تھا لیکن کمال کی فراست نے صلح و جنگ کی ڈور باگ اپنے ہاتھ میں رکھی۔

یہ فیصلہ کیا گیا کہ سوئٹزرلینڈ میں بمقام لوزان ایک کانفرنس منعقد کی جائے جس میں مشرقِ قریب کا مسئلہ آخری بار طے ہو اور دُنیا میں پھر امن و امان قائم ہو جائے۔ خدا کرے یہ مدت کا جھگڑا کہیں ختم ہو اور مشرق و مغرب کے لوگوں میں ایک دُوسرے کے لئے رواداری اور خود اختیاری کا خیال پیدا ہو کر اُسے دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے۔

تُرک کیا چاہتے ہیں؟ یہی کہ وہ تمام تُرکی علاقے پر بلا شرکتِ غیرے اپنی مکمل حکمرانی قائم کرلیں اور کسی قسم کی حُکم برداری منظور نہ کریں۔ تُرکوں کے دوستوں سے دوستی پیدا

کریں اور دشمنوں سے بچے رہیں۔ ملک کے نظم ونسق میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں۔ تعلیم اور صنعت وحرفت میں کسی سے پیچھے نہ ہوں۔ قوم کے نظامِ سیاسی میں جو کمیاں ہیں اُنہیں پورا کریں۔ جو باتیں محنت اور استقلال سے حاصل ہوتی ہوں اُنہیں محض جوش وخروش سے پالینے کی خام آرزو کو دل میں جگہ نہ دیں۔ غیروں کی زیادتیوں سے برافروختہ ہوکر انہیں موقع نہ دیں کہ وہ ترکوں کو مہذب دُنیا میں غلط طور پر بھی وحشی پکار سکیں۔ اپنی عورتوں کو تعلیم و تہذیب کی شاہراہ پر لگادیں اور اُن کے غصب شدہ حقوق کے بحال کرنے میں ہر ممکن کوشش کریں۔ اپنے ملک کی برّی و بحری قوت کو برقرار رکھیں اور تازہ ترین انکشافات و ایجادات سے مستفید ہوکر فریب کار غنیم کے ساتھ لڑائی میں پورے اُتریں۔ اس کے ساتھ ہی دُنیا کو علی الاعلان بتادیں کہ ہم ایک آزاد قوم ہیں ہم آزادی سے محبت رکھتے ہیں۔ ہم جئیں گے تو آزادی میں اور جان توڑیں گے تو آزادی ہی کا دم بھرتے ہُوئے ۔

بشیر احمد

آزادی

میرا وطن وہیں ہے جہاں آزادی ہو۔
آزادی کی محبت دل کے رگ و پے سے ہمکنار ہے۔
آزادی خدا کی طرف سے ہے آزادیاں شیطان کی طرف سے۔
سچی آزادی وہیں ہے جہاں عدل سب کو برابر میسر ہو سکتا ہے۔
جہاں غلامی ہے وہاں آزادی نہیں رہ سکتی اور جہاں آزادی ہے وہاں غلامی کے لئے مطلق گنجائش نہیں۔
وہ خدا جس نے ہمیں زندگی دی اُس نے اُسی وقت میں ہمیں آزادی بھی دی۔
آزادی کی قیمت کیا ہے؟ ہر وقت اُس کی نگہداشت کرنا۔
آزادی سودمند اُسی وقت ہوتی ہے جب وہ محدود ہو۔
قفس کی چڑیا نصف چڑیا بھی نہیں!

دولتِ انگورہ

جب کسی قوم کا شیرازہ منتشر ہوتا ہے تو اس کے اِدارات ربط و ضبط سے مُعرّا اور اُس کے کارنامے صبر و استقلال سے خالی نظر آنے لگتے ہیں۔ تنظیم و تنسیق اُسی وقت پیدا ہوتے ہیں جب قوم کے رگ و پے میں خونِ صالح کا دَوران باقاعدگی کے ساتھ ہو جب اُسکے ارادوں میں التوا کی جھلک دکھائی نہ دے جب وہ اپنے مقررہ کام کو مقررہ اوقات میں بغیر کسی قسم کی تشویش یا غیر ضروری عجلت کے سرانجام دے اور جو کچھ اُس سے ہو سکتا کرے اور جو نہ ہو سکتا ہو اُس کے لئے دستِ حسرت ملنے میں فانی زندگی کی قیمتی گھڑیاں بے سود نہ کھودے!

باہمت قوم اپنی بنیادِ ہستی کو استوار کرتی ہے اور فقط قوس قزح کی سی رنگ آمیزیوں کے پیچھے نہیں دوڑتی۔ وہ تفریحاتِ زمانہ کی طرف مسکرا کر ایک نظر تو ضرور دیکھتی ہے لیکن اصولِ حیات کو چھوڑ کر انہیں بیکاریوں میں زندگی کو تباہ نہیں ہونے دیتی۔ وہ شعر سے زیادہ ریاضی کی طرف متوجہ ہوتی ہے وہ تاروں بھری رات میں عاشقانہ آہیں بھرنے کے بجائے اِن جگمگاتی روشنیوں کو دوربینی کی آنکھوں سے دیکھتی ہے۔ وہ آسایشِ موجودہ پر آئندہ عظمت کو ترجیح دیتی ہے۔ اُس کے افراد انفرادی خوشیوں سے پہلوتہی کر کے قومی خوشیوں میں حصّہ لیتے ہیں اور شبِ رقص سے کنارہ کر کے شبِ برات کی جلوہ افروزیوں کو اپنا دل دیتے ہیں!

مسلمانوں کا جوش مشہور ہے لیکن جب یہ جوش صرف خروش میں تبدیل ہو کر رہ گیا تو اُس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے برافروختہ ہو کر ان لوگوں کے قومی جذبے کو شورش سے تعبیر کیا۔ کس لئے؟ اسی واسطے کہ اِس کا درباری دُنیا میں جو محض کہتا ہے۔ اور کرتا نہیں اُس کی نہیں سُنتا لیکن جو کئے جاتا ہے اور کہے جاتا ہے لوگ مجبور ہوتے ہیں۔ کہ اُس کے کاموں کو دیکھیں اور اُس کی باتوں کو سُنیں!

ہم اُوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب قوم پرست ترکوں کے لئے آزادی کی سبھی راہیں بند

ہوگئیں جب اُنہیں صاف نظر آنے لگا کہ دُنیا میں بجز اپنے کام اور خدا کی مدد کے اور اُن کا
کوئی سہارا باقی نہیں تو انہوں نے شکوہ شکایت چھوڑ کر مستعدی اور سرد مزاجی کے
ساتھ کام کرنا شروع کیا اِس طرح جیسے کہ اک خود دار مفلس چیخنے چلاّنے کی بجائے ذلت
کی نوکری چھوڑ کر خاموشی کے ساتھ مٹی ڈھونے کے کام میں لگ جاتا ہے اور جانتا ہے
کہ وہ بنیادِ زیست کو اسی طور قائم و دائم رکھ سکیگا۔ پہلے پہل چند ترکوں نے حالات کو جانچا
اور خطرات کو محسوس کیا۔ قوم ناامیدی کے گڑھوں میں پڑی غم کے آنسو بہا رہی تھی۔
صرف اِنہیں لوگوں نے دیکھا کہ اس طرح بیٹھے رہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ خود اُٹھیں اور وں
کو جگائیں اور سب مل کے کام میں لگ جائیں۔ ارض روم اور سواس کے قومی جلسوں کے
بعد ۲۳ مارچ ۱۹۲۰ء کو کمال پاشا نے انگورا میں قومی مجلس ملیّہ کا افتتاح کیا اور ایک
تقریر میں قوم کے نئے دستور کا خاکہ کھینچا۔ اُس کی تجاویز کے ساتھ سب نے اتفاق ظاہر
کیا اور مل کر کام کرنے اور کرتے رہنے کی خواہش سب کے دلوں میں برقی رو کی طرح دوڑ گئی۔
مجلس ملیہ۔ وہ عمارت جس میں مجلس کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں شہر کے زیریں حصے
میں واقع ہے اور پہلے انجمن اتحاد و ترقی کا دفتر تھی۔ بڑے ہال میں جس میں اراکین جمع ہوتے
ہیں صدرِ مجلس کی کرُسی کے اوپر جلی حروف میں عربی کا ایک فقرہ لکھا ہے کہ" آؤ مل کر
مشورہ و مباحثہ کریں۔ کرُسی کے قریب منبر ہے جہاں مقرّر تقریر کرتا ہے۔ نیچے ۳۶۲
اراکین مجلس کی نشست گاہیں ہیں۔ اُن میں کوئی رومی ٹوپی پہنے ہوتا ہے کوئی ایرانی وضع
کی اُونی کلاہ۔ کہیں رنگین دستاریں اور پٹکے نظر آتے ہیں اور کہیں کہیں یورپین ملبوس۔
ایشیائے کوچک کے شہروں اور بندرگاہوں کے تاجر، کردستان کے کوہستانی، اناطولیہ
کے کسان، قسطنطنیہ اور تھریس کے مغربی وضع کے جنٹلمین سب اِس مُشترک ایوانِ قومی
میں ایک ساتھ جمع ہوتے ہیں۔ پچاس پچاس ہزار باشندوں کا ایک نمائندہ ہے۔ یونانیوں
کے قبضے کے دنوں میں بھی سمرنا اور تھریس کے نمائندے موجود ہوا کرتے تھے اور دستور
قومی میں صریح طور پر یہ بات بیان کی گئی تھی کہ ہر نمائندہ صرف اپنے حلقے یا ضلع کا نمائندہ
نہیں بلکہ ساری قوم کی نمائندگی اُس کا فرض ہے اور وہ قوم کے سب لوگوں کی طرف سے

اُن کی مجموعی حالت کا محافظ و امین ہے۔ پُرانے عثمانی دستور کے مطابق سُلطان کو اختیار تھا کہ صلح و جنگ کا اعلان کرے، مجلسِ قومی کو معطل کر دے، غیر سلطنتوں کے سفیروں سے تعلقات رکھے، وزارت اور دار الاشراف کے اراکین مقرر کرے۔ اب صلح و جنگ کا اختیار مجلس کے ہاتھوں میں ہے، مجلس کو معطل کرنے کا اختیار ابھی کسی کو نہیں دیا گیا اور جب گذشتہ سال نومبر میں کابینہ نے اسے حاصل کرنا چاہا تو کمال پاشا نے اِس کی شدت کے ساتھ مخالفت کی، سفیروں سے ملنے کا کام فی الحال کمال کے ذمہ ہے اور وُزرا کو مقرر کرنے کا حق خاص مجلس کا ہے جنہیں صدرِ مجلس تجویز کرتا ہے اور اُن میں سے ہر ایک جدا جدا کثرتِ رائے سے منتخب کیا جاتا ہے۔ کابینہ میں گیارہ وزیر ہیں جو مجلس کے سامنے اپنے کام کے ذمہ دار ہیں۔ اور مجلس ہی سب انتظامی آئینی اور دیوانی اختیارات کا منبع و مرجع ہے۔ مجلس کی عمارت کے پہلو میں وزرا کے دفتر ہیں جو دُور تک پھیلتے چلے گئے ہیں۔ مجلس میں فرقہ بندیوں کی گنجایش نہیں۔ سب اراکین قومِ ترکی کے خادم ہیں۔ سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد ہے قومی آزادی اور قومی تقویت! ہر رُکن پیمانِ قومی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے حلف اُٹھاتا ہے۔

پیمانِ قومی۔ اِس پیمانِ قومی کے مطابق حکومتِ انگورہ عربوں کے علاقوں پر اپنا تسلط جمانے کی ہرگز خواہشمند نہیں۔ مغربی تھریس کی حکومت کا دارومدار وہاں کے باشندوں کی مرضی پر رکھا گیا ہے۔ علاقۂ ترکی کی قلیل التعداد جماعتوں کے حقوق کی محافظت ہو گی اس شرط کے ساتھ کہ غیر مسلم ریاستوں میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ آبناؤں کو کھُلا رکھا جائیگا لیکن قسطنطنیہ پر ترکی قبضہ ہر حیثیت سے مکمل ہو گا۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ تُرکوں کو اپنے وطن میں کامل اختیارات دیئے جائیں اور اُن پر کسی قسم کی بندشیں عائد نہ کی جائیں۔ وہ جس طرح چاہیں رہیں جو چاہیں کریں اور اُن کے مُلک میں غیر مُلکیوں کو امتیازی حقوق حاصل نہ ہوں۔

کمال پاشا نے مارچ ۱۹۲۲ء میں مجلسِ ملیّہ کی دوسری سالگرہ کے موقع پر اپنی تقریر میں کہا کہ واشنگٹن کانفرنس میں جو فیصلہ چین کے متعلق دُولِ عظمیٰ نے کیا ہے کہ آئندہ وہ اس ملک کو اپنے اپنے "اثر کے علاقوں" میں منقسم نہ کریں گی اور چین کو اپنی حالت پر چھوڑ دینگی وہی فیصلہ تُرکی پر عائد ہونا چاہیئے۔ اِسی تقریر میں کمال پاشا نے مجلسِ ملیّہ کی کارروائی کا ذکر کرتے ہوئے

بیان کیا کہ گذشتہ سال (مختتمہ مارچ ۱۹۲۲ء) میں مجلس کے ۱۶۷ اجلاس ہوئے جن میں ۳۵۹ نشستیں ہوئیں۔ اس سے پہلے سال میں ۱۷۰ قوانین وتجاویز پیش ہوئے ابکی بار یہ تعداد ۳۵۵ تک پہنچ گئی اور علاوہ بریں دس رپورٹیں بھی پیش ہوئیں اور ان پر غور کیا گیا۔

انفرادی کوششیں۔ اہلِ قوم نے سینکڑوں "غیر مجلسی" خدمتیں بھی انجام دیں۔ انہیں اراکینِ مجلس میں بیسیوں نے فوج میں قائد یا کپتان بن کر جنگ میں شرکت کی۔ بعض مشرق کو بعض مغرب کو اہم سیاسی پیغامات لے کر گئے، بعض ایشیا کے مختلف حصّوں میں تفتیش و مطالعہ کرتے رہے۔ بعض مجلس کے آگے آکر فوجی حالت کا خاکہ کھینچتے ہیں اور بعض لوگوں کو بدخواہ دشمنوں کی غلط بیانیوں سے بچاتے رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں کہ فوج کے عقب میں اُس کے حفظانِ صحت اور سامانِ خور و نوش کے انتظام میں مصروف ہوتے ہیں اور چند ملک کے مختلف حصّوں میں عدالت و نظم و نسق کے ضروری فرائض سے سبکدوش ہوکر قوم کے شیرازے کو مجتمع رکھتے ہیں۔ اور پھر وہ ہیں جو خاکِ وطن کے لئے سینہ سپر ہوئے جنہوں نے ملک و قوم کی عزت کو اپنی جانوں سے زیادہ عزیز سمجھا اور میدانِ کارزار میں جا کر دنیا کے عارضی آرام و آسائش کو خیرباد کہی۔

مالیہ۔ لیکن قوموں کے کام فقط جوش و انہماک سے انجام نہیں پاتے۔ اس کل کے چلنے کے لئے اُس تیل کی ضرورت رہتی ہے جسے سیم و زر کہتے ہیں۔ مسلمانوں کی مفلس قوم اس معاملے میں بیکس تھی لیکن غور کیا جائے تو ناداری بھی کچھ اتنی نادار نہیں ہوتی کہ اپنے حقِ زیست کی محافظت نہ کر سکے۔ قوم پرستوں نے مغربی طاقتوں کی شرائط اور بندشوں سے آزاد ہوکر جی کھول کر اہلِ ملک پر ٹیکس لگایا اور محصول کو پانچ گنا بڑھا دیا۔ علاوہ بریں چالیس فی صدی ایک اَور جبری ٹیکس عائد کیا لیکن ابھی بجٹ میں سخت کمی نظر آئی۔ اراکینِ مجلس کو تو اُنکے حلقہ ہائے نیابت کے اوقات سے مشاہرے دیئے گئے مگر بہت سے کم درجہ افسروں کو کبھی تنخواہ میں ایک پائی نہ ملی۔ پھر تعجب ہے کہ حکومت نے کوئی قرضہ نہیں لیا بلکہ اپنا کام کفایت و دُور اندیشی کے ساتھ چلاتے رہے۔ آمد کی بعض مدات میں بجائے زیادتی کے کمی ہوگئی مثلاً شراب نوشی کے قانوناً بند کر دینے کے باعث چالیس لاکھ ترکی پونڈ خسارہ برداشت

پر صرف ہو نگی کہ ہم اپنے پیدائشی اور قومی حقوق کی حفاظت کریں اپنی ہستی اپنے ملک اور اپنی عزت کے بچاؤ میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں اور بالخصوص اس آخری کام میں تو ہمارے قدم کبھی نہ لڑکھڑائیں گے + تہذیب انسانی نے اپنے تازہ ترین بین الاقوامی تعلقات میں یہ صداقت عیاں کر دی ہے۔ کہ سب قوموں کی ہستی اپنے اپنے ہاتھ ہے۔ ہم دُنیا کی سبھی دوسری قوموں کا یہ حق تسلیم کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ یہ ساری قومیں اسی طرح ہمارے حقِ آزادی کو بھی تسلیم کرلیں + جو لوگ ہمارے اس سچے مطالبے کی مخالفت پر آمادہ رہیں پھر اس فتنہ و فساد سے جو خونریزی ہوگی اُس کا الزام ہمارے سر پر نہ رہیگا + ہمکو نہ کوئی ڈرا سکتا ہے نہ بہلا پھسلا سکتا ہے۔ اپنی قوم کی حفاظت کرنے میں ہم فی الحقیقت اپنی جانوں کو بچا رہے ہیں + دُنیا بھر میں کوئی ایک بھی تو چھوٹے سے چھوٹا کیڑا ایسا نہیں کہ اُس کی جان جوکھوں میں پڑجائے تو وہ اپنے اخیر دم تک جان توڑ کر نہ لڑے اور بقائے حیات کی خواہش کو اپنے رگ و ریشہ میں محسوس نہ کرے ؟ کیا ہماری قوم وہ قوم جس کے کارنامے صفحۂ تاریخ کی زینت ہیں اپنے عزم و ثبات میں متزلزل ہو جائے گی یا اس جہد للبقا میں ایک قدم بھی پیچھے ہٹے گی وہ جس کی قوتِ دافعہ کا اندازہ نہیں ہو سکتا جس کی اخلاقی طاقتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں ؟ + بلکہ ہر نئی مشکل جو اس قوم پر آکے پڑتی ہے۔ اُس کی رُوح کے زور و قوت کو دُگنا چوگنا کر دیتی ہے! ہماری فوج جو ہر روز زیادہ مضبوط و قوی ہوتی جاتی ہے جانتی ہے کہ وہ قوم کی آزادی کے لئے لڑ رہی ہے ایسی آزادی جس کی شیرینیاں اناطولیہ ابھی سے مزے لے لے کر چکھ رہا ہے + اگر ہمارے دشمن یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ تُرکی قوم جنگ کرتے کرتے مضمحل ہو گئی ہے تو وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ یاد رکھیں کہ کسی قسم کی کمزوری کسی طرح کا تامل ہمارے اس عزم کو ضعف نہیں پہنچا سکتا کہ ہم اُن بندشوں اور آلایشوں کو جو ہم پر ڈالی جاتی ہیں ہرگز برداشت نہ کریں گے + "اگر تم صلح چاہتے ہو تو جنگ کے لئے تیار رہو" یہ اک پرانا اصول ہے اور اس جنگِ آزادی میں یہ ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہنا چاہیئے + عزیز و محترم بھائیو! ہماری آخری فتح کا بہترین ثبوت قومی مجلس کی یک جہتی اور اُس جوش و انہماک میں ہے جن کے ساتھ ہم اپنے پے در پے مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے

رہے ہیں۔ صاحبو! اگر ہم اُن نتائج کو دیکھیں جو گذشتہ دو سال میں بتدریج ہماری کوشش کے باعث مترتب ہوئے ہیں تو ہم اطمینان سے کہہ سکتے ہیں کہ ظفر مندی کا زمانہ اب بہت دُور نہیں۔ اس نئے سال کے ساتھ ہماری خود اعتمادی اور ہماری تسکین بڑھ گئی ہے اضمحلال کا کہیں نام نہیں اور عزم و یقین بات بات میں پیدا ہیں۔ ہم کڑے دل کے ساتھ اُس مطمحِ نظر کی طرف پیش قدمی کریں گے جو ہمارے لئے شعلۂ مقدس سے کم نہیں اور جو آنے والی نسلوں کے لئے اپنے اندر اُمیدِ فلاح کو مستور رکھتا ہے۔ یہ ہمارا پیارا وطن کیسے تباہ ہو سکتا ہے؟ اسے تباہ نہ ہونا چاہیئے! اگر بفرضِ محال خدا نہ کرے وہ برباد ہو جائے تو کیا یہ دُنیا اُس کے مُردہ جسم کا بارِ گراں اُٹھا سکے گی۔

بشیر احمد

عصمت پاشا

عصمت پاشا ۱۸۸۲ء میں بمقام سمرنا پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک زمیندار تھا۔ جنگِ عظیم میں عصمت پاشا جرمن جنرل لیمان فون سونڈرز کے تحت میں نہایت کامیابی کے ساتھ کام کرتا رہا۔ آغازِ جنگ کے دنوں میں وہ دردانیال میں انور پاشا کے ساتھ جنگی مقامات کا معائنہ کرتا رہا اور اِس معائنہ میں اُس کی فہم و فراست نمایاں ہوئی۔ بعد میں اُسے قفقاز کے محاذ پر بھیجدیا گیا جہاں اُس نے بار بار جرمن افسروں کو اپنی فوج میں لینے سے صاف انکار کر دیا۔ جب التوائے جنگ والی وزارت مقرر ہوئی تو عصمت پاشا کو وزیرِ جنگ کا ایک نائب بنایا گیا۔ پھر داماد فرید کے کابینہ میں وہ مجلس فوجی میں ناظم اعلیٰ ہو گیا۔ یہاں سے وہ مارچ ۱۹۲۰ء میں مستعفی ہو کر کمال پاشا سے جاملا کیونکہ وہ بھی اُن ترکانِ احرار میں سے تھا جنہیں اتحادیوں کا قسطنطنیہ پر قبضہ کئے رہنا سخت ناگوار تھا۔ وہ افواجِ انگورہ کے جنرل اسٹاف کا چیف مقرر ہوا اور بعد میں مغربی محاذ پر قائد بنا دیا گیا۔ جنگ کے چوتھے اور آخری دور میں عصمت پاشا ہی ترکوں کا قائد تھا اور یونانیوں کی شکست و فرار میں اُس کے استقلال و فراستِ جنگی کو بہت دخل تھا۔ مدانیہ کانفرنس میں جو التوائے جنگ کے لئے اکتوبر گذشتہ میں منعقد ہوئی تھی عصمت پاشا کی خوش مزاجی اور صاف گوئی کی انگریزی افسر سر چارلس ہیرنگٹن نے بہت تعریف کی۔ نومبر میں عصمت پاشا نے لوزان کانفرنس میں ترکی سفیرِ صلح کی حیثیت سے حصہ لیا۔

د ب

غازی مُصطفیٰ کمال پاشا

ابتدائی حالات۔ مصطفیٰ ۱۸۸۰ء میں پیدا ہُوا۔ اُس کے آباو اجداد مشرقی رومیلیا کے رہنے والے تھے۔ اور خود اُس کی صورت و سیرت میں اُس علاقے کے باشندوں کی بہترین خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ وہ ایک پتلا دُبلا آدمی ہے لیکن چُست و چالاک۔ اُس کی نظر ہر بات کو پل میں تاڑ جاتی ہے۔ اور یہ اُس کی فطرت ہے کہ جو کام کیا جائے وہ پوری طرح سے انجام کو پہنچے۔ اُس کا باپ محکمۂ محصولات میں ایک معمولی افسر تھا۔ وہ جوانی ہی میں اپنے بال بچوں (پس ماندگان میں اس کی بیوہ ایک بچی اور ننھا مصطفیٰ تھے) کی معاش کے لئے کچھ کئے بغیر مرگیا اور مصطفیٰ کو دُنیا میں پھولنے پھلنے کے لئے آپ ہی ہاتھ پاؤں مارنے پڑے۔ سب سے پہلے وہ سالونیکا کے ابتدائی مدرسے میں داخل ہُوا اور وہاں سے وظیفہ پاکر اس قابل ہوگیا کہ مناستر کے ثانوی مدرسے میں تعلیم حاصل کرے۔ ابھی نوعمر ہی تھا کہ اُسے قسطنطنیہ کے مدرسۂ حربیہ میں جو ترکی فوجی افسروں کے لئے مخصوص ہوتا تھا جگہ مل گئی۔ زمانۂ تعلیم ہی میں اُس کی زبردست شخصیت نمایاں ہونے لگی۔ اوروں کو یکجا کرنے اور ہر شخص سے اُس کا خصوصی کام کرانے کی قابلیت اُس میں شروع ہی سے عیاں تھی۔ اُس کی شگفتہ مزاجی و خوش طبعی کا ہر کہ و مہ دلدادہ تھا۔ وہ دوستوں کا سچا اور پکا دوست تھا لیکن کوئی رفیق اُس پر بُرا یا اچھا اثر نہ ڈال سکتا تھا۔ طبیعات اور ریاضی کا اُسے خاص ذوق تھا اور یہ ذوق اُس انضباطِ قلبی کا اک نتیجہ تھا جو عمر بھر اُس کے ہر کام میں ظاہر ہوتا رہا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس زمانے میں مصطفیٰ کی طبیعت میں شعریت کا مادہ بھی موجود تھا چنانچہ وہ فرصت کے اوقات میں ترکی حکومت کی مطلق العنانی اور جور و استبداد کے متعلق شعر لکھا کرتا اور آزادی اور حیات و ممات اور محبت کے ترانے گاتا۔ کوئی ہم مکتب نوجوان اپنی شخصیت کو اس قدر ربط و ضبط کے ساتھ برقرار نہ رکھتا تھا جیسا کہ ترکی کا یہ محبِّ وطن!

سلطان عبدالحمید کو ایسے دلدادگانِ حریت سے خاص طور پر نفرت تھی۔ مصطفیٰ خفیہ

طور پر ایک اخبار نکالا کرتا تھا۔ اُس کا رہائشی مکان خفیہ انجمنِ آزادی کا دفتر بھی تھا۔ صرف اس کا ایک دوست اس کے ساتھ رہتا تھا۔ جس روز اُس نے حربیہ مدرسے کا آخری امتحان پاس کیا۔ سُلطانی طلبی کا فرمان آپہنچا۔ تین ماہ کی عید کے بعد اُسے دمشق میں جلاوطن کردیا گیا + یہاں رہ کر اُس نے ۱۹۰۲ء میں شامی سیاسیات میں حصہ لینا شروع کیا اور انجمنِ حریت کا رُکن و ناظم بنگیا حمیدی دستِ شفقت پھر اُس کی طرف بڑھا اور سخت احکام صادر کر کے اُسے یافہ میں بھیجدیا + یہاں سے بھاگ کر وہ اسکندریہ پہنچا اور وہاں سے پھر سالونیکا کا رُخ کیا + سالونیکا میں وہ آٹھ ماہ تک روپوش ہو کر باغی کمیٹیوں کی کارروائی میں حصہ لیتا رہا + دوستوں کے کہنے سننے سے سلطان نے اُس در گذر کیا اور وہ سالونیکا ہی میں سرکاری فوج میں افسر مقرر کر دیا گیا۔ پھر بھی وہ اپنے قومی آزادی کے کام کو نہ بھُولا اور انور پاشا جمال پاشا اور فتحی بے کے ساتھ مل کر اُس نے ۱۹۰۸ء کی تحریک کی بنا ڈالی اور ترکی قوم کو استبداد کے پنجے سے چھُڑانے میں معتدبہ حصہ لیا + لیکن انور پاشا اور اُس میں سخت اختلافات پیدا ہو جانے کے باعث وہ سیاسی معاملات سے علیحدہ ہو گیا + ۱۹۰۸ء کا انقلابِ قومی جس سے برطانیہ کی ہمدردی طلب کی گئی تھی قطعی ناکام رہا اور ترک ترقی کے لحاظ سے جہاں تھے وہیں رہے + مصطفٰے کمال (پہلے اُس کا نام صرف مصطفٰے تھا زمانۂ تعلیم میں اُس کے معلم ریاضی نے اُس کی قابلیت دیکھ کر اُسے کمال کا لقب دیا) مصطفٰے کمال اُن لوگوں میں سے ہے جن کی سیرت کا جزوِ اعظم صبر و ضبط اور استقلال ہوتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی کام کو شروع کر دیتے ہیں تو جب تک وہ تکمیل کو نہ پہنچ لے اپنے ارادے سے باز نہیں آتے۔ کمال نے ان خطرناک دنوں میں بہتر یہی جانا کہ اپنے آپ کو جس قدر ہو سکے تشہیر سے بچائے اور گمنام لوگوں میں جگہ پالے۔ کام اَور کرتے تھے تجویز و تحریک اس کی ہوتی تھی + اُسے یقین تھا کہ مستقبل میں مجھے ملک کے لئے بہُت کچھ کرنا ہے۔ ضرورت نہیں کہ میں اپنے جوش کو نازک وقتوں میں ظاہر ہو جانے دوں۔ اور بن جانے والا کھیل پہلے ہی بگاڑ لوں + وہ محمود شوکت پاشا کی فوج کا سب سے بڑا افسر تھا۔ جب کہ شوکت نے قسطنطنیہ کی طرف پیش قدمی کی اور پُرانی حکومت کو جڑ سے اُکھیڑ دیا۔ مصطفٰے کمال نے اِس فوج کو اپنے خیالات کے مطابق اصلاح و ترتیب دی +

دورِ جدید میں وہ فوج کی جنگِ مصنوعی میں قائد مقرر ہوا۔ ۱۹۱۰ء میں اسی سلسلے میں فرانس گیا۔ جہاں اُسے پہلی بار فرانساوی زندگی اور فرانساوی خیالات سے واقفیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں وہ انور اور فتحی کے ساتھ جنگِ طرابلس میں لڑتا رہا لیکن جلد ہی ان سب کو یورپ میں جنگِ بلقان چھڑ جانے پر لوٹنا پڑا۔ اس جنگ میں ملک کے لئے ہزاروں مشکلات کا سامنا تھا اور ہر طرف بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ مصطفیٰ کمال ان دِنوں درِ دانیال میں ایک حصۂ فوج کا سرکردہ تھا۔ مادام گوبیس جسے مصطفیٰ کمال نے خود اپنی زبانی اپنی کہانی سُنائی ہے لکھتی ہے کہ یہیں سب سے پہلے مصطفیٰ کمال اور انور پاشا میں وہ اختلافات پیدا ہوئے جو جلد ذاتی عداوت کی حد تک پہنچ گئے۔ جنگ کے بعد فتحی بے بلغاریہ میں ترکی حکومت کی طرف سے سفیر مقرر ہوا اور مصطفیٰ اُس کا اٹاچی ہو کر اُس کے ہمراہ گیا۔

کمال درِ دانیال میں۔ لیکن تھوری ہی مدت کے بعد جنگِ عظیم چھڑ گئی اور سلطنتِ عثمانیہ بھی اُس میں شریک ہوئی۔ مصطفیٰ کمال کو حکم ملا کہ درِ دانیال میں جا کر فوج کے ایک دستے کی تنظیم و ترتیب کرے۔ یہ دستہ صرف نام کو موجود تھا اور کام جو اُسی کے ذمے دیا گیا۔ مشکلات سے لبریز تھا۔ درِ دانیال اس وقت سب سے زیادہ خطرناک مقام تھا۔ اور اتحادیوں نے اپنی تمام بحری کوششیں صرف کر دیں تاکہ اس مقامِ مدافعت کو اپنے زور و قوت سے منہدم کر کے ترکی دارالسلطنت پر جا ڈٹیں۔ انور پاشا اور جرمن افسر سر توڑ کوشش کرتے تھے کہ حملہ آوروں کو روکا جائے لیکن بات بنتی نظر نہ آتی تھی۔ طرّہ یہ کہ ان تمام اہم و دشوار کارروائیوں میں مصطفیٰ کمال کی رائے اَور تھی اور ان مشہور جنگی مدبروں کی قطعی اَور۔ شروع ہی سے اُس نے اتحادیوں کو ساحل پر فوجیں اُتار دینے سے روکے رکھا اور مدافعت میں کوئی دقیقہ باقی نہ چھوڑا۔ فوج میں وہ غایت درجہ ہر دلعزیز تھا اور ہر معرکے میں وہ اپنے جنگجوؤں کے خون کے ایک ایک قطرے کو عزیز جانتا تھا۔ فوج یہ جانتی تھی اور اُس کی دل سے قدر کرتی تھی۔ اُس کا مرتبہ تھوڑے ہی دنوں میں بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ اور اُس کا رُتبہ بڑھائے بغیر اُسے زیادہ فوجوں کا کمانڈر بنا دیا گیا۔ سونے پر سہاگا

یہ کہ اتحادیوں کا حملہ ایسے منصوبۂ جنگ کے مطابق کیا گیا جو انور پاشا اور جرمن افسروں کی امیدوں کے خلاف لیکن مصطفیٰ کمال کے خیالات کے عین مطابق نکلا۔ اسکی دُوراندیشی اُنکی ذکاوت پر سبقت لے گئی۔ اور جب سب سے زیادہ خطرے کا وقت آپہنچا اور جرمن افسرِ اعلیٰ بھی کامیابی کو ہاتھ سے جاتا دیکھ کر مایوس ہو چلا تو اُس نے اس آڑے وقت میں مصطفیٰ کمال سے کہا کہ اب کیا کیا جائے؟ کمال نے جواب دیا کہ "فوجوں کی قیادت سب میرے ذمے کر دیجئے تو میں بگڑی ہُوئی بات کو بنانے کی کوشش کر سکتا ہوں"۔ جرمن افسرِ اعلیٰ نے اپنی جگہ خالی کر دی اور مصطفیٰ کمال نے ایسی دانشمندی سے کام لیا کہ صبح ہوتے تک معاملہ دگرگوں تھا۔ ایک لاکھ ساٹھ ہزار جنگجو اُس کی کمان میں تھے۔ لیکن سرکاری بیانات میں اُس کی خدمات کا کہیں ذکر تک نہ تھا۔ ابھی جنگی حالت کچھ سُدھری ہی تھی کہ اُس کے افسروں نے متفق الرائے ہو کر اُسے درِ دانیال سے اُٹھا کر قفقاز کے محاذ پر بھیجدیا جہاں اُس نے مسلمانوں میں سلسلۂ اتحاد قائم کر کے اُنہیں دشمن کے مقابل میں لاکھڑا کیا۔ اس کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف کُردستان میں لڑتا رہا اور پھر ساتویں ترکی فوج کے ساتھ فلسطین میں شامل ہُوا۔ جرمن جنرل فالکن ہائین اور انور پاشا سے یہاں وہ برسرِ پرخاش رہا اور جب جرمن جنرل کا ارادہ بغداد کی طرف پیشقدمی کرنیکا ہُوا تو مصطفیٰ کمال نے اس منصوبے سے شدّت کے ساتھ اختلاف کیا اور اُسکی بات نہ مانی گئی تو اپنا استعفا پیش کر دیا۔

کمال کی عاقبت اندیشی۔ ابکی بار وہ حلب میں منتقل کر دیا گیا جہاں ۲۰ ستمبر ۱۹۱۷ء کو ایک عرضداشت میں جو اُس نے طلعت اور انور کے سامنے پیش کی اُس نے اپنی تشویش و بیزاری کے وجوہات پر روشنی ڈالی اور کہا کہ "جنگ نے ہمارے ملک کے تمام عناصر کو تباہ و برباد کر دیا ہے۔ غیر جنگجو رعایا حکومت سے بیزار ہے اور دیوانی تنظیم و تنسیق کا خون ہو چکا ہے۔ اگر جنگ جاری رہی تو سُلطان کا اقتدار ہمیشہ کے لئے مٹ جائیگا"۔ مصطفیٰ کمال کو اتحادیوں کی آخری فتح کا یقین تھا۔ اس کی وجوہات اُس نے مفصل طور پر بیان کیں اور کہا کہ ترکی فوجیں مضمحل ہو چکی ہیں مغربی محاذ، قفقاز، عراق، سینا، حجاز

تُرک کہاں کہاں لڑیں گے اور ہم کہاں کہاں سے دشمن کو نکال دینے کی سعیِ لاحاصل میں مصروف رہیں گے اور پھر کب تک ؟ انگلستان کی زبردست طاقت کا مرکزِ اسلام میں جم جانا، فلسطین میں عیسائی حکومت کا ظہور، ہمیشہ کے لئے مصر سویز اور بحرِ قلزم پر انگریزی تسلط ہو جانا، تُرکی سلطنت کا اپنی مذہبی قوتوں کو کھو بیٹھنا یہ ہمارے لئے ایسے صدمات ہونگے کہ ہماری طاقت پاش پاش ہو جائے گی + ہمیں اپنے ذرائع و وسائل کو اخیر تک بچائے رکھنا چاہیئے اور جرمنوں کا ڈر دل سے نکال کر صرف حقیقی مفاد ہی پر نظر رکھنی چاہیئے + یہ میں سمجھتا ہوں کہ بالفعل ہم اس مصیبت سے نکلنے کے لئے جرمنی ہی سے استمداد کر سکتے ہیں لیکن میں اس کی شدید مخالفت کرتا ہوں کہ وہ اس بات سے فائدہ اٹھائیں اور جنگ کے بعد ہمارے مُلک کو اپنی نوآبادی بنا کر اُس کی ساری دولت و ثروت اپنے میں جذب کرلیں +

اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ مستقبل کی کون تصویر کھینچ سکتا تھا۔ زمانۂ جنگ کے دوران ہی میں ترکی قوم کا سچا نمائندہ بن کر وہ مغربی طاقتوں کی خودغرضی کو اپنی آنکھوں دیکھ رہا تھا۔ اُس نے جرمنی کے زہریلے اثر کو محسوس کیا جیسا کہ جنگ کے تھوڑی ہی مُدت بعد اُس نے انگلستان کی ریشہ دوانیوں کو بھی تاڑ لیا + اُس کی پالیسی ہمیشہ ترکی مفاد کی پالیسی رہی ہے وہ نہ جرمنوں سے محبت رکھتا تھا نہ انگریزوں سے وابستہ ہے اور نہ اِن قوموں سے نفرت کا اظہار کرتا ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ جو دولتِ یورپ ترکی سلطنت کو اپنے حال پر چھوڑ دے وہ تُرکوں کی بہی خواہ ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اُس سے تُرک عداوت رکھیں۔ عرصۂ حیات میں وہ اپنا حقِ زیست قائم کریں، غیروں کو وہاں دخل پانے سے روکے رکھیں کسی کی ظاہرا یا چھپی حکومت یا حکم برداری کو نہ مانیں۔ گھُسنے والے اجنبی کو زورِ شمشیر سے اپنے علاقے سے باہر نکالنا قومیت کا پہلا فرض سمجھیں۔ مُلک کے نااستعمال شدہ وسائل کو استعمال میں لائیں، شعبہ ہائے تعلیم وصنعت کو ترقی دیں۔ کسی کی نقل نہ اُتاریں کسی کے قدم بقدم نہ چلیں بلکہ اپنی ہی فطرت کے مطابق اپنی قوتوں کو منزلِ ارتقا کی طرف لے چلیں۔ دُنیا میں آزاد رہیں اور آزادی کے ساتھ دُنیا میں دوستانہ تعلقات قائم کریں +

یہ رپورٹ جرمن افسروں نے دیکھی تو وہ مصطفٰے کمال پر دانت پیسنے لگے اور غصے میں

آکر اُسے مشرقی محاذ پر بھیجدیا جہاں اُس نے روسیوں سے متعدد مقامات چھین لئے۔ اس وقت قسطنطنیہ میں موجودہ سلطان محمد ششم تخت پر جلوہ افروز ہُوا۔ کمال اُسے ذاتی طور پر جانتا تھا۔ موقع پاکر طلعت اور انور کے خلاف سلطان کے حضور عرضداشت کی کہ اُن کے غیر محدود اختیارات کو کم کیا جائے۔ جنگ کی صورت بد سے بتر ہو رہی تھی۔ ترک اور جرمن اعلےٰ افسروں نے باتفاق رائے کمال کی خدمت میں درخواست کی کہ وہ اپنے گرتے ہُوئے ملک کو سنبھالے۔ اُسے فلسطین کی طرف بھیجا گیا جہاں ایلنبی کی بڑھتی ہُوئی فوجوں کے سامنے اُس کی مراجعت ایک فتح کے برابر سمجھی گئی ہے۔ یہاں سے اُسے بغداد کی طرف بھیجا گیا کہ اُس شہر کو جلد سے جلد تسخیر کرے۔ اُس کی مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی کیونکہ اُسے یقین تھا کہ وہ اس مہم کو سر کرلے گا۔ بدقسمتی سے جب اُس نے پہلی منزل پر مقام کیا تو اُسے خبر ملی کہ سلطنت عثمانیہ نے اتحادیوں کے آگے بلا شرط ہتھیار ڈالدیئے ہیں۔ وہ غصے سے بے تاب ہوگیا اور قسطنطنیہ میں اُس روز پہنچا جب اتحادیوں کی فوجیں وہاں داخل ہو رہی تھیں۔ فرانس کا رویہ سرد مہری اور زبردستی کا تھا چنانچہ کمال کو خیال پیدا ہُوا کہ ترکوں کو انگلستان سے دوستی پیدا کرنی چاہیئے سال بھر وہ دارالسلطنت میں مقیم رہا اور حالات کو جانچتا رہا۔

کمال کا اخراج قسطنطنیہ سے۔ مصطفےٰ کمال نے دیکھا کہ اتحادی اُس کے وطن کو پاؤں تلے روندے ڈالتے ہیں۔ اُس نے خود سلطان کے پاس جاکر اپنے خیالات کا اظہار کیا اور خطرات سے آگاہ کیا۔ اس پر انگریزی خفیہ پولیس اُس کے درپے ہوگئی اور داماد فرید کی وزارت کو حکم دیا گیا کہ اس ناشکرے کو دارالخلافے سے کہیں دُور بھیج دیا جائے۔ انہوں نے اپنے حاکموں کے حکم کو سر آنکھوں پر جگہ دی اور کمال کو مشرق میں افواج ترکی کا انسپکٹر مقرر کرکے قسطنطنیہ سے نکال دیا۔ کیا تھا کچھ اور ہوگیا کچھ اور! یہ کسے خبر تھی کہ یہ فریادی ایک روز باغی بننے والا ہے۔ اور یہ جسے فوجوں کے معائنے کے واسطے بھیج رہے ہیں جلد ہی اُن کا ناظم و قائد بن کر میدانِ جنگ میں اُترنے والا ہے؟ علاج نے خود مرض پیدا کردیا۔

جنگی کامرانی۔ اوپر بیان ہوچکا ہے کہ کس طرح کمال کی رہنمائی میں چند منچلے اور جانفروش اہلِ وطن نے اناطولیہ میں قومی تحفظ کا سامان فراہم کیا۔ کیسے ایک منزل سے دوسری منزل تک وہ

استقلال کے ساتھ بڑھتے گئے۔ کامرانی نے اُن کے قدم لئے۔ بتدریج ترکوں نے ارمنوں فرانسیسیوں انگریزوں اور یونانیوں کو پسپا کیا اور بتدریج وہ خاکِ وطن کو اُن کی زبردست گرفت سے چھڑاتے گئے۔ فوج جو پہلے چند پرانے تھکے ماندے ترکی سپاہیوں سے شروع ہُوئی اُس میں آہستہ آہستہ ایشیائے کوچک کے شہر و دیہات کے تاجر اور کسان شریک ہُوئے اور وہ کمال اور فوضی کی انتظام بندی کے ساتھ یورپ کی بہترین فوجوں سے ٹکر کھانے لگی۔ پہلے صرف چند بے قاعدہ رضا کار رہی تھے بعد میں حکومتِ قسطنطنیہ کے مقرر کردہ فوجی افسر جوق جوق قومی فوج میں داخل ہونے لگے۔ رضا کاروں نے بُرا مانا کہ یہ بعد کے آئے ہُوئے ہم پر سبقت لے جائیں لیکن جلد ہی تاڑ گئے کہ یہ نفاق و برتری کا وقت نہیں۔ فوج قطعی طور پر متحد ہو گئی اور اہلِ وطن نے بھی اس کی پشت پناہ بن کر یک جہتی اختیار کر لی اور اس طرح یک دل و یک سو ہو کر غنیم کے مقابلے میں آ کھڑے ہُوئے۔ حکومت نے قومی خدمت کی دعوتِ عام دی۔ اٹھارہ برس سے کم عمر کے نوجوان اور پینتالیس برس سے زیادہ عمر کے بوڑھے شریک ہو گئے۔ اشتہاروں تقریروں اور جلوسوں کے ذریعے سے لوگوں کو آئے دن ترغیب دی جانے لگی کہ آؤ تمہارا وطن تمہیں طلب کرتا ہے! انگورہ کے بازاروں میں رنگروٹوں کے دستے نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں عورتیں اپنے مردوں کے لئے آخری تحفے لے کر کھڑی ہُوئی دکھائی دیتیں اُن کے لئے جنہیں مادرِ وطن کی پاسداری کی خاطر شائد ہمیشہ کے واسطے اپنے سے جُدا کر دیا ہے۔ حکومت اِن لوگوں کو نہایت ہی مختصر سی وردی دے سکتی تھی اور انکے فوجی تھیلے میں بجز تھوڑی سی روٹی اور گولیوں کے اَور کچھ سامان نہ ہوتا تھا۔ روٹی اور گولیاں! اور ان میں بھی ضرورت آ پڑے تو پہلے گولیاں پھر روٹی۔ روٹی رہے نہ رہے گولیوں سے تھیلا ضرور بھرا رہے۔ بارود اور دیگر ذخائرِ حرب کچھ تو سرحد پر ادھر اُدھر سے چھینے گئے۔ باقی اطالویوں اور روسیوں کے توسط سے ملک میں لائے جانے لگے۔ مشکل یہ آ پڑی کہ یہ سامانِ حرب پرانے بچے کھچے آلاتِ حرب میں استعمال نہ ہو سکتا تھا۔ بصد دشواری پُرانے گولوں کو توڑ پھوڑ کر انہیں درست کیا اور توپوں کو اپنے کارخانوں میں از سرِ نو ڈھالا اور مفید کار بنایا۔ کلیئر پرائس لکھتا ہے کہ موجودہ جنگی تاریخ میں غالباً اس سے زیادہ تعجب انگیز کارنامہ اور کوئی نہیں

کہ ترکوں نے کیسے پرانی اُکھاڑی ہوئی توپوں اور بیکار ذخائرِ حرب کو نئے فوجی کام کے لئے تیار کیا۔ ایشیائے کوچک کے فلاکت زدہ علاقے کے لئے یہ ایک شدید بار تھا لیکن اس کی تکمیل بلاشبہ ایک معجزے سے کسی طرح کم نہ تھی +

کمال کی سیرت و شخصیت ۔ یہ سب کچھ اُس سراپا ایثار و شجاعت ہستی کی مستقل مزاجی اور مردم شناسی کا نتیجہ ہے جو انگورہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ان کڑے وقتوں میں اپنے وطن کی محافظ رہی ہے! کمال پاشا کو یہاں ایک رُکنِ مجلس نے یہ محل پیشکش کیا۔ کمال نے اسے فوج کی نذر کر دیا اور خود اس میں اپنے جنگجوؤں کا مہمان بن کر رہنے لگا + اپنی ذات کے لئے کسی شئے کا حصول اُس کے اصول کے خلاف ہے + یہاں وہ دن رات اپنے مُلک کی خدمت میں منہمک رہتا ہے + تمام بڑے رہنماؤں کی طرح اُس کے اوقات مقررہ ہیں۔ وہ سویرے ہی اُٹھتا ہے۔ اراکینِ مجلس اور وزرا اس سے ملنے کے لئے انگورہ سے آتے ہیں اور وہ ان سے ملاقات کرتا ہے اور دن کا نصفِ اول دیوانی اور فوجی کاموں کے متعلق مشورے میں صرف ہو جاتا ہے + ایک دو بجے کے درمیان وہ انگورہ جاتا ہے اور وہاں اجلاسِ مجلس اور دوسری مصروفیتوں میں حصّہ لے کر ڈیڑھ دو پہر رات گئے اپنے مکان کی طرف لوٹتا ہے + وہ لوگوں سے الگ تھلگ رہ کر اُن پر حکمرانی نہیں کرتا۔ کبھی کبھی اپنے محل چانکیہ سے نکل کر قرب وجوار میں سیر کے لئے تنِ تنہا نکل جاتا ہے اور بے اطلاع دیئے دوستوں اور عام لوگوں کے دروازے جا کھڑا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ اُسکے ایک مخالف نے کہا کہ "وہ نیک دل ہے صادق اور نیک دل ایسا جیسا کہ کوئی اور شخص نہیں ہے" اُس کی نیکی اور صلح جوئی مسلّمہ ہے۔ وہ خون بہانے کو گناہِ کبیرہ سمجھتا ہے اور اس خیال سے کانپ اُٹھتا ہے لیکن بااین ہمہ وہ کمزوری کا اظہار نہیں کرتا۔ برائی اس کی سنگین گرفت سے رہائی نہیں پا سکتی + وہ ایک ان تھک جنگجو ہے اپنے فوجی کام میں ہمہ تن منہمک وہ اس بات سے قطعی بے پروا ہے کہ لوگ اُس کی نسبت کچھ بھی کہا کریں، نیت کا صاف، اِس بات سے ناآگاہ کہ وہ تعریف کا مستحق ہے، اپنے جذبۂ رحم کو اس طرح چھپائے ہوئے جیسے کہ کوہستانی گھاٹی کسی چشمے کے پانی کو اپنے پہلو میں چھپائے رہے، ایک ہی وقت میں

صابر اور خوش مزاج، دوستوں کا پکا دوست لیکن اُن کے اثرِ صحبت سے قطعی محفوظ۔ وہ کبھی کسی دوست کو نہیں سراہتا لیکن اُس پر مُصیبت ٹُوٹ پڑے تو بات بات میں اُس کا ہاتھ بٹانے کو تیار رہو جاتا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ خوشی اس بات سے ہوتی ہے کہ اپنے سے زیادہ بڑی قوت سے مصروفِ پیکار ہو۔ جنگ کرنے کا منصوبہ وہ پہلے سے تیار کر لیتا ہے۔ پھر دشواریوں پر کامل عبور حاصل کر کے وقت آئے پر زبردست و شدید حملہ کرتا ہے۔ اُسے شان و شکوہ سے نفرت ہے وہ ڈینگ مارنا نہیں جانتا لیکن عزت کرانا جانتا ہے اور یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ کہ کوئی جان بوجھ کر اُسے نظرانداز کرے۔ وہ زندگی کی نعمتوں کی قدر کرتا ہے خوبصورت قالین اور سامانِ آرایش، مجلّد و مُطلا کتابیں، موسیقی، شعر و سخن وہ اِن سب کے حسنِ ظاہر و باطن سے محظوظ ہوتا ہے لیکن بوقتِ ضرورت ایک کسان کے جھونپڑے میں بھی خوش ہے اور اسی کو خدا کا بہترین عطیہ سمجھتا ہے!

وہ جب باتیں کرتا ہے تو اُس کی طرزِ گفتگو مُدلل اور سنجیدہ ہوتی ہے اور ہر فقرے میں اک آہنی عزم اور اک زریں دلکشی پائی جاتی ہے۔ برمحل فقرے بیان کی صفائی اور دوسرے کے اعتراض کو پہلے سے تاڑ لینے کی قوت حیرت انگیز ہے۔ اُس کی فہم غایت درجہ حساس واقع ہُوئی ہے۔ وہ بعض لمحات میں سراپا سادگی ہوتا ہے اور بعض میں مجسم معمّا! اپنا کام وہی بیان کر سکتا ہے۔ اور کسی قدر جوش و انہماک کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ انصاف پسندی اُس کے بُشرے میں کھیلتی ہے، قوتِ فیصلہ کی پہنچ اور تیزی آنکھوں میں عیاں ہے، چہرے پر خوش اخلاقی لہلہاتی ہے اور منہ سے خوش کلامی کے پھُول جھڑتے ہیں اور پھر اِن سب کے ساتھ ایک رہنمائے قوم کا جلال اُس کے سراپا میں اِس طرح صورت اختیار کئے ہُوئے ہے کہ دیکھنے والا شوکتِ قوم کو اپنی آنکھوں دیکھ سکتا ہے۔

مشہور انگریزی قائد جنرل ٹاؤن زینڈ لکھتا ہے کہ کمال کو فوج اور رعایا دونوں محبوب رکھتے ہیں۔ اناطولیہ میں تو ایک فرد بھی ایسا نہیں جو اُس کا پیرو نہ ہو۔ قسطنطنیہ میں بھی ۹۰ فیصدی اُس کے ساتھ ہیں۔ اُس کا ہر حُکم قانون کا درجہ رکھتا ہے اور لوگ اُس کا کہنا سر آنکھوں سے بجا لاتے ہیں۔ اُس کی نیلی نیلی آنکھیں بھورے بھورے بال اور ترشی ہوئی چھوٹی مونچھیں

خوشنما ہیں۔ اُس کا ملبوس سادہ ہوتا ہے۔ وہ بہت کم بولتا ہے لیکن جب کسی ایسے معاملے پر رائے زنی کرے جس سے اُسے خاص دلچسپی ہو تو فصیح و بلیغ بن جاتا ہے + ایک رات ہم اکٹھے کھانا کھا رہے تھے کہ ہم نپولین کے محاربۂ آسٹر لٹز پر بحث کرنے لگے۔ اس پر ہم دونوں کا اتفاق رائے تھا کہ نپولین کا غنیم کے قلب پر حملہ کرنا اس لڑائی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی اور اس طرزِ جنگ کی درستی اور صحتِ اصول آج سو برس کے بعد بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اُن دنوں میں تھی۔ کمال نپولین کی یلغارِ اطالیہ (۱۷۹۹ء) کا بڑا مداح ہے اور جنگی تاریخ پر اُسے کامل عبور حاصل ہے + وہ محنت اور کام سے کبھی نہیں اُکتاتا اور نہ کبھی تھکتا ہی ہے + اُسے یورپین سیاسی حالات سے پوری آگاہی ہے اور وہ مغربی مدبرین کی ریشہ دوانیوں کو خوب سمجھتا ہے + وہ ایک محبِّ وطن ہے۔ وہ اپنے ملک کی رہائی اور آزادی چاہتا ہے۔ ترکی ترکوں کے لئے یہ ہے اُس کا اصول۔ وہ صلح کا خواہاں ہے لیکن صرف ایسی صلح کا جو قومی مفاد کے خلاف نہ ہو۔ اُس کی کامیابی کے تین صریح اسباب ہیں۔ وجدان دُوربینی اور مطالعہ + مشاہدے کی قوت انتہائی حد تک موجود ہے اور کوئی شئے اتفاقِ محض پر نہیں چھوڑ دی جاتی + اپنے پر اُسے کامل اعتماد ہے اور اُسے اپنی خوش قسمتی کا یقین ہے لیکن وہ عجلت میں کسی بات پر نہیں جھپٹتا بلکہ اپنے صبر و خموشی سے دشمن کو تھکا کر چُور کر دیتا ہے حتیٰ کہ پیشقدمی کی ساعت آ پہنچے پھر وہ مخالف پر ایک پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑتا ہے اور اُسے ملیا میٹ کر دیتا ہے!

کسی کو اُس کے دل کے سب خیالات کا پتہ نہیں ہاں! جب اظہار کا وقت آتا ہے تو اسکا طرزِ بیان انوکھا اور اس کی منطق لاجواب ہوتی ہے۔ مجلس اُس کے سامنے غلامانہ روش اختیار نہیں کرتی لیکن جب وہ بولتا ہے تو ایوان کے در و دیوار سے خاموشی برستی ہے اور توجہ ہر رُکنِ مجلس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائے رہتی ہے۔ جہاں کسی دشواری کا سامنا ہوتا ہے اور رائوں میں اختلاف پیدا ہو کر طریقِ عمل دکھائی نہیں دیتا تو بلا ارادہ سب کے دل میں یہی خیال اُٹھتا ہے کہ پاشا کی رائے اس کی نسبت کیا ہے؟

وہ روئے زمین کے تمام مسلمانوں کو اکسا کر ایک عظیم الشان اسلامی ریاست قائم کرنیکا ہرگز خواہاں نہیں اگرچہ اسلامیوں اور تمام ایشیا والوں کے لئے وہ خود اختیاری کا حق ضرور

چاہتا ہے۔ وہ ایک تُرک ہے اور سب سے پہلے وہ ترکوں کی قومی ہستی کو بچانے کا آرزومند ہے۔ وہ ایک مسلمان ہے اور مسلمانوں کی گری ہُوئی ملّت کو شاہراہ ترقی کی طرف لے جانیکی تمنا رکھتا ہے۔ وہ ایشیا کا رہنے والا ہے اور سمجھتا ہے کہ ایشیا کو جلد ایک روز دائرۂ تہذیب میں یورپ کے دوش بدوش کھڑا ہونا ہے۔ اُس کا منصوبۂ قوم سازی اس قدر سادہ درست اور مکمل ہے کہ خالص اسلامی ریاستیں یقیناً مستقبل قریب میں اُس کے خیالات کو اپنا اصولِ کار بنالیں گی۔

وہ ترکوں کی بعض گذشتہ فروگذاشتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس پر راضی نہیں ہوسکتا کہ مخالفین ان الزامات میں رنگ آمیزی کرکے ترکوں کی اس قومی زندگی کو اُن سے غصب کریں جو ہر جماعتِ انسانی کا فطری حق سمجھا گیا ہے۔ اپنے ملک میں بھی وہ ہر فرد کے حقوقِ آزادی کا معاون ہے۔ ایک موقع پر اُس نے کہا کہ ”ہم ایک کام کرنے والی قوم ہیں ایک غریب قوم جو اپنی معاش کے لئے کام کرتی ہے جو اپنی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک کو سیاسی حقوق اور سیاسی اختیارات حاصل ہیں لیکن یہ حقوق کام کرنے ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں۔ ہم کسی اَور قوم سے مشابہت نہیں رکھتے کسی کی نقل نہیں اُتارتے اور اسی پر ہمیں فخر و ناز ہے!“

اُس کا کام آسان نہیں۔ سب امور کی دیکھ بھال اور اندرونی و بیرونی خطرات کا دفیعہ لوگوں کے بے موقع جوش کو کم کرنا اور بے جا نکتہ چینیوں کا خاطرخواہ جواب دینا، حاسدوں کے حسد پر صبر کرنا اور بلا تامل اپنا کام کئے جانا آج اسلامی دُنیا میں کتنے رہنما ہیں جو سرد مزاجی اور دیانت کے ساتھ یہ سب کچھ کرسکتے ہیں!

اُس نے مجلس کو یہ کہہ کر قومی حالت سے آگاہ کیا کہ ”قوم نے اپنی راہ چُن لی ہے۔ اور منزل قریب ہے۔ وہ ظلمت میں بڑھے جاتی ہے اور اب دُور سے اُسے اک روشنی نظر آرہی ہے۔ یہ اس کی خوشیوں کا سُورج چمکتا ہے! دُنیا میں کوئی طاقت نہیں جو اُسے وہاں تک رسائی پانے سے روک سکے!

یہ کمال پاشا جس نے مفتوح ترکوں کو فاتح قوم بنادیا ہے جس نے ایک مُلک کا مُلک

"مہذب و مسلح" دشمنوں کی گرفت سے چھڑا لیا، انگورہ کے سے دور دراز مقام کو مشہور عالم بنا دیا، مسلمانوں کو یاس انگیز گھٹاؤں میں اُمید کی شیریں و تاباں کرن دکھا دی، یورپ کے مُدبروں کو انگشت بدنداں کر دیا اور ایک دوسرے سے لڑا دیا، رُوس کو جو صدیوں سے علاقۂ ترکی پر دانت پیستا چلا آتا تھا حکومتِ اناطولیہ کا حلیف و رازدار بنا لیا، مختصراً یہ کہ ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دیا۔ اس شخص کا دل حرص و ہوا سے قطعی مُبرا اور ذاتی مفاد کے خیال سے بالکل خالی ہے! اپنا محل اُس نے فوج کی نذر کر دیا ہے، اپنا روز و شب وہ قومی خدمتوں میں صرف کرتا ہے، نہ کوئی بیوی ہے نہ بچہ، مُلک ہی اُس کا رفیق زندگی اور وطن ہی اس کا چہیتا بچہ! باوصف اس قدر بلند رتبہ ہونے کے اُس کا مشاہرہ صرف چھ سَو روپیہ ماہوار ہے! دُعا ہے کہ خدا اُسے برسوں تک زندہ رکھے اور ہمت و استقلال کے ساتھ اُسے قوم و وطن کی خدمت کرتے رہنے کی توفیق دے!

بشیر احمد

اے ہم سفر!

حرکت کرنا اے ہم سفر! گویا ہر لمحہ تجھ سے ملتے رہنا ہے۔ وہ گویا تیری آوازِ قوم کے ساتھ گیت گاتا ہے + جسے تیری سانس اک بار چھو لیتی ہے وہ کنارے کے سائے میں نہیں رینگتا وہ تیز ہواؤں کے سامنے اپنے بادبان کو دلیری سے پھیلا کر طوفانی پانیوں پر سوار ہو جاتا ہے!

جو اپنے دروازے کو کھول دیتا ہے اور قدم آگے کو بڑھاتا ہے وہ تیرا خیر مقدم پا لیتا ہے + وہ اپنے نفع پر شاداں یا اپنے خسارے پر غمگین ہونے کے لئے انتظار نہیں کرتا اس کا دل پیش قدمی کے لئے طبل بجاتا ہے کیونکہ ایسا کرنا اے ہم سفر! گویا ہر ہر قدم پر تیرے ساتھ چلنا ہے!

گلچیں

خالدہ خانم

وہ قوم جو آج اپنے طبقۂ اناث میں اس قدر پست اور پس ماندہ ہے اپنی نشاۃ الثانیہ کے دَور میں کم از کم ایک ایسی نازک شخصیت ضرور رکھتی ہے جس کا وجود یورپ کی متمدن اقوام کے لئے بھی فخر کا باعث ہو!

خالدہ خانم (جسے جنابِ یلدرم ناظرینِ ہمایوں سے بار بار روشناس کر چکے ہیں) مشرق و مغرب میں اپنی ادبیات اور اپنی تعلیمی و ملکی خدمات کے لئے مشہور ہو چکی ہے + اس وقت اُس کی عمر تقریباً ۳۲ سال کی ہے۔ حُسن ذہانت عزم و استقلال یہ اُس کی بدیہی خوبیاں ہیں وہ پہلی ترکی عورت تھی جو قسطنطنیہ کے امریکی کالج میں داخل ہوئی جس پر ملک میں ہلچل مچ گئی لیکن اُس نے خفیہ طور پر اپنا درس جاری رکھا اور بعد میں تعلیم پانے کی غرض سے لنڈن اور پیرس کا سفر کیا +

وہ سولہ برس کی تھی کہ اُس نے ترکی معاشرت پر اپنی پہلی کتاب لکھی اور "نقاب و حرم کی سی ذلیل چیزوں" کے خلاف اپنی آواز بلند کی + جنگِ عظیم کے دوران میں وہ ترکی افواج کے لئے فلارنس نائٹ انگلیل کی طرح کام کرتی رہی اور باوجود ملک کی ناپسندیدگی کے اُس نے اپنی تُرکی بہنوں کو زخمیوں کی مرہم پٹی کی خدمت کے لئے بزور آمادہ کیا +

جب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر اپنا قبضہ جما لیا اور قوم پرستوں نے اناطولیہ میں آزادی کا جھنڈا بلند کیا تو خالدہ خانم کی ترغیب پر سینکڑوں محبِ وطن سمندر پار کر کے ایشیائے کوچک میں جا پہنچے + کہا جاتا ہے کہ دو سال ہوئے وہ ایک ہلالی رات چاند کی مدھم روشنی میں ایک کشتی میں سوار ہو کر ایشیا کے ساحل پر اُتری۔ "وہ عشقِ ایزدی میں اس طرف آئی اور اپنے تئیں وطن کی محبت کے حوالے کر دیا + ایک دوست کی بے اختیار چیخ نے اُسے ایسی جگہ پر کنارے لگنے سے بچا لیا جہاں وہ پھر سے اتحادی گرفت میں آجاتی + بعضوں کا قول ہے کہ اُس کی آمد نے مصطفیٰ کمال کو دل شکن نہ ہونے دیا اور گذشتہ سال

اُس نے کمال کو حملے میں تامل کرتے رہنے پر طعنہ دیا کہ اس کمزوری سے کام نہ چلیگا۔

انگورہ پہنچ کر اُس نے ترکی وطن کے گوشے گوشے میں دارالعلوم کھول دیئے۔ اور چارسو اُس کے اثر سے تمدن کی روشنی پھیلنے لگی۔ اُس نے عورتوں کو آزادی کا مردوں اور عورتوں کے لئے سبق دیا انہیں لکھنا پڑھنا سکھایا اور معاملاتِ ملکی میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔ اُس نے برباد شدہ ترکی سلطنت کو ازسرِ نو زندہ کرنا اپنا مقصد قرار دیا اور صاف اعلان کیا کہ بغیر آزادی یافتہ عورتوں کے ترکی کبھی متحد نہیں ہوسکتی۔

گذشتہ سال کی خوں ریز جنگ میں وہ قوم پرست فوج میں شامل ہوئی اور خود بندوق سے مسلح ہو کر نہایت دلیری کے ساتھ میدان میں اُتر آئی۔ مصطفےٰ کمال نے اُسے ایک فوجی افسر کا رُتبہ دیا۔ تعلیمی کام میں اُس کا حوصلہ بڑھایا اور بالآخر اُسے وزیرِ تعلیم بنا دیا۔

وہ قوم جو ایک ایسی دلیر صادق اور فہیم عورت کو پیدا کرسکتی ہے یقیناً ادبار کی وادی سے نکل کر بہت جلد تمدن کی چوٹیوں پر جلوہ افروز ہونے کو ہے!

بشیر احمد

ناظرینِ ہمایوں کو

ایک ماہ کے لئے خاص رعایت

آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں (مرحوم) کا کلامِ بلاغت نظام "جذباتِ ہمایوں" بہت پسند کیا گیا ہے۔ خریدارانِ ہمایوں سے ایک ماہ تک بجائے عہ کے صرف ۱۲ر فی جلد قیمت لی جائیگی۔ سینکڑوں فرمائشیں آرہی ہیں۔ تاخیر نہ کیجئے!

اعلیٰ درجے کا سرورق۔ ۱۷۰ صفحات۔ دو عکسی تصاویر۔

مینیجر

اے مادرِ وطن!

(ایک ترک کا خطاب اپنے وطن سے)

تیرے بچے، مصیبت و فلاکت کے سمندر کی سب سے زیادہ تاریک گہرائیوں میں ڈوب رہے ہیں، اُن کے سینوں سے خون کے فوارے نکل رہے ہیں، اور وہ دل خون اور سینہ چاک تیرے مبہم مگر نرم قلب میں جمع ہوئے ہیں۔ اپنے سینے کو کھول، اے تیرہ خاک! اور اپنے شہیدوں کے لئے جنہوں نے تیرے چھوٹے سے روڑے کی خاطر، لمبے لمبے زخم کھائے مگر دشمن کو تجھ سے دُور رکھا، ہمارے بہادر آبا و اجداد کے پہلو میں جگہ تیار کر۔

تیری متروک، تیری خشک، تیری فراموش شدہ پتھریلی وادیوں کو سفید ریش بڈھوں سے لے کر معصوم ترک بچوں تک کا اپنے آنسوؤں سے ترکرنا کیا کافی نہیں ہے؟

کیا تو ہم سے ناراض ہوگئی، اے مادرِ وطن؟ اس بیگناہ، اس مرد قوم سے نہ پوچھ کہ کن قزاقوں نے، کن خائنوں نے اپنے پاؤں سے تجھے پامال کیا، تیری ہڈیاں توڑیں، کن درندوں نے اپنے ناخنوں سے تجھے مجروح کیا۔ اے مادرِ وطن! تو جو نیلی موجوں کی آغوش میں سو رہی ہے۔ تو جس کے پہاڑوں کے خطوط نازک، جس کا سایہ رنگین، جس کا افق رنگین، جس کا سما شفق گوں، جس کی سحر لطیف، جس کے بادلوں کی رفتار دلبر و غشی آور ہے، تو ہمیں یتیم چھوڑ کر کن بیگانہ آرزوں کے تعاقب میں جا رہی ہے۔

سُن! تجھے نہ محتشم قدیم روما، نہ فیلسوف قدیم یونان نے، ایسے وفا کار، ایسے آتشیں، ایسے نفس واپس تک کے جذبہ سے چاہا ہے جیسا ہم چاہتے ہیں، اور نہ کوئی قوم مستقبل میں چاہ سکتی ہے۔ ترکوں کی سب سے زیادہ دلدوز خشوع و تضرع، ترکوں کے منزہ و مجرد امید و استغراق تیرے لئے ہیں۔ ترک تیرے لئے زندہ رہتا ہے، تیرے لئے مرتا ہے، تیرے لئے برباد ہوتا ہے، تیرے لئے آہ و زاری کرتا ہے۔ سب تیرے لئے۔

کسے معلوم ہے کہ تیرے خمیر میں کتنے ترک شہدا کا خون ہے جنہوں نے اپنے قیمتی قطرہائے خون تیرے سینے پر گرائے، کتنے ترک سپاہیوں کی ہڈیاں ہیں، جنہوں نے اپنی جان و شان تیرے

قدموں پر فدا کر دی۔ تیرے سینے پر جان دینے کے لئے، اور اپنی ہڈیاں تجھے سپرد کرنے کے لئے صدہا سال تک، غربت زدہ، آبلہ پا، رہ پیما، خستہ اور اُس پر بے یارومددگار ترک آئیگا۔

اس خطرناک زمانے میں، وہ باعظمت ترک فاتح جو تیرے لئے شہید ہوئے اور جنہوں نے تیرے لئے مرنا ہی اپنی مکافات ابدی سمجھی، انکی روحیں تیری لطیف ہوا میں، تیرے افق پر جہاں دشمن کے تاریک سائے پڑ رہے ہیں پھر رہی ہیں ماضی کی وسعت میں سے یہ خاموش، مگر دتور و معظم روحیں آرہی ہیں اور تیرے زندہ فدائیوں کی بلند پیشانیوں کو اپنے پرّاں بازوؤں سے مَس کرتی ہیں

ہماری قسمت میں اگر جینا ہے، تو تیرے لئے جینا ہے، لیکن اگر قسمت میں یہ ہے کہ ہمارے قلب کے نازک ترین احساسات کو دشمن اپنے ہاتھوں سے ٹھیس لگائے۔ تو بہتر یہی ہے کہ ہمیں مار ڈال اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اے تیرہ خاک، اپنے میں دفن کرلے۔

اے مادرِ وطن! جو دن تیرے لئے خطرے کا دن ہو، اُس دن وہ معصوم سر جو پالنے میں بلند ہوتے ہیں، اُن سے لیکر اُن کہنہ کمروں تک جو مزار کی طرف جھک رہی ہیں سب اپنا خون تیرے لئے بہانے کو تیار رہیں۔ اُس دن وہ موت کے ڈراؤنے چہرے سے اُلفت کرتے ہیں۔

اے کمال کی، اے مدحت کی ماں! اے فاتح، اے سلیم کی آغوشِ خواب! اگر تیرے پاک گوشوں میں تیری منزہ و صاف محرمیت میں کسی بے ادب کا قدم داخل ہو جائے، تو ہم سب، ہمارا سرفروش الوز، ہمارا بہادر نیازی، (ہمارا مصطفیٰ کمال اعظم) ہماری شیر فوج کے ساتھ، مرد عورت، یتیم بچے، سب کے سب اُس نجس اجنبی قدم کو تیرے پاک سینے سے ہٹا دینگے لیکن اگر نہ ہٹا سکیں تو ہم تیرے سب سے گہرے گڑھے میں گر جائیں، مگر اس وقت تو ہمیں ایسا گہرا گاڑیو کہ تیرے نرم سینے میں دشمن کے ناخن پڑیں تو ہمیں احساس تک نہیں، نہیں، اگر تو ہماری ماں ہونے سے گریز کرتی ہے، تو تو بھی ہماری طرح محو ہو جا۔ اپنے شاندار محلوں اپنے اونچے گنبدوں، اپنے پراسرار جنگلوں اپنے شاداب مرغزاروں سمیت محو ہو جا۔

تو دنیا کی سب سے تاریک، سب سے دور تنہائی میں جا سو۔

نہ انسانوں کے حافظے میں، نہ کتابوں کی سیاہ تحریریں میں تیرا نام و نشاں باقی رہے۔

ہم سب کے ساتھ، تو بھی اُن معموروں کو لیکے جو راکھ ہو چکے ہوں، کتم عدم میں چھپ جا۔

(خالدہ خانم) سید سجاد حیدر

دنیائے اسلام کے انحطاط کی ایک ظاہری اور مسلّمہ وجہ

کوئی مسلمان جو اسلامی تاریخ کے ابتدائی مراحل سے ذرہ برابر بھی واقفیت رکھتا ہوگا وہ اِس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ سب سے اول دنیا میں اسلام کا خیر مقدم کرنے والی ایک عورت ہی تھی اور اِس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ وہ پودا جس کو اللہ تعالیٰ عرب کی سنگ لاخ اور ریتلی زمین میں لگا کر اُس کو اس قدر نشو و نما دینا چاہتا تھا کہ جس کے سائے تلے تمام روئے زمین کی اقوام کسی وقت میں آجائیں اُس کو ابتدائی حوادث سے بچانے میں ایک عورت ہی نے رسولِ پاک کی امداد کی تھی۔ اس کے بعد جب کفار کے تشدّد کی وجہ سے حضرت رسالتمآب کو اپنا وطن ترک کرنے کی مجبوری پیش آئی تو ایک عورت ہی تھی جو اندھیری راتوں میں بیابان جنگل اور پہاڑوں کا راستہ طے کرکے آنحضرت کو غار میں کھانا پہنچاتی تھی۔ پھر جب کفار سے ابتدائی اسلامی خونریز لڑائیاں ہوئیں تو اُس میں عورتیں برابر مردوں کے پیچھے پیچھے رہتی تھیں اور اُن کو لڑائی میں ہر قسم کی امداد دیتی تھیں اور خود بھی لڑتی تھیں اور بیماروں اور زخمیوں کی اُسی طور پر خدمت کرتی تھیں جیسے کہ گذشتہ یورپ کی جنگ میں عورتوں نے خدمت کی ہے۔ شام اور فارس میں جو اسلامی لڑائیاں ہوئیں اُن میں عورتیں برابر میدانِ جنگ میں مردوں کے ہمراہ رہتی تھیں اور لڑائی میں ہر قسم کی امداد دیتی تھیں۔ تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض بعض موقعوں پر محض عورتوں ہی کی امداد سے عساکر اسلام غالب آئے تھے اگر عورتیں نہ ہوتیں تو شکست اور تباہی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ مگر جب عورتوں کی امداد سے مردوں نے دُنیا میں اپنا اثر قائم کرلیا تو پھر اُن کو صنفِ نازک اور جنس کمزور اور کیا کیا خطابات دیکر گھروں میں مقید کردیا کہ بیٹھی بچے پالا کرو اور چکّی چولہے کا دھندہ کیا کرو۔ بس اس سے زیادہ تمہارا کوئی کام نہیں ہے۔ پردے میں بٹھایا تو بٹھایا تھا مگر غضب یہ کیا کہ چہار دیواری سے باہر نکل کر تازہ ہوا کھانے کی بھی ممانعت کردی اور اس بدعت کو جو سراسر ناعاقبت اندیشی پر مبنی تھی اسلامی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی کہ یہ شعارِ اسلام

ہے کہ عورت نہ گھر سے باہر نکلے اور ہوا کھائے اور نہ کوئی کام اپنی اور اپنی اولاد و قوم کی بہبودی کے لئے کرے ۔ خدا جانے یہ کہاں کا اسلام تھا جو غریب عورتوں کی گردن پر سوار کیا گیا کہ جس سے اُنکے جسمانی و دماغی قویٰ مضمحل ہوتے ہوتے اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے۔ کہ چہار دیواری کی محدود و چند قدم زمین سے باہر پیدل چلنا اُن کو دشوار ہے اور چہار دیواری سے باہر دنیا سے اُنکو قطعی لاعلمی ہے اور بجز بچوں کی پرورش اور آٹے دال کے سودے کے دُنیا کے معاملات سے بالکل بے خبر ہیں۔ قانون کی نگاہ میں اب اُنکا شمار نابالغ بچوں اور نیم پاگل انسانوں میں ہونے لگا ہے۔ اُن کا کوئی معاملہ یا معاہدہ جائز نہیں سمجھا جاتا۔ جب تک کوئی مرد اُن کا ہمدرد و رفیق جو خود اُس معاملہ سے بے تعلق نہ ہو اُس کے مشورے اور امداد سے وہ معاملہ نہ کیا گیا ہو۔ کیا ہمارا پاک مذہب جس نے مردوں اور عورتوں کے حقوق کی دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ و نہایت واضح طور پر صراحت کر دی ہے اور جس نے مساوات کا درجہ قائم کرنے کے لئے مردوں سے صاف صاف کہدیا ہے کہ عورتوں کے تم پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسے تمہارے حقوق اُن پر ہیں اور پھر یہ بھی فرمایا کہ عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم عورتوں کا لباس ہو۔ کیا اُس مذہب کے سر اس کا الزام تھوپنا کہ اُس نے عورتوں کو دُنیا کی تمام نعمتوں سے محروم کر کے محض مردوں کی خدمت کے لئے مقرر کر دیا ہے کسی طور پر قرینِ انصاف ہو سکتا ہے ۔ افسوس تو اس بات کا ہے کہ ناعاقبت اندیش لوگ اپنی جاہلانہ طرز زندگی اور اپنے فاسد خیالات کی تائید کے لئے اسلام جیسے پاک ۔ سچے اور حکیمانہ مذہب کو بدنام کرتے ہیں اور اُس کی ناجائز آڑ میں اُن جُملہ غلط طریقوں کے قائم رکھنے پر مُصّر ہیں جو پست خیالی اور انحطاط کے زمانے میں سوسائٹی پر غالب آ گئے تھے ۔ جب سے مسلمانوں نے عورتوں کو بیکار کیا ہے۔ اُس وقت سے وہ خود بھی بیکار ہو گئے اور جب تک وہ اُن کو بیکار رکھیں گے وہ خود بھی بیکار رہینگے ۔ عورتوں کو بیکار رکھنا منشیت ایزدی اور احکام ایزدی کے خلاف ہے۔ پس جو لوگ قوانین قدرت اور احکام ربّانی کی نافرمانی کرتے ہیں اُن کو لا محالہ اسکا خمیازہ بھگتنا پڑیگا ۔

دیگر تاریخی واقعات کو اس وقت نظر انداز کر کے صرف ایک واقعہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جاتا ہے جس سے یہ بات کافی طور پر اُن کی سمجھ میں آجائیگی کہ عورت کی امداد کے بغیر دُنیا میں کوئی دقت حل نہیں ہوسکتی اور نہ کسی بڑے کام میں کامیابی ہوسکتی ہے۔ ہم اسکی بہت سی مثالیں تاریخ سے بہم پہنچانے کو تیار ہیں مگر اس وقت جو تازہ ترین مثال ہمارے سامنے ہے اُسی کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا کے نام نامی اور برگزیدہ شخصیت سے کون ایسا مُسلمان ہوگا جو ناواقف ہوگا۔ نام سے واقفیت تو ایک معمولی امر ہے میرے نزدیک دُنیا میں کوئی ایسا مُسلمان نہ ہوگا جس کے دل میں اس بے نظیر شخص کی محبت نہ ہو۔ وہ تیس کروڑ دُنیا کے مسلمانوں کی ناک ہے اور موجودہ زمانہ کے مُسلمانوں کی عزت و آبرو کی محافظت کی خدمت اللہ تعالیٰ نے اسی شخص کے ہاتھ میں سپرد کر دی ہے۔ خدائے برتر و اعلیٰ خود اُس کا محافظ بنے اور اُس کے مدارج میں ترقی دے اور اُس کو اپنے اعلیٰ مقاصد میں کامیاب کرے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس اسلامی ہیرو کی کامیابیوں میں اُس غریب جنس کا بھی کچھ حصہ ہے یا نہیں جس کو ہم صنفِ نازک کہتے ہیں۔ یہ بات واقعات سے پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ بہت سی ٹرکی خواتین کا انگورہ کی لازوال کارکردگیوں میں حصہ ہے۔ انگورہ کی تحریک اور مصطفےٰ کمال پاشا کی اسلامی خدمات کی ابتدا اس طور پر ہوئی کہ جب اتحادیوں نے قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا اور سُلطان ٹرکی کو مثل بہادر شاہ اخیر بادشاہ دہلی کے اپنے محل میں نظر بند کر کے تمام ترکی سلطنت پر ایک جابرانہ قبضہ کرنا چاہا تو حسب معمول و حسب عادت قدیم خود ترکوں کے ہاتھ سے ہی ترکوں کے گلے کٹوانے کا طرز اختیار کیا اور بعض مقامات پر جہاں حُریت پسند ترکوں کی کچھ پریشان افواج اتحادیوں کی مخالفت پر اڑ رہی تھیں وہاں ٹرکی فوجوں کو ہی اُن کی سرکوبی کے لئے بھیجا جاتا تھا منجملہ اُن کے مصطفےٰ کمال پاشا کو بھی ایک دستہ کے ہمراہ اناطولیہ کے ایک علاقہ میں باغی فوج کی سرکوبی کو بھیجا تھا۔ مصطفےٰ کمال پاشا جب موقع پر پہنچا اور اُس نے دیکھا کہ اُس کے بھائی اور عزیز قوم کے نوجوان اپنی آزادی کے لئے سرفروشیاں کر رہے ہیں تو اُس کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ اتحادیوں کا ایک تنخواہ دار افسر بن کر اپنی قوم سے لڑے۔ اُس نے اپنے عُہدے سے

فوراً علیحدگی کی اور حریت پر جان دینے والوں میں جا ملا اور آخر کو اُن کا سرغنہ و سپہ سالار بنگیا ہمیں یاد ہے کہ لارڈ بالفور نے پیرس کے مقام پر اس غریب مصطفٰے کمال پاشا کو ڈاکو اور لوٹیرے کا خطاب عطا کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ انگلستان کے وزراء نے اس غریب محب وطن کو پانی پی پی کر کوسا تھا۔ لیکن خدائے تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ عزت اُسی شخص کا حق ہے جس کو میں عزت دیتا ہوں اور ذلت اُسی بدنصیب کو ملتی ہے جس کو میں ذلیل کرنا چاہتا ہوں۔ خدا کو یہ منظور تھا کہ مصطفٰے کمال پاشا دُنیا میں عزت حاصل کرے اور آج خدا کے فضل سے وہ دُنیا کے بڑے بڑے سپہ سالاروں اور مُدبّروں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔ الحمد للہ۔ ہاں ہجوم محبت کی وجہ سے غازی مصطفٰے کمال پاشا ہی کا ذکر بار بار قلم سے نکلتا ہے اور جس واقعہ کا ہم یہاں پر خاص طور پر ذکر کرنا چاہتے تھے اُس کے بیان کی نوبت نہیں پہنچتی۔ ہم اس مضمون میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ جیسے کہ ابتداء میں خدا نے ہمارے پاک مذہب کی تائید عورتوں کے ذریعہ سے کرائی تھی ویسے ہی غازی مصطفٰے کمال پاشا کی امداد بھی عورتوں کے ذریعہ سے ہوئی ہے۔ ان عورتوں میں ادیبہ خلید سب سے زیادہ نامی اور قابل ذکر ترکی خاتون ہیں۔ یہ خاتون نہایت تعلیمیافتہ اور بڑی مصنفہ ہیں۔ یہ سب سے پہلی ترکی خاتون ہیں جنھوں نے قسطنطنیہ کے امریکن مشن کے کالج میں اعلےٰ تعلیم حاصل کی تھی اُس وقت کے پُرانے خیالات کے کُل مُسلمان اُسکی تعلیم کے مخالف تھے اور اُس کے والدین پر سخت زور ڈالا تھا کہ وہ اُسکو کالج سے نکال لیں مگر آفریں ہے اُسکے والدین کی روشن خیالی پر کہ اُنھوں نے اُسکو کالج سے نہیں نکالا۔ قسطنطنیہ کے مشن کالج میں تعلیم حاصل کرنیکے بعد وہ فرانس اور انگلستان کو بھیجی گئی اور وہاں پر اُس نے اپنی تعلیم کی تکمیل کی۔ پھر جب وہ لوٹ کر آئی تو اُسکے ملک میں چاروں طرف تباہی کے آثار تھے۔ بلقان کی جنگ کی خونریزیاں اور لاکھوں مسلمانوں کا قتل و غارت ہونا اُس کے آنکھوں دیکھے واقعات ہیں۔ اس کے بعد ترکی کا جنگ یورپ میں شریک ہونا اور ترکی افواج اور آخری شکست اور قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ اور لاکھوں مسلمانوں کا تھریس اور اناطولیہ میں یونانیوں کے مظالم کا شکار ہونا یہ واقعات سب اُسکے چشمدید تھے۔ جنگ کے دوران میں وہ زخمیوں کے اسپتالوں میں ترکی خواتین کے ساتھ برابر کام کرتی رہی۔ لیکن جب قسطنطنیہ پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا اور غازی مصطفٰی کمال پاشا نے اناطولیہ میں آزادی کا جھنڈا

بلند کیا تو اس وقت حریت پسند ترکی مرد اور عورت جو قسطنطنیہ میں مثل قیدیوں کے تھے وہ وہاں سے نکل نکل کر اناطولیہ میں آکر مصطفےٰ کمال پاشا کی فوج میں شریک ہونے لگے۔ اتحادیوں نے یہ دیکھکر قسطنطنیہ سے باہر جانیکی ممانعت کردی اور آبنائے باسفورس اور بحیرہ مارمورا کے کناروں پر پہرے کے جہاز کھڑے کر دئے کہ کوئی شخص قسطنطنیہ سے نکلکر اناطولیہ جانے نہ پائے۔ مگر آزادی پر مرنے والے کو آزادی حاصل کرنے سے کون روک سکتا ہے ہزاروں آدمی عورت اور مرد قسطنطنیہ سے نکلکر اناطولیہ کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان میں سے اکثر پکڑے گئے۔ سلطان کی مردہ گورنمنٹ کے ہاتھ سے انکو سزائیں دلوائی گئیں کیونکہ سلطان بھی مصطفےٰ کمال پاشا اور اُس کی فوج کو باغی قرار دینے پر مجبور تھے۔ مگر بہت سے لوگ پہرہ والوں کے حلقہ سے نظر بچا کر نکل بھی جاتے تھے۔ اُن میں جو اس طور پر نکلکر اناطولیہ پہنچے ادیبہ خلیدہ بھی تھیں وہ کشتی میں جب کنارے کے قریب پہنچیں تو قریب تھا کہ وہ اتحادیوں کے پہرہ دار کے پھندے میں پھنس جاتیں، مگر خوش قسمتی سے اسی وقت کچھ فاصلے پر اُنکو وہ روشنی دکھائی دی جو اُنکے دوستوں نے بطور نشانی کے مقرر کر رکھی تھی کہ اس قسم کا نشان مصطفےٰ کمال پاشا کی طرف سے سمجھا جائے۔ اس طور پر ایک بڑے خطرہ کے مقام سے نکلکر وہ انگورہ پہنچی۔ وہاں جاکر وہ اپنی پوری قوت اور جوش کے ساتھ فوجی اور انتظامی معاملات میں شریک ہونے لگی۔ ترکوں کو اُبھارتی تھی۔ رسالے لکھتی تھی۔ اخبارات میں مضامین لکھتی تھی اور قومی نظمیں لکھتی تھی۔ فوج کے سامان کی تیاری میں ہزاروں عورتوں کو اپنے ساتھ شریک کیا اور ایک موقع پر خود فوج کے ساتھ دشمنوں سے لڑنے گئی اور لڑی۔ اب ان دنوں وہ وزیر تعلیمات کے عہدے پر ممتاز ہے اور قومی تعلیم کے پھیلانے میں دن رات منہمک رہتی ہے۔ پردے کی سخت مخالف ہے اور مسلمانوں کو غیرت دلاتی رہتی ہے کہ تم نے جب سے عورتوں کو گھروں میں بند کیا ہے تم خود بھی غلامی میں مبتلا ہوگئے۔ صورت کی نہایت حسین ہے اور پاکدامنی میں ترک اُسکو بطور مثال کے پیش کرتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر فوج سے اسکی شادی ہوگئی ہے شوہر سے نہایت عمدہ تعلقات ہیں، لوگ کہتے ہیں کہ غازی مصطفےٰ کمال پاشا کی کامیابی اور شہرت میں اس خاتون کا بہت بڑا حصّہ ہے۔

عزیزو۔ زمانہ کی آواز کیا کہہ رہی ہے اسکو پہچانو اور اس پر عمل کرو۔ عورتوں کو بیکار کرکے تم نے کچھ نہیں پایا۔ اور اگر اُنکو یونہی بیکار کئے رہو گے تو اور گروگے اور سخت ذلیل ہوگے۔ شرع کے مطابق چلو تو کبھی خرابی پیدا نہ ہوگی مگر آپ تو اپنے من گھڑت قانون کے بندے بنگئے ہیں اسکے لئے تو آپ خدا سے بھی تائید کی امید نہیں کر سکتے۔

(عبداللہ از علی گڈھ)

دوشیزۂ فرانس

۴

نفسِ انسانی کی صحیح غرض وغایت فداکاری ہے!

دُنیا میں سینکڑوں رضا کار ایسے گذرے ہونگے جنھوں نے اپنی عمر کا بیشتر حصّہ تکلیفوں اور مصیبتوں میں بسر کیا لیکن انجام کار راحت و آرام کی نعمت حاصل کرلی، اُن کی جدوجہد دلگداز ہوتی ہے لیکن حصولِ آسایش تسکین دہ، ہمارا دل جو اُن کی صعوبتوں کو دیکھ کر کڑھتا تھا انکی کدوکاوش سے سراپا اضطراب تھا اب مطمئن ہے کہ انہوں نے تکلیفیں اُٹھائیں لیکن آخر اُن کا اجر بھی پالیا، ہماری جان جو عسرت میں اُن کے ساتھ وابستہ تھی اب خوشیوں میں نہیں تنہا چھوڑ کر الگ ہوجاتی ہے"۔ اس کے برعکس وہ رضا کار جن کا مطمحِ نظر فداکاری ہے ہماری ہمدردی عمر بھر اُن کی کنیز بنی رہتی ہے وہ ہمارے دل کو سُنہری زنجیروں سے اپنی زندگی کے ساتھ جکڑ لیتے ہیں ایسا کہ پھر کوئی وفاپرست اُن سے مُنہ نہیں پھیر سکتا!

مورخین ناحق اک بے سود مباحثے میں مصروف ہیں کہ کیا ژان نے فرمانِ ایزدی سے سرتابی کی؟ یا فقط اپنی ہٹ پر قائم رہ کر اُس مقصد کے حصول میں عمر ضائع کردی جو خود اُس کی قوتِ واہمہ کا آفریدہ تھا؟ یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو اس حقیقت کا احساس نہیں کرتے کہ نیتِ صالح کی ہٹ ہی عزمِ اُستوار ہے' دلِ پاکیزہ کا وہم ہی الہامِ ربانی سے عبارت ہے؟،، پھر جو عظمت پرست اُسے خدا رسیدہ اور حق فرستادہ مانتے ہیں اُنہیں یقین ہے کہ ژان کی آئندہ زندگی کی مُصیبتیں نتیجہ تھیں صرف ہدایاتِ غیب کی نافرمانی کا!۔ کیا ژان کی گذشتہ زندگی صرف آرام و آسائش ہی میں گذری؟ کیا اُسے اندوہ وکشمکش سے واسطہ نہیں پڑا؟ یا کیا احکامِ ربانی کی اطاعت کا لازمی ثمرہ خوشی اور وہ بھی دُنیا کی خوشی ہوتا ہے؟ کیا عزم وراستی کی زندگی کرب وعنا میں نہیں کٹتی؟ دنیا میں کوئی حقیقت آشنا ایسا نہیں گذرا جس نے سکونِ نفس کی تلاش میں اطمینانِ قلب حاصل کیا ہو! جو جسم و رُوح کی عام وخاص خوشیوں میں مگن ہو کر

راضی ہوگیا ہو کہ مقصدِ حیات یہی ہے جو میں نے پالیا! اور اس رُوحانی کشمکش میں مبتلا نہ رہا ہو کہ جو کچھ پالیا ہے اگر پالیا ہے تو وہ صرف اک راہ ہے جو ایسے مقامات کی طرف جاتی ہے جہاں واقعی پالینے کے قابل اشیاء ہمارا انتظار کر رہی ہیں؟!

ژان دارک دوشیزۂ فرانس کا "مُقررہ کام" اگر سرانجام ہوگیا تو ہُوا کرے، جب تک اُس کے دم میں دم ہے وہ ایسے انجام میں آرام نہیں پاسکتی، آرام ہے تو کام ہی میں، مُسرت ہے۔ تو مشقت ہی کے اندر! ژان کے گذشتہ ایثار کو اپنی آئندہ قربانیوں کا درس لینا تھا، ابھی اُس کی نازک رُوح میں وہ ربط وضبط پیدا نہ ہوا تھا جو جسم کی جان اور دل کا ایمان ہوتا ہے! اُس کا جی اُسے چین نہ لینے دیتا تھا، بہت کچھ ہو چکا تھا لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی تھا!

ژان کی کامرانی کا دور مختصر تھا، ۲۹ راپریل کی رات تھی جب وہ اورلیاں میں داخل ہُوئی ۱۷ رجولائی کو ریمز میں بادشاہ کی تاج پوشی ہوگئی! اس کے آٹھ روز بعد وہ شہر سے نکلی، اُس کے عَلَم کا رنگ ذرا مدھم تھا لیکن اُس سے اک خاص شان ٹپکتی تھی، اُس کی زرہ چمکتی تھی۔ اگرچہ جنگ کے آثار اُس سے آشکار تھے ـــــ لیکن اُس کے دل کو پہلا سا اطمینان نہ تھا اور اُسکا مقصد بھی ویسا صاف وصریح نہ تھا + سب سے بہتر بات یہی معلوم ہوتی تھی کہ بلاتاخیر پیرس پر حملہ کیا جائے، قائد بھی سب کے سب ژان کے ساتھ متفق تھے، بڑی مشکل یہ تھی کہ خود کام دوراندیش درباری موجودہ کاوش سے بہت گھبراتے تھے اور ہر بات کا ٹال دینا اُنہیں مرغوب تھا۔ اُس پر طرّہ یہ کہ پیرس والوں کا مزاج بگڑا ہُوا تھا وہ سب کے سب دشمن کے نام لیوا اپنے بادشاہ کے نام پر جھٹ تلواریں کھینچنے کو تیار ہو جاتے تھے" یہاں اورلیاں کا معاملہ نہ تھا۔ جہاں محبّانِ وطن غنیم کے خلاف شہر میں اڑے بیٹھے تھے بلکہ پیرس کی چالاکی اور خود غرضی سے واسطہ تھا جہاں کے رہنے والے غیروں سے لَو لگائے ہُوئے فلپ برگنڈوی کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے + اس حال میں ژان ریمز سے چلی۔ اُس کی "آوازیں" خاموش نہ ہوگئی تھیں، تینوں صورتیں اب بھی آیا کرتیں لیکن پہلے کی طرح لمبی چوڑی ہدائتیں نہ دیتی تھیں کہ یہ کرا ور وہاں جا! صرف اعانت کا مشکوک وعدہ کرتیں اور آنے والی مُصیبت کا مبہم سا پتہ دیتیں اور کہتیں کہ "خوف نہ کھا خدا تیرا ساتھ دیگا"! وہ سمجھتی کہ یہ پہلے کی سی تسلیاں ہیں، زخمی ہُوئی بھی تو اچھی ہو جاؤنگی، جان کو دُکھ بھی ہوگا

تو اُس کے بعد سُکھ ہی سُکھ ہے! لیکن ساتھ ہی وہ کچھ پریشانی سی محسوس کرتی کہ مجھ میں ان میں اب وہ باتیں کیوں نہیں ہوتیں جو ہُوا کرتی تھیں؟

فرنساوی فوج (۲۱ جولائی کو) پیرس کی طرف بڑھی۔ رستے میں جو شہر اور قصبے تھے وہ ایک ایک کر کے چارلز کے حلقۂ اطاعت میں آنے شروع ہُوئے" لاؤں اور سواسوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ سانلی اور بووے حلقہ بگوش ہوگئے۔ اس کے بعد بادشاہ ذرا جنوب کی طرف ہو لیا، فوجی اور ژان سخت برہم ہُوئے کہ قیمتی وقت ہاتھ سے جاتا ہے پیرس پر جس قدر جلد ممکن ہو سکے حملہ کرنا چاہیئے، شاتو تیٹری کو مطیع کر کے چارلز نے مجبوراً پھر شمال کا رُخ کیا۔ ایک دو جگہ انگریزوں کا سامنا ہُوا۔ انہوں نے خندقیں کھود کر فوج کے آگے نوکدار کھمبے گاڑ دیئے تاکہ فرانسیسی ایک ہی حملے میں اُن پر غالب نہ آسکیں، ژان اور رآلانسوں نے اُنہیں کہلا بھیجا کہ ذرا میدان میں آیئے اور لڑیئے۔ یہ بھی وعدہ کیا کہ فرنساوی فوج پیچھے کو ہٹ جائیگی، اتنے میں وہ صف آرائی کرلیں۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، صرف ژان کے جواب میں ایک جھنڈا بلند کیا جس پر ایک چھڑی اور ایک نکلا بنا ہُوا تھا، شاتو تیٹری میں چارلز نے ڈیوک برگنڈی کے ساتھ یہ سمجھوتا کیا کہ پندرہ روز تک لڑائی بند رہے اور اس مدت کے اندر اندر ڈیوک بے لڑے پیرس قوم پرستوں کے حوالے کر دے۔ غالباً چارلز بھی سمجھتا تھا کہ یہ تھوڑی سی مہلت حاصل کرنیکا بہانہ ہے لیکن وہ خوش تھا کہ بلا سے لڑائی کے جنجال سے تو کچھ دنوں رہائی ملیگی۔ اِس فریب کاری سے اُس نے فوج اور ژان دونوں کو چند دنوں کے لئے خاموش کر دیا، بااینہمہ دوشیزہ اس ظاہرا خاموشی میں سراپا اضطراب ہو رہی تھی۔ ریمز والوں نے اُس سے اس توقف و تاخیر کا سبب پوچھا کہ پیرس پر حملہ کرنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کے جواب میں ژان نے یہ خط لکھا:۔

پیارے اور اچھے دوستو! شہر ریمز کے نیک و وفادار فرانسیسیو! ژان دوشیزہ تمہیں اپنا حال لکھتی ہے۔ یہ درست ہے کہ بادشاہ نے ڈیوک برگنڈی کے ساتھ پندرہ روز کی اک عارضی صلح کرلی ہے اور ڈیوک کا وعدہ ہے کہ وہ اِس مدت کے اندر شہر پیرس کو بے لڑے ہمارے حوالے کر دے"۔ لیکن حیران نہ ہونا اگر میں اُس سے پہلے ہی پیرس میں داخل ہو جاؤں

اس لئے کہ مجھے ایسی عارضی صلحیں مرغوب نہیں ہیں اور میں نہیں جانتی کہ اس معاملے میں ہیں معاہدہ پر کاربند رہونگی یا نہیں لیکن اگر رہی تو صرف بادشاہ کی عزت کی خاطر ایسا کرونگی!"

یہ تھے ژان کے احساسات لیکن اب وہ پہلے کی طرح بے دھڑک بادشاہ سے ردوقدح نہ کرتی تھی، وہ ایک تجربہ کار قائد کی طرح فوج کی رہنمائی تو اب بھی کرنا چاہتی تھی لیکن پہلے کی طرح اُس کی بات بات سے غیبی رہبری کا انداز نہ ٹپکتا تھا کچھ نہ کچھ ضرور تھا جس کے باعث ژان وہ ژان نہ تھی۔ پھر بھی حب الوطنی کا جوش اور ضرورتِ وقت کا احساس اتنا زبردست تھا کہ وہ نچلی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ فرنساوی فوج یوں زباں کاری کی گود میں پڑی سو رہی تھی کہ انگریزی فوج نے موقع پاکر اپنا ڈیرا اُٹھایا اور پیرس جا پہنچی۔ شاہِ فرانس کے بجائے کوئی بھی قائد ہوتا تو پیرس کا مارلینا آسان تھا، اب وہ وقت ہاتھ سے جاچکا تھا۔ چارلز نے بہتر جانا کہ علاقۂ کومپئین میں جاکر ڈیرے ڈال دے اور پھر غدار ڈیوک کے ساتھ ایک دوسری عارضی صلح کے لئے سلسلہ جنبانی کرے جو کرسمس تک قائم رہے۔ ژان کا دل غم وغصہ سے نڈھال ہوگیا چند قائدوں نے تنگ آکر فوج کے کچھ حصے کو لیا اور شمال کی طرف نارمنڈی کے صوبے پر جا پڑے۔ پیرس اس قدر خطرے میں پڑ گیا کہ بیڈفورڈ کو نکل کر دارالسلطنت کو بچانے کی فکر پڑ گئی اب پھر موقع تھا کہ فرانسیسی جنوب سے بڑھیں اور پیرس پر حملہ کردیں لیکن حضرت چارلز کومپئین میں پڑے زندگی سے حظ اُٹھا رہے تھے اور حرکت کا کوئی نشان نظر نہ آتا تھا۔ ژان سے زیادہ ضبط نہ ہوسکا۔ ایک دن موقع پاکر اُس نے آلانسوں کو بُلایا اور کہا "اچھے ڈیوک! اپنی اور دوسرے کپتانوں کی فوجیں تیار کرو۔ خدا گواہ! مجھے اپنے عصا کی قسم! میں پیرس کو زیادہ قریب سے دیکھونگی"۔ فوج میں خوشی اور جوش کی اک لہر دوڑ گئی۔ فرانسیسوں نے ایک ماہ ضائع کرنے کے بعد ۲۳؍ اگست کو کوچ کیا۔ سانلی میں کچھ دیر غالباً بادشاہ کا انتظار کرنے کو ٹھیرے لیکن جلد ہی چل کھڑے ہوئے اور ۲۶؍ کو وہ سیں دنی پہنچ گئے۔ سیں دنی فرانس کا دوسرا مقدس شہر موجودہ پیرس کے ملحقاتِ شہر میں ہے۔ ریں میں فرنساوی حکمرانوں کی تاجپوشی ہوتی تھی، سیں دنی میں وہ سپردِ خاک کئے جاتے تھے۔ ریں میں ژان کتنی مسرت سے داخل ہوئی تھی، سیں دنی میں اُس کا دل یاس وحسرت سے لبریز تھا۔ اُس کی تجاویز پر

عمل نہ ہوا۔ بیش بہا وقت ضائع کیا گیا تھا۔ اورلیاں کے حملے کے وقت وہ ہمہ تن امید تھی اُسے یقین تھا کہ وہ کامیاب ہوگی، یہاں یہ حالت نہ تھی لیکن خیر یہاں پہنچ جانا ہی غنیمت تھا اور اگر خدا کی مرضی ایسی ہو تو پھر پیرس کی فتح کوئی بڑی بات نہ تھی۔ بادشاہ کے انتظار میں دن اور راتیں گذریں۔ ۵ ستمبر کو پندرہ روز کے بعد وہ سُست خرام نازک اندام نمودار ہوا۔ فوج میں یکسر خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور ہر کہ ومہ کی زبان پر یہی تھا کہ اگر "بادشاہ نے اجازت دی تو ژان اُسے پیرس کے اندر لے چلے گی"۔

شاہی قاصد پیرس والوں کے نام بادشاہ کے خطوط لے کر گئے کہ تم فرانیسی ہو، اب وقت آ گیا ہے کہ تم شاہِ فرانس کی مدد کو نکلو۔ وہاں حالت دگرگوں تھی۔ عدالتیں، مجالسِ شوریٰ، دارالعلوم، کلیسا سب بیڈفورڈ کے نمک خوار اور انگریزوں کے نام لیوا تھے۔ انہیں اجنبی حاکموں نے خوب ڈرایا دھمکایا کہ اگر تم چارلز کے قابو میں آ گئے تو تمہاری جان کی سلامتی نہیں۔ پیرس والوں کو سب سے زیادہ انگریزوں کا پاس تھا پھر ڈیوک برگنڈی کا۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ ہمارے لئے فی الحال نفع کس بات میں ہے یہ نہ سمجھتے تھے کہ انجام کار مفید و مناسب کیا ہوگا!۔ قصہ کوتاہ پیرس میں فرانس کا نام لیوا کوئی نہ تھا!

۷ ستمبر کو فرنساوی فوج یعنی صرف اُس کا ایک حصّہ (کیونکہ اک معتد بہ حصہ تو حضرتِ چارلز کی رکاب میں ڈورسیں ونی ہی میں موجود تھا ہم نہیں جانتے کیوں، شاید شاہِ مقدس کی حفاظت کے لئے اس لئے صرف باقیماندہ حصۂ فوج) پیرس پر حملہ کرنے کو بڑھا! معلوم ہوتا ہے کہ حملہ آوروں نے پہلے سے مقامِ حملہ کی نسبت پوری معلومات بہم نہ پہنچائی تھیں۔ سینٹ آنورے کا دروازہ اور برُج تو شدتِ جوش وخروش سے فتح ہو گئے لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شہر کے گرد دو خندقیں ہیں پہلی خشک اور دوسری پُرآب۔ ژان کا طرزِ جنگ ہم دیکھ ہی چکے ہیں، فصیل کی طرف بڑھنا وہاں جا کر اپنا عَلم نصب کر دینا اور نبرد آزماؤں کو مرنے مارنے پر برانگیختہ کرنا! یہی طرزِ عمل یہاں دیکھا گیا۔ وہ بڑھی، پہلی خندق میں اُتر کر چڑھی، پھر دونوں خندقوں کے درمیان کھڑے ہو کر جگہ جگہ دوسری خندق میں اپنی برچھی سے پانی کی گہرائی کا اندازہ کرنے لگی۔ یہ ایک نہایت خطرناک مقام تھا، ہر طرف سے اُس پر تیروں کی

لگاتار بارش ہو رہی تھی لیکن وہ دو بجے سہ پہر سے لے کر برابر رات ہوتے تک وہیں جم کے کھڑی رہی محصورین کو پکار پکار کے کہتی تھی کہ "خدا کی راہ میں شاہِ فرانس کے مطیع فرمان ہو جاؤ" اُدھر تیرانداز اور توپچی تاک کر اُسی کو نشانہ بناتے تھے۔ کتنا شاندار ہوگا وہ منظر جب دوشیزہ فرانس تیروں اور گولیوں کی بوچھاڑیں سب سے زیادہ ہولناک مقام پر تن تنہا کھڑی خود بے وار کئے جانفروشوں کو وطن کی خدمت کے لئے پکارتی ہوگی۔ آگے غنیم گالیاں دے رہا ہے پیچھے ہم وطن بڑھے چلے آتے ہیں، بیچ میں یہ عفت و شجاعت کی دیوی استادہ ہے اور دونوں کو راہِ راست کی طرف بُلاتی ہے کہ اپنے پروردگار کا کہنا مانو، اپنے فرائض کو سرانجام دو۔ لڑائی گھمسان کی ہو رہی تھی، محاصرین کے لئے حوصلہ ہار دینے کی کوئی وجہ نہ تھی، اُن میں "خدا کی برکت اور دوشیزہ کی خوش قسمتی سے" بہت کم جنگجو زخمی ہوئے تھے۔ لیکن بدنصیبی سے شام کے وقت ایک تیر سیدھا ژان کی ران میں آ کے لگا۔ وہ گری اور سنبھلی لیکن ابھی سنبھلی ہی تھی کہ ایک اور تیر اُس کے عَلَم بردار کو لگا۔ وہ تیر کھینچ کے نکال رہا تھا کہ ایک اور تیر اُس کے لگا، وہ بل کھا کے ژان کے قدموں میں گرا اور گرتے ہی جاں بحق ہُوا۔ ژان نے عَلَم کو تھام لیا لیکن اُس کی طاقت جواب دے چکی تھی، وہ بمشکل رینگتی ہُوئی ایک جھاڑی یا پتھروں کے ڈھیر کے پیچھے جا چھپی اور وہاں چت لیٹ گئی۔ فوجی افسر اُس کے گرد جمع ہو گئے اور واپس چلنے کو کہا۔ لیکن اُس نے انکار کیا۔ وہ لیٹی ہوئی جنگجوؤں کو پکار پکار کے کہتی تھی کہ ہمت نہ ہارو۔ پیرس تمہارا ہی ہے!" اب رات ہو چکی تھی۔ آلانسوں اور دوسرے کپتانوں نے اُسے مجبور کر کے گھوڑے پر سوار کرایا اور واپس کمپ کو چلے۔ وہ راہ میں بار بار کہے جاتی تھی "کتنا افسوس ہے۔ کتنا افسوس ہے" ! "اگر رات بھر ہم اڑے رہتے تو باشندوں کو پتہ چل جاتا" اُس کا خیال تھا اگرچہ یہ محض غلط فہمی تھی کہ پیرس والے اُس کا ساتھ دیں گے اور اپنے اجنبی حاکموں کے خلاف باغی ہو جائیں گے"۔ رات کے وقت دشمن کے چند آدمی فرانسیسوں کی امان میں اپنے مُردوں کو لینے کے لئے آئے۔ اُن میں سے ایک کا بیان ہے، کہ فرنساوی فوج میں ژان کے خلاف لے دے ہو رہی تھی۔ فوجی کہتے تھے کہ دوشیزہ کا وعدہ تھا کہ آج رات ہم پیرس کے اندر محوِ خواب ہونگے اور وہاں کے سونے چاندی سے اپنی جیبیں

بھر لیں گے، اُس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا!

دوسرے روز ژان لوور کے تڑکے جاگ اُٹھی اور آلانسوں سے کہا کہ "بگل بجاؤ، میں اس مقام سے جنبش نہ کرونگی جب تک پیرس فتح نہ ہو جائے!" ظاہر ہے کہ دوشیزہ کی ہمت اُس کے عزمِ راسخ سے پھر بندھ گئی تھی اور اُسے یقین تھا کہ پیرس فتح ہو جائیگا۔ اس لمحہ میں ایک نیک فال نکلی، مونمورنسی اپنے ہمراہ ساٹھ شرفا کو لئے ہوئے برگنڈی کو چھوڑ کے ان لوگوں میں آملا، فرانسیسی خوشی سے پھُولے نہ سماتے تھے، اتنے میں ایک اَور جماعت دو چار شخصوں کی پیچھے سے آتی ہوئی نظر آئی، شائد یہ بھی کمک ہو؟ نہیں! یہ اک فالِ بد تھی۔ یہ قاصد بادشاہ کا سخت و درشت حکم لے کر آئے تھے یعنی واپسی کا حکم! پیرس نظروں کے سامنے ہے، اُس کی فصیل پر حملہ کی تیاریاں ہیں اور بادشاہ کا حکم ہے کہ سب واپس چلیں! فوج بہت چیخی چلّائی لیکن بالآخر افسروں کو بادشاہ کا کہنا ماننا ہی پڑا، ژان کے عزم میں بھی وہ پہلی سی بات نہ تھی۔ اور یوں وہ کر بھی کیا سکتی تھی، بادشاہ سلامت سات میل کے فاصلے پر متمکن ہیں، شائد وہاں چل کر کچھ ہو سکے، اُدھر سے بھی ایک پُل دریا کے اوپر بنایا جا چکا تھا اگر بادشاہ مان گیا تو دوسرے روز وہاں سے پیرس پر حملہ ہو سکے گا۔ فوج کے کچھ حصے نے صبح ہی چپکے چپکے اُدھر کا رُخ کیا۔ لیکن بادشاہ پہلے سے اُن کا ارادہ تاڑ گیا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ پُل توڑ دیا گیا ہے! یہ غنیم کا کام نہ تھا، یہ اُن کے اپنے ہی بادشاہ کی عنایت تھی!

فرانساوی مورخ کیشیرا اس غلطی کا سارا الزام طریمول پر دھرتا ہے جو بادشاہ کا مشیرِ اعلیٰ تھا لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چارلز بھی اس شدید قصور میں حصّہ دار تھا۔ وہ دوشیزہ کی جوشیلی فطرت سے بہت گھبراتا تھا اور چاہتا تھا کہ جب موقع ملے وہ ان نت نئے جنگی منصوبوں کو چھوڑ کر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے حظ اُٹھانے میں منہمک ہو جائے۔ ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ پیرس کے سامنے ایک دن کی مدافعت کے بعد محاصرہ سے دست بردار ہو لیا جاتا، اورلیاں کے محاصرے میں متعدد بار آگے پیچھے آنا جانا پڑا، پیرس میں اس سے کم استقلال دکھانا اک فریب کاری کے سوا اَور کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ ہر چند فوج والے بُزدل نہ تھے لیکن بد قسمتی سے وہ اُن پُرانے جنگجوؤں میں سے نہ تھے جو دوشیزہ کی پیروی میں فتح و

ظفرمندی کے خوگر ہو گئے تھے۔ اُن میں سے اکثر نئے رنگروٹ تھے جو اُس کی ایک آدھ شکست پر بھی شک وشبہ میں اپنا سر ہلانے لگتے تھے کہ شائد یہ جادوگرنی ہی ہو جس کے جادو کی قوت اب صرف ہو چکی ہے۔ سین دنی واپس آکر تین روز سخت مباحثہ جاری رہا، بعض اوقات تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ژان بادشاہ کے حکم سے سرتابی کر کے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہو جائیگی۔ اس لئے کہ اب پھر اُس کی "آوازیں" جو اس سے قبل وعدۂ کامرانی نہ دیتی تھیں صاف صاف بولنے لگیں کہ پیرس کا محاصرہ جاری رکھنا چاہیئے۔ اُس نے بعد کو اپنی رُوبکاری کے موقع پر کہا کہ "آوازیں مجھے سین دنی ہی میں ٹھیرنے کو کہتی تھیں اور میں بھی ٹھیرنا چاہتی تھی لیکن اُمرا مجھے باوجود میرے اصرار کے لے گئے" اگر میں زخمی نہ ہو جاتی تو میں کبھی جنبش نہ کرتی"۔ مراجعت کے بعد اب پھر حملے کو بڑھنا یُوں بھی دشوار تھا۔ فوج کا حوصلہ پست ہو گیا اور لائیر وغیرہ بھی جو کبھی دوشیزہ کے ادنےٰ سے اشارے کی تعمیل کیا کرتے تھے خاموش ہو گئے۔

فرنساوی فوج نے اپنے بادشاہ کی مصاحبت میں جنوبی علاقے کی طرف کوچ کیا اور ژان بھی طوعاً وکرہاً ہمراہ ہولی۔ چلنے سے پہلے اُس نے سین دنی کے گرجا کی قربان گاہ پر اپنی زرہ اُتار کے رکھ دی۔ یہ اُس زمانے کا دستور تھا کہ جب کوئی جنگجو لڑائی سے واپس آتا تو وہ ایسا ہی کرتا لیکن شاید ایسا کرنا نااُمیدی کا اظہار تھا کہ وہ ملبوس جس کی یوں توہین ہُوئی اُس کا اُتار پھینکنا ہی مناسب تھا جب دوشیزہ وہ دوشیزۂ فاتح نہ رہی جسے دیکھ کر انگریز بھاگ جایا کرتے۔ اور فرانسیسی شیر بن جاتے تھے۔ ژان اس ذلت کو دل سے محسوس کرتی تھی کہ اب وہ اک قیدی کی طرح بادشاہ کی مصاحبت میں لیجائی جاتی تھی، وہ اب اک آسمانی رہبر نہ تھی فقط اک ارضی جنگجو تھی۔ بادشاہ نے مختلف مفتوحہ شہروں کی حکومت کا انتظام کیا اور منصرم مقرر کئے۔ جو فلپ برگنڈوی کے ساتھ عارضی صلح کے متعلق جُملہ امور طے کریں۔ پھر اپنی فوج کو لئے ہوئے جنوب کے زیادہ زرخیز و پُرعشرت علاقے کی طرف رُخ کئے ژیاں پہنچ گیا جہاں سے جون کے آخر میں وہ شمال کی جانب ژان کی سرپرستی میں فتوحات حاصل کرنے کو چلا تھا۔ اب ژان چارلز کی سرپرستی میں جاتی معلوم ہوتی تھی، دربار میں اُس کی خاص طور سے عزت کی جاتی تھی، ملکہ اُس کو سر آنکھوں پر لیتی تھی، اُس کے لئے مصاحب عورتوں کا اک خاص دائرہ مقرر

کیا گیا اور اُسے شریف خاتونوں کی طرح طلائی ملبوس سے آراستہ کرنے میں بادشاہ نے کوئی حجت اُٹھا نہ رکھی۔ بعد میں جب کوئی اَور حیلہ بہانہ نہ سوجھا تو اُس پر یہ الزام تراشا گیا کہ وہ خوش نما ملبوس پسند کیا کرتی تھی۔ ژان کی سی سادہ مزاج بلند فطرت لڑکی کیونکر ان بناوٹوں میں پھنس سکتی تھی، یہ ہم ماننے کو تیار نہیں ہیں، البتہ اگر اُس کے مخالفین اصرار ہی کریں تو ہمیں اتنا اعتراف کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ اُس کی انسانی فطرت بعض اوقات نفاست سے محظوظ ہوتی ہوگی۔ لیکن یہ ظاہر تھا کہ بادشاہ اور اُس کے مشیر اس پر تلے بیٹھے تھے۔ کہ آئندہ ژان اُن کے صریح حکم کے بغیر کچھ نہ کرنے پائے۔ آلانسوں نے اک آخری کوشش کی کہ کسی طرح اُس کی رہبر و رفیق اس جنجال سے رہائی پائے۔ اُس نے منصوبہ باندھا کہ شمال مغربی علاقہ نارمنڈی پر اک یورش کی جائے تاکہ انگریز غنیم کو اپنے عقب میں دیکھ کر پیرس کو غیر محفوظ حالت میں چھوڑ دیں، لیکن درباریوں نے ژان کو اُس کے ہمراہ جانے سے روک دیا اور آلانسوں نے اپنی جمیعت کو توڑ دیا۔ حالت اَور کی اَور ہوگئی، ساری فوج تتر بتر ہونی شروع ہوئی اور سارے بادشاہ کے خاصہ برداروں کے کوئی مسلح جنگجو باقی نہ رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ لوگ جو فرنساوی فوج کی آمد کی خبر سُن کر مطیع ہو جاتے برہم ہو گئے اور انگریزوں کا ساتھ دینے لگے سردیوں میں دربار نے مناسب جانا کہ بعض غیر مفتوح شہروں کے خلاف ایک مہم کی تیاری کی جائے۔ پس ژان کو بورژ بھیجا گیا جہاں وہ "مشیرِ شاہ" رینار کے مکان پر ٹھیرائی گئی رینار کی بیوی مارگریت جس نے ژان کی وفات کے مدت بعد اس کی "بحالی" کے وقت اُس کی عصمت و عفت کی شہادت دی ان دنوں ژان کی رفیق تھی۔ مارگریت نے دوشیزہ کی سیرت کی تصویر کھینچی ہے جیسی کہ وہ اس زمانۂ اندوہ و ملال کے دوران میں تھی۔ ہر چند دومرمی کی کسان لڑکی اور فرانس کی مشہور ترین خاتون کی حیثیت میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا ژان کی فطرت اب بھی ویسی ہی سادہ و بے لوث تھی جیسی کہ گئے گذرے دنوں میں جب وہ اپنے ماں باپ کے گھر کی دہلیز پر یا درختوں کے سائے میں سینے پرونے میں مصروف رہتی تھی۔ وہ تڑکے تڑکے نمازِ سحر کے لئے گرجا جانے کی بہت مشتاق تھی، مارگریت کو ساتھ لے لیتی تاکہ صبح سویرے اکیلی باہر نہ جائے، شام ہوتے وہ سب سے قریب کے گرجا میں

جاتی اور وہاں بچپن کی طرح گرجا کے گھنٹوں کے بجنے میں مزے لیتی۔ آدھ گھنٹہ تک صرف اُس کی خوشی کے لئے گھنٹہ بجایا جاتا، وہ مفلسوں بھکاریوں کو وہاں بُلا بھیجتی اور یہ اُسکے ساتھ نماز و دُعا میں شریک ہوتے + اُس کی سب سے بڑی مسرت اس میں تھی کہ حضرتِ مریمؑ کی مدح میں سب مل کے گیت گائیں یہاں تک کہ شام کا جھٹ پٹا رات کی تاریکی سے تبدیل ہو جائے اور قربان گاہ پر بتیوں کے جھلملاتے تارے اندھیرے میں اپنا نور برسانے لگتے"۔ جب اُس کے پاس کچھ دینے کو ہوتا تو وہ نادار پجاریوں کو جو اُس کے ساتھ محوِ عبادت ہوتے خیرات کرتی + شام و عشا اس طرح گذر جاتیں۔ دن کو وہ رنگروٹوں کے بھرتی کرنے میں مصروف رہتی + شہر کی عورتیں مادام مارگریت کے ہاں سینکڑوں کی تعداد میں آتیں اور تاکہ اس شہرہ آفاق غازیہ کو اک نظر دیکھیں۔ اُس سے بیسیوں قسم کے سوال پوچھتیں۔ کہ کیا تم زخمی ہونے سے ڈرتی ہو؟ یا کیا تم زخم کھانے سے بالکل محفوظ ہو؟" وہ جواب دیتی "میرا بعینہٖ وہی حال ہے جو دوسروں کا"۔ وہ اپنے زیور اور مقدس تمغے لاتیں تاکہ ژان اُنہیں اپنے نفس سے متبرک بنا دے، وہ یہ دیکھ کر مُسکراتی اور مادام یا کسی اَور سے کہہ دیتی کہ تم چھُو دو میرے تمہارے چھُونے میں کچھ فرق نہیں"! اُن میں سے بعض کے تمغوں پر اُسی کی شبیہ بنی ہوئی تھی، وہ اس بُت پرستی سے منع کرتی اور ہنس دیتی + باوجود ان تفریحات کے اُسکی زندگی میں اُداسی اپنی جھلک دکھانے لگی تھی۔ ان دنوں میں اُس نے "اعترافِ گناہ" کے اوقات میں متعدد بار اپنی موت کا تذکرہ کیا اور کہا کہ "اگر میرے نصیبے میں جلد مر جانا لکھا ہو تو بادشاہ سے میری جانب سے کہدینا کہ ملک میں جا بجا اُن لوگوں کی یادگاریں جو اپنے وطن کے لئے جانیں دے چکے ہیں عبادت گاہیں قائم کرے" + وہ بار بار اس بات کا ذکر کرتی تھی اور رات کی سی تاریکی اُس کے خیالات پر چھا رہی تھی، اُس کے شریکِ جنگ ساتھی منتشر ہو چکے تھے اور نئے شخص جنہیں وہ جانتی بھی نہ تھی فوج کے سرکردہ تھے۔ فوجی باگ ڈور دالبئیر کے ہاتھ میں تھی جو ژان کے بڑے دشمن طریموئیل کا داماد تھا۔ اس حالت میں مستقبل اُسکے لئے خوشگوار نہ ہو سکتا تھا +

اس تاریک وقت میں پیئر لو مونیئے کا محاصرہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا جو اگرچہ

تاریخی حیثیت رکھتا ہے تاہم اک معجزہ سے کسی طرح کم نہیں۔ پہلا ہلّہ ناکام رہا۔ مراجعت کا حُکم دیا جا چکا تھا کہ ژان دولوں نے جو دوشیزہ کا دائمی مصاحب تھا اُسے صرف چار پانچ آدمیوں کے ساتھ شہر پناہ کے نیچے کھڑا ہُوا دیکھا۔ دولوں مجروح تھا۔ بصد مشکل گھوڑے پر چڑھ کر قریب آیا اور کہا کہ تم یہاں کیا کر رہی ہو جب کہ سب لوگ جا چکے ہیں؟ ژان بولی میں تو اُسی وقت یہاں سے جنبش کرونگی جب یہ مقام فتح ہو جائیگا۔ یہ کہہ کر وہ شہتیروں اور گٹھوں کے لائے جانے کے لئے بآوازِ بلند پکارنے لگی تاکہ خندق کو پُر کر کے پیشقدمی کا حکم دیا جائے۔ اُس نے لوگوں کے بھاگ جانے کی چنداں پروا نہ کی اور برابر چلاّئے گئی پل کو چلو سب پل کو! گٹھے لاؤ! گٹھے لاؤ! کسی نے قریب سے کہا۔ "ژان لوٹ آؤ! لوٹ آؤ! تم اکیلی ہو!" برہنہ سر چہرہ تمتایا ہوا، دوشیزہ نے جواب دیا "ابھی میرے ہمراہ میرے پچاس ہزار آدمی ہیں!" یہ اُس نے نہ بتایا کہ وہ کون ہیں؟ زمین کے انسان یا آسمان کے فرشتے؟ وہ چلاّئے گئی "کام کئے جاؤ! کئے جاؤ!" تاریخ کی دیوی اس تن تنہا صورت کو آنکھیں پھاڑے حیرت سے دیکھتی ہو گی کہ مردِ میدان چھوڑ کر چل دیئے ہیں لیکن ایک نوجوان عورت کی سیمیں آواز ہنوز پکار رہی ہے "کام کرو، کام کئے جاؤ!" اس کا اثر حیرت انگیز ہُوا۔ بھاگے ہُوئے سپاہی واپس آ گئے۔ قلعہ بندیاں مضبوط تھیں، شہر میں سامان رسد وافر تھا اور محصورین کی تعداد معتدبہ تھی مگر دوشیزہ کی شخصیت کے آگے کسی کی کچھ پیش نہ گئی اور شہر فتح ہو گیا! پھر کیا تعجب ہے کہ جیسا کہ ژان نے کہا اگر فرانسادی افواج پیرس کے سامنے ذرا سا استقلال دکھاتیں تو دارالسلطنت ضرور اُن کے قبضے میں آ جاتا!

لیکن اب پیرس کے مُسخّر نہ ہونے پر اظہارِ تاسف کرنا بے سُود تھا۔ اب تو کامرانی صرف گئے گذرے دنوں کی یاد میں تھی اور مستقبل تاریک ہی تاریک تھا۔ انگریزوں اور برگندیوں نے پہلے اچھی طرح پیرس پر قدم جما لئے پھر اُسے تنہا چھوڑ دیا لیکن ہمارے چست و چالاک شاہِ چارلز نے اس زرّیں موقع سے کچھ فایدہ نہ اُٹھایا۔ غنیم یہ دیکھ کر اور دلیر ہو گیا۔ اُس نے شاہِ فرانس کی دلاوری کا اندازہ کر لیا۔ بیڈفورڈ نے گردونواح کے شہروں کو تاخت و تاراج کرنا شروع کیا اور جو جو شہر انگریزوں کے قبضے سے نکل گئے تھے اُنہیں ایک ایک کر کے شمشیر

انگلستان کے آگے سرنگوں کیا۔ دریائے سین کے کنارے جتنا علاقہ شاہِ فرانس کا مطیع ہوگیا تھا قریب قریب سارا اُس کے تصرف سے نکل گیا۔ کہیں کہیں کوئی شہر یا قصبہ باقی رہا۔ اور اُن کے مضافات بھی تباہی کا افسانہ بنے ہُوئے تھے۔ لاشاریتی کے محاصرے میں دوشیزہ کا سامانِ رسد اور ذخائرِ حرب ختم ہوگئے۔ کسی نے اعتنا نہ کیا کہ کمک بھیجی جائے۔ مجبوراً محاصرے سے دست بردار ہونا پڑا۔ بادشاہ مستِ عیش ہوکر برگنڈی کے ساتھ ایک جھوٹی صلح کے سلسلے میں گرفتار رہتا اور کبھی کبھی کسی مقام کو کمک بھیج دیتا۔ ژان اس کے ہمراہ تھی لیکن دربار کی عشرتوں کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں کڑھتی تھی۔ شاہِ فرانس اور اُس کے غریب کار درباریوں نے جس بے بیدردی اور سرد مہری سے دوشیزہ کی تواضع کی وہ تاریخ کا اک شرمناک واقعہ ہے۔ لیکن یہ بے اعتنائی اُن کے جی خوش کرنے کو نا کافی تھی۔ وہ اس فکر میں تھے کہ کسی طرح ژان کی غیبی پیام رسانی کو جھوٹا کر دکھائیں۔ آخر کسی دغا شعار درباری کے بہکانے سے ایک ذلیل عورت کاترین دلاروشل نے دعوےٰ کیا کہ مجھے بھی "آوازیں" سُنائی دیتی ہیں اور صورتیں نظر آتی ہیں۔ دوشیزہ جو کچھ کہتی تھی کاترین اُس کی تردید کرتی تھی۔ اس جھوٹی پیغمبرہ نے کیا کرایا خاک نہیں، صرف دعوےٰ ہی کرتی رہی؛ ناقدرشناسی اور احسان فراموشی کی کوئی مثال اس سے زیادہ دل شکن اور جاں گداز نہ ہوگی، ژان کے دل کی جو حالت ہوئی وہ قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں!

بالآخر دوشیزہ ضبط نہ کرسکی اور قلعہ چھوڑ کر چل کھڑی ہوئی اس کے بعد اُس نے چارلز اور اُس کے درباریوں کا مُنہ کبھی نہ دیکھا۔ جنگ کی چیخ پکار ان عشرت گاہوں کے قریب قریب سُنائی دینے لگی تھی۔ ژان نے اپنے چند رفقا کے ساتھ جن میں اُس کے دونوں بھائی شامل تھے ملاں کا رخ کیا جس پر انگریز قبضہ کرنے کو تھے۔ یہاں وہ خندق کا معائنہ کر رہی تھی اور اپنی موجودگی میں قلعہ بندیوں کی مرمت و مضبوطی میں مصروف تھی کہ اُسکی "آوازیں" جو مدت سے خاموش تھیں گویا ہوئیں اور یہ پیام دیا "تم سین ژان کے روزِ متبرک سے پہلے پہلے گرفتار کرلی جاؤ گی"! سین ژان کا دن جُون کے اخیر میں پڑتا ہے، یعنی ژان کی گرفتاری میں صرف دو ماہ کی مدت باقی رہی اس میں اُسے فرانس کے لئے جو کچھ کرنا ہے کر گذرے۔

اِس فوری اطلاع سے ژان چونک اُٹھی۔ وہ کیا کیا منصوبے باندھ رہی تھی اور یہاں کیا ہو جانے والا ہے؟ دوشیزہ نے گڑگڑا کر دعا مانگی کہ خدایا! تو مجھے اک طویل قید کی مشقتوں سے بچا کر جلد ہی اپنی پناہ میں لے لیجیو! وہ جانتی تھی کہ اُس کے دشمن اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے اور اُسے اُن سے کیا توقع رکھنی چاہیئے؟ آسمانی آوازوں نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ صرف اُسے ہمت نہ ہارنے کی نصیحت کی جیسا کہ ہر شہید کو ہوتی ہے۔ کہا کہ خدا تیری مدد کریگا خدا تجھے اپنی پناہ میں لیگا! انسان نہیں سمجھتا کہ یہ مدد کیا ہے؟ اسے آرام و آسائش سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن خدا وہی کرتا ہے جو اُس کے حسب منشا ہو! بعد میں ژان نے اپنے بھولے پن کے ساتھ اعتراف کیا کہ اگر مجھے اُس دن کا علم ہوتا جب میں گرفتار ہوئی تو میں لڑنے کو باہر نہ نکلتی۔ اُس نے آوازوں سے پوچھا کہ کہاں؟ کس روز؟ مگر کچھ جواب نہ پایا!

ملاں سے وہ لائی گئی۔ رستے میں برگندیوں کے ایک دستے سے مٹھ بھیڑ ہوگئی۔ وہ اور اُن کا سرکردہ فرانکے داراس قید کر لئے گئے، یہ شخص اپنے زمانے کا مشہور ڈاکو تھا جس نے سینکڑوں گھرانوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا + اب وہ قانون کی زد میں آیا اور اُس پر مقدمہ چلا کر اُسے پھانسی پر چڑھا دیا گیا + ژان کو بعضوں نے الزام دیا کہ وہ اس قتل میں شریک تھی اگر مجرم کو سزا دینا غلطی ہے تو ژان نے حقیقت میں اس غلطی کا ارتکاب کیا!

ایک اور واقعہ پیش آیا جس کا ذکر بعد کو اُس کے الزامات میں کیا گیا۔ شہر میں ایک بچہ مُردہ پیدا ہُوا۔ اس زمانے میں عیسائی دستور تھا کہ ایسے بچے کو قربان گاہ پر لٹا دیتے کہ شاید کرامات کے ذریعے سے وہ زندہ ہو جائے۔ اِس مُردہ بچہ کو بھی گرجا میں لے جایا گیا، شہر کی کنواری لڑکیوں نے دُعا کی، ژان کا قول ہے کہ وہ بھی اس دُعا میں شریک تھی، بچے نے اپنی آنکھیں کھولیں تین چار بار انگڑائی لی، اُسے اصطباغ دیا گیا جس کے بعد وہ پھر مر گیا! آج کل ان باتوں کا ماننے والا کوئی نہیں، خدا جانے واقعہ کیا تھا۔ بہرحال مخالفین کو کہنے کا موقع مل گیا۔ کہ یہ صریح جادو ہے!

ہر روز بلا ناغہ اور دن بھر اُس کی "آوازیں" اُس کے کان میں اپنا پیام پھونکتی

رہتیں" سیں ژان سے پہلے"! آخر ژان نہ رہ سکی اور اپنے رفقا میں سے بعض کو اُس نے یہ بات بتلادی" لانی سے وہ دو تین مرتبہ کومپی این کو گئی جہاں دشمن کا زور تھا۔ ایک بار اُس نے منٹواسی کا محاصرہ اُٹھانے کی غرض سے کوچ کیا + ایک دفعہ جب وہ کومپی این میں تھی وہ گرجا میں چند بچوں کی رسمِ عشائے ربانی میں شریک ہوئی + بچوں کے ساتھ محوِ عبادت رہنا اُسکی روحانی مسرت کا منتہائے کمال تھا۔ اثنائے ریاضت میں نہ جانے اُس کے جی میں کیا آئی کہ وہ نظروں سے اوجھل ہوکر ایک ستون سے جا لگی، چند لوگ جن میں بچے بھی شامل تھے اُسے دیکھنے کے لئے قریب ہو لئے۔ ژان کا کوئی محرمِ راز نہ تھا، اُس کا جی بھر آیا اور وہ بے اختیار ہوکر بولی" پیارے دوستو! پیارے بچو! مجھے تم کو اطلاع دینی ہے کہ میرے ساتھ دغا اور بیوفائی کیگئی ہے اور جلد ہی میری جان کے لالے پڑ جائیں گے"؛ خدارا! میرے لئے دعا کرو کیونکہ تھوڑی ہی مدت بعد میں بادشاہ اور ملک کی خدمت نہ کر سکونگی" +

آخر کار خبر آئی کہ کومپی این کو انگریزوں اور برگندیوں نے گھیر لیا ہے، کومپی این جو کبھی چارلز کی قیامگاہ تھا اور جہاں زور شور سے اُسکی آؤ بھگت ہوئی تھی + اس کا بچانا لازم تھا، ژان کریسپی میں تھی جب اُسے یہ خبر ملی۔ وہ بلا توقف (۲۲ مئی ۱۴۳۰ء کو) محصورین کی کمک کو چل دی، اُس نے کہا میں اپنے کومپی این کے اچھے دوستوں سے ملنے جا رہی ہوں" یہ الفاظ ژان کے اُس بُت کے نیچے کندہ ہیں جو کومپی این کے چوک میں دوشیزہ کی یادگار میں نصب کیا گیا ہے + اُس کے کوچ اور پیش قدمی میں فتحیابی کے زمانے کا جوش پھر رُونما ہوا۔ وہ مطلق نہیں جھجکی، شاید یہ سمجھتی تھی کہ ابھی اُس کی گرفتاری میں کم از کم ایک ماہ کی مُدت ہے اور اس عرصے میں کچھ بھی ہو وہ سب خطروں سے محفوظ رہے گی + شہریوں نے بڑے تپاک سے اُس کا خیر مقدم کیا اور اگرچہ اُس کی مرضی نہ تھی کہ دشمن کو اُس کے آنے سے آگاہی حاصل ہو لیکن گھنٹوں کے بجنے اور نعروں کے بلند ہونے سے غنیم کو پتہ چل گیا کہ ہو نہ ہو یہ دوشیزہ ہی ہے جس کی آمد میں اس قدر شور و غل سُنائی دیتا ہے + وہ صبح ہی شہر میں پہنچ گئی تھی۔ تیاریوں میں سارا دن صرف ہو گیا۔ شام کے پانچ بجے وہ اپنی جمعیت لے کر دشمن پر حملہ کرنے کو نکلی + کومپی این کا شہر پیرس سے ۳۵ میل شمال مشرق

ؔ پیرس کے شمال مشرق میں ایک مقام ہے۔

کی طرف دریائے آوآز کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ غنیم دریا کے دائیں کنارے ڈیرے ڈالے پڑا تھا، برگنڈیئے کچھ تو شمال کی طرف عین سامنے مارنی کے گاؤں میں پل سے ایک میل کے فاصلے پر تھے اور کچھ مشرق کی طرف کلیروآ کے گاؤں میں دو اڑھائی میل پر اور انگریزوں کی فوج مغرب کی طرف وینت کے گاؤں میں قائم تھی جو دریا کے کنارے کومپی این سے ڈیڑھ میل پر واقع ہے یعنی غنیم ایک تکون کے تینوں کونوں پر متمکن تھا جس کا قاعدہ دریا کی رَو تھی اور قاعدے کے وسط میں شہر تھا۔ شہریوں کا تنہا سامانِ حفاظت ایک برج تھا جو پل کے سرے پر قائم تھا۔ دوشیزہ کا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے مارنی پر حملہ کرے اور پھر کلیروا پر، انگریزوں کی طرف اُس نے مطلق توجہ نہ کی، شہر کے ناظم فلاوی کے ساتھ اُس کا سمجھوتا تھا کہ وہ برج میں تیراندازوں کی ایک خاصی جماعت مامور کرے جو ان کو روکے رکھے۔ جنگ کا آغاز ژان کے لئے تسلی بخش تھا۔ مارنی کی فوج بغیر تامل کے پس پا ہوگئی۔ یہ دیکھ کر مشرق سے کلیروآ کی فوج اپنے رفقا کی مدد کو بڑھی اور فرانساوی فوج سے مصروفِ پیکار ہوگئی۔ تین بار دونوں فوجیں بڑھیں اور ہٹیں، کبھی ایک فریق کا پلہ بھاری تھا کبھی دوسرے کا۔ اتنے میں مغرب سے انگریز بڑھنے لگے اور دوشیزہ کی فوج کے عقب کو خطرے میں ڈالدیا۔ ناگہاں بھاگڑ سی پڑگئی اور جنگجو منہ موڑ کر بھاگے۔ کوئی کشتیوں کی طرف لپکا، کسی نے برج کی سمت رُخ کیا۔ انگریزوں نے یہ حالت دیکھی تو بے تحاشا اُن کا تعاقب کرنے لگے کیونکہ اب برج کے تیرانداز اِس ڈر سے اُن پر تیر نہ برسا سکتے تھے کہ شاید تیر اُن کے اپنے ہی آدمیوں کو نشانہ بنائیں۔ پیچھا کرتے ہوئے انگریز شہر کے اِس قدر قریب آپہنچے کہ شہر کے دروازوں کو بند کردینا پڑا۔

یہ سب کچھ ژان کی فوج کے عقب میں ہو رہا تھا، اُسے شروع شروع میں اس کی مطلق خبر نہ تھی، اُس کے رفقا کو خبر ہوئی تو انھوں نے زور دیا کہ جلد شہر کا رُخ کرنا چاہیئے۔ مگر وہ لوٹنے کا نام نہ لیتی تھی، اب بھی اُس کا نعرہ یہی تھا "بڑھے چلو، ہم ابھی اُن کو مارلیں گے!" ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تنِ تنہا کھڑی رہے گی اور دشمن کا مقابلہ کئے جائے گی خواہ صورتِ حالات بد سے بدتر کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن ساتھیوں نے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اُسے زبردستی موڑا۔ بھاگتی ہوئی فوجوں کے درمیان کوئی ایسی صورت نہ تھی کہ چھپائے سے چھپ سکتی، مسلّح

آدمی اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہُوئے اُس کی محافظت پر تُلے ہُوئے تھے، وہ ایک قرمزی کُرتہ پہنے ہُوئے تھی اور دیکھنے والوں کی نظریں چاروں طرف سے اُس کی طرف اُٹھ رہی تھیں! پیچھے سے برگندیئے جو پس پا ہو چکے تھے پھر بڑھنے لگے اور آگے انگریز اِن لوگوں اور شہر کے دروازوں کے درمیان حائل تھے + اُس وقت بھی سواروں کا ایک دستہ رستہ چیرتا ہُوا غنیم کی فوجوں کے بیچ سے نکل جا سکتا تھا لیکن افراتفری کا یہ عالم تھا کہ مفرورین کہیں دروازوں پر پٹے پڑے تھے کہیں انگریزوں کی برچھیوں پر دھکیلے جا رہے تھے اور کوئی راہِ فرار انہیں نظر نہ آتی تھی + ژان کا دستہ سڑک پر سے مجتمع و مرتب ہوکر آ رہا تھا کہ انہوں نے رستے کو قطعی طور پر مسدود پایا۔ پھر بھی اک آخری کوشش کی کہ مغربی دروازے کی طرف کو ہو چلیں لیکن اتنے میں دشمن نے اس گرد و غبار اور تاریکی میں بھی دوشیزہ کو پہچان لیا کہ بس شکار اب ہمارے ہاتھوں ہی میں ہے + چاروں طرف سے انگریز اور برگندیئے ژان پر جھپٹ پڑے اور باوجود شدید مزاحمت کے کسی نے اُس کے گھوڑے کو کھینچا کسی نے باگ تھامی اور ایک برگندی جنگجو نے اُس کی قبا پر ہاتھ ڈالا اور اُسے گھسیٹ کر گھوڑے سے نیچے اُتار پھینکا!! ایک لمحے کے لئے دوشیزہ فرنسادی نظروں سے اوجھل ہوگئی اور غصہ و یاس کی اک لہر شہر بھر میں دوڑ گئی، کومپی این کے گرجے گھنٹوں کی آوازوں سے گونج اُٹھے، کوچے کوچے میں غلغلہ اُٹھا کہ اُٹھو! چلو! دوشیزہ کو بچاؤ! وہ دشمن کے قبضے میں جانے کو ہے! ـــــ لیکن افسوس! کُچھ نہ ہو سکا، نہ کُچھ کیا گیا، ژان گرفتار ہوگئی اور واقعی دشمن کے قبضے میں آگئی!!

(باقی)　　　بشیر احمد

محفلِ ادب

ندی کا راگ:۔ میں نے گھر بار چھوڑ دیا ہے۔ اور پیا سے ملنے کی خاطر تمام آرام و آسائش پر لات مار دی ہے۔

مجھے حقیر سمجھ کر دشوار گذار ٹیلے، اور جھاڑیاں میرا رستہ روکنا چاہتی ہیں، مگر میرا جذبۂ شوق ان کو خاطر میں نہیں لاتا اور اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے۔

میرے دونو پہلوؤں میں ہریالی چھائی ہے۔ اور نسیم اُسے تھپکیاں دے دے کر دُنیوی آنکھوں کیلئے ایک حسین نظارہ پیش کرتی ہے۔ مگر میرے اُس راگ کی طرف کوئی کان متوجہ نہیں ہوتا ہے جو میں اپنے (پیا) سے ملنے کی مسرت میں ہر لمحہ و ہر لحظہ گاتی رہتی ہوں۔ اور جس میں میری زندگی کی تمام ترسعی پوشیدہ ہے۔

بہت سے جوگی میرے کناروں پر بیٹھے عبادت میں محو ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ میرے سرد دل میں بھی محبت کی گرمیاں موجود ہیں۔ اور انہیں بھی کسی چیز کا شوق بیتاب و مضطرب رکھتا ہے۔

نشیب و فراز، خوبصورتی اور بدصورتی۔ خزاں اور بہار ان تمام اشیاء میں میرے لئے کوئی کشش کوئی شیرینی نہیں۔ مجھے تو صرف یہ خیال، یہ تمنا بے قرار کئے ہوئے ہے کہ کسی طرح اپنے پیا کے پاس پہنچ جاؤں۔ اور اپنے آپ کو، اپنی ہستی کو اُس میں فنا کر دوں۔

میں نے گھر بار چھوڑ دیا ہے۔ اور پیا سے ملنے کی خاطر تمام آرام و آسائش پر لات مار دی ہے۔

جیوتی لاہور (ہندی)

پھول کی کہانی:۔ دو دن کے لئے باغیچہ میں آیا اور اپنا کھیل کھیلنے کے بعد چلا گیا۔ وہ حسین صورت لیکر آیا تھا۔ جب تک رہا ہنستا کھیلتا رہا۔ اپنی خوشبو سے ہوا کو معطر کرتا رہا۔

اس سے زیادہ اس چندروزہ زندگی، اس نہ رہنے والی عمر میں کیا کیا جا سکتا ہے۔

اُس کی پیاری پیاری ادائیں دیکھ کر۔

مالی کا ہوس پرست، اور بے ترس دل اُس پر فدا ہو گیا۔

اُس نے اُسے شاخ زندگی سے علیحدہ کر لیا اور
بازار کو فروخت کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ اُس کے دل میں یہ خیال ایک بھی دفعہ نہیں آیا۔ کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ آسمان دُنیا کو ایک درخشاں تارے سے اور محفل حیات کو ایک شمع منور سے محرُوم کر دیا۔

یہ دُنیا کیسی خود غرض، کس قدر بے پروا ہے۔
زندہ پھُول کو سر پر چڑھاتی ہے۔
مُردہ کو پاؤں سے ٹھکراتی ہے۔
اور گھر سے دُور، فاصلے پر پھینکوا دیتی ہے۔ اور اپنے اپنے کام میں اس طرح مصروف رہتی ہے۔ گویا کوئی غیر معمُولی واقعہ، افسوسناک حادثہ نہیں ہُوا۔ حالانکہ ایک پھُول دُو دن کے لئے باغیچہ میں آیا اور اپنا کھیل کھیلنے کے بعد چلا گیا۔

مادھری لکھنؤ (ہندی)

رنج و راحت۔ منظر یاس کتنا شیریں، کس قدر پُر اثر ہے۔ دُنیا کا کوئی منظر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
رستے میں بہت سے لوگ ہنستے کھیلتے ہُوئے نکل جاتے ہیں۔ لیکن کیا کوئی اُن کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھنے کی پروا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص تباہ حال ہو اور اشکبار آنکھوں سے امداد کیلئے التجا کر رہا ہو تو کیا ہر درد مند دل میں یہ آرزو نہیں پیدا ہوتی۔ کہ اسے ذرا روک لیں اور اُس سے اپنی دُکھ بھری داستان کہنے پر اصرار کریں۔ اس کے دل کے ساتھ اپنا دل ملا دیں اور اُس کے بہتے ہُوئے آنسوؤں کو چُوم کر خشک کر دیں۔
جو جنگ سے فتحیاب ہو کر واپس آتا ہے۔ اُس کا حال سُننے کو جی تڑپتا ہے یا جو ناکامیاب ہو کر، شکست کھا کر روتے ہُوئے وہیں لیٹ جاتا ہے اُس کی کہانی سُننا؟ ہمدردی کس کے ساتھ ہوتی ہے؟ دل کس پر رحم کرتا ہے؟ آنکھیں کس کیلئے روتی ہیں ــ اور گیت؟ مسرّت کا اچھا معلوم ہوتا ہے، یا رنج و غم کا؟ خوبصُورتی اُفق میں ہے یا غروب آفتاب کی سُرخی میں؟ وُہ دلی دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ جو پُر رونق ہے۔ عالیشان ہے۔ امیر ہے نصیب آباد ہے۔ یا وُہ متھرا دیکھنے کو طبیعت بیقرار ہوتی ہے۔ جس کی بہار لُٹ چکی ہے۔ جو تباہ ہو گئی ہے۔ اور جہان کی فضائے آسمانی میں دن رات اُداسی چھائی رہتی ہے۔ مُسرّت غرور ہے۔ اس کی تان بہت بلند اور سخت ہوتی ہے۔ مگر غم ہمیشہ دوزانو رہتا ہے۔ اس کی آواز عاجزانہ اور اثر میں شرابور ہوتی ہے۔ غم جمع کرتا ہے۔ مُسرّت اُسے لٹا دیتی ہے۔ غم

اپنی طرف دیکھنا سکھاتا ہے۔ مسرّت آنکھیں بند کر دیتی ہے۔ غم جڑھوں کی طرف مٹی سے رس کھینچتا ہے۔
مسرّت اُسے پھُول پتوں میں صرف کر دیتی ہے۔ رنج برسات کی طرح گرم زمین کو اپنے چھینٹوں سے سرد کرتا ہے۔
راحت چودھویں کے چاند کے مانند اُس کے اُوپر طلوع ہو کر اُس پر ہنستی ہے۔ دُکھ کسان کی طرح مٹی میں ہل چلاتا ہے
سُکھ بادشاہ کی طرح اُس میں سے پیدا ہوئی۔ شیرینی سے فایدہ اُٹھاتا ہے۔ دونوں میں اچھا کون ہے؟ دُنیا کیلئے
فائدہ کس میں ہے؟ لوگ کس کو چاہتے ہیں؟

(پرتاب بنگالی)
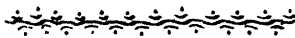
وقت۔ آہ اِس لفظ میں کس قدر وسعت سمائی ہوئی ہے۔ اور یہ کیسا عالمگیر ہے۔ یہ دُنیا کا ہمزاد بھائی ہے۔ جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ تک رہیگا۔ جو واقفیّت دُنیا کی کوئی کتاب نہیں دے سکتی۔ جس کا بیان دُنیا کی کوئی زبان نہیں کر سکتی۔ جس کا تماشہ دُنیا کی قدیم سے قدیم آنکھ نے نہیں دیکھا۔ وُہ وقت نے دیکھا ہے۔ اگر قدرت اسے ایک زبان کی نعمت سے محرُوم نہ رکھتی تو یہ بتا سکتا۔ کہ اس نے دُنیا میں کیا کیا دیکھا ہے۔ اور دُنیا نے کس طرح اپنے رنگ تبدیل کیئے ہیں۔ یہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہندوستان کی سرزمین کو کسی غلام کے قدموں نے پامال نہ کیا تھا۔ اور دنیا کی اقوام میں ہندوستانیوں کا سر اس طرح اُونچا تھا۔ جس طرح ہمالہ کا سفید سر تمام پہاڑوں سے بلند ہے۔ یہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہندوستان کے ایک حکمران کی بیوی جوئے میں ہاری جارہی تھی۔ اور دھرم کا فرزند یدھشٹر تباہی وبربادی کی مہر اپنے وطن پر ثبت کر رہا تھا۔ یہ اُس وقت بھی موجود تھا۔ جب ہندوستان پر اکبر اعظم جیسا اہل دماغ حکومت کر رہا تھا۔ اور ملک کی دو منتشر قوموں کو متحد و متفق کرنے کی سعی میں مصروف و مشغول تھا۔ یہ اُس وقت بھی دیکھ رہا تھا۔ سُن رہا تھا۔ سمجھ رہا تھا۔ جب ہندوستانی قومیّت تباہ ہو رہی تھی۔ یہ آج بھی دیکھ رہا ہے۔ جب ہندوستان رستے کا فقیر بنکر پیسے پیسے کے لئے التجا کر رہا ہے اور در بدر ٹھوکریں کھا رہا ہے یہ سب کچھ دیکھتا ہے، یہ سب کچھ جانتا ہے مگر خاموش رہتا ہے۔ اور ہماری پیدائش سے لیکر موت تک ہمارا ساتھ دیکر ہمیں آگ کے خوفناک شعلوں یا مٹی کے بھاری تودوں کے سپرد کر دیتا ہے +

اے کاش اس کی زبان گویا ہوتی۔ تو ہم پر کیسے کیسے عجیب و غریب حالات کا انکشاف ہوتا +

(سوبھاگیہ سندری گجراتی)

وُہ ذہین نہیں تھا:۔ وُہ معمُولی عقل کا مالک تھا۔ اُس کا حافظہ بھی کچھ تیز نہ تھا۔ تاہم اُس نے محبّت کے میدان میں فتح حاصل کی اور ایک نوعمر حسینہ کو اپنے ساتھ شادی کرنے پر رضامند کر لیا۔ اُس رات اُس کی مسرّت کا ٹھکانا نہ تھا۔

آخر اُس نے لمپ کے سامنے بیٹھ کر اپنی محبُوبہ کو چٹھی لکھی۔

جانِ من! مَیں تم سے اتنی محبّت کرتا ہوں۔ جتنی کسی فانی آدمی نے کسی فانی عورت سے نہ کی ہوگی۔ مَیں تم سے ملنے کی خاطر گھر سے گھر سے سمندر میں کُودنے اور خوفناک آگ میں گرنے کو تیار ہوں۔ اور دُنیا کا بلند ترین پہاڑ مجھے تمہاری زیارت سے نہیں باز رکھ سکتا۔

تمہارا چارلی

نوٹ:۔ مَیں تم سے ہفتہ کی شام کو ملنے آؤں گا۔ بشرطیکہ اُس دن بارش نہ ہو رہی ہو۔

(پیرسن لنڈن)

دُنیا کا سب سے بڑا آدمی:۔ دُنیا کا سب سے پہلا بڑا آدمی پہلوان تھا۔ اُس وقت دُنیا طاقت کی پرستش کرتی تھی۔ اس کے بعد پروہت کا عہد شروع ہُوا۔ لوگوں کو مذہب کا خیال ہو گیا تھا۔ مگر زمانہ آئندہ کا بڑا آدمی کاروباری آدمی ہوگا۔ کیونکہ اب دُنیا نہ جنگ کی خواہاں ہے۔ نہ رُوحانی خوف کی ــــ اب اُسے صرف کاروبار کی ضرورت ہے۔

(کرنٹ اوپینئن امریکہ)

وطن کا راگ

(۱)

بھارت دل کا چین ہمارے، بھارت آنکھ کا تارا ہے
ہر رُت ہر اک موسم اس کا کیسا پیارا پیارا ہے
کیسا سُہانا کیسا سُندر پیارا دیش ہمارا ہے
دُکھ میں سُکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۲)

سارے جگ کے پہاڑوں میں بے مثل پہاڑ ہمالا ہے
پربت سب سے اُونچا ہے یہ پربت سب سے نرالا ہے
بھارت کی رکھشا کرتا ہے بھارت کا رکھوالا ہے
لاکھوں چشمے بہتے ہیں اس میں لاکھوں ندیوں والا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۳)

گنگا جی کی پیاری لہریں گیت سُناتی جاتی ہیں
صدیوں کی تہذیب ہماری یاد دلاتی جاتی ہیں
بھارت کے گلزاروں کو سرسبز بناتی جاتی ہیں
کھیتوں کو ہریالی دیتی پھُول کھلاتی جاتی ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۴)

ہرے بھرے ہیں کھیت ہمارے دُنیا کو ان دیتے ہیں
چاندی سونے کی کانوں سے ہم جگ کو دھن دیتے ہیں
پریم کے پیارے پھُول کی خوشبو گلشن گلشن دیتے ہیں
امن و امان کی نعمت سب کو بھر بھر دامن دیتے ہیں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۵)

کرشن کی بنسی نے پھُونکی ہے رُوح ہماری جانوں میں
گوتم کی آواز بسی ہے محلوں میں میدانوں میں
چشتی نے جو دی تھی مئے وہ اب تک ہے پیمانوں میں
نانک کی تعلیم ابھی تک گونج رہی ہے کانوں میں

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۶) ہندو بھی ہیں مسلماں بھی ہیں، پارسی ہیں عیسائی ہیں
مذہب کچھ ہو ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
بھارت ماں کے عاشق ہیں ہم بھارت کے سودائی ہیں
پریم کے ہم شیدائی ہیں پریم نے سب کو ایک کیا ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

(۷) دیش میں شوبھا جو کچھ ہے اے دیش کے داتا تجھ سے ہے
راجا پرجا سب کے مالک سب کا ناتا تجھ سے ہے
داتا سب آشش کی بھکاری بھارت ماتا تجھ سے ہے
بھارت بھاگ بنا دینے کی آس بِدھاتا تجھ سے ہے

بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

حامد اللہ افسر میرٹھی

صبح و شام

صبح

آزاد غمِ دہر سے ہے چہرۂ خنداں
پروا ہی نہیں اس کی کہ گیسو ہیں پریشاں
کہتے ہیں کہ ہوتے ہیں حسیں رہزنِ ایماں
یہ حسن تو ایماں کا ہے سرچشمۂ حیواں

کیا سادہ و پُر لطف جمالِ سحری ہے!

سب دشت و جبل حسن سے معمور ہوئے ہیں
ذراتِ چمن غیرتِ صد طور ہوئے ہیں
پردے رخِ محبوب سے کیا دور ہوئے ہیں!
اشجار مئے نور سے مخمور ہوئے ہیں

قدرت کی صراحی مئے وحدت سے بھری ہے!

شام

ظلمت نے کیا عالمِ امکاں کو جو تسخیر
معمورۂ آفاق بنا درد کی تصویر
طاری ہے سکوں گویا ہر اک چیز ہے دلگیر
خاموشیِ عالم میں ہے تاثیر سی تاثیر

اس نغمۂ خاموش کی لے درد بھری ہے

جو نیلے سے آکاس پہ روشن ہیں ستارے
کس حسن کے جلوے ہیں یہ بے سوز شرارے
مہتاب کی کرنیں ہیں کہ ہیں نور کے دھارے
اندوہ رُبا، روح فزا ہیں یہ نظارے

کس شاہدِ محبوب کی یہ جلوہ گری ہے!

ہو نورِ سحر کا کہ سیاہی شبِ غم کی
ہو نغمۂ مطرب کہ ہو صحرا کی خموشی

مہتاب فلک پر ہو کہ ہو ابر میں بجلی
جس چیز سے پوچھو وہ بصد ناز کہیگی

اے پوچھنے والے یہ تری بے بصری ہے!

عبدالسمیع پال آشر

جذباتِ عالیہ

گرامی

اسیرِ عشق بناموس و ننگ در جنگ ست
کہ عشق دشمنِ ناموس و رہزنِ ننگ ست

اداشناس رموزِ کرشمہ میدانند
کہ در نگاہ و تغافل ہزار فرسنگ ست

دلِ من و ہوسِ وصلِ آں صنم چہ کنم
عجب معاملۂ آبگینہ و سنگ ست

دماغِ عشق ہمہ حکمت و ہمہ عقل ست
فسونِ عقل ہمہ عشوہ و ہمہ رنگ ست

ہزار جلوہ و رنگے ز بیخودی نگرفت
فقیہہ شہر ہمانا گلیم خود رنگ ست

زلافِ معرفتِ شیخ شہر دانستم
کہ مدعا رہ باریک و مُدعی لنگ ست

ز قُرب و بعد چہ گوئی کہ قُرب او بُعد ست
ز جنگ و صلح چہ پُرسی کہ صلح او جنگ ست

سپہرِ دآں ہمہ چشمک فروشی اختر
فریب پردۂ قانونِ فتنہ آہنگ ست

تراودد از نگہ رہ نوردِ وادیٔ نزع
کہ نیم گام دریں رہ ہزار فرسنگ ست

بصلح دست در آغوش غیر را چہ خبر
کہ چشم من ہمہ شب با ستارہ در جنگ ست

عتاب او ہمہ آفت خطاب او ہمہ قہر
گرامی اینچہ فسونست و اینچہ نیرنگ ست

وحشت کلکتوی

ستم ہے بارشِ تیرِ جفا چرخِ ستمگر کی
ضرورت ہے مجھے ساقی حصارِ دورِ ساغر کی

قیامت خیز ہے وحشت کی بھی ہنگامہ آرائی
مرے چاکِ گریباں میں جھلک ہے صبحِ محشر کی

ہوئے اس کی یاد کامل شیوۂ عاشق نوازی میں
زیارت کرنے آئی ہے ہمارے قلبِ مضطر کی

ترے قربان قاتل غیر کیوں محروم رہ جائے
ہم اپنے قتل سے ہمت بڑھائیں تیرے خنجر کی

دلِ آفت طلب تجھ پر بھی کچھ الزام آتا ہے
مسلّم ہے فسونکاری تو اُس چشمِ فسوں گر کی

خدا جانے غم و اندوہ کی کب انتہا ہوگی
ہماری شامِ محنت منتظر ہے صبحِ محشر کی

ہُوئی تاخیر دم بھر کی نہ اپنے قتل ہونے میں
ہم اپنے شوقِ دل کی داد دیں یا تیرے خنجر کی

تغافل کا گلہ جاتا رہا، یہ لطف کیا کم ہے
تبسّم نے کسی کے قدر تو کی دیدۂ تر کی

ہوئیں رسوائیاں چشمِ خلائق میں تو کیا اس سے
تری رحمت تو عاشق ہے ہمارے دامنِ تر کی

تمنا ثروت و جاہ و حشم کی کیوں کروں وحشت!
میسّر کیا نہیں مجھکو گدائی یار کے در کی؟

احسن مارہروی

یہ اُدنیٰ حمدِ خالق میں ہے آدابِ رقم میرا
کہ چلتا ہے تو سر کے بل ہی چلتا ہے قلم میرا

اذیت پاؤں تکلیفیں اٹھاؤں سختیاں جھیلوں
مگر ٹھوکر نہ کھائے راہ میں تیری قدم میرا

غلط ہے اپنی ہستی پر اگر کچھ مجکو غرّا ہے
کہ رکھتا ہے حقیقت کیا وجودِ کالعدم میرا

مجھے بھرنے دے سرد آہیں کہ شب بیدارِ فرقت ہوں
اُڑاتی ہے عبث خاکا نسیمِ صبحدم میرا

تری جاں بخشیوں پر بھی ہوں اپنی جان کا دشمن
عجب ہے وہ کرم تیرا غضب ہے یہ ستم میرا

جو بگڑی ابتدا میری تو کچھ پروا نہیں اسکی
مگر ہو خاتمہ بالخیر احسن مرتے دم میرا

قواعد

۱- ہمایوں بالعموم ہر ماہ کے نصفِ اول میں شائع ہوا کرے گا۔

۲- علمی و ادبی۔ تمدنی و تاریخی اخلاقی و روحانی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پورے اتریں درجِ رسالہ کئے جائیں گے۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہ ہوں گے

۴- جواب طلب خطوط کے لئے ا؍ کا جوابی کارڈ آنا چاہیئے۔

۵- کوئی ایسا اشتہار نہ لیا جائے گا جو خلافِ تہذیب ہو۔

۶- سالانہ قیمت پانچ روپے ششماہی تین روپے نمونہ کا پرچہ ۸؍ علاوہ محصول ڈاک۔

۷- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحات سالانہ ہو گی۔

۸- خط و کتابت کے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافہ پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے ضرور لکھیں

۹- ناپسندیدہ مضمون ا؍ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے۔

۱۰- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے۔ اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتاً بھیجا جائے گا۔

۱۱- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ تحریر کریں۔

منیجر رسالۂ ہمایوں

۳۰- مزنگ روڈ- لاہور

(باہتمام لالہ دیوان چند مالک مرکنٹائل پریس لاہور چھپوا کر شائع کیا)